



مجموعہ ہمایوں آپ بیتیوں جنگ بیتیوں

سنگرزشت

اکتوبر 2017

معارف و ادب
معارف و ادب

A contact loved ones.

ایک رابطہ ایمنوں سے
Aik Rabta Apno Se.



www.PakistaniPoint.Com

شاعر انقلاب: وہ ایک ایسا شخص تھا جس سے عرب حکومتیں خوف زدہ تھیں
آواز کا جادو گر: جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں کے لوگ اسے پسند کرتے ہیں
رہائی: قیام پاکستان کے وقت اسے دھوکے سے قید کر لیا گیا، تب سے وہ اذیت جھیل رہا ہے



گفت و شنید



مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

سرگزشت



ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

تذکرہ



شکیل ادیس

اردو ادب کے ایک
اہم مسئلہ کار کا زندگی نامہ

ذکر خاص



سعید احمد سلطان

پوری دنیا میل س کی آواز
کا ب دو اپن اٹھکائی تھی

سفر کہانی



ندیم اقبال

جانبوں کی کاشہ کا دیا
الگ انداز کی داستان

خراج تحسین



شکیل صدیقی

سندھ کے دو سپوتوں کی
زندگی کے چٹنڈا م واقعہ

دلچسپ واقعات



شاہد لطیف

امریکا کے ایک
پراسرار قتل کا تذکرہ

دہشت گردی



گاشف زبیر

عراق میں سیاح کی ہر شے گروہ
سے ابھرا ایک اہم واقعہ

شخصیت



ضیاء تنسیم بلگرامی

اسلامی تاریخ کی ایک ہستی
کے کالات کا تذکرہ

عالمی ادب



سلمیٰ اعوان

عصر دنیا کے ایک
باکمال شاعر کا تذکرہ

فلم نگری



انور فرہاد

پاکستانی فلمی دنیا کے ایک
بہت بڑے اداکار کا قصہ

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس نامہ میں نئے
کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ داری نہ رکھتا۔

معاشرت

ناسور

158

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

یاد رفتگان

تلقین شاہ

155

افتخار مجاز

ایک معصوم نوجوان کی خون
رنگ لہو گرما دینے والی داستان

اردو ادب کے اس متلکار نے
دنیا کو ایک نیا زاویہ دیا

تیسری سچ بیانی

حماقت

221

سائبرہ

اس نے یہ سوچ کر لکھ پتی پڑھے
سے شادی کی تھی کہ وہ جلد مر جائے گا

دوسری سچ بیانی

کی جاناؤں

213

اصغر جمال

وہ مرد وخت یا عورت، ایک
ابھی شخصیت کی سچ بیانی

پہلی سچ بیانی

رہائی

194

زویا اعجاز

1941ء میں لکھا، ادا
ہیں انوار، وہ کنی تھی

چھٹی سچ بیانی

زہر کا پیالہ

242

تفسیر عباس باہر

اس لڑکی کی محبت میں ایک کو
خوکشی کرنا تھی دو عاشقوں کی داستان

پانچویں سچ بیانی

شیر کی خالہ

235

خرم

مردوں کو اسیر کیسے بنایا جائے یہ سیکھتے
ہوئے اس نے غضب کی چال چل دی

چوتھی سچ بیانی

تریاق

227

وسیم

اس کے محبوب نے ایک
انوکھا راستہ اپنا یا تھا

نویں سچ بیانی

دل مشکل

271

حسب اشرف

ماں پھر بھی ماں ہوتی ہے اولاد
کے لیے قربانی دینا اس کا وطن سیرہ

اثوویں سچ بیانی

تیزاب

263

رافعہ

تیزاب گردی کا شکار
ہونے والی دوشیزہ کا انتقام

ساتویں سچ بیانی

فرشتہ

255

عبداللہ

سیاست میں کیسی کیسی
چالیں چلی جاتی ہیں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کے صحیح اسلام، طہ بقہ، مطابقت، برحرمہ، سر، محفوظ رکھیں۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

میں ہر ماہ آپ کو ایک مٹی کہانی سنایا کرتا تھا اس بار
ایک نظم کہانی سنانا چاہتا ہوں، عنوان ہے اجڑی محفل:
”اماں خوش تھی“

ہونٹوں پر مسکان بھی تھی
آنکھ میں چمک رہے تھے تارے
مدت بعد جمع تھے سارے
پیاری بیٹیاں، بیٹے پیارے
بہتے تھے باتوں کے دھارے
ایک دم کسی نے فون اٹھایا
”ہل گیا نیٹ“ کانرہ لگایا
بس اک پل میں اجڑی محفل
ساتھ ہی اجڑاں کا دل

عثمان جامعی کی یہ نظم پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ
ہماری ایک تہذیب ہے، اعلیٰ معاشرہ ہے۔ نئے دور میں
انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے طوفان میں یہ ساری اقدار
بہہ جائیں گی؟ کیا یہ سب ختم ہو جائے گا؟ اجتماعیت کا جو
اسلامی پیغام ہے وہ سب بکھر جائے گا؟

معراج رسول



مدیر اعلیٰ: عذرار رسول

مدیر: پرویز بلگرامی

نائب مدیر: نبیلہ ظہر

◆◆◆
منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆
سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

تیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرمسالانہ 800 روپے



پبلشر روپروپرائٹرز: عذرار رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹیشن

پنشن کنٹرول برائین کورنگ روڈ

کلونی 75500

جیلاسٹن

پرنٹر:

ابن جن پرینٹنگ پریس

مطبوعہ:

ہائی اسٹیمپ کورنگ

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802554
E-mail: jdggroup@hotmail.com



مصنفہ

اس نے لکھنو کے ایک علم واد گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ایک نوجوان باپ کی تیسری بیٹی کہلائی۔ والد بے روزگار تھے اس لیے گھر میں ہی وقت گزارتے لیکن اس کی پیدائش کے تیسرے روز اس کے والد کو طاعون کا بلاوا آگیا۔ ان کی تقرری ایک قصبہ میں ہوئی تھی۔ وہ نوکری پر چلے گئے۔ لوگوں نے کہا۔ ”بٹیا بھاگوان ہے، آتے ہی باپ کی نوکری ہوگئی۔“ نوکری بھی ایسی کہ کبھی اس ضلع میں تو کبھی اس ضلع میں۔ یہ پھر کی طرح گھومتے رہنے کا اثر بچوں پر پڑ رہا تھا۔ انہیں اسکول میں داخل کرانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا، اسے بھی بہنوں کے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ تین مختلف استاد دو دو گھنٹے کے وقفے کے ساتھ آتے اور بچوں کو پڑھاتے۔ پہلے ایک مولوی صاحب آئے اور قرآن کی تعلیم دیے۔ پھر ان کے جاتے ہی ایک دوسرے استاد آجاتے جو انہیں فارسی کی تعلیم دیتے۔ ایک تیسرے استاد آجاتے جو اسکول کا مربی نصاب پڑھاتے۔ ان تینوں استادوں کی نظر میں وہ کندہ بن گئی پڑھائی میں اس کی دلچسپی صفر تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی اس کی کندہ دینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے صرف کھیلنے سے دلچسپی تھی کہ ایک دن اس کی بڑی بہن نے اسے ”سنڈر بلا“ کی کہانی پڑھ کر سنائی۔ یہ کہانی اسے اتنی اچھی لگی کہ وہ بار بار فرمائش کر کے سنی لیکن اس کا بڑھتا ہوا تقاضا بڑی بہن کو ذرا بھی پسند نہ آتا۔ دو تین بار کے بعد بہن نے کہانی سنانے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”کہانیاں سننے کی بجائے خود پڑھو۔ گھر میں کہانی کی کتابوں کی کمی نہیں ہے۔“ بہن کی بات اسے پسند آئی اور اس نے کہانیاں پڑھنا مول میں شامل کر لیا۔ گھر میں بہت سے پرچے آتے تھے۔ ان میں بچوں کی کہانیاں بھی ہوتیں۔ اسے کہانی سمجھ میں آئی یا نہ آتی لیکن وہ بڑھتی ضرور۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گھر میں پرچہ آتا تو وہ اسے چھپا دیتی۔ اس بات پر اس کی بہن خدیجہ کو غصہ آ جاتا اور وہڑنے پڑا کرتی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا۔ جنگ عظیم اول زور و شور سے جاری تھی۔ ملک میں سیاسی ہنگامے بھی بڑھ رہے تھے اسی دوران اسے شوق نے گھیرا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ اس نے اڑتے پرندوں، خط آسمان، رنگین پتنگوں، لکھی۔ اختتام میں اس نے لکھا کہ کیا ایسی حالت میں آسمان تلے ہم برسانے والے جہاز کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اڑے۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے جسے اس نے اپنی ایک سبکی کے نام پر ایک اخبار میں بھیج دیا۔ اخبار نے اس تحریر کو نمایاں طور پر چھاپا۔ جب وہ اخبار اس نے بہن خدیجہ کو دکھایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اب اس نے محل کر لکھنے کو کہا اور اس کا قلم چل پڑا۔ اب وہ دونوں بینش مقابلے میں لکھنے لگیں۔ اس نے انہی دنوں پہلا افسانہ لکھا جو ایک فقیر پر تھا۔ وہ مرکز پر گیا اور مرکز پر ہی مر گیا۔ خدیجہ نے بھی ایک مضمون لکھا۔ دونوں کی تحریروں چھپ گئیں۔ ان دونوں کے افسانوں کا موضوع دینی محبت تھا۔ ایسے افسانے پڑھ کر لوگوں نے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ ایسے موضوع کا انتخاب غلط ہے کیونکہ پڑھنے والے اسے قلم کار کی خود بینی سمجھے گا لیکن اس نے حوصلے سے ان کو جواب دیا اور لکھتی رہی پھر ایک افسانہ ساتی میں بھیجا جو چھپ گیا۔ اتنے بڑے پرچے میں چھپنا معمولی بات نہ تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ساتی کے مدیر شاہد احمد دہلوی کی حوصلہ افزائی بھی ملی۔ پھر اس نے ایک دوسرے بڑے ادبی پرچے ”ادبی دنیا“ میں بھی افسانے بھیجے۔ وہاں بھی خوب پذیرائی ملی۔ مدیر صلاح الدین احمد نے ادبی نوٹ لگا کر حوصلہ افزائی کی لیکن جب تیسرے بڑے ادبی پرچے ادیب لطیف میں اس نے افسانے بھیجا تو شروع سے تو احمد ندیم قاسمی نے بھی بھرپور حوصلہ دیا۔ اب وہ اس کے لیے احمد ندیم قاسمی کی بجائے ندیم بھائی ہو چکے تھے۔ اسی دوران قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور وہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئیں۔ کراچی پہنچیں اور پھر لاہور کا رخ کر لیا۔ لاہور ان کے لیے جو ایک بالکل نیا شہر تھا وہاں کے ادبی حلقے نے بھرپور مدد دی اور صرف دو دن کے اندر انہیں وہ گھرا لٹ ہو گیا۔ جوان کامیہ کہلائی اسی گھر سے اس کی ڈوٹی اٹھی اور احمد علی خان کے گھر جا پہنچی۔ احمد علی خان جو پاکستان ٹائمر کے ایڈیٹر تھے۔ ایک تو وہ پہلے ہی اچھا لکھی تھی احمد علی خاں کی حوصلہ افزائی سے اب وہ مزید اچھا لکھنے لگی اسی طرح وہ ادبی دنیا کی ایک نامور افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی جسے ہم حاجرہ سرور کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ رضا احمد اعوان کا تجزیہ بھکر سے۔ ”پوری قوم اس سال 70 واں یوم آزادی منا رہی ہے۔ چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان عورت مرد سب ہی شاداں و فرداں ہیں۔ گلی، کوچے، بازار، سڑکیں، ہر طرف ہنر ہلائی پرچموں کی بہار ہے۔ کوئی سندی ہے نہ بھابی، نہ بلوچی ہے نہ پٹھان۔ سب ”پاکستانی قوم“ بن کر جشن منا رہے ہیں۔ ہر قسم کا نسلی امتیاز مٹ چکا ہے۔ ہنسی ہے، خوشی ہے، اسن ہے، محبت ہے، فضا میں ملی لگوں سے گونج رہی ہیں اور میں اپنے کمرے میں رکھی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگائے آنکھیں موندھے، ان سارے مناظر کو ایک ایک کر کے اپنے ذہن میں لا رہا ہوں اور یہ سوچ سوچ کر فرحت و خوشی کا یہ احساس میرے قلب و ذہن کو معطر کر رہا ہے کہ ان دنوں کا ہر منظر، واقعی بڑا دلکش اور حسین ہے۔ بلاشبہ وہ پُر خلوص جذبات اور پُر لطف احساسات، قابل دید اور قابل ستائش ہیں جو جشن آزادی کے احساس سے پاکستانی قوم میں اٹھ اٹھے ہیں لیکن ایک بھکی سی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوتی ہے اور اگلے ہی لمحے ایک گہرا دکھ اور آنسوؤں ساری خوشی پر غالب آ جاتا ہے۔ میرے خوابوں کا محور و مرکز پاکستان ہے اور

رہے گا لیکن کیسا پاکستان؟ وہ پاکستان جو میرا ہے، ہم سب کا ہے جہاں دنیا کے بلند پایا پہاڑ ہیں۔ وادیاں ہیں، بلیکشیئر ز ہیں، جہاں کی جھیلوں کا شفاف پانی، آپ چلو میں بھر کر لی سکتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ دریا اور پانچ ہی موسم ہیں۔ جو بخوبی سے لے کر مجبور تک میں ہمیں خود کشیل بناتے ہیں۔ زمین سونا لگتی ہے یہ پاک وطن عظیم المرتبت ہستیوں کا عظیم خواب تھا جو ان کی محنت شاقہ کی بدولت تعبیر پا گیا لیکن اس مادہ وطن کے لیے دیکھے جانے والے آج کے خوابوں کا تقابل، ان عظیم خوابوں سے کروں جو اس مادہ وطن کے لیے دیکھے جانے والے آج کے خوابوں کا تقابل، ان عظیم خوابوں سے کروں جو اس کے پائیان نے دیکھے تو عداوت کا احساس قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے خواب تو ہم نے ایسے ہی پاکستان کا دیکھا تھا اور ابتدا میں یہ خواب نبیر ہوتا بھی دکھائی دیا لیکن رفتہ رفتہ ہم عجیب اندہ ہناک صورت حال کا سامنا کرنے لگے۔ کیوں؟ وہ پاکستان کہ جس کی اقتصادی ترقی کی رفتار دنیا کے بہت سے ممالک کے لیے قابل تقلید نمونہ تھی جس کے ماہرین معاشیات کو ریا، ملاییشیا اور آذربائیجان جیسے ممالک کے ترقیاتی منصوبے تیار کرتے تھے۔ جس کی جامعات، طب اور زراعت میں اعلیٰ تحقیقات کی حامل تھیں۔ ایئر لائن باکمال لوگ لا جواب سروس کے سلوگن کی حامل اور جدید دور کی منافع بخش کمپنی کی معمار تھی۔ جس کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کا ایشیا بھر میں کوئی ثانی نہ تھا۔ دنیا بھر کے کھلاڑی سیالکوٹ کے تیار شدہ سامان کے ساتھ میدان میں اتر کر تے تھے۔ وزیر آباد کے آلات جراحی مغرب کے جدید ترین شفا خانوں کی ضرورت تھے۔ جس کی دی ڈرامے، انتہائی کم وسائل کے باوجود پڑوسی ملک کی جدید ترین انڈسٹری برہادی تھے۔ وہ پاکستان کہ جو عالم اسلام میں اعتدال اور درواداری کا نشان سمجھا جاتا تھا جس کا گورنر جنرل ایک انکم ٹیکس آفیسر کو اس لیے وائس راج کے اس نے اسے وقت پر انکم ٹیکس ادا نہ کرنے پر نوٹس کیوں جاری نہیں کیا؟ جی ہاں یہی ہے میرے خوابوں کا پاکستان، جو ماضی میں ایک حقیقت تھا لیکن اب یہ مستقبل کے لیے میرے خوابوں کا پاکستان ہے۔ لیکن ذرا سوچئے! آج یہ پاکستان اس قدر کمپہری کی حالت میں کیوں ہے؟ مائیں اپنے بچوں سمیت خودکشی پر مجبور ہیں، تو دوسری طرف دندناتے دہشت گرد ماؤں کی گودیں اجاڑ رہے ہیں۔ خلق خدا کو کوڑے کے ڈھیروں سے رزق تلاش کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سونا اگلنے والی زمینوں کے ہوتے ہوئے بھی قوم غذائی کمی کا شکار ہے۔ بجلی پیدا کرنے کے لامحدود ذرائع ہیں لیکن پھر بھی اندھیرے ہمارا مقدر بن چکے۔ جہالت کے اندھیرے، اس پرستراویہ کہ اب ہمارا طالب علم ڈگری رکھنے کے باوجود اپنے وطن کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ملاوٹ، و خیرہ اندوڑی اور ناپ تول میں کی اب باعہ شرم نہیں رہی۔ آزادی کی لغت سے کون واقف نہیں لیکن آزادی کا بھی اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہے جیسے فرد کی آزادی لیکن تہہ کے ساتھ جذلوں کی آزادی، دوسروں کے احساسات سمجھتے ہوئے تعلقات کی آزادی لیکن

اخلاقی اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی آزادی اور ان کی بات برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوئے صبر و برداشت اور محنت سے کام کرنے کی آزادی، اس اعتماد کے ساتھ کہ عزت نفس مجرد نہیں کی جائے گی۔ خوف سے آزادی یا سوائے رب کا کائنات کے سامنے بچی کے خوف سے خوابوں کی ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی فہرست ہے۔ جسے مکملی ہوا میں سانس لینے کی آزادی، ملاوٹوں سے پاک اللہ کا عطا کردہ رزق و صبر و شکر سے کھانے کی آزادی۔ اب ہم کیسے پاکستان کے خواب دیکھتے ہیں۔ دُشمن سے کہا جاسکتا ہے کہ صرف اشرفیہ ہی نہیں ہم سب بھی اپنے خوابوں کے قائل ہیں۔ ہم نے ترقی اور خوش حالی کے ان حقائق کو دوام دینے کی کوشش ہی نہیں کی جن کی بنیاد پر میرے خوابوں کا پاکستان دنیا کے لیے قابل تقلید بن سکا۔ گمراہ اشرفیہ، آسان سے اتری ہے نہ سیاسی جماعتیں دہشت گرد زمین سے اُگتے ہیں نہ خدا و ملین۔ یہ سب طبقے ہم ہی میں سے ہیں۔ لہذا میرے خوابوں کا پاکستان کسی کو مور و الزام ٹھہرانے، کسی پر اپنی اٹھانے یا پھر کسی کو کوٹنے سے پرگز وجود میں نہ آئے گا۔ اعلیٰ و ارفع خوابوں کا پاکستان تب وجود میں آئے گا جب ہم الزام تراشی کے اس رویے کو ترک کر کے دل و جان سے اس پاک وطن کے لیے خلوص اور چاہت سے کام کریں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے کرناو میں جھانک کر سوچنا ہوگا کہ خوابوں کے پاکستان کے حصول کی منزل دور ہونے میں ہم انفرادی طور پر کس حد تک قصور وار ہیں؟ برس ہا برس سے نام نہاد قائدین کو آزما تے اور مسلسل دھوکے کھاتے چلے آ رہے ہیں اگر ہم نے عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو پھر متحد ہونا ہوگا۔ مسلک، فرقے، عقیدے سے قطع نظر صرف ایک پاکستانی کا طرز فکر اختیار کرنا ہوگا۔ دیانت داری اور محنت دوا لیے اختیار ہیں کہ جن پر تکیہ کیا جائے تو بڑے سے بڑا پہاڑ بھی سر کیا جاسکتا ہے۔ خواب لا محدود ہیں لیکن ان کا مفہوم صرف آزادی ہے اور تہمید بھی صرف ایک لفظ نہیں یہاں ہے اور وہ ہے خود احتسابی۔ ہمیں صرف اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ فرد کی سوچ جب قوم کی سوچ میں ڈھلے گی تو انشاء اللہ یہ سوچی ہوئی قوم ایک نئے عزم اور ولولے لے کر بیدار ہوگی۔ اب آتے ہیں جبر کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ اداکار و حیدر اداکار نور فرہاد کا مضمون ”لیڈی کلر“ پڑھا۔ عروج و زوال تو زندگی کا حصہ ہے لیکن جن پراسرار حالات میں ان کی موت ہوئی اور جس طریقے سے ان کی میت کو کراچی سے لاہور لایا گیا اور یہ بات تو بے حد دھمکی کرکھی کہ کراچی ایئر پورٹ پر کسی کو خیر نہیں سمجھی کہ میت پاکستان کے ایک عظیم اداکار کی ہے اور تھوڑی سی لڑکپی میں نہ ان کی میت کھل دیا اور نہ نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کا بہت اچھا دوست اور منہ بولی بہن ممتاز۔ یہ کسی قسم کا ہراسہ نہیں ہے۔ ہمارے دل میں بھی نہ لوانا اور لاوارث کی طرح تابوت کو کراچی سے لاہور پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ہر انسان کو اس میں حصہ ہے۔ لاہور میں رہنے والا کھس لینے تھالی کی موت مر گیا۔ وہ شخص جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ٹریک جام ہو جایا کرتی تھی۔ اب اہل ایئر پورٹ پر لاوارث میت کی صورت پڑا تھا اور جن پراسرار حالات میں ان کی موت واقع ہوئی اپنے پیچھے بہت سے وال بھڑکی جن کے جواب دعوئے ناہت ضروری ہیں۔ یقین کریں مجھے بار بار ان کی میت کی کراچی سے لاہور روانگی کا منظر دیکھ رہا تھا رہا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ زویا اعجاز کی مشعل راہ، شکیل صدیقی کی ہلاکت خیز، خالد جوم کی دیوار گریا، کاشف زبیر کی پرانی کھکھاسے کی چیزیں تھیں۔ جج بیانیوں میں ٹھکرانی ہوئی لڑکی، جذبہ، گمناہ گار بائرنیپ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔ ”ششال سے نو رنڈ“ اور ”ناسور“ تو اپنی مثال آپ ہیں۔ دونوں روز آؤں سے اب تک اپنی دلچسپی پر رقرار رکھے ہوئے ہیں۔ رومی بانو، طارق عزیز اور طاہرہ نقوی کے بارے میں بھی مضامین لکھیں۔ ”عہر خیال“ میں سید امتیاز حسین بخاری، حنیف ادیب، رانا محمد شاہد کے خطوط پسندیدہ تھے۔ مجموعی طور پر ستمبر کا شمارہ اچھا تھا لیکن انور فرہاد سب پر بھاری رہے اور ان کا مضمون ”لیڈی کلر“ ستمبر میں ستم کرنا بت ہوا۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کو بھی کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”چنگیزی خون اور شاعری، بہادر شاہ ظفر اور اوجہد حسین لگانہ حقیقت ہیں۔“ ”عہر خیال“ میں سعید احمد چاند کا خط اور ان کی رحلت دنیا کی بے ثباتی کو دو چند کر رہی تھیں۔ خدا ان کی مغفرت اور لواحقین کو صبر عطا کرے۔ ہماری دعاؤں میں ان کے لیے ہی نہیں اپنے جانے والے ہر سامی ہر لکھارے کے لیے ہمیشہ جگہ رہے گی۔ اماں راہی اور بشری افضل کو دیکھ کر احساسِ پختہ ہو گیا کہ دو عین مراد اپنے میں صرف خلوص ہی شرط ہے۔ رانا محمد شاہد اور اعجاز حسین سٹار کو اگر اسٹیج دے دیا جائے تو سدرہ بانو تا گوری کا خط اس مرتبہ سب سے شاندار تھا۔ بی بی سدرہ ہمارا دل جلا نا اس لیے ضروری ہے کہ اپنی حد اور اپنے فرائض کے معاملے میں الٹ رہیں۔ قصہ خانہ میں صرف محسن کش ہی نہیں خود کش بھی بنتے جا رہے ہیں۔ اپنی انا اپنی قوی حیت و غیرت اور انسان کے اجتماعی مفاد سب کا تو قلع قمع کر دیا ہے۔ اب لے دے کے اگر آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے آکر آزاد وطن کی نعمتِ مرقیہ میرے تو اسے بھی ہم اپنی وڈ ہاؤسٹ کی مسجد بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ”سجنت“ ضیاء نسیم بلگرامی کا تھوڑا سا حمر، نعت اور منقبت جس کے بھی ذہن کے ذریعے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائے وہ ہم سب سے اعلیٰ و ارفع ہے بھلے کلام ہی ہو۔ اب اگر شاعری کی ہے تو جمیل مظہری کی آشتیہ سری نے اپنی شاعری کے ذریعے شاعری کے غیر واجب الادا فرض بھی چکا رہے ہیں۔ زویا اعجاز کی ”اسپاٹ گلسٹ“ نے بور کیا۔ اخباری خبروں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ (اسپاٹ گلسٹ، اعتراض زریاب و صلی کی بھی زویا اعجاز کی ”مشعل راہ“ تھی) ”پرانی کھکھ“ نے حیرت زدہ کر دیا۔ ”ہلاکت خیز“ بھی پسند نہیں آئی۔ البتہ بابا نے جغرافیہ، قلم کار کی نیگم، دیوار گریہ اور نقد نہ کہانی اچھی لگیں۔ ”ششال سے نو رنڈ“ تک کے بارے میں اگر ہماری رائے جاننا ہو تو ”عہر خیال“ میں لاہور کے حنیف ادیب کے خط کو پڑھ لیا جائے۔ ہم بھی اسی سلوک کے

مستحق ہیں۔ اما زراہی کا نظریہ مبہوت کیے دے رہا تھا۔ ”فہر خیال“ میں آکر ہماری بات رکھنے کا شکریہ۔ ”ناسور“ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ”ٹھکرانی ہوئی لڑکی“ سے زیادہ سمندر، جذبہ اور گدھا اچھی تھیں۔ اب ذکر ہو جائے شمارے کی سب سے خوب صورت تحریر کا۔ ”مڈی کلر“ وحید مراد کو شاعر اخراج حقیقت تھا۔ اسنے شاندار فنکار کو سراہے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ پراسرار موت کا دکھ بھی کم نہیں ہوگا۔ مدگر تار کے مرحوم الیاس رشیدی، وحید مراد کے غم میں اتنے نڈھال تھے کہ وہ واقعی نہیں سمجھ سکے وحید مراد کے دوست قادر موسانی کے بیان کو کہ وہ وحید مراد کی وفات کے دن یعنی 23 نومبر کو کہہ رہے تھے کہ ان کی وحید سے چار روز قبل ملاقات ہوئی تھی اور وحید مراد اپنے بیٹے عادل مراد کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا کہہ رہے تھے۔ کس طرح ممکن ہے کہ اتنا غصہ اور با اصول آدمی اپنے بیٹے کی سالگرہ کا دن بھول جائے جب کہ انتقال سے 10 دن پہلے یعنی تیرہ نومبر کو عادل مراد کی سالگرہ گزر رہی تھی پھر وہ اور بقول قادر موسانی، وحید مراد 19 نومبر کو کہہ رہے تھے کہ وہ اس مرتبہ اپنے بیٹے کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔“

☆ اعجاز حسین ستھار کا تجزیہ پور توصل سے۔ ”کتنے خوشگوار اور ناقابل یقین لمحات تھے جب صرف دو دن میں طویل سفر کر کے پرچہ ہمارے ہاتھ میں آگیا۔ نصیر اشرفی نے محبت سے خوب صورت خط لکھا وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ شکر ہے قیصر خان کو کد ننداری اور ناپ تول سے فرصت ملی کہ روٹمانی کرا دی۔ سرگزشت میں کتنے سلسلے اور مضامین ہیں، تجویز ایسا لکھا جائے تو یہ کالم بلبلانے لگے گا۔ چند منتخب اور پسندیدہ سلسلوں پر ہی لکھنا ممکن ہو سکے گا۔ ”مشتعل راہ“ کی شخصیات میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے (ایک پاکستانی ویشیزہ بھی شامل ہے الگ سے شائع کرنے کیلئے روک لیا ہے)۔ ”مڈی کلر“ میں وحید مراد سے متعلق انور فراد نے لکھنے کا حق ادا کر دیا کوئی پہلو ہٹھکتا نہیں رہا۔ سلسلی مراد سے میت نام لگائی اور اس کے تاثرات کمال سچائی سے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے۔ واقعی ہم نے انہیں کھو دیا ابھی عربی کیا بھی کتنے ریکارڈ بننے اور ٹوٹنے تھے، ناظرین نے تفریح حاصل کرنا بھی نئے تجربے ہوئے، فن عروض پر کچھ کر دیا وصول کرتا، ماحول کا سیر و خون بڑھتا اور ناقدین کی انگلیاں منہ میں رہ جاتیں لیکن تقدیر کے ایک ہی وار نے خاویں کوٹلی میں ملا دیا اور ایک دنیا سو گوار ہو گئی۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ ان کی جگہ پر نہ ہو سکی۔ ایسی محنت اور خدا داد صلاحیت ہر کسی کے حصے میں کہاں آتی ہے بس اب ان کی بخشش کے لیے دعا بھی کی جاسکتی ہے۔ ”مشتعل سے ٹورنٹو“ میں شکر ہے کہ پوسٹل والے معاملے سے مکمل جان چھوٹی اور پریشان کرنے والا ”پرچہ 1“ انجام کو پہنچا لیکن نسرین والا سیاہ سانسے آگیا ہے، دیکھیں وعدوں اور دل کی کا پڑھ سنبھالے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اگلے ماہ تک سب کچھ سامنے آجائے گا۔ ”ناسور“ پڑھتے ہوئے دلچسپی اور تجسس سے ہٹ کر دل کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے۔ سچ بیانیوں میں ”ٹھکرانی ہوئی لڑکی“ میں اللہ سیما عیسی بیٹیاں سب والدین کو دے۔ بات ٹھکرائے جانے سے شروع ضرور ہوئی ہے لیکن اس میں سیما کی مستقل مزاجی، عزم، محنت اور کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ شامل ہے۔ وہ زمین سے اٹھ کر بلندی پر چل گئی لیکن اپنی اصلیت نہیں بھولی۔ شوخی، بے سنور نے اور مردوں سے میل ملاقات سے دور رہی اور خود کو اپنی صلاحیتوں سے سنوایا یہی وجہ ہے کہ آج قابل فخر مقام پر ہے۔ ہر رشتے کو اپنے مقام پر عزت و احترام دیا والدین کی دعائیں ہر قدم پر شامل حال رہیں اور خداوند بھی خلوص نیت سے احسان مند ہے جس گھر میں ایسی بیٹی، بہن اور بہو ہوگی وہاں خوشیاں قدموں میں آکر لوٹ پوٹ ہوئی رہیں گی۔ ”فرشتہ انکل“ میں بچے نے راہ دکھائی اور سدھر نے کا بہانہ بنا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا لیکن اصل بات ہے کہ دونوں میں شریف والدین کا خون تھا وہ کسی مجبور میں بیٹھنے ہوئے تھے یہ ان کا شعیرہ ہی تھا بس ارادہ کیا اور قسمت مہربان ہو گئی۔ ”سیلائی“ میں فیروز کی اہل ابالی طبیعت، غیر ذمہ دار اندر و بیہ اور قیمتی وقت کی بربادی دیکھ کر یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مستقبل کر زندگی سے پیار کرنے لگے گا اب کاروبار سے دلچسپی، شادی اور بچوں کا پڑھ کر دل کو تسلی ہو گئی ہے کہ وہ اب جھلسے سے باز رہے گا اس نے ہر کام ناپسندیدہ اور اثاوت کیا لیکن کوئی نیکی ایسی تھی کہ بگڑی سنور جانی ہو گیا وہ رب کی رحمت کے حصار میں رہا اور آج اپنے حصے سے بڑھ کر سترس دامن میں سمیٹ رہا ہے۔ ”سمندر“ میں فوڈی کی حد تک مان لینے ہیں کہ عورت کا ظرف وسیع ہے لیکن بھی ایسے تھے شہ سانسے آتے ہیں کہ انسانی کتباحتی ہے۔ کئی عورتیں اپنی فطرت اور جلا بے میں سوتیلی اولاد کو دردناک موت سے بھرتا کر رہی ہیں، عدالتیں اور وکلاء ایسی کتنی وارداتوں کے گواہ ہیں پھر منافقت، جلا کٹا رویہ، بچا کچھ کھلا کر داکھینے کے چکر میں رہنا ایسی کتنی حقیقتوں کی اپنی آنکھیں گواہ ہیں اور سوتیلی بیٹیوں کو غلط راہ پر لگانا بھی دور پرے کی بات نہیں ہے بس اپنی اپنی فطرت اور مزاج کی بات ہے۔ ”جذبہ“ بڑھ کر خشوع و خضوع سے دعا مانگی ہے کہ زہم چھوے دھیروں دھیر لاکھوں کروڑوں بیٹے پیدا ہوں جو دشمنوں کے دانت کھنے کے انہیں دھول چٹائیں اور پاک سرزمین کی طرف بری نظر سے دیکھنے اور سوچنے سے پہلے کا پتہ ڈھے جائیں، (آمین)۔ ”منہا گار“ میں جو قدم اٹھایا گریمر سے سامنے اریشہ ہوتی تو میں ایسی قابل فخر بیٹی کا ہاتھ چوم لیتا اگر ہم سب دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھیں تو خود ہماری چار دیواری کی شر اور بدنامی سے محفوظ رہے گی جو نقصان کی نیت سے قدم بڑھا لے گا۔ ایسی گڑبڑ ہو جائے گی کہ گھر کرنا نام نہ نہ متاثرہ واپس لے گا کیونکہ ایسے ایماندار اور نیک دل لوگوں کی اللہ خود حفاظت کر کے صدمات اور شیطان کے چیلوں کی حرکات سے محفوظ اور پاک رکھتا ہے۔ ”سچ ہے“ میں سارا قصور اسما کے وہ اپنے خاندان کی اجازت کے بغیر غیر محرم دے ملاقاتیں کرتی رہی جس مقدس رشتے کی بنیاد پر وہ ملتے تھے شری طور پر کوئی جواز نہیں ہے نہ معاشرہ قبول کرتا ہے۔ سلیم کا شک کرنا مرد کی فطرت کے عین مطابق تھا اگر وہ تیز مزاج ہوتا تو خون خرابہ دور کی بات نہ تھی پھر

کتی بر بادی ہوتی کون زندگی سے جاتا اور کوئی جوانی زندان میں گزاردیتا۔ کچھ کہانیں جاسکتا تھا۔ اسماء کا گھر بن گیا ہے اور شکوک کے بادل ٹل گئے ہیں لیکن غلط فہمی پیدا کرنے میں خود اس کا ہاتھ تھا اور یہ سب تقدیر میں لکھا جا چکا تھا۔“

☆ مفرد معاویہ کا خط خاندان سے۔ ”تبر کا شمار 22 کو ملا۔ اس سے پہلے تین تیرے پیچھے مگر پتا نہیں وہ کدھر گئے (حیرت ہے کہ تیرے ایک بھی نہ ملے) انکل کی مختصر بیانی سوچنے اور سمجھنے والوں کے لیے بہت سے درد اُکرتی ہے اور زندگی کو آسان اور ملک کو ترقی کرتا ہوتا تھا۔ قرآن پاک پر عمل کر کے انسان کی ناکام نہیں ہوتا۔ یگانہ شاعر کے بارے میں معلوم تالیس جوا بھی لکھیں۔ دوستوں کی محفل ”غیر خیال“ آئے تو آفتاب احمد نصیر اشرفی کو بہترین تیرے کے ساتھ کرسی صدارت پر پایا، مبارکائی جی۔ فقیر غلام حسین ضیاء کا بھی بہترین تیرہ، سدرہ بانو ناگوری کی عمدہ انکڑ، روی انصاری بھی سرگزشت میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ شاید نقوی کی بھی اعلیٰ کاوش، بشری افضل صاحبہ کا تبرہ، دیکھ کر دل کو سکون ہوا اور بے اختیار کہا الحمد للہ جاسوسی اور سٹاکس سے وہ ایسے غائب ہوئیں کہ میں پریشان ہو گیا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا۔ آج تبرہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سب خیر خیریت ہے۔ باقی تمام دوستوں کے تبرے بھی اچھے رہے کہانیاں شروع کیں۔ ضیاء منیم بگڑائی کے قلم سے ”جنتی“ کی زندگی مسائل کا شکار رہی اگر وہ ایک جگہ تک کر رہتا تو اس کی عزت بڑھتی اور ساتھ میں دوسروں کو بھی برداشت کر لیتا مگر اس کی اتنے اس کو کہیں کہانیں چھوڑا۔ ”آشتی سر“ زین مہدی تاریخ کے بڑے نام جیل منظر کی جو یک وقت نئی خوبیوں کے مالک تھے۔ زویا اعجازی ”شعل راہ“ بہت ہی عمدہ تحریر و کاوش ہے واقعی یہ تمام لوگ دنیا کے لیے شعل راہ ثابت ہوئے یا وجود کئی مشکلات کے جو آڑے آئیں پر وہ گھبرائے نہیں۔ اعتراف از ریاب و ملی ”اسپاٹ گلنگ“ لائے واقعی اس اسپاٹ گلنگ نے کئی نامور اور اپنے وقت کے بہترین کرکٹرز کو تباہ کر دیا۔ کشف صاحب مرحوم کی بہت ہی عمدہ تحریر ”پرانی کوکھ“ پڑھی پڑھ کر حیرت آگیا۔ ہلاکت خیز کھیل صدیقی کے قلم سے اچھی تحریر تھی۔ انور فرادی کی حیدر آباد پر تحریر ”لیڈی کٹر“ پڑھی سچ کہا حیدر آباد جیسا انسان اور ادا کا قسمت سے پیدا ہوتے ہیں حیدر آباد کی ان کت لکھیں ہیں جن کی ابھی تک دھوم ہے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ میں سر جی کی شہزاد کے ساتھ تھن ماری فقرے بازی بہت مزہ دیتی ہے۔ سیامیل آباد کی ”گھبراہٹ ہوئی لڑکی“ پڑھی۔ بالکل ٹھیک بات ہے کہ انسان کو کوئی محبت کرتے ہوئے یکدم ٹھکرا دیتا۔ انسان ٹٹ لٹ رہے جاتا ہے۔ یہاں تو نے کی بھانے خود کو ٹھکنے کی راہ پر ڈالا اور خود کو اپنے چچا کے خاندان سے بھی اوپر لے گئی اور اس کا شادی کا اجلاس بھی ٹھیک تھا۔ (اما تمہر اور جامع لکھیں۔ بے جا کی طوالت خط کا حسن ٹھکانا دیتی ہے)“

☆ رانا محمد شاہد کا اظہار یہ پورے والا ہے۔ ”ادارے میں معراج رسول نے جو بات لکھی، اس کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ معزز زمانے میں مسلمان ہو کر اور تم خوار ہوئے تاکہ قرآن، نوکریوں پر بگڑائی صاحب بڑے عرصے سے مدبر چلے آ رہے ہیں۔ ان کا نام پہلی بار اوارنی صفیہ پڑ گیا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا صدارتی خط خط و شیریں جملوں میں لکھا، اچھا کاوشی پھر جس شخص کو اپنے جائز کام کے لیے بھی رشوت دینی پڑے، ذلیل و درواہا ہوتا پڑے۔ اس میں تحمل کیسے اور کیونکر آئے گا۔ سدرہ بانو ناگوری بیٹی کی سالگرہ پر مبارک کے لیے شکر ہے۔ باپ کے حوالے سے آپ کے تاثرات حقیقت پر مبنی تھے۔ قیصر خان، ہم، واقعی اپنے محسنوں کو بھولتے جا رہے ہیں اور ہمارے زوال کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ عبدالبارودی قصور سے۔ شاید تم روزگار نے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید نقوی کا خط دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ رؤف خالد کا شکر کے حوالے سے لکھا ڈراما سیریل ”انکار وادی“ نہ صرف ہم شوقی سے دیکھتے تھے بلکہ اس ڈرامے نے تنقید پر بننے والے دیگر ڈراموں سے منفرد شناخت بنائی تھی۔ یقیناً آپ نے جن اداکاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی زندگیوں کے بارے میں سرگزشت کے خاص نمبر میں پڑھنے کو ملے گا۔ شاید اقبال شاہد! آپ تو واقعی کافی عرصے بعد آئے ہیں اگر سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتے رہے ہیں تو تھوڑا بہت ناگم نکالا جاسکتا تھا۔ خراب باقاعدگی سے آگئے۔ ”غیر خیال“ کی افسوسناک خبر سعید احمد چاندکا انتقال تھا۔ بس یہی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ سعید احمد چاند کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل دے (آمین)۔ بشری افضل کافی مہینوں کے بعد ابھی گئیں۔ ضیاء منیم بگڑائی، ڈاکٹر ساجد امجد کا ساتھ خوب دے رہی ہیں کہ اب بھی ان کی اور بھی ساجد صاحب کی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ عرب کی تاریخ کے ایک بڑے شاعر کا عبرت انگیز زندگی نامہ دلچسپ رہا۔ زویا اعجازی نے علم سے محبت کرنے والوں پر لکھا اور خوب لکھا۔ ایسے لوگ ہی کسی بھی قوم کے حقیقی ہیرو ہیں جو اپنے علم کے ذریعے لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں لاتے ہیں اور انہیں شعور دیتے ہیں۔ اعتراف از ریاب کے ”اسپاٹ گلنگ“ والے ”مضمون میں مکالمہ اضافی تھا کہتے ہیں کہ انسان دینا سے جانے کے بعد بھی اپنی تحریروں کی صورت اپنے پڑھنے والے کے دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ کشف زبیر بھی انہی میں سے ہیں ”پرانی کوکھ“ ان کی ایک اور منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر تھی۔ ندیم اقبال کا ”شمشال سے ٹورنٹو“ دلچسپ واقعات و باتوں کی وجہ سے قارئین میں پسندیدگی کی سند لیے ہوئے ہے۔ اس مرتبہ مونی کی مناسبت سے سفر نامہ میں عید کا حوالہ بھی اچھا لگا۔ سلی ایوان ایک مقبول سفر نامہ نگار تو ہی ہیں، شخصیات پر بھی زبردست لکھتی ہیں۔ ایک بڑے راسخ کی زندگی کی کہانی دلچسپ رہی۔ خالد نیوم کی ”دیوار گرہ“ اور افتخار مجازی کی ”نہ قصہ نہ کہانی“ بھی پڑھنے کے لائق تھیں۔ افتخار مجازی کا شمار تو سینئر لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔“

☆ سلیم رشید کا تو شہ لاہور سے۔ ”میں اس رسالے کو ابتدا سے پڑھ رہا ہوں اور اس میں شائع شدہ مضامین، تراشے اور آپ

کے تیسرے حالات حاضرہ کے مطابق بہت معلوماتی ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ جو تیسرہ پاکستان کے لوگوں پر معراج رسول نے تحریر کیا ہے، وہ ان کی زندگی کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے اور ملکی لوگ جس طرح مختلف قوموں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور قومیت سے دور ہو جاتے جا رہے ہیں۔ وہ تباہی اور بربادی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ہم لوگوں کو پہلے پاکستانی ہونا چاہیے بعد میں کسی مذہب اور ذات کی بات کرنی چاہیے۔ اس جذبہ سے پاکستانیوں نے بھارت 6 ستمبر 1965ء کی جنگ میں شکست دی تھی۔ جب تو قوم تقسیم ہو جاتی ہے تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن جاتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اس ملک کی عظمت اور وقار کے لیے کام نہ کرنا چاہیے۔ رسالہ کے مضامین جو پڑھنے اور پتیرہ کے تمام مضامین اور ترانے بہت معلوماتی اور سبق آموز ہیں ”بہ قصہ نہ کہانی“ بہت خوب صورت اور عبرت ناک سبق آموز واقعہ ہے۔ افتخار مجاز صاحب نے کمال کر دیا کہ ایک پاگل انسان اور جو پاکستان سے نفرت کرنے کا تھا دوبارہ پاکستانی بنا دیا۔ اگر ایک ہدایت کار پاگل شخص کو سمجھ کر سکنا ہے تو کیا قوم کے علماء، عالم فاضل، مفکر اور سیاسی شخصیات جو اپنی لچھے دار باتوں سے دودھ اور عہدے حاصل کرتے ہیں۔ وہ پاکستانی قوم کو اس مملکت پاک کی عزت اور سر بلندی کے لیے تیار کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ لوگ صرف لمبی لمبی گاڑیوں اور کوشیوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں؟ میں کوئی ناسمجھ نہیں ہوں صرف اپنی رائے دے سکتا ہوں اور دعا کر سکتا ہوں کہ پاکستان کی سلامتی اور آزادی ہمیشہ قائم رہے، (آمین)۔ ”شمشال سے نور نرو“ ایک دلچسپ مضمون ہے اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ وحید مراد بر انور فریدی کی تحریر بہت تفصیل سے بیان کر رہے ہیں اور واقعی ایک خوب صورت فنکار کی زندگی کی آخری دنوں میں تکالیف میں گزریں اور کسی نئے کچا ہے کہ دکھوں میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ میں نے وحید مراد سے کینز، عند غلب فلوس کی شوٹنگ کے دوران ملاقات کی تھی۔ وہ ایک سنجھے ہونے والا دکھتا تھا اور عوام کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتے تھے۔ رسالے میں جو ترانے موجود ہیں ان سے بیمار یوں کی وجوہات اور ان کا تذکرہ بہت عمدہ تحریریں ہیں اور اس ماہ کا رسالہ واقعی بہت عمدہ اور لوگوں کو اپنے پاکستانی ہونے کا احساس جگانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید عمدہ کاوشوں پر مامور رکھے، (آمین)۔“

☆ عبدالحکیم شمر کا خط کراچی سے۔ ”سرگزشت کے دیرینہ ساتھی سعید احمد چاند کا اظہار یہ موجودہ شمارے میں پڑھتے پڑھتے اچانک ان کی رحلت کی اطلاع کہنی دھکا کے سے کم نہ تھی۔ جس نے میرے ہوش و حواس کے چھوڑ دیے تھے میرے دینے چھینکے دیے چونکہ میں دل کا مریض ہوں اس لیے سنبھلنے سنبھلنے طبیعت سنبھلی۔ میں دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرماتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے۔ (آمین)۔ سعید احمد چاند کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی فتنہ کردہ آخری شعر کے جواب میں پروین شاکر کا ایک ایسا شعر پیش کر رہا ہوں جو میرے خیال میں مرحومہ کی سفر آخرت کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسی طرح سعید احمد چاند کا پسند کیا ہوا آخری شعر ان کی رخصتی کا پیغام دے رہا ہے۔“

☆ فضل رؤف مروت لکھی مروت سے لکھتے ہیں۔ ”میں آپ کے ماہانہ سرگزشت کا سات سال سے باقاعدہ قاری ہوں۔ اپنی ایک تحریر جو عرف ریزی کے بعد تحریر کی ہے۔ بیچ رہا ہوں امید ہے اس ماہ کے شمارے میں جگہ دیں گے۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری نے لیٹر کراچی سے لکھا ہے۔ ”اداریے میں یہ کیسا انفسانہ تھا اگلے یہ فسانہ یقیناً ہمارے لیے نہیں تھا یہ تو شاید بھولے سے آپ کے ہاتھ لگ گیا ورنہ ہم کہاں ان فسانوں پر پورا اترتے ہیں۔ ہم تو چوتھی کھائی ہوئی قوم ہیں۔ خبروں کے ذریعے یقیناً آپ کو بھی علم ہوا ہوگا کہ وطن عزیز میں جج کے نام پر کتنا بڑا افراڈ ہوا ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے خدا کے مقدس گھر کی زیارت کے خواب آنکھوں میں سجائے تھے مگر وہ سب لٹ گئے۔ ان میں میرے بھی کچھ عزیز تھے دعوتیں ہوئیں مبارک بادیں وصول کیں مگر جب جانے کی گھڑیاں آئیں تو کبھی نے سر قدام لیے۔ فراڈ نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا یہ دھوکے اگلے سال بھی ہوں گے۔ امیدیں اگلے سال بھی ٹوٹیں گی یہی ہوتا رہے گا۔ ”عصبر خیال“ میں آفتاب احمد نصیر اشرفی اپنے خوب صورت خلوص ناسے کے ساتھ مستند صدارت پر نظر آئے۔ آپ نے تمکیم فرمایا واقعی یہ بڑا احسان ہے کہ بڑے بڑے نای گرامی شعراء ہمارے حصے میں آئے جو وطن عزیز کی شان اور اس کی بچکانہ کہلائے۔ سعید احمد چاند ایک سادہ چمکے اور ”عصبر خیال“ کا دیرینہ ساتھی ہم سے رخصت ہوا خدا ان کی مغفرت کرے ان کے لواحقین کو صبر دے یہ جاتے جاتے بھی سرگزشت سے اپنی محبت کو زندہ رکھ گئے۔ ایاز راہی آپ کی تحریریں ہمیشہ ہی دلچسپ ہوتی ہیں۔ خوب صورت تیسرے کے ساتھ ”عصبر خیال“ میں رؤف افغانی کا شعر یہ۔ سلی ایحوان نے عظیم قلم کار کی عظمت کو زبردست نقوشوں میں ڈھالا۔ ”شمشال سے نور نرو“ کی یہ قسط بہت خوب رہی۔ آج کل قلم نگری پر بھاری ہوئی ہے۔ بڑے بڑے شاہکار دے رہے ہیں جو ہر دکھا رہے ہیں گو کہ ان کی اداکاری کو برسوں گزر چکے ہیں مگر ہمارے لیے تو ہر فنکار ہی نیا ہوتا ہے۔ یہ انور فرید کا بڑا بین ہے کہ وہ آج کی نسل کو ماضی سے جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ چاکلیٹی بیروں وحید مراد کا نام بچپن میں سنتے تھے تو منہ میں مٹھاں بھرا کرتی تھی مگر جب ان کی داستان حیات پڑھی تو رونے لگے کھڑے ہو گئے۔ لا زوال اداکار کس ذوال کا شکار ہو گیا۔ انہوں کی سازشوں نے اسے وقت سے بہت پہلے موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔ اس کی موت کس کرب میں ہوئی مگر وہ اب بھی ذہنوں میں زندہ ہے۔ زویا اعجاز کی کاوش بھی عمدہ رہی۔ مجھے فوزیہ کا کردار پسند نہیں

آیا۔ نعمان جیسے ہیرو کی ہیروئن تو زہیرہ کو ہوتا چاہیے جس کے حوصلے بلند اور عزائم چٹان کی طرح مضبوط ہیں۔ خوبریہ کیا ہے وہ تو پہلے بھی اکیلی تھی بعد میں بھی تنہا رہ جاتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ”ٹھکرائی ہوئی لڑکی“ اگر ٹھکرائی نہ جاتی تو اس سچ بیانی کا انداز بیان ہی بدل جاتا۔ ”فرشتہ انگل“ آنکھوں میں بھی بھرگئی۔ ”لب بام“ میں ایک اجڑا اور متواضع عورت نے اپنے گھر کو بچانے کے لیے کیا چال چلی کہ ایک پڑوسی لکھی اور بظاہر سمجھا اور عورت کو مات دے دی۔ سچ ہے کہ سچائی نے دہلا دیا انسان کیسی کیسی غلط فہمیاں پال لیتا ہے جس کا وہ تا عمر مذاکر نہیں کر پاتا بلکہ منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہمیشہ کے لیے بے نشان رہ جاتے ہیں مرگ ناگہاں نمبر کا عنوان دل کو بے چین کیے ہوئے بس انگل جنی اب انتھاری گھڑیاں ختم بھی کر دیجیے۔“

☆ انجم فاروق ساحلی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”میری جانب سے عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ گھر خلد بازار بکروں سے بچے ہوئے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی اور شوق کا عجیب عالم ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری کہانیوں کی طرف توجہ فرمادی جائے اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ جاسوسی سبب شائع ہونے والی کہانی ”تجربے کی ذہانت“ نے پذیرائی حاصل کر لی۔ امید ہے مرگ ناگہاں نمبر آپ کی محنت سے پسندیدہ کی حاصل کرے گا۔“

☆ قصیر خان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ”اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت بڑے مسئلے پر لکھا ہوا تھا لیکن اس پر عمل کون کرے گا۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے اس کی طرف سے جب حکم ہوگا تب ہی کوئی اچھا نگران ملے گا، یہ سب تو لکیر ہے ہیں۔ چنگیزی صاحب کے بارے میں پڑھا واقعی وہ چنگیزی تھے۔ ”عصیر خیال“ کے پاسیوں کو عید مبارک۔ جناب اشرفی صاحب کا شاعرانہ تیرہ تھا اور دو تیسرے شامل تھے ایک ستمبر نمبر 18 اور دوسرا 13 پر تھا (صفحہ تیرہ پر جو خط ہے وہ کمپیوٹر کی غلطی کا شکار ہے۔ یہ خط محمد ایاز راہی کا ہے جو دو حصوں میں بٹ گیا) ان کے علاوہ غیر حاضر لوگوں میں دونوں ڈاکٹر صاحب، معتمد علی، محمد عامر ساحل خالد صاحب بتائیں کہاں ہیں۔ ہمارے محترم ساتھی سعید احمد چاند وفات پا گئے۔ ان کا کیا رہا تھا کہ انہوں نے تیرہ لکھا۔ یہ ان کی علم دوستی کا ثبوت تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام دے، (آمین)۔ (پن مہدی، ذہاب، ایاز، اختر، ازاد، باب، کاشف زہیر، فکیل صدیقی، ہسلی، احوان، خالد، قیوم، اجمے، مضمون کے لکھے تھے۔ اور ۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹۹-۱۵۰۰-۱۵۰۱-۱۵۰۲-۱۵۰۳-۱۵۰۴-۱۵۰۵-۱۵۰۶-۱۵۰۷-۱۵۰۸-۱۵۰۹-۱۵۱۰-۱۵۱۱-۱۵۱۲-۱۵۱۳-۱۵۱۴-۱۵۱۵-۱۵۱۶-۱۵۱۷-۱۵۱۸-۱۵۱۹-۱۵۲۰-۱۵۲۱-

ہم نوابت افتشال کی آمد مہور فتح جنگ سے۔ ”اداریہ حب معمول ہلا دیئے والا تھا۔ یگانہ چنگیزی معروف شاعر تھے۔ اپنی شاعری سے زیادہ وہ غالب و اقبال کے نائد کے طور پر بھی مشہور ہوئے۔ یگانہ نے دیوانگی کے عالم میں وفات پائی۔ احسان دانش کی سوانح حیات ”جہان دگر“ میں ان کے بارے میں تفصیل درج ہے۔ معروف عرب شاعر ”جنتی“ پر ضامہ نسیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ ”آشدہ سر“ علامہ جیل منٹری کے حوالے سے اچھی تحریر تھی۔ ”مفضل راہ“ بہترین تحریر تھی لیکن کاش وطن عزیز کے کسی فرد کا ذکر بھی اس میں ہو جاتا کیونکہ یہاں بھی ایسے کئی آدمی گزرے ہیں۔ ”اسپات گلنگ“ نے تو وطن عزیز کو بدنام کر دیا ہے۔ اتنی اچھی خواہیں بنانے کے باوجود نہ جانے کیوں کھلاڑی حضرات لالچ میں آجاتے ہیں۔ لیڈی کلر، بابائے جغرافیہ، دیوار گریہ، ہلاکت خیز، قلم کار کی تنیم، نقد نہ کہانی بھی بہترین تحریریں تھیں۔ ”شمشال سے نورنو“ اب بہترین موڈ پر ہے اور اپنی گرفت قائم کیے ہوئے ہے۔ ”ٹھکرانی ہوئی لڑکی“ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ سیاسے کے چچا اور چچی نے اسے ٹھکرانا لیکن اس کی اعلیٰ ظرفی کے اعلیٰ عمدہ پر پہنچ کر بھی وہ بہت باغرف نگار نہیں معاف کر دیا۔ ”سیلانی“ اچھی تحریر تھی شکر ہے فیروز کو کوئی منزل مل گئی۔ ”سمندر“ زبردست اور سبق آموز کہانی تھی۔ ”جذبہ“ بھی قابل تعریف تھی۔ ”منہ گار“ میں اربیتھ نے بہت اچھا فیصلہ کیا کاش ہم سب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے۔ ”مگدھ“ بھی اچھی تحریر تھی۔ اقتباسات اور پارے بہت مطلوباتی تھے۔ ”عہم خیال“ میں صدارت و آفتاب احمد نسیم اشرفی کے حصے میں آئی۔ جناب آپ نے درست کہا۔ اقبال کا ہم کو نصیب ہونا ہماری خوش قسمتی ہے لیکن افسوس کہ آج ہم کو ہماری آنے والی سلسل کو اقبال سے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت دور کیا جا رہا ہے۔ خصوصاً درسی نصاب سے اب اقبال کو نکالا جا رہا ہے۔ فقیر غلام حسین ضیاء، سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد شاہد، عبدالجبار روی، شاہد نقوی، شاہد اقبال شاہد، اعجاز حسین، شہار اور سید امتیاز حسین بخاری عمرہ اور بھر پور تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ باجی بشری افضل شکر ہے کہ آپ نے دو چار سطریں لکھ کر خود کو حاضر کر دیا۔ قبائے منافقت، فریب زن کے عنوان سے دو کہانیاں اور ایک تحریر اقبال کے حوالے سے دے رہی ہے کہ اب تک شائع ہو جاوے گی۔ (آپ کی کہانیاں مارچ میں موصول ہوئیں اور بورڈ نے مسترد کر دیا، وہ برپے کے مزاج کی نہ تھیں۔ اقبال کے حوالے سے ”دفاع فکر اقبال“ اشعار پر تبصرہ ہے۔ سرگزشت میں واقعات و رد و داد کو ترجیح دی جاتی ہے آپ سرگزشت کے مزاج کی کہیں۔“

☆ عبدالجبار روی انصاری کا تبصرہ قصور سے۔ ”ہائے ہائے قائد اعظم نے فرمایا میری جیب میں کھولے سکے ہیں۔ وہ کتنے دور اندیش تھے آج کی بات انہوں نے اس وقت کہہ دی تھی جب وہ خود اپنی کابینہ کے لیے جانے بناتے پر ملازم کو کمر لٹک رہے تھے کہ قوم کا چہرہ ہے اسے اس طرح کی فضول خرچیوں میں ضائع نہیں کرنا لیکن ان کی جیب کے کھولنے کے آگے اب تک سچے نہ ہو سکے۔ ان کھولے ٹکوں نے ہی شاہ خرچیوں سے اور قوم کی دولت لوٹ کر اٹھوں کے انبار لگا لیے افسوس صد افسوس۔ آفتاب احمد نسیم اشرفی کا تبصرہ زبردست رہا۔ فقیر غلام حسین کی آمد بھی اپنی مثال آپ تھی۔ سدرہ بانو کا بھر پور تبصرہ اچھا رہا۔ مقدس جہاں، محمد ابراہیم درانی، جینا اور محمد ایا ز راہی بھی عمدہ رہے۔ سید احمد چاند کا تبصرہ عمدہ تھا۔ ان کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ”جنتی“ کی سرگزشت دلچسپی سے بھر پور تھی۔ ”ٹھکرانی ہوئی لڑکی“ نے اپنی ہمت سے دس سالوں میں اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ حاصل کر لیا جب کہ مخالفین وہ ہیں کے وہ ہیں۔ اچھے ثابت قدمی ہی کا سامنا ہی سے ہسکتا کرنا ہی ہے۔ اس رمان کی باجی نے اپنے گناہ گار بھائی کو پولیس کے حوالے کر کے اچھا فیصلہ کیا۔ ”مگدھ“ اچھی لگی۔ کوکھ پرانی تھی مگر مانتا کا جذبہ تو خالی نہیں تھا جو بیو کو ختم دینے والی سبلی نے بین جوئے کو اپنی اولاد دینے سے انکار کر دیا۔ قلم نگری سے ”لیڈی کلر“ چالکیٹی ہیر و وحید مراد پر تحریر نا در دیا اب ثابت ہوئی۔ بے حد پسند آئی۔ ”شمشال سے نورنو“ میں اس دفعہ نرسن کا ساتھ بہت اچھا لگا اور عید کی مناسبت سے عید کی یادیں بھی اچھی لگیں۔ مختلف لوگوں کی سرگزشت جو مفضل راہ ہے عمدہ لگی۔ شاہ زیب عرف زبمی نے اٹھارن آئیفر راون اور اس کے ساتھیوں کو ختم رسید کر کے خود بھی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ”جذبہ“ اچھی تحریر تھی۔“

☆ سیف اللہ کا تبصرہ ملک وال سے۔ ”عہم خیال“ کے ساتھی سید احمد چاند کے اس دنیا میں نہ رہنے کی خبر اس کا گھمائی۔ ہم سب پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مرحوم کے تبصرے بھی اچھے ہوتے تھے اور ”بیت بازی“ میں شمر بھی معیاری بھیجتے تھے۔ ضیاء نسیم کی تحریر ”جنتی“ اور زین مہدی کی تحریر آشدہ سر نے زیادہ ساثر نہیں کیا ایک وجہ تو میری کم علمی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ جن دو شخصیات کا تذکرہ ہے مجھے پہلی دفعہ پتا چلا ہے۔ مفضل قلم تمام کر مثال بننے والے لوگوں سے زیادہ اعجاز نے متخالف کر لیا۔ ”اسپات گلنگ“ پڑھنے سے یہ تو پتا چل گیا کہ کون کون سے کھلاڑی اس کا شکار ہوئے لیکن اچھا ہوتا اگر تحریر کے شرو میں بیٹا دیا جاتا کہ ”اسپات گلنگ“ ہے کیا چیز اور یہ مل میں کیسے آتی ہے۔ سرگزشت پڑھنے والے میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مھل آگاہی نہیں ہوتی۔ ”پرائی کوکھ“ پڑھی۔ کاشف زبیر مرحوم کی تحریر ایسی ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ تحریر اور بھی جیتی ہوئی اور پڑا ہے جو کہ جلدی بھولنے والی نہیں۔ انور فاد صاحب کی تحریر ”لیڈی کلر“ واقعی تعریف کے قابل ہے۔ معلومات کا خزانہ پڑھنے والوں کے لیے، اور وحید مراد کو چاہئے والوں کے لیے سرگزشت کے صفحات پر اغزل دیا ہے۔ کہاں تک تعریف کی جائے آخری صفحہ ہدایت کا پر پوز کے خط کی چند سطریں کیا کہنے۔ وحید مراد تک پہنچنے والے اس خط نے ہر قاری تک پہنچ کر اسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مضمون کا اختتام اس سے زیادہ برا اثر طریق سے ہو ہی نہیں سکتا۔ انور فاد صاحب اللہ آپ کو خوش رکھے۔ عہد بعد سبلی اعوان کی حسب سابق گہرائی والی تحریر قلم کار کی تنیم پڑھی اور پوری طرح سمجھنے کے

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کالاف استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ ساہجر کرائز انٹرا ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

لیے تحریر کو دوبارہ پڑھا۔ ندیم اقبال صاحب نے اس دفعہ سرچی اور شہنازی چیٹ پٹی باتوں کے علاوہ نسرین سے یارک میں ملاقات کو Love spot بنا کر ایسا ماحول بنادیا ہے کہ ندیم صاحب نے قاری کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں جکڑ لیا ہے اور آخر میں پھر اسی نسرین نے بل صراط پر لا کھڑا کیا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ ”نقصہ نہ کہانی“ نے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔ نظریے، دیوانہ گریہ کو چھوٹی چھوٹی تحریر میں لیکن اچھی ہیں مگر دیوانہ گریہ میں صفحہ 158 پر لائن 13 میں لکھا ہے کہ ماں چھوڑے پڑ چلا کہ دیوار کی مغربی جانب نگاہیں جمادیتیں اور لائن 27 میں لکھا ہے کہ باپ کی قبر مشرقی طرف ہے۔ سلسلہ دار کہانی ”ناسور“ پر تجسس واقعات کے ساتھ دکھائی دے رہی ہے لیکن شروع میں بیٹھ ستار کے بلائے گئے تینوں لوگوں کو کالیا اور نعمان نے فحشائے نگاہیوں کیوں نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ڈرامائیور نے گاڑ کو اندر کے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ تین لوگوں کو مارنے سیٹھی کی آنکھ ضائع کرنے کے بعد لڑکی کو ساتھ لے کر کالیا اور نعمان آرام سے باہر چلے گئے۔ ایسی غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے۔ طارق عزیز کی ”بابائے جغرافیہ“ محنت کا نتیجہ ہے۔ یونانی سائنسدان ابن تو کاس رمانے میں خط استوا ہر زمین کا محیط بتا جہان ان کو ہے ہی لیکن صاحب تحریر نے کب پینک دھماکا، نظام شمسی کا وجود یا آنا کرہ ارضی یا آلف لٹل بولس ٹاؤنس کی حرکت۔ اس کی نوٹ بھٹ تا کر کائنات کو کھٹے میں بہت مدد کی ہے۔“

ان اربابِ علم و محرمِ حاضر داخل لے کر ان کو باقیل خان لے لکھا ہے۔ ”مصر و غلات زندگی کی پہلے سے ”فہم خیال“ میں شائع ہوتا ہے۔ ان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے پاس ”مصر و غلات“ میں بھی مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔“

’اندیم اقبال‘ فاشی کن امر لیا۔ ’ملوس نام۔‘ ’جبر 2017ء کا شمار اس وقت میرے ہاٹھ میں ہے۔ ہر باریک طرح میں نے ابتدا و قارئین تبصرہ نگاروں کے خطوط سے کی۔ یہ آپ سب کے خطوط ہیں جو مجھے اس گروں کے دیں میں اردو لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کے خطوط ہی ہیں جو مجھے ایک نئی توانائی بخشتے ہیں۔ جب میں پڑھتا ہوں کہ ’سفر نامہ پشند آیا‘ تو کیا ہمیز ملتی ہے۔ بیچے لمبے ذہن کے کیونوں ہا تازہ ہو جاتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کرچی کا کھلا واقعی پہلے نمبر پر آنے کا حقدار تھا۔ بہت عمدہ اور باریک بینی سے تبصرہ کیا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہیں ’شمشال سے نورنور‘ پشند آ رہا ہے۔ جناب نے صحیح کہا کہ داستان کو مسافر کو اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ ہم آپ سب بشر ہیں اور بشر خطا کا پتلا ہے۔ اگر سہو انہیں کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے تاکہ اندر وہ غلطی نہ ہو۔ بغیر غلام حسین ضیاء کا خط بھی پشند آیا۔ سدرہ ہونا گوری کا شکر ہے کہ وہ اتنی باریک بینی سے سفر نامہ پڑھتی ہیں۔ آپ کے سوال کا جواب تفصیل کا طالب ہے۔ آپ جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے قانون کا احترام کرنا ضروری ہے۔ رانا محمد شاہد بیوروے والا کا بھی شکر ہے کہ انہوں نے یاد رکھا۔ عبدالجبار رومی آپ کا بھی شکر ہے کہ سفر نامہ انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ سرگزشت کے جن افراد کے تبصرے میں غور سے پڑھتا ہوں ان میں ایک آپ بھی ہیں۔ سیف اللہ ملک دال آپ جیسے افراد کے توصیفی کلمات مجھے ہمیز کرتے ہیں۔ بہت بہت شکر ہے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سرگزشت کے تبصرہ نگاروں کو میرا سفر نامہ اچھا لگ رہا ہے۔ شاہد اقبال شاہد کا یہ جملہ ’شمشال سے نورنور‘ پر کچھ بھلا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ’میرا ذخیرہ خون پڑھا گیا۔ یہ آپ جیسے لوگ تو مجھے تصنیف ہی دنیا میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ محمد ایاز راسی کا تبصرہ بھی مدلل ہوتا ہے اس لیے پشند آتا ہے۔ ان کی تحریر بھی الگ انداز کی ہوتی ہے۔ سعید احمد چاند کے انتقال کا سن کر دل غم سے بھر اٹھا۔ ان کا تبصرہ مجھے ہمیشہ پشند آتا تھا۔ اعجاز حسین۔ سٹارے جن منتوں کو اٹھایا پشند آیا، بہت شکر ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری کا بھی شکر ہے کہ انہیں میری تحریر اتنی زیادہ پشند آ رہی ہے۔ بشری افضل، عزیز بٹے اور ان تمام دوستوں کا شکر ہے جنہیں شمشال سے نورنور پشند ہے۔“

تاخیر سے موصول خطوط

تجسم عرفان تریخی، ابرار احمد، سہیل شہیدی، ناصر حسین (کراچی)۔ زابد حسین قادوری (فیصل آباد)۔ عامر علی عامر (وینہ)۔ اشرف علی (لاہور)۔ نیاز شاہہ، غازی عباس (سرگودھا)۔ یاسین قادوری (سکھر)۔ انعم (حیدر آباد)۔ ذیشان مصطفیٰ (کوئٹہ)۔ نسیم احمد (ای جی خان)۔ کائنات مرزا (ربوہ)۔ اشفاق چٹوٹی (چنیوٹ)۔ اباز انام (شادی پور)۔ ارشد عثمانی (شجاع آباد)۔

علامہ ابن جوزی

ضیاء تسنیم بلگرامی

ماضی کے جن بڑے علمی لوگوں نے اپنے دور کو انتہائی متاثر کیا اور وفات کے بعد صدیوں ان کا کام نسلِ انسانی کو متاثر کرتا رہا۔ ان میں عبدالرحمن ابن جوزی کی ذات بہت نمایاں تھیں۔ یہ بیک وقت مفسر، محدث، مؤرخ، خطیب، مصنف اور ناقد تھے۔ ان کی حالاتِ زندگی اور جدوجہد آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے مشاہیر سے لاعلم اور ناواقف ہیں۔ مولانا شبلی کے بقول ”مغرب نے ہمارے زندوں کو تو مفتوح بنا لیا ہے مگر اس سے بھی زیادہ ظلم اور ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے مُردوں کو بھی فتح کر لیا ہے۔“ آج ہم علم کے کسی بھی شعبے سے متعلق باتیں کرتے ہیں تو ہمیشہ مغربی مشاہیر کے حوالوں میں نام لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے مشاہیر کا علم ہی حاصل نہیں اور اگر کچھ ناموں سے واقف ہیں تو ان کے بارے میں اتنی سرسری اور معمولی معلومات رکھتے ہیں کہ انہیں ہم کسی مغربی مشہور ہستی کے نام کے ساتھ حوالے میں استعمال نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے بڑے لوگوں کے بارے میں بس نام کی حد تک واقفیت حاصل ہے۔ حالانکہ ہمیں ان کے کام کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہونی چاہیے۔

اس شخصیت کا احوال جو نیکی کی طرف بلا تا رہا۔

قائم کر رکھا تھا اور یہاں حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی، قرآن مجید کو حفظ کروایا جاتا تھا قرآن پاک کی تعلیم میں تجوید پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

ماں نے عبدالرحمن کو ابنِ ناصر کے مدرسے میں داخل کر دیا اور بیٹے کو نصیحت کی کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح بے کار مشاغل میں پڑے وقتِ ضائع نہ کرے کیونکہ بچپن کا یہ زمانہ اگر بے کار مشاغل میں پڑے ضائع کر دیا گیا تو سچا ہوا وقت واپس نہیں آئے گا اور بے کار مشاغل کی عادتیں پختہ ہوتی چلی جائیں گی اور پوری زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔

ماں کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا ان پر کتنا اثر ہوا یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بچہ خدا کی طرف سے ایسی فطرت لے کر آیا تھا کہ جس کا بچے کی ابتدائی زندگی کے مشاغل سے خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

بچے کو درس گاہ سے اتنی محبت اور دلچسپی تھی کہ مدرسے کے ان کی عمر سے بڑے لڑکے ان کے مقابلے میں پیچھے ہو

وہ 508 ہجری بمطابق 1114 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ یعنی عبدالقادر جیلانی سے ستائیس سال چھوٹے تھے۔

باپ کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی ماں پر آگئی تھی۔ چھٹی صدی ہجری کو تصور میں لائیں اور سوچیں کہ اس عہد کی عورت کا معاشرے میں کیا مقام تھا اور اس کا اپنے گھر کے باہر، بیرونی دنیا سے کتنا ربط و تعلق ہوتا ہوگا اور اسے تنہی معاشی اور معاشرتی دشواریوں کا سامنا اور مقابلہ کرنا پڑتا ہو گا۔

شوہر کا وفات پا جانا اور اپنے پیچھے ایک مغیر سرن بچے کا چھوڑ جانا ذمہ داری کا ایک بحرِ بیکراں تھا پھر بھی بیوہ نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اس بچے نے جیسے ہی شعور کی دنیا میں قدم رکھا ماں کو بیٹے کی تعلیم کی فکر لگ گئی۔

اس زمانے میں مسجدوں میں مدرسے قائم تھے چنانچہ اس عہد کے ایک مشہور محدث ابنِ ناصر نے مسجد میں مدرسہ



انہی لڑکوں میں سے ایک نے ان سے پوچھا۔
”دوست عبدالرحمن تم اپنے طور پر کس طرح پڑھتے ہو ہمیں
بھی بتاؤ تاکہ ہم اپنی اصلاح کریں اور استاد کے علاوہ بھی
پڑھائی شروع کر دیں۔“

عبدالرحمن نے جواب دیا۔ ”میرے کچھ بتانے سے
تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا تم مدرسے میں میری طرح
جلدی پختہ ہو اور دیکھو کہ میں اپنے طور پر کس طرح تعلیم حاصل
کرتا ہوں۔“

لڑکے ان کی باتیں بے دلی اور بے توجہی سے سنتے
اور مسکرا کر خاموش ہو جاتے جبکہ ان کو دوڑنے کا راستہ مل
جاتا اور یہ دوڑتے اور ہانپتے ہوئے مدرسے پہنچ جاتے۔
استاد ابن ناصر انہیں ہر روز دوڑ کر مدرسے میں داخل
ہوتے دیکھتے اور یہ بھی محسوس کرتے کہ عبدالرحمن ہانپ
رہے ہوتے۔

لیکن استاد نے ان کے اس طرح مدرسے میں آنے
کے بارے میں کبھی کوئی پریشانی نہیں کی۔

دجلہ کے کنارے بھڑکلی ہوئی تھی اور اس دن کوئی نیا
بازی گر لوگوں کو شعلہ بے دکھانے میں مشغول تھا اور دیکھنے
والوں کو حیران کر رہا تھا۔ لڑکے بھی بازی گر کے آس پاس موجود
حڑے لے رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی نظر عبدالرحمن پر پڑ
گئی اور وہ بھاگ کے عبدالرحمن کے قریب پہنچ کے کہنے لگا۔
”عبدالرحمن آج تو تجھے رکنا ہی پڑے گا ایک بازی گر شام
سے آیا ہوا ہے اور بڑے حڑے کے شعلہ بے دکھا رہا ہے۔“
عبدالرحمن نے کوئی جواب تو نہیں دیا لڑکے کو دو دنوں
ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا کے دوڑ لگانی شروع کر دی۔

اس طالب علم کو بھی غصہ تو بہت آیا کہ یہ اس کا ہم
درس عمر میں اس سے چھوٹا طالب علم دنیا کے دوسرے
مشاغل میں مشغول نہیں کیوں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ اس لڑکے
نے عبدالرحمن کے پیچھے دوڑ لگائی یہ دیکھنے کے لیے کہ
عبدالرحمن مدرسے میں داخل ہونے کے بعد اپنے طور پر کس
طرح پڑھتا ہے۔

عبدالرحمن نے اپنی جماعت میں داخل ہونے کے
بعد کچھ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ان کے پیچھے ان کا ہم جماعت بھی داخل ہوا اور
عبدالرحمن پر جھک کے دیکھنے لگا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔

ایک دن پہلے استاد نے جو درس دیا تھا اور احادیث
بیان کی تھیں وہ سب اس وقت لکھی جا رہی تھیں۔

مگئے۔ ان کے دجود میں علم کی پیاس ساتی ہوئی تھی۔ دوسرے
لڑکے مدرسے کی طرف اطمینان سے جاتے ہوئے نظر آتے
مگر عبدالرحمن کو عموماً اس حال میں دیکھا گیا کہ وہ مگر سے
مدرسے کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آتے، بالکل ایسا لگتا تھا
گو یا عبدالرحمن نامی بچہ کسی دور لکھ جانے والی شے کا ذوق
و شوق کی کیفیت میں پھنسا کر رہا ہو۔

راستے میں دریائے دجلہ کے قریب تفریح کرنے
والے نظر آتے اور ان تفریح کرنے والوں کے لیے کھانے
پینے کی چیزیں فروخت ہو رہی ہوتیں اور یہیں بازی گر اپنے
تھیل تھما لے دکھاتے اور ان کے آس پاس ہر عمر کے لوگ
موجود لڑکچئی سے تماشا دیکھ رہے ہوتے۔

مدرسے کے لڑکے بھی ان میں نظر آتے مگر عبدالرحمن
نامی بچہ ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کیے مدرسے کی
طرف دوڑ لگتا ہوا نظر آتا۔

ہم جماعت لڑکوں کو جستجو رہی کہ آخر عبدالرحمن میں یہ
بے چینی کیوں پائی جاتی ہے۔ وہ عبدالرحمن کو راستے میں
روک کر یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ تمام لڑکے مدرسے کی طرف
معمول کی چال چل کے پہنچتے ہیں اور وقت پر مدرسے پہنچ
جاتے ہیں مگر عبدالرحمن دوڑ کر پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں آخر ایسا
کیوں ہے؟

کئی بار لڑکوں نے ان کو راستے میں روکا اور پوچھا۔
”یہ تم دوڑ کر مدرسے کیوں پہنچتے ہو کیونکہ تمہارے جلدی پہنچ
جانے کا آخر فائدہ کیا ہے استاد اسی وقت پڑھاتے ہیں جو
درس کا وقت مقرر ہے۔“

عبدالرحمن نے راستے میں روکنے والے طالب علموں
کو جواب دیا۔ ”تم لوگ یہ سوال مدرسے میں بھی کر سکتے ہو
اس وقت میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تاکہ میں مدرسے کا
کام اپنے وقت مقررہ میں انجام دے لوں۔“

ایک لڑکے نے پوچھا۔ ”اے عبدالرحمن! کیا تمہیں
استاد محترم کچھ الگ درس دیتے ہیں ہم نے تو وقت مقررہ پر
ہی ان کو پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے۔“

عبدالرحمن نے جواب دیا۔ ”تم لوگ صرف استاد کی
دی ہوئی تعلیم پر انحصار کرتے ہو جب کہ میں اپنے طور پر بھی
تدریسی عمل جاری رکھتا ہوں۔“

لڑکوں کو عبدالرحمن کے اس جواب پر ہنسی آمیز اور ان
کی اپنے طور پر درس جاری رکھنے کی بات بالکل سمجھ میں نہیں
آئی۔

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کپاس چڑا جاتا ہے۔ جس سے دھاتی چیزوں کو پالش کر کے چمکا یا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہو جائے۔ شمالی ایران اور روس کا کپاس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

کرنے لگے۔

اس کے کئی ہم درسوں نے یہ بھی دیکھا کہ ابن جوزی مروجہ نصاب کے علاوہ بھی کتابیں پڑھتا بھی تاریخ میں کم نظر آتا اور کئی تذکروں میں غرق دکھائی دیتا۔

اس ہمہ جہتی مطالعہ نے اس میں غیر معمولی لیاقت اور قابلیت پیدا کر دی اور دوسرے طالب علم اس معاملے میں اس سے بہت پیچھے رہ گئے اساتذہ ابن جوزی پر بھرپور توجہ دیتے پھر بھی ان کو کبھی کبھی ابن جوزی پر یہ اعتراض ہوتا کہ وہ مروجہ نصاب کے علاوہ کتابیں کیوں پڑھتا ہے۔

ایک استاد نے پوچھا۔ ”مجھے تمہارے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہیں تاریخ کے واقعات پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔“

ابن جوزی نے جواب دیا۔ ”بے شک مجھے تاریخ

ساتھی طالب علم نے پوچھا۔ ”انہیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ احادیث سن لیں، زبانی یاد رکھو اور اگر انہیں محفوظ ہی کرتا ہے تو استاد کے لکھے ہوئے مجموعے احادیث کو لے کر ان کی نقل کر لو۔“

عبدالرحمن نے جواب دیا۔ ”مسئلہ احادیث کے یاد کرنے کا نہیں ہے۔ میں استاد کے کسی مجموعے سے انہیں نقل کر سکتا ہوں مگر یہ مسئلہ سالوں کا ہے اور میں انہیں لکھنے کے لیے ہر روز استاد سے کتابیں مانگا کروں، اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ میں اپنے حافظے میں محفوظ کر کے فرصت کے اوقات میں انہیں لکھ لیا کروں لکھنے کا مجھے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ میرا حافظہ بہت اچھا کام کرنے لگا ہے۔“

ہم درس ساتھی کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آئیں، وہ کوئی مزید سوال کیے بغیر ان کے پاس سے اٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کو ان کے بارے میں بتایا۔ ”عبدالرحمن کے دل و دماغ میں ایک قسم کا ضبط پایا جاتا ہے اور یہ بڑے ہوئے اور نہ اہل ہاتھ کو حافظے میں محفوظ کرنے کے لیے انہیں لگایا جاتا ہے کہ اس طرح اسے سب کچھ سنا اور یاد آ رہا ہے۔“

اس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اس کا خود یہ بیان ہے کہ معاشی کمزوری نے اسے بہت پریشان رکھا مگر وہ اس بات کا ہمیشہ خدا کے شکر گزار رہا کہ اسے کئی احسان نہیں لینا پڑا۔

مدرسے میں درس احادیث کا دیا جاتا تھا اور قرآن پاک کے حفظ کرنے کے دوران تجوید کو بھی حافظے میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ حلق سے آوازیں نکالنے کی مشق بھی کرنا پڑتی تھی۔ کون سا حرف کس طرح ادا کیا جائے گا اور اس کے صوتی صحیح اظہار کے لیے حلق سے غرض پر بھی دھیان دینا پڑتا تھا چنانچہ اس جدوجہد میں ان کے چوتھیں گھنٹے مشغولیت میں گزر جاتے تھے۔

ان کے ہم درس طلباء کو حیرت تھی کہ دوڑ کر مدرسے پہنچنے والا یہ طالب علم مدرسے کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آتا گویا کھیتا کو دنا اس کے لیے غیر ضروری مشغلہ تھا۔

اس کے ساتھیوں کو اس کی مصروفیت سے حیرت پیدا ہو گئی تھی اور وہ اس کے الگ تھلگ رہنے میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے اسی کیفیت نے حسد کی شکل اختیار کر لی اور وہ عبدالرحمن ابن جوزی کے خلاف ایسی سیدھی حرکتیں

اس قسم کی قدغزوں سے عالم ادھر اور یہ جاتا ہے۔ کیا آپ میرے لیے یہ پسند کریں گے کہ میں ناقص عالم کہلاؤں؟“ استاد کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آ رہی تھیں چنانچہ استاد نے زور دیا کہ وہ استاد سے جو کچھ کہہ رہے ہیں کتابوں کے حوالوں سے ان کی وضاحت بھی کریں۔

ابن جوزی نے امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کی تاریخی فردگزاشت کا ذکر کیا۔ ”جناب غزالی نے اپنی اس کتاب میں مختلف واقعات اور تواریخ کو اس طرح جمع کر دیا ہے کہ انہیں تاریخی حقائق سے رد کیا جاسکتا ہے۔ غزالی نے لوگوں کے حوالوں سے جو باتیں لکھ دیں وہ تاریخ کے گہرے مطالعے سے جھٹلائی جاسکتی ہیں، وہ جن دو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے حوالے سے کوئی واقعے یا کوئی بات بتاتے ہیں تو اس وقت انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں کے زمانوں میں طویل زمانی فاصلہ موجود ہے اور وہ کس طرح ایک ساتھ اور ایک جگہ موجود ہو سکتے ہیں۔“

استاد نے حیرت سے ابن جوزی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کسی مثال سے اپنی ان باتوں کو ثابت کرو۔“

ابن جوزی نے جواب دیا۔ ”غزالی نے اپنی کتاب منظرہ میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتے میں سے کچھ تیرکا بھیجو۔ ابو حازم نے ان کے پاس اگلا ہوا چکر بھیجا۔ سلیمان نے اس چکر کا ناشتا کیا اور پھر اپنی بیوی سے ہم بستہ ہوا۔ اس سے عبد العزیز پیدا ہوئے اور عبد العزیز سے عمر بن عبد العزیز پیدا ہوئے۔ اس واقعے میں سخت مغالطہ موجود ہے کیونکہ غزالی نے عمر بن عبد العزیز کو سلیمان بن عبد الملک کا پوتا قرار دیا ہے جب کہ وہ سلیمان کے چچا کے بیٹے تھے اسی طرح شیخ ابوالعالی جوینی نے اپنی کتاب ”الاشائل“ میں لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے کہ منصور حلاج، جبانی قریطی اور ابن القتیع نے سلطنتوں کے نظام کے اٹلنے، مملکت کی تحریب اور عوام کی استقامت کی سازش کی اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری قبول کر لی۔

جبانی نے احسا میں سکونت اختیار کی ابن القتیع نے ترکستان کی حدود میں قیام کیا اور منصور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا۔ اہل بغداد دھوکا نہیں کھاتے اور وہ بڑے مردم شناس اور سمجھ دار لوگ ہیں جب کہ میں اگر شیخ ابوالعالی کے قریب ان کے دور میں

سے بڑی دلچسپی اور لگاؤ ہے کیونکہ تاریخوں میں قوموں کے عروج و زوال کے واقعات محفوظ ہیں اور مجھے تاریخ کے ان لوگوں سے بھی دلچسپی ہے جو بہت مشہور ہو گئے کیونکہ ان کی شہرت کے پیچھے بے انتہا لگن، جوش و خروش اور لگاؤ مارا مل پایا جاتا ہے اور ان کے واقعات سے مجھے یہ ترغیب ملی کہ اگر مجھے ان لوگوں کی طرح بڑا آدمی بننا ہے تو مجھے ان کی پیروی کرنا پڑے گی۔“

استاد کو ابن جوزی کی یہ باتیں مطمئن نہیں کر سکیں اور انہوں نے پوچھا۔ ”اے عبد الرحمن! چلو، ہم نے تمہاری بات مان لی اور ماضی کے بڑے آدمیوں کو پڑھ کر تم بھی ایک نہ ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ گے مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہیں تاریخ کے جس بڑے آدمی کو اپنے لیے مثال بنانا ہے اس کی پیروی کرنا شروع کر دے تو تاریخ کا وہ بڑا آدمی سپہ سالار ہو گا، دزیر ہو گا یا کسی طرح غاصب حکمران بنادیا گیا ہو گا، کیا تم بھی انہی میں سے کچھ بننا چاہتے ہو۔“

ابن جوزی نے جواب دیا۔ ”میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ بڑے آدمیوں میں دینا حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو کس حد تک نقصان پہنچایا اس کے علاوہ کئی کتابوں کے مطالعوں کے بعد میں نے بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی پکڑی ہیں اور مجھے انہیں پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ شہرت کے بلند مینارے تک پہنچنے کے باوجود بہت غیر محتاط اور غیر ذمہ دار لوگ تھے۔ انہیں کھنے سے پہلے جھوٹ اور سچ کو ضرور پرکھنا چاہیے تھا۔ استاد محترم میں خود بھی تصنیف و تالیف کے کام کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے آدمیوں کی بھول چوک، غلطیوں اور لغزشوں سے میں نے عبرت پکڑی اور چونکا ہو گیا آئندہ میں خود وہ غلطیاں نہیں کروں گا۔“

استاد کو ان کی باتوں میں بڑی جتنو محسوس ہوئی اور وہ ابن جوزی سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر وہ بڑے لوگ کون ہیں جنہوں نے مذکورہ غلطیاں کیں اور جو ابن جوزی نہیں کرنا چاہتا۔

استاد نے پوچھا۔ ”مجھے بھی ان غلطیوں کے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تمہاری باتوں سے اتفاق یا انحراف کروں لیکن میں بھر مبی کہوں گا کہ تمہیں ہر موضوع پر کتابیں نہیں پڑھنا چاہئیں۔“

ابن جوزی نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ ”استاد محترم! آپ مجھ پر مطالعے کی قدغزیں مت لگائیں کیونکہ

سے محروم ہونے لگے۔

اس کے علاوہ یہ امراء اور حکام دنیا داروں کے لیے بڑی چیز تھے اور ان کا کسی سے ملنا عزت و توقیر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ شروع شروع میں ابن جوزی نے بھی امراء اور حکام کو اپنی طرف متعلق دیکھا تو انہیں بھی خوشی اور فخر محسوس ہوا۔ وہ لوگوں کے سامنے وعظ کہتے تو اس میں بڑے بڑے حاکم اور امیر بھی موجود ہوتے اور سب ہی ان کی تقریر سے متاثر ہوتے۔ مشغولیت اور مصروفیت اللہ کے بجائے اس کے بندوں کی طرف ہو گئی تو انہیں اپنے اندر بڑی تکلیف دہ تبدیلی محسوس ہوئی۔

اب وہ اگر اللہ کی طرف رجوع ہوتے، دعائیں کرتے تو انہیں اپنے دل میں پہلے بھی لذت اور حلاوت محسوس نہ ہوتی اس کے علاوہ اللہ کی یاد اور دعا کے دوران حکام اور امراء بھی یاد آنے لگے جس سے ان کی ارتکازی کیفیت میں نمایاں کمی پیدا ہو گئی۔ وہ پہلے جن حکام اور امراء کی حاضری، ملاقات اور صحبت کو فخر و مباہات کا ذریعہ سمجھتے تھے اب دل کی یکسوئی کے ختم ہو جانے سے ان سب کو بارگراں محسوس کرنے لگے۔

لیکن امراء اور حکام سے تعلقات بڑھانے کے بعد ان سے کھینچاؤ اور کنارہ کشی اختیار کرنا بھی زیادہ اختیاری بات نہیں تھی لیکن وہ دل کی جس دولت سے ان امراء اور حکام کی وجہ سے محروم ہوئے تھے وہ اس دولت سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی بھی اختیار نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی کشمکش میں کچھ عرصہ گزر گیا اور ابن جوزی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دل و دماغ بتصادم تھے دل انہیں یہ مشورہ دیتا کہ وہ دنیا داری سے گریز اختیار کریں اور اللہ کی طرف یکسوئی سے رجوع ہو جائیں مگر دل کا ساتھ ان کا دماغ نہیں دے رہا تھا۔ دماغ کہتا کہ اے ابن جوزی تو امراء اور حکام سے گریز کرے گا، کیا یہ تیرے اختیار کی بات ہے تو لوگوں کے سامنے دینی تقریریں کرتا ہے اور ان تقریروں سے سامعین فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سامعین میں امراء اور حکام بھی موجود ہوتے ہیں اور تیری توجہ ہر خاص و عام کے لیے یکساں اور مساوی ہوتی ہے، جن امراء اور حکام کو تو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتا ہے کیا انہیں عوام کی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے سکتا ہے۔ تیرے وعظ اور تقریر سے جس طرح عوام فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح خواص کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اس

ہوتا تو انہیں بتاتا کہ منصور حلاج اور ابن المقفع کا زمانہ ایک نہیں تھا۔ ابن المقفع کے قتل کا منصور نے ایک سو چوالیس ہجری میں (761 عیسوی) حکم دیا تھا اور وہ قتل کر دیا گیا جب کہ ابوسعید جہانی کا ظہور 286ھ (899 عیسوی) میں ہوا ہے اور وہ گیا منصور حلاج تو یہ تین سو نو ہجری (921 عیسوی) میں قتل کیا گیا اس طرح منصور حلاج اور جہانی قریبی کا زمانہ تو قریب ہے لیکن ابن المقفع بہت پہلے گزر چکا ہے۔ اسی لیے یہ دونوں مل کر کسی طرح سازش کر سکتے تھے۔ میں اسی لیے یہ کہتا ہوں کہ ہر صاحب علم کو چاہیے کہ وہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھیں اور اس کا مطالعہ ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ ہر علم کا دوسرے علم سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ استاد محترم، کسی محدث کے لیے یہ بات کتنی محبوب ہو گی کہ کسی واقعے کے مطابق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے۔“

ابن جوزی کی حوالوں کے ساتھ گفتگو نے استاد کو االجواب کر دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

انہوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ پر مائل ہوئے۔ وہ اپنی خاص ان پاد موضوع کی کتابیں نہیں پڑھتے تھے بلکہ ان کے مطالعے میں ہر موضوع کی کتاب رہتی تھی اور ان کی مطالعے سے سیر نہیں ہوتی تھی۔

کوئی نئی کتاب نظر میں آتی تو انہیں ایسا لگتا جیسے کوئی دینہ ہاتھ لگ گیا ہے، ان کے بقول کتابوں کے مطالعے سے سلف کے حالات و اخلاق ان کی عالی ہمتی، قوت حافظہ، اوق عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا جو ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں انہیں اپنے زمانے کے لوگوں کی سطح پرست معلوم ہونے لگی اور اپنے عہد کے علماء کی کم ہمتی ان پر ظاہر ہوئی۔ وہ پڑھنے کے علاوہ لکھنے میں بھی مشغول رہتے تھے۔

وہ لوگوں کے سامنے تقریر کرتے تو سامعین پر ان کی تقریر کا بہت اثر ہوتا۔

ان تقریروں نے حکام اور امراء کو ان کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ان کی خدمت میں حاضریاں دینے لگے۔ ملاقات کے لیے حاضری دینے والوں کو وہ منع بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ منع کر دینا بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے یہ امراء اور حکام ان کی تنہائی اور خلوت پسندی میں حارج ہونے لگے جو وقت وہ اللہ کی یاد میں خشوع و خضوع سے دیتے تھے وہ اس

نہیں۔“

مشورہ دینے والوں نے ابو مسلم خراسانی کی بات جیسے سنی ہی نہ ہوا انہوں نے خراسانی سے پوچھا۔ ”جب تجھے یہ معلوم ہے کہ سلطنت خطروں میں پڑے بغیر اور کوششیں نہ کرنے سے نہیں ملے گی تو تجھے بلند ہمتی سے کام لے کر خود کو خطرات میں ڈال دینا چاہیے۔“

ابو مسلم خراسانی مذہب تھا جواب دیا۔ ”دوستو! میری عقل مجھے سلطنت کی حصولیابی سے باز رہنے کا مشورہ دے رہی ہے بتاؤ میں کیا کروں۔“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”اے بے مثل سپہ سالار اور بلند حوصلہ انسان، ہم تجھے کیا مشورہ دیں گے۔ تجھے جیسا دل اور جیسی عقل عطا ہوئی ہے وہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے مشورے پر کیا عمل کرے گی اب تو خود فیصلہ کر کہ تجھے کیا کرنا چاہیے۔“

ابو مسلم خراسانی کچھ دیر تو سوچتا رہا کہ واقعی اسے کیا کرنا چاہیے۔ کافی دیر غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اب میں دل و دماغ کے مذہب مشورے پر عمل نہیں کروں گا۔ اس وقت مجھے اپنی ہاگ ڈور نادانی کے ہاتھ میں دے دینا پڑے گی۔ نادانی ہمتی ہے کہ میں خطرہ مول لوں اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلے گا وہاں عقل سے بھی مشورہ کر لوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے کم ہمتی سے کام لیا تو گمناہی میں چلا جاؤں گا گمناہی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں۔“

ابو مسلم حکومت حاصل کرنے کی کوششوں میں دیوانہ رہا اور اس مقصد کے لیے اس نے بہت خون بہایا، کتنے ہی بے گناہ لوگ قتل ہوئے اور بالآخر اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اس کی عقل نے کوئی بندوبست نہیں کرنے دیا۔

ابو مسلم خراسانی کے بلند ہمتی سے متعلق واقعات کو پڑھ کر ابن جوزی سوچ میں پڑ گئے، اسی غور و فکر کے درمیان دل نے ان کو بتایا کہ ابو مسلم خراسانی نے جو کچھ بھی کیا لیکن اس کی بلند ہمتی نے سب سے اہم مسئلے کی بجائے کسی کر دی تھی۔ اس مسئلے کا تعلق آخرت سے ہے اس نے اپنی بلند ہمتی سے دنیاوی لذتوں کا قلیل حصہ حاصل کیا اسے آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا اور وہ دنیا سے بڑی بری حالت میں رخصت ہو گیا۔ ابن جوزی یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ابو مسلم خراسانی کو کھنسن دنیا کی ہوس تھی۔

لیے امراء اور حکام سے نفض و عتا اور کھنا فضول اور کار عبث ہے۔

دماغ کی دلیلوں اور تادیلوں نے دل کو شکست دے دی اور وہ لوگوں میں تقریریں کرتے رہے۔

انہیں باضی کے لوگوں کا مطالعہ کرنے سے ایک خاص بات معلوم ہو گئی تھی۔ ماحول اور معاشرے کے کسی معمولی خاندان کے معمولی آدمی نے بلند و بالا مقام کیونکر حاصل کر لیا، سب ہی ایسے بڑے آدمیوں میں یہی تو مشترک نظر آئی کہ انہیں بلند ہمتی حاصل تھی اور وہ غیر معمولی لوگ تھے۔ دماغ نے اتنا سمجھانے کے بعد ابن جوزی کو مشورہ دیا کہ وہ بھی بلند ہمتی کا مظاہرہ کریں۔

دماغ کے اس مشورے پر عمل کرتے رہنے کے دوران وہ آہستہ آہستہ یہی محسوس کرتے رہے کہ جب تک وہ دل کے مشوروں پر عمل کرتے رہے ان کا دل اللہ کے ذکر و مناجات اور دعاؤں سے لذت حاصل کرتا تھا مگر دماغ کے بلند ہمتی سے متعلق مشورے پر عمل کرنے کے بعد وہ دل کے سوز اور کیف و سرور سے محروم ہو گئے تھے۔

دماغ نے اس مرحلے پر انہیں مشورہ دیا کہ وہ باضی کے بڑے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ بغور کریں اور انہیں کسی طرح بلند ہمتی سے کام لے کر اپنے دور کے غیر معمولی آدمی بن جائیں۔

بڑے لوگوں کے مطالعے کے دوران ابن جوزی کی نظر ابو مسلم خراسانی کی حالاتِ زندگی پر پڑ گئی۔ اس شخص کو بھی غضب کی بلند ہمتی عطا ہوئی تھی۔ یہ شخص اپنی جوانی کے زمانے میں بہت کم سوتا تھا کسی نے ابو مسلم سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ”اے سوال کرنے والے، جسے روشن دماغ بلند ہمت بلند یوں کا حریض نفس ملا ہو وہ پست اور محدود زندگی پر قناعت نہیں کر سکتا اور اسے کس طرح نیند آنے کی۔“

ابو مسلم خراسانی بھی اسی کشش میں زندگی بھر مبتلا رہا۔ وہ عباسیوں کی طرف سے عساکر اسلامی کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تو دل و دماغ میں سلطنت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کے آس پاس موجود لوگوں نے بھی اس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اس مرحلے پر ابو مسلم خراسانی نے اپنے لوگوں سے کہا۔ ”تم لوگ جس شے کی حصولیابی کا مشورہ دے رہے ہو وہ خطروں میں پڑے بغیر اور جان کی بازی لگانے بغیر ممکن

اسی مطالعے کے دوران ان کی نظر شریف رضی نامی شاعر کے ایک شعر پر گئی ”ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے اور میری جسم کی معیبت میری بلند ہمتی ہے۔“

ابن جوزی نے اپنی بلند ہمتی کا جائزہ لیا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں تک پہنچنے کا انہیں خود بھی یقین نہیں ہے وہ تمام علوم کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ موضوعات سے انہیں کوئی بحث نہیں تھی۔ وہ سوچتے کیا میں ہر علم کی تکمیل اور اس کا احاطہ کر سکتا ہوں۔ اس سوال کے بعد انہوں نے اپنی چھوٹی سی عمر پر بھی غور کیا تو وہ انہیں بہت ہی مختصر نظر آئی۔ وہ اپنے آس پاس یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی کو کسی فن میں کمال حاصل ہے اور دوسرا کسی دوسرے فن میں کمال رکھتا ہے۔ یہ دونوں دوسرے فنون میں ناقص اور بے بہرہ تھے۔

ایک محدث فقہ سے محروم تھا اور ایک فقیہ حدیث سے بے خبر تھا۔

وہ انہی الجھنوں میں مبتلا رہے، ان کے سامنے ایسے بلند ہمت لوگوں کے حالات زندگی بھی تھی جنہوں نے احتیاط اور زہد کی زندگی گزاری تھی۔ وہ کتابوں کے مطالعے اور بندگان خدا کو تعلیم دینے کا کام بیک وقت کرتے تھے اور اسی لیے انہیں عام لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل بھی اختیار کرنا پڑتے تھے۔ وہ اللہ کی مخلوق سے دور رہنا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ان پر کوئی احسان نہ کرے اور یہ دوسروں پر احسان کرنے کے قابل اور لائق ہو جائیں۔ گویا الجھنوں ہی میں ان کی زندگی بسر ہوتی رہی۔ انہوں نے شادی کر لی تھی اور انہیں اولاد کی خواہش بھی تھی۔ بیوی اور اولاد کے لیے کسب معاش بھی ضروری اور لازمی ہے اور یہ بھی دنیا داری کا اہم حصہ ہے، وہ اپنے معاشی معاملات میں دوسروں کے ممنون ہونے سے نہیں بچ سکتے تھے جب کہ وہ دوسروں کے سلوک اور تحفوں کو قبول کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بلند پایہ کتابیں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ وہ اپنی تصانیف کو اپنی یادگار سمجھتے تھے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہی تصانیف ان کی قائم مقام ہوں گی۔ اب اگر وہ اس کا اہتمام کرتے تو اس سے دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلے خلوت و تنہائی میں فرق آتا اور طبیعت میں اختصار پیدا ہوتا۔

انہیں دنیا سے جائز لطف لینے کا بھی شوق تھا لیکن یہاں بھی مال کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ سوچتے

کہ اگر انہیں مال کی کمی نہ ہو اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں انہیں وہ سامان بھی مل جائے تو اس سے دل کی آسودگی رخصت ہو جائے گی۔ وہ اچھے کھانے پینے کے بھی شوقین تھے۔ وہ صحت کی طرف سے بھی ہوشیار اور چوکنا رہتے تھے۔ ان کا جسم نفاست پسند تھا لیکن یہاں بھی مال کی کمی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں درحقیقت وہ سب کچھ اضداد و متضاد بننے کی کوشش ہے اس عالمی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جنہیں صرف دنیا مطلوب ہو۔

ان کی خواہش تھی کہ انہیں دنیا اس طرح حاصل ہو جائے کہ ان کے دین پر آج نہ آئے اور وہ بالکل محفوظ رہیں۔ ایک طرف تو انہیں شب بیداری عزیز تھی۔ احتیاط اور تقویٰ کا اہتمام تھا۔ دوسری طرف علم کی اشاعت تصنیف و تالیف اور جسم کے لیے مناسب غذا انہیں مطلوب تھیں۔ وہ لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے مگر دوسری طرف خلوت اور تنہائی کی دعا اور مناجات کی حلاوت میں کمی کو بھی افسوس اور رنج سے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ کافی تکفیش اور تکلیف کے بعد وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو گئے وہ ایک سانس بھی کسی فضول کام میں صرف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مجالس و عطا کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ خلفہ سلاطین، وزراء اور اہل علم و اہل ان کی مجلس میں شرکت کریں گے تو یہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔

انہوں نے اپنے سامنے وعظ سننے کے لیے جمع ہونے والوں کا اندازہ لگایا تو انہیں بتایا گیا۔ ”ایک لاکھ سے کچھ زائد ہی لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔“ وہ دل سے وعظ کہتے۔ تا شیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گر جاتے تھے۔ وجد و شوق میں اپنے کپڑے پھاڑ دیتے تھے ان کی چیخیں نکل جاتیں آنسوؤں کی جھریاں لگ جاتیں۔

وعظ کے بعد لوگ ان کی طرف بڑھتے۔ کئی بار شروع شروع میں تو ان کا بی جا ہا کہ وہ اپنی طرف آنے والوں کو روک دیں۔ انہوں نے وعظ کے سلسلے میں جو تقریر کی تھی اسی کو سامعین مناسب سمجھیں اور اس پر عمل کریں لیکن ان کی طرف بڑھنے والوں کو کوئی روک بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ لوگ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شوق کے عالم میں ابن جوزی کی طرف بڑھے تو ابن جوزی کے ارادت مندوں کو شبہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ابن جوزی کو نقصان نہ پہنچا

دیں۔

ارادت مندا اتنے طاقت ور بھی نہیں تھے کہ وہ ابن جوزی کی طرف بڑھنے والوں کو حصار بنا کر روک دیتے۔ آگے بڑھنے والے لوگ والہانہ جذبے اور شوق سے آگے بڑھتے رہے اور شیخ کے قریب پہنچنے کے والہانہ جذبے سے کہا۔ ”ہم آپ کے ہاتھوں پر توبہ کرنے آئے ہیں اس طرح خدا ہماری توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ کی طرف سے آپ کو اجر عظیم عطا ہوگا۔“

ابن جوزی ان سے توبہ کرواتے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے۔ اللہ سے دعا کرتے کہ خدا انہیں توبہ معاف کر دے اور توبہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما، اس میں بھی ابن جوزی کو بہت وقت دینا پڑتا۔

توبہ کرنے والوں کے بعد دوسرے بہت سے لوگ ابن جوزی کے پاس جانے کے منتظر نظر آئے۔ یہ وہ لوگ تھیں جو توبہ کرنے کے منظر کو دیکھ رہے تھے اور خود ان کی ایک کتاب توفیق کی نیت دارادہ کہتے تھے۔

ابن جوزی ان کی ارادت مند آئے اور ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں ان کا تعلق دوسرے مذاہب سے ہے اور اس وقت وہ ابن جوزی کے وعظ سے متاثر ہو کر ابن جوزی کے ہاتھوں مسلمان ہونا چاہتے ہیں تو انہیں ابن جوزی کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔

ہر مجلس وعظ کے بعد ہزاروں غیر مسلم ان کے ہاتھوں مسلمان ہوتے رہے۔

اس عمل سے بھی ابن جوزی کو اپنے قلب میں فخر اور بڑائی کا جذبہ محسوس ہوتا اور وہ مگر پیچھے کے بعد مجدے میں گر کر توبہ و استغفار کرتے کہ خدا یا مجھے تکبر اور غرور سے دور رکھ کیونکہ تیری توفیق کے بغیر میں اس پر قابو نہیں پاسکتا۔

ابن جوزی کے بارے میں لوگوں نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے بیس ہزار یہودیوں اور عیسائیوں کو مسلمان کیا اور ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی۔

☆.....☆

ابن جوزی نے اپنی تصنیف تلخیص التلخیص میں اپنے زمانے کے مسلم معاشرے کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر جماعت کو سنت اور شریعت کے معیار سے پرکھا ہے۔ ان کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں، غلط فہمیوں اور خوش

فہمیوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح اس امت کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انہوں نے کسی طبقے اور کسی شخص کی رعایت کے بغیر یہ بتایا ہے کہ شیطان نے کن کن راہوں سے مسلمانوں کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے۔ اس میں علماء، محدثین، فقہ، واعظین، ادیب، شاعر، سلاطین، حکام، عابد، زاہد، صوفی اور عوام کی الگ الگ کمزوریاں غلط رسوم اور اعداد بے اعتدالیاں اور مغالطے بیان کیے ہیں۔

ابن جوزی نے واعظوں پر تنقید کی اور لکھا۔ ”یہ لوگ بڑی پر تکلف اور آراستہ عبارت بولنے کے شائق ہوتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے میں وعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور اور یوسف زلیخا کے قصے بیان کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ لوگ فرائض کا ذکر نہیں کرتے اور گناہوں سے بچنے کا بھی ذکر ان کے وعظ میں نہیں ہوتا۔ سو ہمیں کہ ایسے وعظ سے ایک زانی، سودخور کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے یہ مواظظ ان مضامین سے خالی ہوتے ہیں۔ انہوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا جس سے ان کا بازو خوب گرم ہے اس لیے کہ حق ہمیشہ طبعیتوں پر بھاری ہوتا ہے جب کہ باطن بالکل ہلکا اور خوشگوار۔ بھی ایسا بھی ہوتا کہ وعظ کہنے والا سچا اور خیر خواہ ہونے کے باوجود اس کے دل میں جاہ طلبی موجود ہوتی ہے اور وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے۔ اگر اس کے مقابل کوئی دوسرا مقرر اور واعظ کہنے والا قائم مقامی کے لیے آجائے یا اس کے کاموں میں مدد کرنا چاہے تو یہ قائم مقامی کرنے والا اسے ناگوار کرتا ہے حالانکہ یہ شخص مخلص ہوتا ہے۔“

اگر طالب علم اپنے مدرس کے علاوہ دوسرے کے پاس چلا جائے اور یہ دوسرا مدرس پہلے مدرس سے زیادہ لائق اور فائق ہو تب بھی پہلے مدرس کو اس سے بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان کی مثال اطباء جیسی ہوتی ہے جو اللہ کی مخلوق کا خلوص دل سے علاج کرتے ہیں۔ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہو جائے تو دوسرا طبیب خوش ہوتا ہے۔

ابن جوزی نے سلاطین اور حکام پر بھی زبردست تنقید کی ہے۔ ”یہ حضرات شریعت کی پرواہ کیے بغیر اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں اور یہ اس شخص کا بھی ہاتھ کاٹ دیتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اس شخص کو قتل کر دیتے ہیں

جس کا قتل جائز نہیں اور اپنی جگہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ یہ سیاست یہ ہے حالانکہ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ گویا شریعت ناقص ہے۔ یہ اپنی رائے سے اس نقص کو دور کر کے خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ شریعت، سیاست الٰہی ہے اور خدائی سیاست میں کوئی غلط یا کوئی کمی نہیں ہو سکتی اور اللہ کی مخلوق کو سیاست الٰہی میں تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کرنا چاہیے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی اور تاکہ اس کے حکم کو کوئی مٹائے والا نہیں ہے جو بھی اس سیاست کا مدعی ہے وہ دراصل شریعت میں غلطی اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے۔“

حکام، امراء اور سلاطین کی دوسری عام کمزوری اور مغالطے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ ”گمنا ہوں پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو صالحین کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان سے ملتے ہیں اپنے حق میں دعائیں کروا لیتے ہیں۔ شیطان نے ان کو سمجھا رکھا ہے کہ اس طرح وہ اپنے گمنا ہوں کا پلڑا ہلکا کر لیں گے، انہیں یہ معلوم ہوتا چاہیے کہ وہ اس خیر سے اپنے شر کو ختم نہیں کر سکتے۔“

دوسری جگہ فرمایا۔ ”ان امراء اور دنیا داروں کو عالموں اور فقیہوں سے زیادہ خلاف شرع بیہودوں، گمانے بجانے والوں اور صوفیوں سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے اور وہ ان فضول لوگوں پر بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں حالانکہ اہل علم پر ایک پسا خرچ کرنا بھی ان کو بار ہوتا ہے یہ علماء، اطباء کی طرح ہیں۔ وہاں میں خرچ کرنا انسان کو بوجھ معلوم ہوتا ہے ان بیہودوں اور فوٹالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گانے والی عورتوں پر خرچ کرونا یہ لوگ ان کے لیے گویوں اور مدار یوں کی طرح سامان تفریح اور لازمہ ریاست ہوتے ہیں یہ لوگ بنا دنیوی زاہدوں اور تاریک دنیا درویشوں کے بہت جلد معتقد ہو جاتے ہیں اور انہیں علماء پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ یہ اگر دنیا کے سب سے بڑے جاہل کے جنم پر بھی درویشی کا لباس دیکھ لیں تو اس کے فوراً معتقد ہو جائیں گے۔ اگر وہ سر کو جھکانے اور بنا دنیوی خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو یہ اس پر فوراً سرفیض ہو جائیں گے اور کہیں گے بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ یہ تارک دنیا وہ طالب دنیا ہے نہ تو اچھی غذا نہیں کھاتا ہے اور نہ شادی کرتا ہے حالانکہ یہ کہنا محض جہالت ہے اور اس سے شریعت محمدی کی تحقیر ہوتی ہے۔“

انہوں نے عوام پر بھی تنقید کی ہے۔ ”شیطان نے عوام کی اکثریت کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ وعظ اور ذکر کی محفل میں شریک ہو جانا اور متاثر ہو کر رو دینا ہی سب کچھ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محفل خیر میں شرکت اور رعت ہی کافی ہے وہ وعظوں سے اس کے فضاائل سنتے رہتے ہیں اگر ان کو کسی طرح یہ بتا دیا جائے کہ یہ مخصوص عمل ہے تو یہ سنتا اور عمل کرنا وبال جان ہوگا۔ میں ذاتی طور پر بہت سے ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال سے وعظ کی محفلوں میں شریک ہوتے، روتے اور متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ نہ تو سود لینا چھوڑتے ہیں اور نہ تجارت میں دھوکا دینے سے باز آتے ہیں۔ وہ ارکان صلاۃ سے پہلے بھی بے خبر تھے اور اب بھی بے خبر رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے۔ وعظ سننے کے بعد بھی اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ شیطان نے ان کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ محفل وعظ کی حاضری اور گرہ و بکا ان کے گمنا ہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ ان میں سے بعض خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عالموں اور صالحوں کی محبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔“

جو دولت مند اپنی دولت کو حصول ثواب کی خاطر زمانے کے مروجہ مدوں میں خرچ کرتے ہیں ان پر بھی انہوں نے سخت تنقید کی ہے۔ دولت مندوں پر تبصرہ اس طرح فرمایا۔ ”ان میں سے اکثریت مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں وہ یہ کام خلوص سے نہیں کرتے ان کا مقصد ریا اور شہرت ہوتا ہے اس طرح انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کی یہ بخاکی ہوئی چیزیں ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ مساجد اور پلوں کی تعمیر پر وہ اپنا نام کندہ کروا رہے ہیں اگر انہیں صرف اللہ کی رضا مقصود ہوئی تو وہ اس قسم کی تعمیرات کو کافی سمجھتے ان کے لیے اللہ کا دیکھنا اور جانتا ہی کافی ہوتا ہے وہ لوگ ہیں کہ اگر ان سے ایک ایسی دیوار کی تعمیر کی درخواست کی جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ ایسا کام نہیں کریں گے۔“

”یہی وہ لوگ ہیں جو رمضان المبارک میں شہرت کے لیے مسجدوں میں موم بتیاں بھیجتے ہیں حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے وہ جانتے ہیں کہ محض رمضان میں موم بتی بیچ دینے سے وہ نمازیوں کی نظر میں آجاتے ہیں۔“

ان جوڑی اپنے نفس سے مکالے فرمایا کرتے تھے

بعض اوقات ان کے دل میں عجیب سی کشش پیدا ہو جاتی تھی اور وہ اپنا محاسبہ کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ ایک بار وہ اپنے کسی مقصد کے لیے دعا کر رہے تھے کہ ان کے قریب ہی ان کے ایک صالح دوست اور بزرگ بھی ان کی دعا میں شریک ہو گئے۔ دعا تو قبول ہو گئی لیکن دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوئی یا کس کے طفیل دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا وہ اسی انجمن کے شکار ہو گئے اور ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہونے لگا۔ ان کا نفس انہیں بتا رہا تھا کہ دعا کو شرف قبولیت اس بزرگ کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جو دعائیں ان کے شریک تھا کیونکہ ان کے نفس کے بقول ان کی دعا کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ خود نفس کو سمجھ رہے تھے کہ یہ دعا میری وجہ سے قبول کی گئی کیونکہ ابن جوزی اپنے گناہوں اور غلطیوں سے آگاہ تھے اور انہیں ان کی وجہ سے شرمندگی کا احساس شدید رہا اور وہ ندامت بھی محسوس کرتے رہے۔ اللہ کو ان کا اعتراف اور احساس شرمندگی دل شکستہ اللہ نے نہ اند آئی ہوگی اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی لیکن ان کے دل میں شریک دعا صالح بزرگ کے بارے میں یہ خیال ابھرا کہ ان کے دل میں وہاں دو لوگوں میں سے کوئی ایک ہی ایمان لی مایہ افضل کا طالب نہیں ہو سکتا خود انہوں نے اپنے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”خدا یا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما کیونکہ میرے اعمال ایسے نہیں ہیں کہ مجھ پر تیرا فضل ہو، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں لیکن مجھے امید رہی کہ میری سن لی جائے گی۔ میرا ساتھی بزرگ اگر اپنے اچھے اعمال کا خیال کرے اور یہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کے حسن عمل کی وجہ سے دعا کو شرف قبولیت حاصل ہونا چاہیے اس کی یہ سوچ اس کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے وہ اپنے نفس سے کہتے رہے کہ میرا دل زیادہ نہ توڑ دہ تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے میں اپنی توقیروں کا اعتراف کر چکا ہوں، ان کے ہوتے ہوئے میں نے اللہ سے جو مانگا ہے اس کا میں بے حد محتاج ہوں اور جس سے میں نے سوال کیا ہے مجھے اس کے فضل کا یقین ہے۔ خدا یا یہ ساری باتیں جو میں سوچ سوچ کے بیان کر رہا ہوں میرا ساتھی صالح بزرگ اس طرح نہیں سوچتا ہو گا خدا یا اس کی عادت میں برکت دے میرے لیے اعتراف تحقیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔“

ابن جوزی اپنے آس پاس کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے تھے۔

برمودا ٹرائی اینگل کو دنیا کے چند پراسرار ترین خطوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے جہاں بحری جہازوں اور طیاروں کے حیران کن طور پر غائب ہونے کی رپورٹس سامنے آتی رہتی ہیں اور اب اس خطے میں سمندر سے ابھرنے والے ایک جزیرے نے اس کے اسرار کو مزید بڑھا دیا ہے۔

برطانوی اخبار انڈیپنڈنٹ کی رپورٹ کے مطابق امریکا کے ساحلی علاقے شمالی کیرولاؤنڈا کے قریب ایک نیا جزیرہ نمودار ہوا ہے جو کہ ہم جو سیاحوں اور فوٹو گرافرز کو اپنی جانب متوجہ رہا ہے یہ جزیرہ موسم بہار میں ابھرتا شروع ہوا جس کے بعد یہ بتدریج نمایاں ہوتا چلا گیا۔ وہاں کے مقامی رہائشیوں کے مطابق یہ جزیرہ جسے شمالی آئی لینڈ کا نام دیا گیا ہے، کو ماہرین نے خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہاں جانے سے گریز کیا جائے۔ ان کے بقول اس جزیرے کے اگر گرد پانچ فٹ لمبی شائیں اور اسٹریک ریز کو تیرتے دیکھا گیا ہے۔ ہلال کی شکل کا یہ جزیرہ ایک میل لمبا اور چار سو فٹ چوڑا ہے۔ یہ جزیرہ سمندر میں اس جگہ ابھرا ہے جو کہ برمودا ٹرائی اینگل میں شامل ہے جس کے اندر سمندر کا چار لاکھ چالیس ہزار میل کا رقبہ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوسطاً ہر سال یہاں چار طیارے اور بیس کشتیاں گم ہو جاتی ہیں جن کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مرسلہ: شمیمہ خانم۔ ملتان

وہ کہیں جارہے تھے، انہیں دوران سفر دو محروم و دوروں کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں ایک بھاری ڈھیر اٹھا کر لیے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک کوئی فقرہ ادا کرتا تھا دوسرا نرم میں جواب دیتا۔

ابن جوزی نے ان دونوں کے معاملات پر غور کیا اور دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دونوں نے کیا کہہ رہے ہیں اور اس سے ان کا مقصد کیا ہے۔

بہت کچھ سوچنے کے بعد انہیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ اگر وہ دونوں ایسا نہ

کر س تو انہیں اپنی محنت اور بوجھ کا بہت زیادہ احساس رہے گا لیکن اس ترکیب سے ان کا دھیان محنت اور کام کی طرف سے ہٹ جاتا ہے اور ہمتیر کو لے جانے میں انہیں آسانی ہوتی ہے۔ وہ درینک دونوں کے معاملے پر غور کرتے رہے اور انہیں یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں جو کمالات ادا کرتے ہیں ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر سستالیتا ہے اور کچھ ضروری بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

جب ایک کچھ گا کر با آواز بلند خاموش ہو جاتا ہے تو اسے دوسرے کی جوابی آواز سے دھیان کے ہٹ جانے سے بوجھ کے اٹھانے کا احساس زائل ہو جاتا ہے اور ہمتیر کو اٹھانے رکھنے کا احساس جاتا رہتا ہے۔

اب ابن جوزی سوچ رہے تھے کہ انسان نے بشری و مرداریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے ان میں سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست کا ہے اور اس میں اہم کام یہ ہے کہ نفس کو اس کے مرغوبات سے روکا جائے اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ہے ان پر اسے قائم رکھا جائے۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ سفر کے راستے کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کر دیا جائے انہیں اس موقع پر کسی شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا۔ ”رات بھر چلتے رہنے سے سواریاں تھک جائیں اور وہ فریاد کریں تو موج کی روشنی کی امید دلا اور ان سے دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کر۔“

اس موقع پر ابن جوزی کو مشہور صوفی بشرحانی کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ ”بشرحانی اپنے چند ارادت مندوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے ان کے ایک ساتھی کو راستے میں پیاس لگ گئی۔ ان سب کے سامنے ایک کنواں تھا مگر بشرحانی نے سفر جاری رکھنے کی تلقین کی اور کہا۔ ”آگے بھی ایک کنواں ہے جلدی کیا ہے آگے بڑھتے رہو اگلے کنویں سے پیاس بجھائیں گے۔“

بشرحانی سے کسی نے اختلاف نہیں کیا اور ان کا سفر جاری رہا۔ کافی دیر بعد وہ کنواں بھی انہیں نظر آیا جس کا ذکر بشرحانی نے کیا تھا۔ ان کے ساتھیوں نے اس کنویں کے قریب رکنے کی خواہش کی تو بشرحانی نے کہا۔ ”تم لوگ سفر کو ٹھکان سے کھوٹا کر دو گے پانی پینا بھی ضروری ہے لیکن دوستو! اس کنویں کو بھی نظر انداز کر دو اور سفر جاری رکھو ہمارے راستے میں کئی کنویں ہیں ہمیں اگلے کنویں پر اپنی پیاس بجھانی ہوگی۔“

ساتھیوں نے بشرحانی کی بات مان لی اور اس کنویں سے بھی پانی نہیں لیا اگلے کنویں کی جستجو ان کی پیاس پر غالب آئی اور بشرحانی بھی یہ دیکھ رہے تھے کہ اگلے کنویں کی جستجو اور پیاس کی شدت نے ان میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا ہے اور سفر کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور بشرحانی اپنے ساتھیوں کو لے ہوئے کئی کنوؤں کے پاس سے گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے اور یہ سفر بہت جلد ہی طے کر لیا گیا۔ آخر کار جب وہ اپنے سفر کے اصل مقام پر پہنچ گئے تو اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔ ”دوستو! دیکھو میں اسی طرح دنیا کا سفر طے کرنا چاہیے یاد رکھو کہ جس نے اس نکتے کو سمجھ لیا وہ اس دنیا سے با آسانی سفر کر جائے گا۔“

ارادت مندوں کو آپ کے ان نصائح آمیز مشورے اور باتوں سے بے حد خوشی اور سکون حاصل ہوا وہ سمجھ چکے تھے کہ اپنے نفس کو بہلانے اور دل جوئی کرنے اور اس سے وعدہ کرتے رہنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہوتا رہے گا۔

ابن جوزی کو یاد آیا کہ بعض بزرگان سلف فرمایا کرتے تھے اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔ ”اے نفس میں تجھے تیری مرغوب چیزوں سے روکتا ہوں اور یہ عمل شفقت اور خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ انہیں بائید بسطای کا یہ قول یاد آیا۔ ”اپنے نفس کو جب میں خدا کی طرف لے جا رہا تھا تو وہ رو رہا تھا پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا۔“

ابن جوزی نے کہا۔ ”اے نفس تجھے یاد رہنا چاہیے کہ خاطر داری اور ملاحظت بھی ضروری ہے اور راستہ اسی طرح سے ہو جاتا ہے۔“

ابن جوزی نے آبادی کے بہت سے کنوؤں کو بھونکتے ہوئے دیکھا انہیں جستجو ہوتی کہ یہ کتنے بے تحاشا کیوں بھونک رہے ہیں۔ جستجو کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ وہیں کہیں قریب سے شکاری کتے گزر رہے ہیں اور یہ کتے جن کے ساتھ ہیں وہ اپنے کتوں کی بڑی عزت کرتے ہیں ان پر جمول پڑی ہوئی ہے اور ان کے چلنے کے انداز میں وقار پایا جاتا ہے یہ شکاری کتے آبادی کے کتوں میں حسد پیدا کر رہے تھے اور شکاری کتوں نے محلے کے کتوں کو بھونکنے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شکاری کتوں کے رویوں سے لگتا تھا کہ وہ محلے کے کتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ دونوں کتے یہ شعور بھی رکھتے ہیں کہ دونوں کی قومیں الگ ہیں۔ مقامی کتے موٹے موٹے بھدے اعضاء

کے ہیں ان میں امانت کی مفت نہیں پائی جاتی جب کہ حکاماری کتے نازک، پھرتیلے اور چست و چالاک نظر آتے تھے۔

اب ابن جوزی ان دونوں کے تاثرات پر غور کر رہے تھے۔ حکاماری کتے مہذب لگ رہے تھے اور ان کے بارے میں یہ بات تو سبھی کو معلوم تھی کہ جب وہ اپنے آقا کے لیے شکار کرتے ہیں تو کیا مجال کہ شکار کو منہ لگائیں اپنے مالک کے ڈر سے یا مالک کے احسانات کے شکر پرے میں شکار کو جوں کا توں مالک تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اس سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے اگر بدن لطیف ہے تو اخلاق بھی لطیف ہوں گے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انسان کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیے جسے وہ اپنے طبقے اور اپنی سطح کا نہ سمجھتا ہو وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ جس کو اللہ ایمان اور عقل کی دولت سے سرفراز کر دے اس کو اپنے حاسد پر حسد نہیں ہوتا لیکن جو ایمان اور عقل سے محروم ہو وہ اس کو قابلِ اِلمام نہیں سمجھتا اِلمام کی علامت یہ ہوتی ہے اور اس کا مطلع نظر آخرت ہے اور اللہ ان میں بعد اُمر کریمین ہوتا ہے۔

ابن جوزی نے تعریف و تالیف کے گراں قدر کام انجام دیے، بطور خاص ان کی کتاب صید الخاطر بہت شہرت رکھتی ہے اس کتاب میں انہوں نے اسی نوعیت کا کارنامہ انجام دیا ہے جو امام غزالی نے اُجائے علوم دین میں، اپنی اس کتاب میں انہوں نے اسلام، مسلمان، ماحول، معاشرے، حکومت، سیاست، امیر، غریب، صوفی، عالم سب ہی کو اپنی فکر و سوچ اور علم کے دائرے میں لے لیا ہے اور بڑی بڑی شخصیات کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ وہ فنِ تاریخ کی اہمیت اور ضرورت کو بہت ضروری سمجھتے تھے ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء اور فقہاء سے اپنی کتابوں میں بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اور یہ غلطیاں ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

وہ اپنی ادبیت اور خطابت سے مدّتوں کام لیتے رہے۔ ان کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت کے بھی معترف تھے جب ان کی مجلسِ وعظ کو مقبولیت کی وجہ سے لوگوں کے اُٹو دھام کی شکل میں دیکھتے تھے تو انہیں اپنی ذہنی کشمکش سے اذیت پہنچتی تھی۔ اس موقع پر ان کا نفس ملامت

کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ یہ کام چھوڑ دیں۔ لغتوں کی طرف بالکل توجہ نہ دیں کیونکہ یہ سارا کا سارا تکلف اور تصنع ہے لیکن ان کا علم اور فقیہی منصب نفس کے خیال کو روکتا تھا، اس نے ان کے نفس کو سمجھایا کہ حسنِ کلام ایک خدا واد قابلیت کی شکل میں ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے، اسے نقص اور عیب نہیں سمجھنا چاہیے۔ دعوت اور تبلیغ میں اس سے کام لیتے رہو اس کی ناقدی مری مکترو۔

ان کے دل میں کئی بار شدت سے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ وہ وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زندگی کا اختیار کریں دنیا سے قطع تعلیق کر لیں اور بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں۔

لیکن اس خیال کو بھی دلیلوں سے اپنے نفس سے مفصل مباحثہ اور مناظرہ کر کے نجات حاصل کی اور اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ انہیں شیطان در غلار ہا ہے کیونکہ شیطان یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔

دعوت اور تبلیغ تو نبیوں کا راستہ ہے۔ سارے نبی اپنی زندگی اجتماع اور اختلاط میں بسر کرتے تھے جب کہ نفس بے کاری اور قسطل کو پسند کرتا ہے۔ جدوجہد سے بھاگتا ہے۔ اس میں جاہِ طبعی بھی ہے، عزت، گوشہ نشینی، زہد اور دنیا سے قطع تعلیق کر لینا عوام کے لیے زہد باعثِ کشش ہوتا ہے اور لوگ ادھر فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اس لیے انہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت سے ہمیشہ کام لینا چاہیے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ ان کی ساری دماغی صلاحیتیں ساری خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں لوگوں کی اصلاح کے لیے عطا کی گئی ہیں اور وہ پچاس سال سے زیادہ پورے انہماک اور قوت کے ساتھ اصلاح اور افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

597 ہجری (جمہ کی شب) ابن جوزی نے سفر آخرت اختیار کیا بغداد میں کھرام برپا ہو گیا۔ بازار بند ہو گئے۔ جامع منصور میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ یہ وسیع مسجد کثرتِ اُٹو دھام سے تنگ اور نا کافی ثابت ہوئی۔

بغداد کی تاریخ کا یہ ایک یادگار دن تھا۔ لوگ بلند آواز میں گر یہ و زاری کرتے رہے اور رمضان بعد لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن پاک ختم ہوتے رہے۔



راشدی برادران

شکیل صدیقی

رخ حیات پر وحشت مدام مگر کشکول فکر لبالب بھرا اور دل میں کچھ کر دکھانے کی لک اور اسی لک نے اسے ہمہ وقت بے چین رکھا۔ وہ بے سرو سامانی کے عالم میں بھی علم و عرفان کی شمعیں جلا رہا تھا۔

ان دو بھائیوں کا تذکرہ جن پر سندھ کو فخر ہے

بڑے بھائی پیر علی محمد راشد کی سارے اخبارات پڑھتے تھے بلکہ انہیں کتابوں سے عشق تھا۔
حسام الدین کو تعلیم اور پڑھائی سے کیسے عشق ہوا اس کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز جب وہ

پڑھائی میں وہ زیادہ تیز نہیں تھے۔ چونکہ زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے مشاغل عام لڑکوں سے مختلف تھے۔ کتابوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ انہوں نے بھی تعلیم کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ البتہ ان کے

کھیل کر واپس آئے تو اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں چلے گئے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب حسام الدین کی عمر بارہ برس تھی۔ وہ کتابوں اور اخبارات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان کی دل چسپی کی وجہ نصابی تھیں جو رسالے میں شائع ہوتی ہیں۔ اچانک علی محمد راشدی کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ ”تم میری کتابوں کو ہاتھ کیوں لگا رہے ہو؟ جاہل تمہیں ان سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جاؤ گلی ڈنڈا اٹھیو۔“

اپنے بھائی کا یہ رکیک جملہ سن کر حسام الدین رونے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ”تم مجھے جاہل کہہ رہے ہو۔ دیکھنا کہ میں تم سے زیادہ پڑھوں گا اور میرا نام سب سے اوپر ہوگا۔“

”اچھا جب تک نہ کرو اور میرے کمرے سے نکل جاؤ۔“ علی محمد نے اکتا کر کہا۔ ”اس سے پہلے بھی تم کافی دعوے کرتے رہے ہو۔“

اس بار حسام الدین کے دل کو لگ گئی تھی، لہذا انہوں نے کتابوں کو اپنا دھڑھٹا چھوٹا ٹالیا۔ وہ کھیل کی طرف سے متفرک ہو گئے۔ لیکن ان کے انہیں آوازیں آتی تھیں۔ یہ ان پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے تھا۔ انہوں نے عالموں کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ صحبت طالع تراطالع کدہ صحبت صاحب تراصالح کدہ۔

گھر میں جو بھی وقت انہیں ملتا وہ کتابوں پر صرف کرتے۔ حد یہ ہے کہ اب انہوں نے رات کو بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ لائبرین ایجاد ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس ایجاد سے فائدہ اٹھایا اور رات کو لائبرین جلا کر پڑھنے لگے۔ ان کی والدہ انہیں دعا نہیں دیا کرتی تھیں اور پنکھا جھلا کرتی تھیں۔ ایک بار وہ رات بھر پڑھتے رہے تو ان کی والدہ ساری رات پنکھا جھلاتی رہیں۔

علی محمد راشدی نے انہیں بڑھاوا دینے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ البتہ وہ ڈسٹین جان کی ذات میں شامل تھا، کوشش کر کے حسام الدین میں منتقل کر دیا۔ ایک بار انہوں نے کسی بات پر غصے میں حسام پر ایئر گن تان لی۔ ہر چند کہ اس ایئر گن میں مٹر کے دانے بھرے ہوئے تھے مگر جب انہوں نے فائر کیا تو مٹر کا دانہ حسام کے پیٹ پر لگا، دھم ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ پیٹ پر داغ پڑ گیا جو آخری عمر تک قائم رہا۔ اسے دیکھ کر وہ کہتے تھے۔ ”یہ میری غلامی کی نشانی ہے۔ جس طرح شاہ باز قلندر کے فقیر گرم لوہے سے اپنے بازو پر پھر لگواتے ہیں۔“

ان دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سے جلد از جلد بڑے ہو جائیں اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ ان کے گھر ”جنگھی“ کی جتڑی آتی تھی جو کھلنے سے شائع ہوتی تھی۔ انہوں نے اس میں داڑھی اور مونچھوں کا اشتہار دیکھا تو دوست منگوا لیے۔ پھر دونوں نے داڑھی مونچھیں لگا لیں اور ”بڑے“ بن گئے۔ عقل و خرد بہر حال وہیں تک تھی جہاں اسے پہنچنے کی عمر میں ہونا چاہیے تھا۔ علی محمد اس وقت اٹھارہ اور حسام الدین تیرہ برس کے تھے۔

ان کا ماحول تعلیمی کے بجائے دؤیرا شای تھا۔ جاگیر دار میلے ملاکڑے کرتے، مرنے لڑاتے، کتے دوڑاتے اور اپنا سر بلند رکھنے کی جستجو میں ہاریوں پر ظلم اور زیادتیاں بھی کرتے۔ مگر یہ دونوں بھائی ان چیزوں سے متفرک تھے۔

ان کا سلسلہ نسب پیر محمد راشد روضہ دینی (بارگاہ) سے ملتا ہے۔ ان کے والد انہیں پیار سے ”ڈول شاہ“ کہہ کر پکارتے تھے۔ انہیں پیری مریدی کی ہمتی تھی اور وہ زمین دار بھی تھے۔

گاؤں کی روایتی زندگی اور پیری مریدی کی وجہ سے ان کی نصابی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ ویسے بھی اس طبقے میں تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن حسام الدین اور ان کے بڑے بھائی علی محمد راشدی نے اپنی عقل و فہم کو استعمال کیا اور اپنے لیے حکمت اور علم کے راستے کا انتخاب کیا۔ جو سب سے اعلا اور ارفع راستہ ہے۔ علم کی طرف ان کی رغبت اور رجحان میں ان کے دادا کا بھی دخل تھا۔

دونوں بھائیوں کی والدہ بہت دانش ور اور سلیقہ مند تھیں۔ وہ انہیں رات کو پری اور جنوں کی روایتی کہانیاں سنانے کی بجائے صحیح کیا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا۔ ”میرے بچو! زمانے کی ہوا تہل ہو رہی ہے۔ سب چیزیں بدل رہی ہیں۔ انسان اب تیل گاڑیوں کی بجائے ریل گاڑیوں میں بیٹھتا ہے اور فضا میں پرواز کرتا ہے۔ پیری اور زمین داری زیادہ عرصے تک نہیں چلے گی۔ اگر تم لوگوں کو اچھی زندگی گزارنا ہے تو علم حاصل کرو۔ ورنہ مزاروں پر بیٹھ کر توبہ کرتے رہو گے۔“

والدہ کی بات علی محمد کے دل کو لگ گئی اور انہوں نے اپنی زندگی میں علم کے چراغ جلانے کا فیصلہ کیا۔ جب کہ حسام لا تعلق رہے۔ انہیں لاڈلیاں کرنے لگا ڈرکھا تھا۔ ہر ایک کھیل جن میں لگی ڈنڈا اور کچے کھیلنے سے لے کر کرکٹ تک شامل تھی ان کو بہت مرغوب تھی۔ دیہاتی لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ان کا بہترین

مشغل تھا۔

☆.....☆

حسام الدین راشدی 20 ستمبر 1911ء کو نصرت اشٹن ضلع لاڑکانہ (توڈیرو تعلقہ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار اور محمد الیاس سے حاصل کی۔

ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گئیں اور تب گئیں۔ تین دن تک درودہ میں مبتلا رہیں۔ لوگوں کا قیاس تھا کہ بچہ پیدا ہوگا تو مردہ ہوگا۔ گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا ڈاکٹری نہیں تھا کہ اسے بلالیا جاتا۔ ان کے دادا نے اپنے دوست شیخ غلام علی کو لاڑکانہ سے بلایا۔ وہ علم نجوم پر دسترس رکھتے تھے۔

انہوں نے حیرت و عافیت پوچھی اور حالات سے آگاہ ہونے کے بعد حساب کتاب لگا کر بتایا کہ بچہ شام سے پہلے ہو جائے گا۔ زندہ ہوگا۔ بڑا نام پیدا کرے گا اور خوش نصیب ہوگا۔ خاندان کا نام روشن کرے گا۔

شام سے پہلے بچہ (حسام الدین) ہو گیا۔ زندہ تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ انہیں نہلا دھلا کر دادا کی گود میں دے دیا گیا۔ اس کی آنکھیں سچ سے بھری ہوئی تھیں۔ دیکھ کر آرزو ہوئے کہنے لگے۔ ”غلام علی جھوٹے نجومی، تم کو کہتے تھے کہ خاندان کا نام روشن کرے گا اور خوش نصیب ہوگا۔ یہ تو اندھا معلوم ہوتا ہے۔“

غلام علی نے انہیں گود میں لیا اور آنکھیں صاف کرنے کے بعد کہا۔ ”سائیں میر پریشان نہ ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہی ہوگا۔ یہ خاندان کا نام روشن کرے گا اور آنکھوں کے ساتھ زندہ رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے رہ جائیں گے۔“

دادا نے اپنے بڑے بھائی کے نام پر اس کا نام رکھا۔ پھر اس کی آنکھوں کا علاج کرایا۔ حسام کی آنکھیں جلد ہی ٹھیک ہو گئیں۔

جب حسام الدین نے چوتھی کلاس پاس کر لی تو سکندر نامہ اپنے استاد سے پڑھا۔ دونوں بھائی ٹھوڑے پر بیٹھ کر نصرت اشٹن کے اشٹن ماسٹر کے پاس جاتے تھے، جو ایک انگریز تھا اور جس کا نام مرید کپتھال تھا، اس سے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ یہ سب اس لیے تھا کہ زمین داروں کے ہاں بچوں کو اسکول یا کالج بھیجنے کا رواج نہیں تھا، اس لیے استاد گھر پر تعلیم دینے آتے تھے۔ بہر حال انگریزی کا معاملہ استثنائاً بقول علی محمد کے جب انگریزی استاد کے پاس ذخیرہ

الفاظ ختم ہو گیا تو ہماری انگریزی پڑھائی بھی ختم ہو گئی۔

ان دونوں بھائیوں کی پڑھائی ٹھوڑے عرصے کے لیے ڈنگاتی رہی، ان معنوں میں کہ ان کے استاد ملا مٹھل (بیٹھا ملا) ان کی پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے، اس لیے کہ دو بیٹیاں تھیں۔ حلیمہ اور کریمہ۔ حلیمہ میں حلیم کی اور کریمہ میں کرم کی کمی تھی۔ دونوں ہر روز برسر پیکار رہتی تھیں۔ ملا کے گھر کو انہوں نے سہر فائنگنگ باؤس بنارکھا تھا۔ البتہ ان میں اتنی شعور و فہم اور وضوح داری تھی کہ وہ براہ راست لڑا کرتی تھیں۔ یہ نہیں کہ آگ لگا کر تماشہ دیکھنے کے لیے الگ کھڑی ہو جاتیں۔ ان کی لڑائی کا وقت وہی تھا جو دونوں بھائیوں کی تعلیم کا تھا۔ ادھر ان کا سبق شروع ہوا ادھر ان کی لڑائی شروع ہوئی۔ برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں، بچے دہشت زدہ ہو کر رونے لگتے۔ اس عالم میں ملا کا سکون عارت ہو جاتا۔ وہ مکتب چھوڑ کر گھر چلا جاتا اور جب تک یہ دونوں خواتین کھانا پکانے میں مصروف نہ ہو جاتیں وہ مکتب میں نہ لوٹتا۔ دو چار طالب علم ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے اور پھر اٹھ کر چل دیتے۔ دونوں بھائیوں نے اس طرح تعلیم حاصل کی۔

ملا مٹھل اپنی زندگی پوری کر چکا اور گورغریاں کو روانہ ہوا تو ان کی پڑھائی کی ذمہ داری کے لیے ایک مولوی کو مقرر کر دیا گیا۔ یہ مولوی ہاتھ چھوڑ تھا اور بچوں کی پٹائی کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ طالب علم اس کا سامنا کرنے سے ڈرتے تھے اور اپنا سبق بھول جاتے۔ اس کی بد قسمتی کہ اس کا سابقہ حسام الدین سے بڑ گیا۔ اس نے ایک دن حسام الدین کو ہلکا سا تھپڑ رسید کر دیا تو مگر حسام الدین نے اس کی داڑھی کے ساتھ گستاخی کر ڈالی اور چند بال بھی شید کر ڈالے۔

بھائی کی ہمدردی میں علی محمد اس چٹائی کو لپیٹ کر لیٹ گیا جس پر وہ سب بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے کچھ نازیبا کلمات بھی ادا کیے۔ استاد نے دادا سے شکایت کر دی۔ دادا نے مقدمہ سنا اور فیصلہ کیا کہ ان کے دونوں پوتے ذرا حساس طبع ہیں لہذا مار پیٹ بالکل نہیں چلے گی۔ اگر پڑھنا چاہیں تو بہتر، اگر نہ پڑھنا چاہیں تو اللہ کی مرضی جس نے ان کی قسمت بنائی ہے۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب کا انداز تدریس تبدیل ہو گیا اور انہوں نے ڈٹے کے بجائے لاڈ پیار سے کام لینا شروع کر دیا۔

ان کی والدہ نے اپنی طرف سے ان سے معافی مانگی اور کچھ تحفے تحائف بھی مولوی صاحب کی خدمت میں

میں رعایت حاصل ہو جاتی۔

اجازت لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس لیے کہ انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہے لوگوں کو آزادی اور سہولت حاصل ہو، وہ اپنے دل کا بخار نکالتے رہیں۔ گھٹ کر باغی نہ بن جائیں اور تخریبی راستہ اختیار کر لیں۔

ان کے بڑے بھائی علی محمد نے سیاست میں قدم رکھنا شروع کر دیے۔ پہلے انہوں نے اپنے قبیلے کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ جن کی ابتدا ان کے ضلع لاڑکانہ سے ہوئی۔ انہوں نے خان بہادر کھوڑو کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا ساتھ دیا لیکن ہندوؤں کا حوصلہ کم ہونے لگا۔ آ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے سوچا جب تک سندھ ممبئی سے علیحدہ نہیں ہو جاتا، ہندوؤں کا زور کم نہ ہوگا۔

سندھ کی علیحدگی کی تحریک پہلے سے چل رہی تھی، لیکن اب انہوں نے اسے جدید طریقے سے چلانا شروع کر دیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ منظم بھی تھے۔ کھوڑو نے اس تنظیم کی صدارت سنبھالی تو علی محمد نے ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔

1926ء میں حسام الدین نے ایک رسالے ”پہاگن“ کے نمائندے کے طور پر بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ پہاگن میں ملازمت ان کی ادبی حیثیت کا آغاز تھا۔ اس میں انہوں نے سندھ کی تاریخ اور اس کی شخصیات کے متعلق ایسے مضامین لکھے جن کی وجہ سے سندھ کے تمام لوگوں کی نگاہیں یکبارگی ان کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ 1929ء میں سکھر کے ادبی جریدے المنار نے انہیں اپنا مدیر مقرر کیا۔ اس دوران انہوں نے تحریک آزادی کے مشہور رہنما عبدالکریم چشتی کی بھی تحریروں اور مضامین کے ذریعے بڑی مدد کی۔ اور تحریک آزادی کے مشن کو بڑھانے میں حصہ لیا۔ اس وقت عبدالکریم چشتی اپنا رسالہ پیغام نکالتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اس رسالے نے سندھ کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس اثنا میں حسام الدین نے ”زمانہ“ نامی اخبار کے رپورٹر کے طور پر بھی کام کیا۔

ایوب کھوڑو ایک بڑی سیاسی شخصیت تھے۔ جب انہوں نے سکھر سے ”سندھ زمین دار“ اخبار نکالنے کا پروگرام بنایا تو ان دنوں بھائیوں کو سکھر بلا لیا۔ انہوں نے اپنا اخبار بند کیا اور سکھر پہنچ گئے۔ 1930ء میں حسام الدین اس کے

باقاعدہ نائب مدیر مقرر ہوئے۔ جب کہ ایوب کھوڑو اس کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ سندھی صحافت کا ابتدائی دور تھا جب متحدہ ہندوستان کی سیاست میں سندھ صوبے کی ممبئی سے علیحدگی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ”سندھ زمین دار“ نے رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پہلے اس کا مدیر ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ مگر ان دنوں جوانوں کا جوش و خروش دیکھ کر انہوں نے علی محمد کو اس کا مدیر مقرر کر دیا۔ اس وقت علی محمد 24 برس اور حسام الدین صرف 18 برس کے تھے۔ وہ بڑے بھائی کی ماتحتی میں کام لیتے اور کام کرنے لگے۔ علی محمد نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اس وقت سندھ میں صحافت اور سیاست بہت دشوار ہیں، اس لیے ہمت نہ ہار بیٹھنا۔ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتے رہو۔ انہوں نے کہا کہ ”انسان میں توکل، محنت، جفاکشی اور کمال لگن ہونا ضروری ہے“ وقت کی قدر معلوم ہونا چاہیے۔ علم کی اہمیت سے آگاہی ہو۔ لیلائے صحافت کا وصال مطلوب ہو تو بھجوں بھی بنا پڑے گا۔

اخبار کے دفتر کے قریب ہی سکھر میونسپلٹی کی جنرل لائبریری تھی۔ دونوں راشدی بھائی وہاں سے کتابیں لاتے اور اخبار کی ادارت کے بعد جو وقت بچ رہتا وہ مطالعے میں صرف کرتے۔ گویا علم ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ وہ سوتے بھی کم ہی تھے۔ کمرے میں جگہ کم ہونے کے سبب حسام الدین فرش پر چٹائی بچھا کر سو جاتے۔

علی محمد پڑھری ڈے داری تھی۔ وہ ایڈیٹری کرتے اور ایوب کھوڑو کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کرتے۔ انہوں نے حسام الدین کو لکھنا سکھا دیا۔ وہ اخبار کے ادارے اور پڑے جوش مضامین لکھنے لگے۔ ان کی تحریر میں تندی زیادہ ہوتی تھی۔ تین سال بعد یہ واضح ہو گیا کہ سندھ ممبئی سے علیحدہ ہو رہا ہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس پر علی محمد اور ایوب کھوڑو کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ اختلاف اس بات پر تھا کہ علی محمد ذرا تیز جانا چاہتے تھے جبکہ ایوب کھوڑو مصلحت و ذریعوں اور مسلمانوں کو رشتائی کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ علی محمد نے اشتعال میں آکر استعفا لکھا اور وہاں سے چلے آئے۔ حسام الدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب! اب کیا ہوگا؟“

”جو مرضی آتا کی وہی میری بھی ہے۔“

”مگر پھر توکل پر انحصار کرنا پڑے گا۔“ حسام الدین نے سر ہلا کر کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے۔ تمہاری ہماری ڈے داری ختم۔ اب

گھاڑ دیے اور انہوں نے تاریخ کی سب سے بڑی امپائر کی جڑیں برصغیر سے اکھاڑ پھینکیں۔

وہ بڑے خواب دیکھتے، بے مایہ ہوتے لیکن فرومایہ نہیں ہوتے تھے۔

اس صورت حال کے ساتھ وہ دونوں گھر پہنچ گئے، مگر اس کی منصوبہ سازی کسی نے نہیں کی تھی کہ کل کیا کریں گے۔ گمری کا موسم تھا۔ دونوں بھائی نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے اور حالات حاضرہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے دادا شیخ غلام محمد غلام جنہیں لوگ ان کے آجوبی رنگ اور تھکنے والے بالوں کی وجہ سے ”غلام محمد شیدی“ کہتے تھے۔ سامنے ہی بیٹھے اور ان لوگوں کے بارے میں تردّد کا شکار تھے کہ وہ اچھی ملازمت چھوڑ کر گاؤں کیوں آئے اور اب کیا کریں گے۔

کچھ دن فارغ بیٹھنے کے بعد نہ جانے علی محمد راشدی کے دماغ میں کیا سہاکی کہ انہوں نے حسام الدین سے کہا کہ اب ایک بار مجھ کو اپنا اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ تم دونوں کو اس کے سوا کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ ”اخبار اپنے گاہکوں سے شائع کرنا تو بہت دشوار ہے۔ یہاں اس کی فروخت اتنی نہیں ہوگی جتنی کہ شہروں میں ہوتی ہے۔“ حسام نے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو۔“ علی محمد نے کہا۔ ”اخبار ہم سکھر سے نکالیں گے۔“

”مگر ہمارے پاس تو اتنا سرمایہ نہیں ہے۔“
 ”تو کل۔۔۔ علی محمد نے گھر اساتس لے کر کہا۔
 وہ دونوں کھمرا آگئے۔ کھربچ کر انہوں نے چار روپے
 ماہانہ پر بزنس دس سو روپے والے کی بلڈنگ میں ایک کمرہ کرائے پر
 لے لیا۔ یہ عمارت لیوکس پارک کے سامنے تھی۔ اخبار کیسا ہوگا
 اور اس کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا یہ انہوں نے قدرت
 پر چھوڑ رکھا تھا کہ وہ ان کے لیے کیا اسباب پیدا کرتی ہے۔
 دکان تو کرائے پر مل گئی، لیکن اس میں فرنیچر نام کی کوئی
 چیز نہیں تھی اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھی، اس لیے وہ صرف ایک
 دکان تھی جس میں وہ پکڑے بیچے یا جلیبیاں بناتے یا اخبار
 شائع کرتے یا چار بائی بیچا کر سوتے رہتے۔

قریب ہی ایک حجام کی دکان تھی جو ان بھائیوں سے واقف تھا۔ اس نے اپنے ہاں سے ایک چار پائی اور دو کرسیاں ان کی دکان پر بچھوا دیں۔ شام تک ان کا ملازم لڑکا بھی پہنچ گیا۔ اس نے لیوکس پارک سے پانی لا کر دکان کے سامنے چھڑکا اور دونوں کرسیاں باہر بچھا دیں تاکہ دونوں مہر بھائی

اس لی ڈے داری ہے جس پر ہم توکل کر رہے ہیں۔“ علی محمد نے جواب دیا۔

عائبا وہ توکل پر اس لیے زیادہ زور دے رہے تھے کہ ان کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے۔ اس میں وہ کہاں ہاٹتے تھے؟ ارادہ تو گھر ہی جانے کا تھا مگر جاتے کس طرح؟ اس لیے کہ ریل کا ٹھوکڑ کلاس کا کرایہ فی کس آٹھ آنے کا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ دو آنے مزید خرچ ہو گئے۔ اب جیب میں چھ ہی آنے رہ گئے۔

تاکہ وینٹگ روم کے سامنے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ گاؤں کا ایک دیہاتی دوڑتا ہوا ان کے نزدیک آ کر پوچھنے لگا۔ ”بھیا! گاؤں چل رہے ہوتا؟“

”ہاں۔“ علی محمد نے جواب دیا۔

[illegible]

ان کی ہستہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سارا پیسا خرچ کر دیا کرتے تھے۔ علی محمد کو پچاس روپے جب کہ حسام الدین کو تیس روپے ملتے تھے۔ وہ اس میں فراخ دلی سے گزر بسر کر رہے تھے۔ کہہ والوں سے وہ کچھ نہیں مانگتے تھے۔ اور رشوت خوری کا رواج ابھی تک اخبار نویسوں تک نہیں پہنچا تھا۔ صحافت ایک مقدس مشن تھا۔ اخبار نویسوں کے بارے میں لوگ اس قدر مہربان تھے اگر انہیں شبہ بھی ہو جائے کہ اخبار محض پیسا کمانے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے تو وہ اس اخبار کو خریدنا بند کر دیتے تھے۔ بلکہ موقع مل جاتا تو اس سے بھی زیادہ کر گزرتے تھے۔ یہ ان کے نزدیک جائز تھا کہ وہ کھلی کر اپنے اخبار کو سرکاری ترجمان بنا دیں۔ اور حکومت کی خوشامد کرتے رہیں، مگر یہ بات صاف ہو اور اس میں کسی قسم کا کمرو فریب شامل نہ ہو۔ وہ منافقت سے متنفر تھے۔

یہ بات انہیں ناگوار گزرتی تھی کہ اخبار عوام کی ترجمانی کا مجموعہ ہے اور حکومت سے امداد حاصل کرتا رہے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خان، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، شیخ عبدالمجید ندوی، رامانند چٹرجی نے صحافت کی دنیا میں اسے جھنڈے

اس پر بیٹھ کر منصوبہ سازی کر سکیں۔ وہ عام سی گزرا گاہ تھی، اس لیے لوگ گزرتے رہے اور ان دونوں کو دیکھتے رہے۔ چند گھنٹوں میں سکھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ راشدی برادر دوبارہ آگئے ہیں۔ وہاں ان کے مسلمان دوست بہت تھے جو سیاسی پارٹیوں کے کارکن تھے۔ کافی افراد وہاں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد بیٹھنے کی جگہ کم پر گئی تو سب افراد پارک میں چلے گئے۔

سب کو جس تھا کہ وہ دوبارہ کیا کرنے آئے ہیں۔ بے درپے سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔ علی محمد کا ایک ہی جواب تھا کہ اپنا اخبار شائع کریں گے۔ مگر کیسے؟ ان کا جواب تھا کہ ہمیں خود نہیں معلوم تھیں کیا بتائیں؟

یہ سب مسئلے مسائل آنے والے کل کے تھے۔ اس وقت کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس کھانے کے لیے بھی رقم نہیں تھی اور وہ کسی سے مانگنا نہیں چاہتے تھے۔ علی محمد نے حسام الدین کو ”سادھو بیلہ“ بھیجا کہ وہاں سے مفت کی پوریاں اور بریٹاؤ وغیرہ لے آئے۔ وہ ایک مندر تھا اور وہاں باقاعدہ لکھنؤ تنظیم ہوتا تھا۔ پوریاں لائڈ ہوئی تھیں، اس لیے کہ اصلی کمی میں پکائی جاتی تھیں۔ حسام اور ملازم لڑکے نے ڈٹ کر کھایا پھر علی محمد کے لیے بھی لے آئے یوں پیٹ پوجا کا انتظام ہو گیا۔

شہر کے مالدار مسلمان اپنی شہرت اور ناموری کے لیے کوشاں رہتے تھے، لیکن پیرا خرچ کرنے کا معاملہ آتا تو پیچھے ہٹ جاتے اور تماشا دیکھتے۔ البتہ غریب لوگ جوش و خروش سے قومی کاموں میں حصہ لیتے۔ علی محمد نے اعلان کر دیا کہ لوگ اگر کچھ بھی چندہ بھیج دیں گے تو اخبار شائع کرنے میں آسانی رہے گی۔

دونوں بھائی اپنی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ جبکہ آباد میں رہتا تھا اور ہندوؤں کا ستایا ہوا تھا۔ تاں گئے سے اتر کر اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور حال احوال پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اخبار شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے کوئی تبصرہ کیا اور نہ کوئی سوال۔ بس مسکراتا رہا۔ پھر ہاتھ ملا کر دوبارہ تانگے میں بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن علی الصباح اس دوست کا فنی ان کی دکان پر آگیا اور کہنے لگا کہ وہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ پریس کا سامان خرید کر ہمارے حوالے کرے۔ پھر ایک اور دوست نے اپنے پریس سے سیلنڈر مٹین لےنے ہاں سے اکڑوا کر ان کی دکان پر بھیج دی۔ اور ایک ستری بھی جس نے مٹین سیٹ کر

دی۔ یوں پریس لگ گیا۔ پھر حسام الدین ڈکریشن لے آئے۔ اس طرح سے مالک حقیقی نے اخبار شائع کرنے کے سارے اسباب مہیا کر دیے۔

انہوں نے اپنا اخبار ”ستارہ سندھ“ شائع کرنا شروع کر دیا۔ حسام الدین نے اس کا بیشتر کام سنبھال لیا۔ یہ ایک دل چسپ اور معلوماتی اخبار تھا جس میں خبروں کے علاوہ دنیا بھر کی تاریخ کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر چنیدہ مضامین بھی شائع کیے، مثلاً افسر شاہی (سرکاری ملازمین) جو عوام کے لیے زحمت پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ وڈیا شاہی (زمین دار طبقہ) جس نے اپنے ظلم اور زیادتیوں سے عوام کی کمر توڑ ڈالی ہے۔ ہندو سیٹھ جو سود پر رقم دیتے ہیں اور عوام کا خون چوستے ہیں۔ ملا اور پیر جو عوام کی دھنی پھساندی کے ذمے دار تھے۔

دونوں بھائی حالانکہ زمین دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور سلسلے کے اعتبار سے پیروں میں شامل تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان فردو عانی چیزوں کے بارے میں دل کھول کر لکھا اور اپنے بڑھنے والوں کو جگا دیا۔ انہی کی وجہ سے سندھ میں بیداری کی ایک لہر اٹھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ جب سندھ ممبئی پر بریڈری سے علیحدہ ہو کر اپنی اصلی شکل میں کام کرنے لگے تو عام لوگوں کو کوئی وقت نہ ہو۔

راشدی بھائیوں کی تیز و تح اداریوں اور مضامین کے لگاتار شائع ہونے کی وجہ سے انگریز، افسر شاہی اور وڈیئے ہندو سیٹھ اور پیروں جیسی طاقتیں ان کے خلاف ہو گئیں۔ چنانچہ انہیں خاصی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ مثلاً ان پر جموں نے مقدمات قائم کیے گئے۔ ایک مقدمہ تو پورے تین برس تک چلتا رہا۔ ان پریشان کن حالات کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے سچ بولنے سے گریز نہ کیا۔ اپنا اخبار جاری رکھا اور ایسی ہی تحریروں سے اعلا طبقے کی بے چینیوں میں اضافہ کرتے رہے۔

☆.....☆

سکھر میں رہائش کے دوران انہیں اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ لکھتے ہیں ”سکھران دونوں اگرچہ بے انتہا صاف ستھرا شہر تھا، لیکن اتنا بڑا نہیں کہ آدمی ادھر ادھر محوم پھر کر اپنا وقت کاٹ لے۔ کھاتے بیٹے لوگ شام کو ریلوے اسٹیشن پر آجاتے تھے۔ ریل کا تماشا دیکھتے اور ریلوے ویننگ روم میں

ملید فاصو والے بوڑھے میرے جان صاحب کی بٹائی ہوئی لہن چائے جس سے خوشبو کی مہکیں پھیل جاتی تھیں، پی کر بٹال سے کھڑے کھڑے اپنی پسند کے دو ایک اخبارات کا ہازہ لے کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

میں بھی دوسروں کی طرح شام کو اسٹیشن پر پہنچ جاتا۔ جان صاحب کی چائے پینا تو اپنی مقدر سے دور تھا۔ کون سا زمانہ چار آنے چائے پر سرف کرے۔ لیکن یار آنے کی وجہ سے بٹال والا اسٹول رکھ دیتا اور میں اس پر بیٹھ کر رسائل اور اخبارات پڑھ لیا کرتا۔ اگر بھی جیب میں پیسے ہوتے اور کسی رسالے کا خاص نمبر آگیا تو وہ بھی خرید لیا کرتا۔

یہ دور اور اپنی یہ صورت حال تھی جب دلی سے ایک رسالہ ”ساتی“ بٹال پر آیا۔ سرورق دیدہ زیب، چھاپائی صاف، قلمی کلاہور کے رسائل کا مقابلہ کر سکے۔ مضامین ان کے دل میں گہرے گہرے۔ شاہد احمد دہلوی صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ حضرت کون تھے؟ ادبی دنیا میں ان کا نام بڑا تھا۔ کس ادبی اگے اور بڑے اس کا نام تھا؟ ان کے نام پر کبھی معلوم نہیں تھا۔ ان کے نام کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہ تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ حضرت دہلوی صاحب دہلوی کے صاحبزادے ہیں جن کی کسی ہوئی ان ہمدون میں منعم تہا میں و اتمات دارا حکومت دہلی اور اعلیٰات ہمار میری کرسی کی پشت دالی الماری میں آج بھی خاص الخاص حیثیت سے رکھی ہوئی ہیں۔ توبہ البصوح والے ان ظہیر احمد ان کے دادا تھے۔ شاہد احمد دہلوی اس میدان میں ہیں ہی نہیں فک پڑے بلکہ خاندانی لحاظ سے ایک طویل اور وقلمی روایات کا پورا انبار اپنی جھولی میں بھر کر لائے تھے۔ اور خود بھی بھر پور ہو کر آئے تھے۔ اگر میں نے کوئی رسالہ دور افلاس میں مستقبل طور خریدنا شروع کیا تھا تو وہ یہی رسالہ تھا۔

میرے آخر میں سگرٹ کے بجائے 15 نمبری بیڑی پی کر اٹھ آنے بچا لیتا اور پہلی تاریخ کو جا کر یہ رسالہ خرید لیتا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب ساتی خرید لیتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے دیروں دولت میرے قبضے میں آگئی ہو۔

یہ رسالہ میرے اور ساتی کے تعلقات کی۔ اور یہ داستان ہے ساتی کے ذریعے شاہد احمد دہلوی سے میری واقفیت کی۔ زمانہ بہت ہی اچھا تھا۔ سوائے اخبار شائع کرنے کے کوئی خاص ذمہ داری نہیں تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ عشق کی

کیا آپ ایسی ملازمت کرتے ہیں جس میں آپ کا زیادہ تر وقت کرسی پر بیٹھ کر گزارتا ہے؟ اگر ہاں تو آپ کینسر جیسے جان لیوا مرض کے لیے آسان شکار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایڈیٹر گریو نیورٹی کی تحقیق میں بتایا گیا کہ درمیانی عمر کے افراد جو اپنا زیادہ تر وقت دفتر میں بیٹھ کر گزارتے ہیں، ان میں کینسر، ذیابیطس ٹائپ ٹو، خون کی شریانوں کے مسائل (امراض قلب یا قارچ) اور جلد موت کا خطرہ جسمانی طور پر متحرک افراد کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ تحقیق کے دوران لگ بھگ پندرہ ہزار کے قریب افراد کے دن بھر کے معمولات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ دن بھر میں سات گھنٹے سے زائد وقت بیٹھ کر گزارنا کینسر سمیت دیگر جان لیوا امراض کا خطرہ بڑھاتا ہے، چاہے وہ لوگ دیگر اوقات میں جسمانی طور پر زیادہ متحرک ہی کیوں نہ ہوں تحقیق میں بتایا گیا کہ اوسط درجہ کی عمر کے افراد دن بھر میں آٹھ گھنٹے تک اپنا وقت بیٹھ کر گزارتے ہیں جس کی بڑی وجہ دفتر میں ستر طرز زندگی کو اختیار کرنا ہے۔ محققین کا کہنا تھا کہ دنیا بھر میں آبادی کا بڑا حصہ خطرناک حد تک ستر طرز زندگی کا عادی ہو چکا ہے، دفاتر سے بہت کچھ گھر میں بیٹھ کر دن کے سائے بیٹھے رہنا لوگوں کو دلچسپ مسئلہ بن چکا ہے جو کہ مختلف امراض کی وجہ بنتا ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ بٹان

کک اور اس کی حرارت سے دل خالی تھا تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ یہ چیز یقین کرنے کے قابل ہے بھی نہیں۔ اس لیے انکار نہیں کرتا۔ دل میں ایک کک لیے ہوئے تھا۔ لیکن بڑے اعتدال اور احتیاط کے ساتھ بلکہ یہ حرارت، یہ گرمی اور یہ سوز و ساز ساتی پڑھنے میں اور اس کے مضامین سے لذت حاصل کرنے میں، سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے مدد و معاون ثابت ہوئے۔ اگر بھی میں نے افسانے انہماک اور لذت سے پڑھے ہیں تو فقط ساتی میں اور وہ بھی محض اس دور میں۔

ساتی نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو جنم دیا تھا۔ عظیم بیک چٹائی اسی زمانے کی عظیم پیداوار تھی۔ ان کی بہن عصمت چٹائی آج تک اسی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ پریم پجاری کی جی کہانیوں نے نہ فقط عشاق کے گروہوں میں ہلکے بچا دیا تھا بلکہ آہ و فغاں کی گونج اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہتی ہوئی، میں نے خود دیکھیں، بہ کئی برس کے بعد

ساتھ ساتی، پریم پجاری اور وہ خاتون سب مل جل کر مجسم صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ مد میں بیت کہیں۔ لیکن سچ عرض کرتا ہوں کہ جب کبھی وہ یاد آجاتے ہیں تو آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ اور بڑی دیر تک پرانے واقعات میں گم مگم ہو جاتا ہوں۔

☆.....☆

حسام الدین صرف صحافی اور مؤرخ ہی نہیں شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری صرف بیازوں میں نہیں لکھی بلکہ مشاعروں میں اپنی نظمیں بھی سنائیں۔ وہ سندھی شاعروں کے اصناف اور اسلوب کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہیں اچھے شعرا کا کلام زبانی یاد تھا۔ غزل کے مقابلے میں وہ نظم کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے سندھ کے غزل گو شعرا پر اپنی مشہور کتاب ”ہوڈوٹی ہونینس“ میں کھل کر تنقید کی ہے۔

سندھ زمین و ادب کی اشاعت کے زمانے میں انہوں نے افسانے بھی لکھے۔ یہ بعد میں دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئے اور انہوں نے قارئین سے داد پائی۔ ان کے افسانے ”انارکلی“ نے شہرت پائی۔ اپنی بیماری کے زمانے میں انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب قلمباز کی تھی۔ وہ ان کی یادگار تصنیف ہے۔ اس کتاب میں حسام الدین نے سندھ کے سماجی، سیاسی اور علمی ادبی تاریخ کا احاطہ دل نشیں پیرائے میں کیا ہے۔ پیر پرستی اور ادب کا حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔ یہ دور سندھ میں تو ہم پرستی اور قبر پرستی کا دور ہے۔ مردہ لوگوں کا زندہ لوگوں پر رعب و اب قائم ہے جو ساروں سے مٹی کے نیچے دفن ہیں۔ حالانکہ ان کی قبریں ابتداء ہی سے منکوک ہیں۔

یہ حرف کوئی اور لکھتا تو قابل گردونی قرار پاتا اور اس کی تحریر منکوک قرار پاتی، لیکن یہ تحریر حسام الدین کی تھی جو خود بھی پیری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور یہ ان کے مشاہدے سے متعلق تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کا تقدس باپال نہ ہو۔ عام آدمی کس طرح سے خوار ہوتا ہے اور اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے، یہ حسام الدین نہیں دیکھ سکتے تھے۔

حسام الدین الحاد کے بھی خلاف تھے، لہذا جب دین محمد وفا نے اپنا رسالہ ”توحید“ شائع کرنا شروع کیا تو وہ اس میں بھی شریک رہے۔ وہ سماجی نقاد تھے اور بہتر سماجی معاشرہ قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ چنانچہ ان کا قلم سماج و دشمن عناصر کے خلاف حرکت کرتا رہتا تھا۔

فارسی زبان ان کی فطرت ثانی کی طرح ان کی ذات کا

معلوم ہوا کہ یہ حضرت عندلیب شادانی کی ذات صفات والا تھی جنہوں نے پریم پجاری کا روپ دھار رکھا تھا۔ اور یہ سچی کہانیاں حقیقت میں ان کی اپنی سچی کہانیاں تھیں بہر حال اس وقت تو پریم پجاری ایک بڑا سرا و شخصیت تھی اور عشاق کے امام سمجھے جاتے تھے۔

وہیں سکھر میں آرت مل پنجابی ہمارے ہم پیشہ دوست تھے خوب صورت، جوان، صحت مند جسم اور کھلا گندی رنگ اگرچہ کٹر آریہ سماجی تھے لیکن ان کا یاراند ہم جیسے مسلمانوں سے رہا کرتا تھا۔ ہندو نمٹ نکالتے تھے اور اس میں مسلمانوں کو برا بھلا کہتے رہتے تھے۔ اردو کے بڑے رسیا تھے۔ سرشار اور شرر کے ناول، حجاب علی امتیاز اور ایم اسلم کے افسانے انہیں خاص طور پر پسند تھے۔ پریم پجاری سے جب آشنا ہوئے تو یکھتے ان کے دل میں عملی طور پر عشق کی آگ بھڑک اٹھی۔ یا اگر دہلی ہوئی کوئی چنگاری پہلے سے تھی تو وہ اب الاؤ بن چکی تھی۔ انہی دنوں ایک ہندو خاتون ڈاکٹری کا امتحان دے کر سکھر آئی تھیں، پریم پجاری کی کہانیوں نے ہمارے اس دوست کو عاشقی پر اس حد تک اکسایا کہ اس خاتون پر والدہ دیشدا ہو گئے۔ عشق چونکہ یک طرفہ تھا اس لیے ہمارے دوست آرت مل ہمیشہ سوزش اور سرگردانی میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک تو بال بچہ دار تھے اور پھر عشق، عشق بھی ہندو خاتون سے۔ اس لیے کسی ہندو کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان سے اپنا راز کہہ سکتے۔ چونکہ ہمارے لنگوئیاریا تھے اس لیے ہمیں ہی اپنا راز وار بنایا۔ ان کے عشق میں روزانہ جو مد و جزر ہو رہا تھا وہ راتوں میں آکر ہم دونوں بھائیوں کو بتایا کرتے تھے۔ شرر کے ناول پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں مسلمانوں کو عشق کے پیٹھ میں استاد اور فرہاد سمجھے ہوئے تھے۔ اس لیے فریق ثانی کو راہ راست پر لانے کے لیے مجھ سے کم، البتہ بھائی صاحب سے زیادہ مشورے لیا کرتے تھے۔ مینے بھر اسی ریاضت میں کٹ جاتا اور جب پہلی تاریخ کو سائی آجاتا اور اس میں پریم پجاری کی کہانی پڑھتے تو ان کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے بے پناہ دھارے بہہ نکلتے تھے۔

آرت مل ہم دونوں بھائیوں کے جانی دوست اور لنگوئیاریا تھے۔ مد میں اکٹھی گزریں تھیں۔ کوئی راز ایک دوسرے سے مخفی نہ تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ عشق کا الاؤ آخر تک ان کے دل میں شعلہ زن رہا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ جب پاکستان بن گیا اور وہ ہم سے رخصت ہوئے تو دونوں بھائیوں سے گلے مل کر بچوں کی طرح دھاڑیں مار کر روئے۔ ان کی یاد کے

تھی اس لیے وہ ان سے بھرا رہتا تھا۔ وہ محرز تھے علی الصباح اٹھ کر کام میں مصروف ہو جاتے۔ چائے بسکٹ پر گزارا کرتے۔ پھر 9 بجے اٹھ کر غسل کرتے اور اس کے بعد بڑی میز پر کام کرتے اس دوران بھی چائے بسکٹ چلتے رہتے۔ قرض خواہوں (حسام کی اصطلاح کے مطابق ملاقاتی) کی آمد سے پیشتر وہ کافی کام نہایت ایک بجے تک اپنی میز پر بیٹھے اور لوگوں سے اپنی لائبریری میں ہی ملاقات کرتے رہتے۔ ہر ایک کو خندہ پیشانی اور بے تکلفی سے خوش آمدید کہتے۔ گفتگو میں علم و ادب کے علاوہ لطیفے بھی ہوتے۔ انہیں انسانوں سے محبت تھی۔ وہ ظاہری شان و شوکت کے لیے کام نہیں کرتے تھے۔ شادی شدہ تھے مگر اولاد اب تک نہیں ہوئی تھی۔ دوسری شادی بھی نہیں کی۔ البتہ انہوں نے بڑے بھائی کے دو بچوں کو گود لے لیا۔ جن کے نام حسین شاہ اور حسن تھے۔

حسام الدین نے 1974ء میں الحمر اسوسائٹی میں ایک مکان خرید لیا۔ اور اپنے پوتے (حسین شاہ راشدی) کے نام پر اس کا نام علی رضا منزل رکھ دیا۔ پھر لائبریری بھی رفتہ رفتہ وہاں منتقل ہو گئی۔ لیکن صبح کے وقت وہ ایک دو گھنٹے کے لیے بیت الضیاء میں آکر بیٹھ جاتے۔ اس لیے کہ الحمر اسوسائٹی وہاں سے دور تھی اور بس کا کوئی روٹ بھی نہیں تھا۔ ملاقاتی پہلے تو بیت الضیاء میں آتے رہتے مگر بعد میں انہوں نے علی رضا منزل میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بہر حال وہاں ملاقاتیوں کا اتنا ہتکھٹا نہیں تھا۔ وہ بڑی بڑی دعوتیں کرتے اور اس کے لیے علی رضا منزل بہترین تھی۔ پھر شور وغل سے بھی نجات مل گئی۔ وہ خود آم کھانے کے شوقین تھے اس لیے ملاقاتیوں کو دعوتوں میں آم ضرور پیش کرتے تھے۔

وہ سچے، کھرے، با اصول اور جری انسان تھے۔ چاہے نجی محفل ہو یا دوستوں میں بیٹھے ہوں، وہی کہتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ میر حسن کو امیر خسرو سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے صرف طرفداران خسرو کو خوش کرنے یا تالیف قلوب کرنے کے لیے وہ خسرو کی تعریف کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ وقت کی لہروں کے ساتھ بہتا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ حکام اور ارباب حل و عقد کی قربت انہیں پسند تھی۔

وہ منظم انسان تھے۔ بڑے پروفیسروں کی طرح بھولتے نہیں تھے۔ دنیا بھر کے اسکالروں سے خط و کتابت رہتی تھی مگر وہ فائلوں کو اس طرح سے مین مین کرتے کہ منٹوں

مصر تھی۔ ان کی یہ صلاحیت تاریخ و تحقیق سے گہری وابستگی کی وجہ سے دو آئندہ ہو گئی۔ سندھ میں فارسی زبان و دوسروں تک انگریزی زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔ سندھ کا ایران سے قبل از اسلام سے تعلق رہا ہے۔ یہاں تک کہ سندھ کی سیاست اور تاریخ کے اہم واقعات ایران کی جانب سے آمد شخصیات کی وجہ سے نمودار ہوئے۔ سندھ کی اکثر تاریخی کتب فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ میر حسام الدین راشدی تاریخ کے محقق کی حیثیت سے جب اس طرف متوجہ ہوئے تو انہیں کئی مقامات پر تاریخ کا تسلسل ٹوٹا محسوس ہوا خصوصاً سندھ کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے حقائق درج نہیں تھے۔ ان کو قلمبند کرنے میں ماہداری برتی گئی تھی۔ حسام الدین نے ان ٹوٹے ہوئے ٹاپلوں کو ملانے سندھ اور ہیران سندھ کے سارے کتب خانوں کو کھنگالا۔ انہوں نے پنجاب، دکن، ایران، شام، مصر، اریتریا اور برطانیہ کے کتب خانوں میں جا کر برصغیر کے مالا مال قریبی کتب، ٹاپلوں کا مطالعہ کیا، پھر ہزاروں اور ہزاروں مطالعہ کرنے کے بعد تاریخ کے ادراک میں کمی کو ایک سطح پر پہنچا۔ اس ضمن میں ان کی کتابیں شہر ہیں۔

یہ اعزاز اس سے پہلے برصغیر میں پروفیسر ہادی حسن کو ملا تھا۔

تہران یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ مگر حسام الدین نے اپنے نام کے ساتھ کبھی لفظ ڈاکٹریٹ نہیں لکھا۔ انہیں ایران کی سب سے بڑی ڈگری دی گئی تھی مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے نصائی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

☆.....☆

کراچی میں آکر انہوں نے جمشید روڈ پر ایک حویلی میں رہنا شروع کر دیا۔ جس کا نام انہوں نے بیت الضیاء رکھا۔ ان کی کتابوں کا کمرچھوٹا تھا لیکن اور تک کتابوں سے بھرا رہتا۔ علمی ادبی کام کرنے والوں کے لیے کوئی پابندی نہیں

میں مطلوبہ خط فائل سے نکال لیتے۔ دوسروں سے کتابیں لیتے تو انہیں علیحدہ رکھتے، تاکہ جب بھی وہ شخص اپنی کتاب مانگے تو فوراً ہی دے سکیں۔ اگر پوچھا جاتا کہ لندن میں فلاں پروفیسر کا پتا چاہیے، بالآخر میں تمام فلاں ادیب کا فون نمبر درکار ہے تو حسام الدین گھر پر ہوں یا ہارپنی ڈائری نکال کر مثنوی میں بتا دیتے۔ اسی تنظیم کی بنا پر وہ بہت سی علمی انجمنوں اور سوسائٹیوں کے گھراں اور رہنما بن گئے۔

شعبہ آثار قدیمہ و کتب خانہ جات اور دانش گاہوں اور دیگر متعلقہ اداروں کو کام کی مفید تھیں فراہم کیں۔ آثار قدیمہ کی نہ صرف یہ کہ نشان دہی کی بلکہ خود شواہد گزار کھدائیوں میں شریک رہے۔

حسام الدین بہت متواضع اور خلیق تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہونے کے بعد گرجوٹی اور خلوص کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا گھر سندھی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ علی محمد اور حسام الدین کی بیگمات اور ان کے بچے آپس میں اتنے مل جل گئے تھے کہ یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کون کس کا بچہ ہے۔

ایک وقت آیا کہ حسین شاہ اور حسنہ کی شادیاں ہو گئیں۔ گھر میں گنجائش کم تھی اور مالک مکان نے پریشان کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے اپنی عظیم الشان لائبریری اسلام آباد روانہ کر دی اور خود انحراسوسائٹی میں رہنے لگے۔ اسی اثنا میں ان کی بیگم بیمار ہو گئیں اور انہوں نے نئی جگہ پر منتقل ہونے سے انکار کر دیا۔ حسام الدین کو گلے کا سرطان ہو گیا اور وہ روس روانہ ہو گئے۔ ابن اثنا بھی اسی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ انہوں نے تو ہمت ہار دی تھی، لیکن حسام الدین نے تو کمال کر دیا اور پہلے سے زیادہ انتہاک سے تعریف و تالیف شروع کر دی۔ 1979ء میں ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا تب حسام الدین کا آپریشن ہوا۔

☆.....☆

ان کی مشہور کتاب ”کالمہوں گوشت و زن جون“ (باتیں میرے وطن کی) 1980ء میں شائع ہوئی۔ جس میں 43 مقالے شامل ہیں جو سندھ کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھی ادب اور تاریخ پر مستند مواد ہیں۔ یہ مقالے پیر حسام الدین شاہ راشدی کی پچاس سالہ تحقیق اور جستجو کا ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ حسام الدین نے چین جاکر بھی تحقیق کی۔ وہ صرف فارسی اور سندھی کے ادیب نہیں تھے بلکہ انہوں نے اردو میں تحقیقی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ 1961ء میں انہیں ایوب خان نے ستارہ امتیاز دیا، لیکن انہوں نے

قبول نہ کیا۔ حسام الدین بہت سی علمی اور ثقافتی انجمنوں کے بانی اور ممبر بھی رہے۔ وہ سندھی ادبی بورڈ کے کافی عرصے تک ممبر رہے۔ انجمن ترقی اردو کے تاحیات ممبر تھے۔ لیاقت میموریل لائبریری اور نیشنل میوزیم کی ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر رہے۔ کراچی یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل کے 1958ء سے ممبر رہے اور وہاں کی انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔

وہ 1962ء میں سندھ یونیورسٹی کے سینیٹ اور سینڈیکٹ کے ممبر رہے۔ اس کے علاوہ 1964ء میں سندھی اکیڈمی کو انسٹی ٹیوٹ آف سندھ لابی میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے نام کا ایک گوشہ وہاں قائم کیا گیا۔ ان کے نام سے ایک آڈیو ریم بھی منسوب کیا گیا۔

انہوں نے 40 کے قریب سندھی، فارسی اور اردو میں سوانحی، تاریخی اور ادبی کتابیں لکھیں۔

یہ 1959ء کی بات ہے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ پھر اس کے بعد ان کی طبیعت میں انخلاف پیدا ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ علمی اور ادبی کام کرتے رہے۔ ان کی تحقیق جاری رہی۔ پھر انہیں سرطان ہو گیا۔ وہ 74 برس کی عمر میں یکم اپریل 1982ء میں انتقال کر گئے اور انہیں ملکی ہتھکے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن وہ اپنی تصنیفات میں زندہ ہیں اور رستی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ ان کی علم و دانش ہمیں نت نئی راہیں دکھانے کے لیے موجود ہے۔

ان کی تصنیفات و تالیفات ”مثنوی“، حیمہ نامہ، مقالات شعرا، مثنوی مظہر الاسرار، قصائد و مثنویات، مثنویات ہشت بہشت، تاریخ مظہر شاہجانی، تاریخ ترخان نامہ، تذکرہ حدیقہ الاولیاء، تذکرہ شعرا، تنقیر (تین جلدوں میں) حالات فیضی، محمد صادق مینا، تذکرہ روضۃ السلاطین، دیوان بیہم خان، تختہ الکرام، مثنوی مہر و ماہ، تذکرہ سروستان، مولانا محبت علی سندھی، مفت مقالہ، دود چراغ، مرزا غازی عمر خان اور اس کی بزم، اسلامی کتب خانہ، سندھی ادب، رسالہ مہراں، تذکرہ امیر خان، ملکی نامہ، مک بھینا رائل، مرزا عیسیٰ خان ترخان، سعدی علی رئیس، تذکرہ مشاہیر سندھ مولوی وفاقی، گوشت و زن جون گالے پھرن۔



تنقید نگار

شکیل الدریس

اردو ادب کو تنقید کے ذریعے باثروت بنانے، سنوارنے میں اہم کردار ادا کرنے والے کی زندگی غموں کے کوہِ گراں تلے دبے سسکتی سی تھی لیکن یہ کوہِ گراں معاشی نہیں فکری تھی۔ وہ گردشِ حالات سے ہمہ وقت برسِ پیکار رہا۔ ذات کی پنہائیوں میں اسیر ہو کر بھی اس نے اپنا مقام پیدا کیا۔

ایک بڑے تنقید نگار کی حالاتِ زیست



والا تھا تو والد صاحب انہیں اچکن اور علی گڑھ پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنا کر اسکول لے گئے۔ وہ اپنی عمر سے ذرا ”بڑے“ دکھائی دینے لگے۔ امتحان دیا اور چھبیس بچوں میں اول آئے، لہذا گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے گیا۔

ان کا نام جمیل تھا اور انہیں بچپن ہی سے اسکول میں پڑھنے کا شوق تھا۔ جب ان کے والد انہیں چھٹی جماعت میں داخل کرانے کے لیے اسکول لے گئے تو ہیڈ ماسٹر نے ”مہوٹا“ دیکھ کر داخل نہیں کیا۔ مگر جب داخلے کا امتحان ہونے

پھول، تعلیم و تربیت اور فنچ کا مطالعہ کیا۔ انہیں روزانہ جو جیب خرچ ملتا تھا۔ اس کو بچا کر نزدیکی ایک پیسہ لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں منگوا لیتے۔

ان کی ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ان کے والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور انہیں مطالعے کا شوق تھا۔ ان کے گھر میں محمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ علامہ شبلی نعمانی کی ”سیرت النبی“ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت، توبۃ النصوح اور مرآۃ العروس موجود ہوا کرتے تھے۔ جمیل کا کہنا ہے کہ ہر چند کہ یہ کتابیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر انہوں نے سب کو پڑھ ڈالا۔ دلچسپ تو تھیں لیکن سر پر سے گزر جاتی تھیں۔

وہ جب با شعور ہوئے تو انہوں نے ساقی، نگار اور ادبی دنیا جیسے رسائل لگوا لیے۔ یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب وہ گریجویٹ ہو کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں محمد حسن عسکری نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جمیل کو کالج کے زمانے میں بھی لائق اور جید اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ انہوں نے انگریزی میں بھی شاعری کی۔ ان کا شمار ذہین طلبہ میں ہونے لگا۔ اچھے اساتذہ کے شوق دلانے پر ان کا مطالعہ وسیع ہو گیا۔ نصابی کتب کے علاوہ بھی انہوں نے بے شمار ادبی کتب کا مطالعہ کیا۔ اسی زمانے میں انہیں انگریزی میں شاعری کا مسوق ہوا۔ دچاگر انہیں لکھی تھیں کہ اساتذہ نے انہیں منع کر دیا کہ وہ انگریزی میں شاعری نہ کریں۔

انہوں نے بچپن ہی سے کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ ان کی پہلی تصنیف ”سکندر اور ڈاکو“ تھی جسے ان کے استاد نے پسند کیا اور وہ اسکول کے سالانہ جشن میں ڈرامے کے طور پر پیش کی گئی۔ ان کی پہلی کہانی ”بنات“ دہلی میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں وہ اسکول کے طالب علم تھے اور ان کا نام محمد جمیل خان ہوا کرتا تھا۔ ان کی کچھ تحریریں ”عصمت“ میں بھی شائع ہوئیں۔ ان کا پہلا مضمون ”پاپائے صحافت میر جالب دہلوی“ تھا۔ پہلی کتاب ”جانورستان“ تھی جو جارج آرویل کے ناول کا ترجمہ تھا۔

1944ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن شام کے وقت جمیل کو ان کے والد کے ایک دوست گھر لے گئے اور ان کے بھائی انوار عالم صدیقی سے ملایا۔ انوار عالم کو یہ بلا پتلا اور گورا چٹا سا لڑکا پسند آیا۔ جس کا رنگ گورا تھا اور انہیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور طبیعت میں

اچھے بچوں کی طرح وہ پابندی سے اسکول جاتے تھے۔ اسکول کے شرارتی بچے انہیں دیکھ کر کتر کر نکل جاتے تھے۔ وہ سلیقہ مند اور با اصول تھے۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کپڑوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اس لیے جو کپڑے اسکول پہن کر جاتے تھے وہ ابھی پر بالکل صاف ہوتے، کہیں سے بھی میلے نظر نہ آتے۔ وہ پہلے یونی فارم اتارتے اور اس کے بعد کھانا کھاتے بغیر اسکول کا کام کرنے بیٹھ جاتے۔ اسکول کا بھی تاغ نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ان کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی تو والد صاحب نے کہا کہ کچھ دن کے لیے چھٹی کر لو لیکن جمیل نہ مانے۔ چنانچہ ان کے والد نے ایک ملازم سے کہا کہ جمیل کو کاندھے پر اٹھا کر اسکول پہنچائے۔ وہ ایک ہفتے تک یہ ورزش کرتا رہا۔

جب انہوں نے آٹھویں جماعت پاس کر لی اور نوں میں جانے لگے تو والد صاحب نے سائنس دلوادی جب کہ جمیل کو سائنس سے کوئی شغف نہیں تھا لیکن والد کا حکم کیسے ٹالتے؟ چنانچہ جوں توں کر کے میٹرک پاس کر لیا اور کالج کا مرحلہ آگیا۔ والد صاحب نے کہا کہ وہ سائنس لیں اور سائنس داں بنیں۔ ناچار انہوں نے سائنس لے لی لیکن جلد ہی اس سے طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے بغیر کسی کو اطلاع دیے آئرش میں داخلہ لے لیا۔ دو برس تک انہوں نے اسے راز رکھا، لیکن جب کالج کا رزلٹ آیا تو والد صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس بیٹے کو وہ سائنس داں بنانا چاہتے تھے اس احمق نے آئرش میں ڈبکیاں کھانے کا انتظام کر لیا ہے۔ وہ ناراض ہوئے لیکن کر بھی کیا۔ سکتے تھے۔ جمیل اردو اور انگریزی کے رسائل کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا۔ سائنسی علوم انہوں نے اس وقت پڑھنا شروع کیا جب انہیں ادب اور زندگی کے گہرے رشتے کا احساس ہوا۔

وہ بچپن ہی سے ادیب بننا چاہتے تھے۔ لہذا جب گھر والے سو جاتے تو وہ قتل خانے میں جاتے اور کاپی کے اوراق پھاڑ کر اسے کتاب کی شکل دیتے پھر اس پر نصابی کتب سے ایک دو مضامین نقل کرتے اور اس کے ٹائٹل پر علی حروف میں اپنا نام لکھ دیتے۔ ان کے والد کو جب یہ پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ بیٹا کھیل کھیل میں کئی کتابوں کا مرتب بن گیا ہے۔

بچپن میں انہوں نے اسکول لائبریری سے بہت استفادہ کیا۔ لائبریرین ولی محمد شعلہ تھے۔ وہ بچوں کے رجحان کو مد نظر رکھتے تھے اور بچے جس کہانی یا رسالے کی فرمائش کرتے وہ منگوا کر انہیں دیتے۔ جمیل نے اپنے بچپن میں

رہتے تھے۔ جمیل کے دادا کے مراسم ایک سنیما کے مالک سے بھی تھے جو پڑوس میں رہتا تھا۔ وہ جا کر اس سے کہتے کہ دادا نے فلم کے دو پاس منگوائے ہیں۔ وہ پاس دے دیتا تو دونوں فلم دیکھ لیتے۔ ایک روز دادا نے انہیں بلایا اور پوچھا کہ کیا وہ ان کا نام لے کر مالک سے پاس مانگتے ہیں؟ وہ سر جھکا کر خاموش کھڑے رہے۔ دادا نے کہا۔ ”یہ طریقہ غلط ہے۔ جب فلم دیکھنا ہو تو مجھ سے ایک رقعہ لکھوا کر لے جاؤ۔ پھر فلم دیکھ لو۔ فلم دیکھنے کو میں منع نہیں کرتا۔“

جمیل بہت شرارتی تھے، بات سے بات نکالنا دوسروں کو لاجواب کرنا انہیں خوب آتا تھا۔ ایک دن وہ کانٹا نہیں آئے۔ انوار نے دوسرے دن اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے پھل پانی اور سرکے کی داستان سنائی نہ نہایت ہولناک داستان۔ کسی چھوٹے بچے کو سنا دی جاتی تو وہ پیچھے مارنے لگتا مگر انوار کو یقین ہی نہ آیا۔ جمیل تمسک کھانے لگے اور سر پر لگا ہوا زخم دکھایا۔ انوار نے کہا۔ ”یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کسی لڑکی سے اظہار عشق کیا تھا تو اس نے تمہارا سر نوچ لیا۔ سچ بتاؤ، کسی لڑکی کی؟“

جمیل نے تمسک کھا کر کہا۔ ”واقعہ بالکل سچ ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں تو ہم پرست نہیں ہوں اور نرم نے میری زبان سے ایسی کہانیاں سیکھیں سنی ہوں گی لیکن یہ واقعہ سچ ہے۔ وہ حسین و جمیل بھی مگر اس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے کافی باتیں کیں لیکن میں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ ٹھیک کیا نا؟“

انوار کی اور ان کی دوستی کافی دنوں تک قائم رہی وہ جب بھی اس واقعے کے بارے میں پوچھتے جمیل یہی کہتے کہ وہ واقعہ سچ تھا۔

1947ء میں جب انہوں نے میرٹھ کانٹا سے بی اے کر لیا اور ایم اے کے لیے داخلہ لیا۔ تقسیم کے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ جس طرف نظر جاتی، لاشیں اور دھواں دکھائی دیتا۔ ایک دن جمیل بغیر بتائے غائب ہو گئے۔ انوار نے گھر جا کر ان کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ اپنے والد کے پاس سہارن پور چلے گئے ہیں اور پھر پاکستان۔ جب ان کا خط پاکستان سے آیا تو اس کی تصدیق ہوئی۔

دراصل قائد اعظم کی تقریریں سن کر جمیل پر پاکستان جانے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ریل گاڑی میں سوار ہو کر پاکستان آ گئے۔ (یہ پاکستان بننے کے تیسرے دن کی بات ہے) تین چار مہینے

ہا بلایا تھا۔ باتوں میں اعتماد۔ بڑے پانچوں کا پاجامہ اور اہم سے شیر وانی، جس کے سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب کے والد کے دوست نے جمیل کا تعارف کرایا۔ ”یہ بیل احمد خان ہیں۔ میرٹھ کانٹا میں سینکڑا ایر میں پڑتے ہیں۔“ انوار نے بھی ان سے ہاتھ ملا لیا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے، لہذا انہوں نے ایک دوسرے سے انسیت محسوس کی۔ انوار، فیض عام انٹر کانٹا میں سینکڑا ایر میں پڑتے تھے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے بھی میرٹھ کانٹا میں داخلہ لے لیا۔ ان کے درمیان دوستی استوار ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ دونوں اتفاق سے ایک ہی سیکشن میں تھے۔ کلاس میں ساتھ بیٹھے، کانٹا میں ایک ساتھ رہتے، لائبریری ایک ساتھ مانتے۔ کتابیں پڑھتے پھر ان پر بحث کرتے۔ اردو ادب کی انہیں ایسی چاٹ تھی کہ سارے بڑے مصنفوں کو انہوں نے تقریباً پڑھ ڈالا۔ کرن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ جو اردو افسانے کی آبرو ہیں۔

سلیم احمد ان دنوں مسلم ہوٹل میں رہتے تھے، جہاں طالب علموں کا ہتھکھانکار ہوتا تھا۔ لوگ اپنی گفتگوات لکھ کر لاتے اور سناتے۔ جمیل ان دنوں ہر روز ایک افسانہ لکھ لیتے تھے۔ پھر انہوں نے تنقید کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ کانٹا میگزین میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس سے ان کے رجحان کا پتا چلا ہے کہ وہ تنقید کی طرف مائل تھے۔

زندگی کے اس صے پر غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کے ذوق و شوق کا ایک ایسا سیلاب تھا جو زندگی کی ہر سرگرمی کو اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ وہ شرارتیں کرتے اور سیر و تفریح بھی کرتے، لیکن زندگی کا محور صرف اور صرف ادب تھا۔ جمیل خان تو جیسے کتابوں کے کیڑا تھے۔ لائبریری سے جو کتاب لیتے وہ دوسرے دن واپس کر دیتے۔ وہ کلاس میں نہایت شریر اور مزہ پھٹتے تھے۔ بعض نوجوان پروفیسروں سے ان کی کہیں ہمتی تھی۔ پروفیسروں کو شکایت تھی کہ وہ کچھ کے دوران بے سکتے سوالات کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جمیل کا رویہ چند پروفیسروں کے ساتھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔ البتہ حسن عسکری کو بہت پسند کرتے تھے اور جب ان کا کچھ شروع ہوتا تو جمیل لڑکوں کا خاموش رہنے کی تلقین کرتے تاکہ کچھ سب کی سمجھ میں آجائے۔

جمیل ان دنوں میرٹھ چھاؤنی میں اپنی دھیلیاں میں

جیکب لائن کے ایک برآمدے میں پڑے سے اُدھر گھر والے مانی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ پھر ایک دن ریڈیو سے اعلان ہوا تو گھر والوں تک خبر پہنچی اور انہیں سکون آیا۔

ان کے بعد ان کے بھائی بھی پاکستان آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ڈھ لاکھ روپے لے کر آئے تھے۔ جیل نے اس رقم سے ہیرا المی بخش کالونی میں مکان خرید لیا۔ پھر ایم اے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ 1949ء میں امر وزشائع ہونے لگا تو انہوں نے اس میں ملازمت کر لی۔ لیکن یہ ملازمت طویل ثابت نہ ہوئی۔ صرف ایک ماہ بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور تنخواہ بھی نہیں لی۔ تفصیل کچھ یوں تھی کہ ان دنوں مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ان سے بالیسی میٹر پر بحث ہونے لگی۔ سارا اسٹاف جمع ہو گیا لیکن باہر گھڑا ہو کر تماشا دیکھتا رہا، کوئی اندر نہ آیا اور نہ کسی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

بات آئی مکی ہو گئی۔ مگر ایک ہفتہ بعد پھر دونوں میں بحث ہو گئی۔ جیل کا کہنا تھا کہ آزادی اظہار پر پابندی عائد کرنے سے ان کے لیے کام کرنا دشوار ہے۔ میں نے لیکھوں اور وہ نہ لیکھوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی تاحقی مگر نو جوانی میں خون گرم ہوتا ہے اور برداشت کم ہوتی ہے۔

خاندان والے ابھی اٹھایا میں تھے اور وہ چھڑے چھانٹ یہاں رہ رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ کھانا باہر کھانے کی بجائے گھر پر ہی پکایا جائے۔ سب نے فیس واریاں تقسیم کر لیں۔ سب اپنا کام ختم کر کے بیٹھ گئے۔ اب جیل کا انتظار ہو رہا ہے۔ آوازیں دی جا رہی ہیں۔ ”آؤ بھئی۔“ وہ کمرے میں پڑے کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب سب اکٹا جاتے تو خود ہی کر لیا کرتے۔ اس طرح سے کام میں اکٹا ہٹ پیدا ہو گئی کہ جیل تو اپنے حصے کا کام نہیں کرتے سب کچھ ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلا گیا کہ انہیں امور خانہ داری سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

وہ 1950ء سے لے کر 1952ء تک بہادر یار جنگ اسکول میں ماسٹر اور پھر ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ مشہور ڈراما نگار خواجہ معین الدین چشتی بھی اسی اسکول میں ماسٹر تھے۔ انہوں نے لال قلعہ سے لائوسٹیک تک، مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغان جیسے دل چپ اور ناقابل فراموش ڈرامے لکھے تھے۔ مختصر سے عرصے میں جیل نے اسکول کو بہت ترقی دی۔ اس کا شمار بڑے اسکولوں میں ہونے لگا۔ اسی زمانے

میں جیل نے دلی کا یادگار مشاعرہ خود لکھا اور اسٹج کیا۔ اس کو اسٹج کرنے کے لیے خود ہی ایڈیٹ کیا۔ اس کے لیے ابتدائی ڈاکو مٹری بھی لکھی۔ جس میں ڈرامے کا تعارف تھا۔ یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا کہ اس کے دس شو ہوئے۔

اعجاز الحق قدسی بہت سی دینی کتابوں کے معصف تھے اور لوگ ان کی تحریروں کو پسند کرتے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے کا داخلہ بہادر یار جنگ میں کرانا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اپنے بیٹوں کو داخلہ دلانے کے لیے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انہیں اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ایسا نہ ہو کہ بھگدایے جائیں۔ ایک چہر اسی کو ان پر رحم آ گیا اور اس نے کہا۔ ”میاں اسی طرح سے بیٹھے رہو کہ تو شام ہو جائے گی۔ لائیے مجھے اپنے نام کی پرچی لکھ دیجیے میں اسے صاحب تک پہنچا دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا نمبر جلد آ جائے۔“ قدسی صاحب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد بلا لیا گیا۔

انہوں نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر ایک گفتنی شخصیت براجمان ہے۔ جس کے منہ میں پاں دبا ہوا ہے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ دو تین لڑکے سامنے کھڑے تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ان سے مخاطب ہو گئے اور بولے۔ ”فرمائیے؟“ قدسی نے نہایت مختصر لفظوں میں اپنا وکھڑایا کیا۔ ان کی روداد سن کر اپنی میز کی دراز سے داخلے کا فارم نکالا اور ان کی طرف بڑھا کر بولے۔ ”داخلے کی طرف سے آپ مطمئن ہو جائیے۔ اس فارم کو بھر کر مجھے بھیج دیجیے۔ کل اس بچے کا داخلہ ہو جائے گا۔“

انہوں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آئے۔ اتفاق سے اسی چہر اسی سے ملاقات پھر ہو گئی۔ کہنے لگا۔ ”حضرت! آپ کا کام بن گیا؟“ قدسی صاحب نے کہا۔ ”میاں تمہاری مہربانی سے کام بن گیا۔ تمہارے ہیڈ ماسٹر بہت اچھے انسان ہیں۔“

”ان کا کیا کہنا حضرت! جب سے آئے ہیں اسکول کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے۔ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ یہاں کی تعلیم اچھی ہو جائے۔ ہر ایک سے اس موضوع پر بات کرتے ہیں، غصہ کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔ وہ بہت دیر تک اپنے ہیڈ ماسٹر کے گن گاتا رہا۔“

اس کی باتیں سن کر قدسی نے کہا۔ ”جیل خان عظیم انسان ہیں اور ان کے اخلاق نے میرا دل موہ لیا ہے۔“ ان کے لڑکے کا داخلہ اسکول میں ہو گیا اور وہ بندرتج

میل خان سے قریب ہوتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے اپنی "حدود یعنی کتابوں پر ان سے دیا۔ پچھلی لکھوائے۔

☆.....☆

کچھ عرصے بعد "پیام شرق" نامی ہفت روزہ شائع ہونے لگا۔ جمیل نے بیڈ ماسٹری چھوڑ دی اور پیام شرق میں کام کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ صحافی بن جائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ پڑھنے پڑھانے کی طرف تو رجحان تھا، لیکن ابھی ان کی سوچوں کو کوئی صحیح سمت نہیں ملی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے مالک نے سارا پرچا ان کے سر پر لاد دیا اور سارا کام کرانے لگا۔ اس میں انہوں نے خود بھی لکھا اور شاہد احمد دہلوی سے بھی مضامین لکھوائے۔ ایک روز شاہد صاحب نے پوچھا کہ انہیں کیا ملتا ہے؟

جمیل کہنے لگے "کچھ کہا نہیں۔ وہ اللہ کا بندہ بھی سانپ لگھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے خود کچھ سوچنا چاہیے۔ میں کیا کہوں؟ یہاں ان کی رواداری اور مردوت آڑے آ رہی ہے۔"

یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا پھر ایک روز وہ کاج سے کھڑے کر چلے آئے کہ کل سے نہیں آؤں گا۔ دوسرے دن اس کا مالک آگیا اور اس نے جمیل کے پاؤں پکڑ لیے۔ جمیل پھر جانے لگے۔ مگر پھر بدل سے ہو گئے۔ کہنے لگے خود کھاتا ہے لیکن طباعت اور کتابت پر کچھ خرچ نہیں کرتا۔ نتیجے کے طور پر اس بار جو ملازمت چھوڑی تو اس کے لاکھ کہنے پر بھی جو اننگ ندی۔ گویا کہ صحافت سے انہوں نے منہ موڑ لیا اور پوری توجہ ادب کی طرف مبذول کر لی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ادبی محفلوں میں جاتے تھے۔ مگر وہاں اختلافات ہونے لگتے۔ اس لیے کہ جمیل میں الجھنے کی عادت بہت تھی۔ وہ غلط بات نہیں سن پاتے تھے۔ ہر چند کہ ان کا دل صاف تھا لیکن رویے کے بارے میں بے وجہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔

☆.....☆

شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" نے ان کا خاکہ اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں جمیل اکیس برس کے تھے۔ "کراچی میں ایک دن شام کے وقت ایک بڑے دل نشیں سے نو جوان آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب سے انہوں نے سلام کیا۔ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پہ سفید شیشی نمنا ٹوپی، گول چہرہ، بامشینی رنگ کی کشادہ پیشانی، غلائی آنکھیں، کنارہ سی ناک، پتلے پتلے سے

گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہ زخمدال، داڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیر دانی، اکھیر اپا جامہ اور پاؤں میں سفید سانہری جوتی۔

کچھ دیر اس نو جوان سے گفتگو کرنے کے بعد اعزازہ ہو گیا کہ یہ طرح دار نو جوان آج کل کے نو جوانوں کی طرح کھوکھلا نہیں ہے اور اس کے ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی اجلا ہے۔ شرافت، نسب، شرافت نفس کی ذمے دار تھی۔ ان کی شخصیت میں کھر رایت اور ان کی باتوں میں موٹی ہے۔ جمیل فریب، مکاری اور چالاکی ان میں نہیں ہے۔ باتیں بہت بھولی بھولی ہی کرتے ہیں۔"

جوش صاحب نے ان کے بارے میں ایک خط میں لکھا ہے۔ "جمیل صاحب جاہلی، جشم بدور، رنگیلے جوان اور طیار انسان ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ان کے لہجے میں شرافت کی تلک پائی جاتی ہے۔ قدرت نے انہیں سخن مہی اور بذلتی کا جو بھی عطا کیا ہے اور بدل صلح بات کہنے کی صلاحیت بھی عطا کی ہے۔ ان کی شخصیت میں جاہلیت اور ان کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے

اب اور کیا چاہتے ہو، تیسری مل جائے؟

جمیل صاحب خامسے بھولے آدی ہیں۔ فوراً لوگوں پر اعتبار کر لیتے ہیں اور بعد میں آدی لفظ ثابت ہونے پر پچھتاتے بھی نہیں۔ قصہ سنئے۔ انگریز کی ایک اخبار نویس میرے پاس آیا۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے چلا گیا۔ گفتگو میں جمیل کا تذکرہ اس طرح کرتا جیسے ان سے گہرے مراسم ہوں۔ میں اس کے رویے سے کھٹک گیا۔ یہ شخص جو کبھی میرے پاس نہیں آیا۔ اب میری تقریروں کے پل کیوں باندھ رہا ہے۔ مجھ پر مضمون کیوں لکھوا رہا ہے اور مجھے بزر باغ کیوں دکھلا رہا ہے؟

اگلے دن وہ اخبارات کا پلندہ اٹھا کر پھر آگیا۔ اپنے چھپے ہوئے مضامین دکھانے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد اس نے اجازت چاہی اور فون نمبر دے کر کہنے لگا۔ "میرے اخبار کا نمبر ہے جب کوئی مسئلہ ہو تو فون پر بات کر لیں۔"

میں اسے چھوڑنے دروازے تک گیا۔ وہ اچانک مڑا اور کہنے لگا۔ "آپ کے پاس دس روپے ہوں گے؟ میں اپنا پرس گھر بھول آیا ہوں۔ جمیل کے پاس تمہارا وہ گھر پر نہیں ہے۔ میں کل اسی وقت دے جاؤں گا۔"

میں نے سوچا اگر اسے دس روپے دے کر پچھا چھوٹ

سکتا ہے تو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اندر جا کر دس روپے کا نوٹ لا کر اسے دیا تو اس نے کہا۔ ”بس کل اسی وقت۔“ اور چلا گیا۔

دوسرے دن بھلا کون آتا ہے۔ میں نے تیسرے دن فون ملایا کہ دیکھو تو سہمی کیا کہتا ہے۔ نمبر مل گیا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا آفس ہے۔ اس شخص کے بارے میں پوچھا۔ اتفاق سے اس اخبار کا ایڈیٹر میرا واقف کار تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ”وہ شخص آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا؟“

میں نے بتایا۔ ”دس روپے لے چکا ہے۔“ وہ افسردہ ہو کر بولے۔ ”اس شخص کو ہم نے اخبار سے نکال دیا ہے۔ ذہن ہے لیکن ناکارہ۔ کم بخت سب کو ہمارا نمبر بتا دیتا ہے۔ آئندہ بھی اس کا اعتبار نہ کیجیے گا کہ پرس کمرہ بھول آیا ہوں۔“

اگلے دن میں جمیل صاحب کو آگاہ کرنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ ان کا نام سننے ہی پوچھا۔ ”آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا ہے؟“

”جی دس روپے۔ مگر اس سے ہوشیار رہیے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس بھی دس روپے مانگنے آجائے۔“

”وہ تو پہلے ہی مجھ سے لے چا چکا ہے۔“ وہ بولے۔

”چلو دس روپے پر ہی جان چھوٹ گئی۔“

”نہیں وہ پھر آئے گا۔“ انہوں نے بے چارگی سے کہا۔ مجھ سے تو کئی بار پانچ پانچ اور دس روپے لے چا چکا ہے۔“

”اور آپ دیے جا رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”کیا کروں اس کی مفلسی پر ترس آ جاتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

کبھی انہیں ترس آ جاتا ہے، کبھی انہیں خوف خدا ہوتا ہے اور کبھی ان کا جی چاہتا ہے۔ طالب علموں کی فنیس اپنے پاس سے دے دیتے ہیں، کنائیں دلوادیتے ہیں، امتحان کی فنیس ادا کر دیتے ہیں۔ دوستوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ جمیل صاحب آپ کا فلاں کام ہو گیا۔ مٹھائی کھلائیے۔

جمیل کہتے ہیں۔ ”آئیے۔“ پھر سب کو حلوئی کی دکان پر لے جاتے ہیں اور ہر ایک کی سن پسند مٹھائی کھلاتے ہیں۔

ایک دن خود کہنے لگے۔ ”اپیل جیت گئے۔ دعوت ہوگی۔ مرغ اور آکس کریم۔“

سب ہانہ کر کے ریتوران کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی سی دیر مرغ کی ہڈیوں کا پہاڑ سا بن گیا۔ اس کے بعد سب نے آکس کریم پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جمیل ہیں کہ خوشی سے کھلے جا رہے ہیں کہ دوستوں کی دعوت کر دی۔

بی بی این کی نمائندگی کرنے جب وہ پیرس گئے تو وہاں بھی ایک جگہ ان کا دل چاہ گیا۔ پروفیسر سید علی احسن نے بتایا کہ تمہارے یہ جمیل خان بھی عجیب آدمی ہیں۔ پیرس میں ہماری حیثیت مہمانوں کی تھی مگر جتنے مندوین وہاں تھے انہوں نے ان کو نہایت قیمتی شراب پلا دی۔ میں نے سوال کیا یہ کیا حرکت تھی؟

”میرا جی چاہ گیا تھا اس وقت۔“ انہوں نے جواب دیا۔

جب انہوں نے رسالہ ”نوادور“ شائع کرنا شروع کیا تو مجھ سے فرمائش کی کہ آپ بھی کچھ لکھیں۔ میں نے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھ دیا۔ وہ انہیں پسند آیا۔ نیا دور میں چھپ گیا۔ قارئین کے خطوط آنے لگے کہ شاہد صاحب سے مزید کچھ لکھوائیے۔

میں تجھے میں تھا کہ اب کس موضوع پر لکھوں کہ ان کا فیچر آیا اور اس نے ایک لفاظ مجھے پیش کیا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں دس دس کے کئی نوٹ تھے۔ میں نے فیچر کو لفاظ واپس کر دیا اور کہا۔ ”میں نے غلط اور محبت سے مضمون لکھا تھا۔ میں اس کا معاوضہ نہیں لوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ جمیل خان ہانپتے کانپتے خود چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ ”یہ معاوضہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی رہنمائی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں آئندہ بھی پرچے کے لیے لکھوں گا لیکن معاوضہ نہیں لوں گا۔“ وہ خاموشی سے چلے گئے۔

وہ بہر حال ایک خوددار آدمی ہیں۔ اس لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن صبح کی کام سے آئے۔ کہنے لگے۔ ”آپ کے ہاں پنکھا نہیں ہے، بڑی گرمی ہے۔“

”ہاں لگو لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”فرمت نہیں ملی۔“ ان کا مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ بی بی این میں رہتے تھے اور میں مارٹن کوارٹرز میں۔ ہم لوگ ٹھیکے ہوئے ایک دوسرے کے گھر آ جاتے تھے۔ کسی کام سے بندر روڈ چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ایک بالکل نیا پنکھا لگا

ہوا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو بتا گا کہ جمیل خان آئے تھے اور اپنے ساتھ ایک الیکٹریشن کو بھی لائے تھے۔ وہ پنکھا لگا گیا۔ اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ جب ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟“

کہنے لگے۔ ”اب کچھ نہ کہیے گا۔ دوستوں کا حساب دل میں رکھا جاتا ہے۔“

میری اہلیہ نے ایک اسکول میں پڑھاتے ہوئے بیماری کی حالت میں ایم اے کیا تو سب کو بہت خوش ہوئی۔ مگر میں زمانہ میلاد شریف ہوا۔ جمیل کی بیگم جب آئیں تو مٹھائی اور ایک بھول دار ساڑی بھی لے آئیں۔ میری بیگم نے کہا۔ ”یہ کیا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”تمہارے بھائی صاحب لارڈ لے گئے تھے۔ وہاں مجھ سے کہنے لگے کہ بھائی کے لیے ایک ماڑی پسند کر لو۔ ہمیں یہ رنگ پسند ہے؟“

اب الپ دل چسپ واقعہ سنئے۔ جوش صاحب نے ادا کیا۔ ”اے! آپ ہماری دعوت پیچھے“

”اے! پھر مائیں“۔ ”کیل نے ماموت سے کہا۔“

”امامی“ میں بھائی اور بھارے بیگن کا سالن ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیگم حیدر آباد میں رہ رہی ہیں۔ کھانا اچھا کانا جاتی ہیں۔“

جمیل بھولا سا آدمی ہے۔ تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ بہر حال تاریخ اور وقت طے ہو گیا۔ دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا گیا۔ میں نے معذرت کر لی۔ اس لیے کہ مجھے لاہور جانا تھا۔ واپس آیا تو قدسی صاحب نے مزے دار قصہ سنایا۔

جمیل صاحب نے کھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ سب کچھ جوش صاحب کی فرمائش کے مطابق تیار کر دیا۔ لونچ کھکے تھے اور مہمان آرہے تھے۔ جوش صاحب کو دس بجے گاڑ گھر سے لانا تھا۔ جمیل خان میں یہ بری عادت ہے کہ وہ کوئی کام وقت پر نہیں کرتے۔ ساڑھے دس بجے ان کی بیگم نے کہا کہ کھانا بالکل تیار ہے۔ قدسی جمیل خان کی کار لے کر جوش صاحب کے گھر پہنچے۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔

ملازم نے بتایا کہ جوش صاحب کھانا کھا کر لیٹ گئے ہیں۔ قدسی نے کہا کہ ان سے کہو کہ قدسی آپ کو لینے آئے ہیں۔ جمیل خان کے ہاں آپ کی دعوت ہے۔

جوش صاحب وقت کے بہت پابند تھے۔ ٹس سے مس

نہ ہوئے۔ قدسی نے خواب گاہ میں جا کر کہا۔ ”اس نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ دس بارہ آدمی بلا لیے ہیں۔ آپ سب پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔“

جوش صاحب اپنی ارٹ لگائے رہے۔ ”اب تو ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ اب نہیں جائیں گے۔“

قدسی واپس آگئے۔ پھر جمیل کو قصہ سنایا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

”ہاں، مگر انہیں آ جانا چاہیے تھا۔“ جمیل نے خفیف ہو کر کہا۔

جمیل صاحب کوئی کام وقت پر نہ کرنے کے عادی تھے جب کہ جوش صاحب ہر کام کو وقت پر کرتے تھے۔ ایسے میں دعوت کا استیفاء کیوں نہ ہوتا۔

جمیل خان کبیدہ خاطر ہوئے۔ سب نے کھانا زہر مار کیا اور اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔ جمیل افسردہ تھے۔ مگر ایک روز جوش صاحب ان کے آفس پہنچ گئے۔ جمیل خان نے انہیں گلے لگا لیا اور ساری باتیں بھول گئے۔ دل سے ساری کشافیت دور ہو گئی۔

جمیل صاحب کی نفاست پسندی بعض اوقات ان کے دوستوں کے لیے صبر آزمائیت ہوتی ہے۔ مثلاً انہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔ ایک بار مجھے چودھویں کی رات کو اپنے ساتھ سینڈز پیٹ لے گئے۔ چاند نے کھیت کیا تو سمندر میں دور تک چاندنی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے لگے، ایسا سحر آفرین منظر تھا کہ آدمی نظاروں میں کھو جائے۔ وہ بت بنے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ”بس دیکھ لیا۔ اب گھر چلو مگر نہیں، وہ تو خاموش بیٹھے انہیں نکتے جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹے دو گھنٹے، کوئی حد ہے اس خوش منظری سے لطف اندوز ہونے کی؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے قلعی جی جا رہی تھی۔ اور آپ ہیں کہ کبھی چاند کو اور کبھی چاندنی کو نکتے جا رہے ہیں۔“

تنگ آکر میں نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ آپ ماہ زدہ ہو جائیں اور Lunatic کہلائیں، آپ کھڑے ہو جائیں۔“

وہ بڑی لجاجت سے بولے۔ ”ابھی چلتے ہیں، بس ذرا۔۔۔۔۔۔“

”ذرا اور کچھ نہیں آپ کھڑے ہو جائیے ورنہ میں چلا۔“

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات گھر پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔

اس کا کام نہیں کر دیں گے جین سے نہیں بیٹھیں گے۔

☆.....☆

جیل 1953ء میں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر محکمہ انکم ٹیکس سے وابستہ ہو گئے۔ پھر انکم ٹیکس کمشنری حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ نومبر 1980ء میں وزارت تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔

انہی دنوں ڈاکٹر خلیق انجم ہندوستان سے پاکستان آئے۔ وہ ”پاکستانی ٹیگز“ پڑھ چکے تھے۔ جیل کی تحریر سے متاثر ہوئے اور جیل کو ملاقات کے لیے فون بھی کر چکے تھے۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ محمد علی صدیقی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے تو انہوں نے اشارے سے بتایا کہ جیل صاحب کا آفس اس عمارت میں ہے۔ خلیق نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو محمد علی اندر لے گئے۔ آفس کے باہر ایک چڑیا پیور وریک انماز میں سینہ بھلائے بیٹھا تھا۔ ایک بیٹج پر انکم ٹیکس کے مارے ہوئے چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر خلیق نے محمد علی کو اوپاس چلنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے خلیق کا مشورہ قبول نہیں کیا اور ایک چٹ پر خلیق کا نام لکھ کر چڑیا کو تھما دیا۔ وہ چٹ لے کر آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ محمد علی نے خلیق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ تمہارے صاحب کے بھائی ہیں اور ہندوستان سے آئے ہیں۔“ چڑیا کو جب اہمیت کا احساس ہوا تو وہ چٹ لے کر اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آیا اور اس نے اشارہ کیا کہ وہ اندر جا سکتے ہیں۔

جیل صاحب فائلوں کے انبار کے پیچھے چپے ہوئے تھے اور چند افراد اپنا کیس لے کر بیٹھے تھے۔ جیل صاحب ہمیں دیکھتے ہی کمرے ہو گئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ پانچ چھ منٹ باتیں ہوئیں، پھر انہوں نے معذرت کی کہ شام کو آپ میرے گھر آجائیں وہاں ملاقات ہوگی۔ ایک سرکاری افسر کی اس ذمہ داری سے خلیق بہت متاثر ہوئے۔ عام طور پر سرکاری افسران ایسے موقعوں پر اس طرح سے جو گفتگو جاتے ہیں کہ انہیں گروہ پیش کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اور سرکاری کام سے آنے والے افسر ملاقاتی دونوں کو کونسنے دیتے رہتے ہیں۔

☆.....☆

اسی سے ملتا چلتا ایک واقعہ اور ہے۔ ایک صاحب آفس میں آ کر ادب پر گفتگو کرنے لگے۔ جیل نے مصیبت سے کہا کہ ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ادبی محمد جیل خان میرے سگے بھائی ہیں اور میرے ہمیشہ اس لیے کہ ہم

ایک راز کی بات بھی بتا دوں کہ گلاب کا پھول ان کی کم زوری ہے۔ کہیں دیکھیں گے تو اکھاڑ لیں گے، دکان پر دیکھیں گے تو خریدنے سے باز نہیں رہیں گے۔ جب کوٹ پھینس گئے تو گلاب جب کے اوپر ضرور لگائیں گے۔ ان کی خوش اخلاقی بعض اوقات اپنی حد کو پہنچ جاتی ہے اور لوگ انہیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں۔ میں نے چند بار ان کے التفات فراوان کو دیکھا ہے اور اس پر انہیں ٹوکا بھی ہے۔ تو جیل صاحب نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔“ مگر بدلیمنٹز کا کیا کیجیے؟ مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے، لیکن کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جاسکتی۔ جو لوگ جیل کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ عورت جیل کی کم زوری ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب کسی خاتون سے ملاقات ہو جائے تو اتنا مکمل مل جاتے ہیں کہ دیکھنے والے یہ تاثر لیتے ہیں کہ ریشہ منگلی ہو گئے۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ گلڈ کے انتخابات ہو گئے تو مہمانوں کی ٹولیاں بنا کر شرفی پاکستان کی سیر کرائی گئی۔ جیل صاحب کو خواتین کی ٹولی میں شریک کر دیا گیا۔ ریل کسی خوش منظر علاقے سے گزر رہی تھی۔ جیل نے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا۔ ”دیکھیے کتنا خوب صورت منظر ہے۔“

خاتون نے پلٹ کر کمرے کی منظر دیکھا پھر اٹھلا کر کہا۔ ”ہوں تو آپ میری کمرہ دیکھنا چاہتے تھے؟“

جیل صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو یقیناً اسے مار بیٹھتے۔ بہر حال مرد باری سے بولے۔ ”آپ کی کمر میں کیا رکھا ہے جو اسے دیکھوں؟“

اس خاتون نے پھر وار کیا۔ ”آپ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟“

جیل بولے۔ ”جب آپ اپنے شوہروں کو ساتھ نہیں لاتیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی بیویوں کو ساتھ لائیں۔“ اس بات پر زبردست فتنہ پڑا اور وہ خاتون محبوب سی ہو گئیں۔

میں نے بچپن میں ایک انگریزی فلم میں دیکھا تھا کہ استانی بچے کو صیحت کرتی ہے کہ اگر زندگی میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ”نہیں“ کہنا سیکھو۔ جیل نے کامیابی تو حاصل کی، لیکن ”نہیں“ کہنا ابھی تک نہیں سیکھا۔ ان کے پاس کوئی بھی ضرورت مند آجائے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کسی کو کوئی بھی کام کرانا ہو تو ان سے کہہ دیتے۔ جب تک

نہیں نکلی۔

☆.....☆

جیل صاحب کا خاندان ماشا اللہ بھرا ہے۔ قدرت نے انہیں پانچ بہنیں اور پانچ بھائی عطا کیے۔ ایک بہن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ باقی خدا کا شکر ہے کہ بقید حیات ہیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ جیل کے والد محمد ابراہیم خان نے اپنی تمام اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جیل کے ایک بھائی ڈاکٹر ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ باقی تین چھوٹے بھائیوں نے امریکا میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ان میں سے ایک بھائی کیمیکل انجینئر، دوسرا کمپیوٹر انجینئر جب کہ تیسرا معاشیات میں ماسٹر ہے اور تجارت کرتے ہیں۔ جیل سب سے بڑے ہیں۔ جاوید بھینش شادی شدہ ہیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

☆.....☆

جیل کی شخصیت کی تعمیر و ترقی ترویج میں بہت سے اساتذہ نے حصہ لیا، لیکن چند اساتذہ کا کردار بے حد اہم ہے۔ جن میں ایک ہندوستانی عیسائی مسٹر فرانسس سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کے ایک شاگرد تھے جن کا نام مولوی محمد اسماعیل تھا۔ جیل نے ان سے اردو، جغرافیہ اور حساب پڑھا۔ اردو بہت سے اساتذہ سے پڑھی، لیکن مولوی فیض الحسن نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔ انہوں نے جیل میں ایسا ذوق پیدا کیا کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ہی جیل کی تخلیقی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ شعر و شاعری سے نہ صرف دل چسپی پیدا ہوئی بلکہ مولوی فیض الحسن کے کہنے پر باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیے۔ جغرافیہ، سائنس اور حساب سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں تھی البتہ اردو، انگریزی اور تاریخ کے مطالعے سے انہیں لگاؤ تھا۔

☆.....☆

اردو کے بہت سے ادیب بچوں کے لیے لکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے حیثیت گر جاتی ہے۔ حالانکہ غالب اور اقبال عظیم شاعر تھے، لیکن انہوں نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور مولانا الطاف حسین حالی جیسے بلند پایہ ادیبوں نے بھی بچوں کے لیے کافی لکھا۔ جیل صاحب بھی اس اہمیت سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے فرائض منصبی اور ادبی مسائل سے وقت نکال کر بچوں کے لیے لکھا۔ حضرت

پڑھاں ہیں۔ وہ ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں، جبکہ میں یہاں انکم لائن کے کیس نمٹاتا ہوں۔ وہ بے چارہ خاموش ہو گیا اور بہت سے انہیں دیکھنے لگا۔

جیل آفس سے گھر آکر سو جاتے اور پھر جب اٹھتے تو رات ڈیڑھ بجے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے۔ صبح اٹھ کر روزانہ کی نئی کی دوڑ لگاتے۔ کہتے تھے کہ آدمی کو صحت کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ آدمی صحت مند ہوگا جب ہی کام آئے گا۔ خود کام کرتے اور دوسروں کو بھی کام کرنے کی تلقین کرتے۔ حضرت سلیمان کے دور میں ہوتے تو یقیناً ہیکل بابائی کی تعمیر انہی کے ذمے ہوتی۔

کراچی میں ان دنوں شورسا چار پتا تھا، نفسانسی کا عالم تھا۔ جیل خان نے یہ شور اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا۔ وہ اکثر لہا لہا کرتے تھے کہ زندگی کے لیے کابلی بہت ضروری ہے۔ سب جسم کال ہو جاتا ہے تو دماغ چل پڑتا ہے۔ سوچنے آتا ہے۔ ہاں ایک عظیم عمل ہے۔ وہ خوب محنت کرتے ہیں۔ دماغ اڑا لے کر کلم لے کر بیٹھا اور سارا مقالہ لکھ لیا۔ وہ ایب ہیز کی مرتبہ لکھنے کے عادی ہیں۔ اسے بار بار پڑھتے ہیں غور کرتے ہیں پول پول، غصاتے ہیں۔ اس وقت ماسٹرنس ہیں۔ سب تک ان کا مافی الضمیر یہ اعلان کر دے کہ اب اس میں مزید رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

وہ تحریر کے معاملے میں ایک خطاط شخص ہیں، سردیوں کی محراب میں چین سے بیٹھ کر سوچتے ہیں، موسم بہار میں پھولوں کی خوشبو ابھی بھی کے لفظوں میں ملاتے ہیں پھر وہ سوغات ایب عالم کو بانٹ دیتے ہیں تاکہ انسان زندہ رہے اور کائنات کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا رہے۔

پان بہت کھاتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں بھی صفائی قرائی کی طرف سے غافل نہیں رہتے۔ جب لالی ہونٹوں تک آ جاتی ہے تو تولیے سے ہونٹ صاف کر لیتے ہیں۔ جب دہنی کرب اور بے چینی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اسی شدت سے پان کھانے لگتے ہیں۔ جب دہنی طور پر بے سکون ہو جاتے ہیں تو پھر پان وقفہ وقفہ سے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔

ان کے ایک دوست کی بیوی نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ایک بار میرے گھر آئے تو میرے شوہر سے کسی بات پر الجھ گئے۔ ذہن میں کوئی پھانس تھی جو شاید چھ رہی تھی، لہذا پان پر پان کھانا شروع کر دیے۔ جب گئے تو سارا دنیا لال ہو رہا تھا۔ حالانکہ پاندان بھی رکھا تھا، مگر اسے استعمال کرنے کا ہوش نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ دہنی پھانس نکلی یا

سے پاک ہیں۔“

کافی پہلے کی بات ہے کہ میری ایک طویل غزل پڑھنے کے بعد جمیل نے مشورہ دیا کہ تم غزل لکھنے کے چکر میں نہ پڑو اور ڈراما لکھا کرو۔ میں نے کہا۔ ”یاریل میرا ڈرامے سے کیا تعلق؟ میں نے تو کوئی ڈراما آج تک پڑھا ہی نہیں۔“

”میری بات مان لو اور ڈراما لکھو۔“ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے مزاج میں ڈرامائیت بہت ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔“

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔ جمیل جب بھی ملتے تو کہتے کہ دیکھنا ایک دن تم ڈرامے میں نام پیدا کرو گے۔ ان کی بات اس طرح سے پوری ہوئی کہ میں نے پچیس برس تک ڈرامے کی روٹی کھائی۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جمیل نے یہ صلاحیت مجھ میں کیسے دریافت کر لی؟

☆.....☆

وہ محمد جمیل تھے مگر انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے جمیل جالبی کر دیا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اردو کے نامور صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل کے دادا دونوں ہم زلف اور رشتے کے بھائی تھے۔ جمیل نے جب ادبی زندگی میں قدم رکھا تو جالب دہلوی ان کا آئیڈل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ پیوند کاری کر لی۔ تاہم حسن عسکری انہیں جمیل جالبی کہتے تھے۔

جمیل انگریزی میں ماسٹرز کر چکے تھے۔ ملازمت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اردو میں ماسٹرز کیا اور پھر ایل ایل بی بھی کر لیا۔ اس کے بعد سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

☆.....☆

ایک بار انہیں خیال آیا کہ زندگی کم ہے اور انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وقت سے پہلے ملازمت چھوڑ دی اور ادب کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

جب ان کے قدم پاکستان میں جم گئے تو انہوں نے اپنے والد کو بھی پاکستان بلا لیا۔ ان کے والد کی وہاں بیس چلتی تھیں، چنانچہ انہوں نے یہاں بھی بیس چلوانے کا کام شروع کر دیا جس میں انہیں فائدہ ہوا، لہذا خاندان پہلے کی طرح سے خوش حال ہو گیا۔

☆.....☆

یکم نومبر 1953ء کو ان کی شادی انہی کے خاندان کی ایک صاحبزادی نسیم شاہین سے شادی ہوئی۔ ان کی ازدواجی

امیر خسرو، ہید کی کہانی، عجیب واقعہ اور نئی گلستان اسی زمانے میں لکھیں جو عصمت اور ہونہار وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ بڑی عمر کے بچوں کے لیے انہوں نے فسانہ آزاد کے کردار خوشی کی داستان ہونہار میں شائع کرائی۔ یہ کہانی وہ اور کامل القادری مل کر لکھا کرتے تھے۔ یہ قسط وار لکھی تھی، اس کی 78 اقساط شائع ہوئیں۔ روزنامہ حریت کراچی میں انہوں نے ایک مقالہ مئی 84ء میں لکھا۔ ”اچھا لکھنے والوں کو بھی بچوں کے لیے لکھنا چاہیے۔“

ان کی سب سے اہم کتاب ”پاکستانی کلچر“ ہے جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ سندھی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ ان کا اہم کارنامہ ”تاریخ اردو ادب“ ہے جس کی پانچ جلدیں شائع ہوں گی۔ (اب تک صرف تین جلدیں شائع ہوئی ہیں)

جمیل کہتے تھے کہ پاکستان کو وجود میں آنے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے، لیکن اہم اب تک ایک قوم نہیں بن سکے ہیں۔ ہمارا کوئی الگ قومی کلچر نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی کلچر کی تشکیل کے مسئلے پر انفرادی و اجتماعی طور پر غور کیا جائے۔ وہ خود بھی اس مسئلے پر غور کرتے رہے بالآخر پاکستانی کلچر شائع ہوئی۔ جس کا ذیلی عنوان ”قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ“ ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جس میں خلوص کے ساتھ اہم بنیادی قومی مسئلے پر غور کیا گیا ہے۔ یہ موضوع نہایت پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے اس کے باوجود اس کتاب کا اسلوب گفتگو اور صاف ہے کہ بہت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

سلیم احمد، جمیل صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”انہوں نے کلچر پر پاکستانی کلچر کے نام سے ایک باقاعدہ کتاب لکھنے کے علاوہ کلچر کے مختلف مظاہر کے حوالے سے علیحدہ علیحدہ مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کی کتاب ”کلچر اور مسائل“ میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں وہ پاکستانی کلچر کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے کلچر اور مذہب کے تعلق پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہمیں بے فکری اور بے راہ روی ترک کر کے اپنے بنیادی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔ جمیل صاحب کی عملی تنقیدی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بھی کسی کم درجے کے ادیب پر کیں لکھا اور نہ ہمارے ہاں عام طور پر تنقید میں یہ درواج چل نکلی ہے کہ نقاد حضرات فرامشی مضامین لکھتے ہیں اور ان میں فرامشی آرا کا بھی اہتمام کرتے ہیں لیکن جمیل اس علت

..... تھے کہ طلبہ نے گیت پڑتے ڈال دیے اور بندوقیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ یہ صورت حال بارہ گھنٹے جاری رہی۔ مگر جمیل خان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ وہ مذاکرات اور نصیحتیں کرتے رہے، بالآخر جو طلبہ بدتمیزی کی ساری حدیں پھلانگ چکے تھے۔ انہیں روئے اور معافی مانگتے دیکھا گیا۔ اسی اثنا میں کراچی کی انتظامیہ نے کمانڈر میجر کی پیش کش کی، لیکن جمیل صاحب نے سختی سے منع کر دیا۔

ساڑھے تین بجے تو طلبہ نے انتظامی عملے سے کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ عملے نے انکار کر دیا۔ عجیب سی چوٹیں مچی۔ ایک طرف طلبہ، دوسری طرف آفس اسٹاف اور درمیان میں جمیل صاحب۔ ایک عبرت انگیز واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ڈاکٹر منظور احمد کھانا لے کر گیت پر پہنچے تو لڑکوں نے بندوقیں تان لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سینہ تان کر کہا۔ ”لو بیٹا، اپنے استاد کے سینے کو گولیوں سے پھینکی کر دو۔ یقیناً تم نے جو تربیت تمہیں دی ہے، اس میں کوئی کمی رہی ہے۔“

لڑکوں نے شرمندہ ہو کر بندوقیں نیچے کر لیں اور گیت کھول دیا۔ ڈاکٹر صاحب کھانا لے کر اسٹاف روم میں پہنچ گئے تو سب نے کھانا کھایا۔ اس سارے منظر میں جمیل جالبی کا استقلال، بردباری اور کھٹکتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بیشتر لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ انہیں ایسی صورت حال سے نمٹنے کا بخوبی تجربہ ہے۔ وہ کچھ اور ہی نائب کے انسان ہیں۔

جمیل صاحب نے پہلے اور بھی چالاک کر دے، صورت حال کچھ یوں ہوئی تھی کہ یونیورسٹی مالیاتی بحران کا شکار ہو جاتی تھی۔ نئے مکانات تو بن نہیں پاتے تھے، پرانوں پر سفیدی کرانے کے لیے فنڈ نہیں ہوتا تھا۔ نئے اپارٹمنٹس بند ہو جاتے، عملے کی ترقیاں بند ہو جاتیں۔ جب انہوں نے چارج سنبھال لیا تو نیشنل بینک کا لاکھوں کا ادور ڈرافٹ اور سندھ حکومت کا قرضہ چڑھا ہوا تھا ترسے اتنے تھے جب کہ اخراجات ہیں کہ سر پہ چڑھے رہے ہیں۔

جمیل صاحب معلوم نہیں کہاں سے الدین کا چراغ لے کر آ گئے تھے کہ بینک اور حکومت سندھ کا قرضہ ادا ہو گیا۔ نئے مکانات بننا شروع ہو گئے، لاکھوں روپے کی کتابیں آ گئیں اور لیبارٹری کا قیمتی سامان بھی آ گیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی نے ایک کروڑ روپے کے محفوظ ذخائر بھی قائم کر لیے۔ کمپس کی حالت تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ نئی سڑکیں بننے لگیں، بجلی کے سب اسٹیشن قائم ہو گئے، نیا ٹیلی فون اسٹیشن لگ گیا۔ شجرکاری ہونے لگی اور چند ماہ میں یونیورسٹی باغ و بہار ہو گئی۔ جس طرف

دیکھو سبزہ وہ گل کھلے ہوئے۔ اساتذہ خوش اور لڑکے بھی خوش۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں۔

جمیل صاحب نے بھی فنڈز کی کمی کا رونا نہیں روایا۔ عجب دریا دل قسم کے انسان تھے۔ انہی دنوں برٹش کونسل نے اپنی برائی کتابوں کی فروخت کا اعلان کیا اور کنفیشن کے نزدیک نمائش رکھی۔ جمیل خان کی ہدایت پر سارے شعبوں کے صدور وہاں پہنچ گئے۔ جمیل صاحب کی ہدایت پر سب نے اپنی اپنی پسند کی وہ کتابیں خرید لیں جو یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود نہیں تھیں۔ ایک ہی دن میں پانچ لاکھ روپے کی کتابیں خرید لی گئیں۔

وہ قومی معاملات اور یونیورسٹی کی توسیع کے لیے ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ مگر ہر ایک چیز میں باریک بینی بھی کرتے تھے۔ ایک بار کسی پروفیسر نے لکھا کہ رجسٹرار کے کمرے کی گھڑی پرانی ہو گئی ہے، چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ نئی گھڑی کی منظوری دے دی جائے۔ کچھ نہ ہوا۔ پروفیسر صاحب نے سوچا ممکن ہے بھول گئے ہوں یا درخواست پڑھی ہی نہ ہو چنانچہ یاد دہانی کرانے کے لیے ان کے آفس میں چلے گئے۔ نئی گھڑی کے لیے مطالبہ سن کر جالبی صاحب نے اپنا چشمہ اتارا اور بولے۔ ”اگر اسی گھڑی کی مرمت کرائی جائے تو میرا خیال ہے کہ کام بن سکتا ہے۔ آدی کو یہ سوچنا

چاہیے کہ ایک روز اللہ کے ہاں بھی حساب دینا ہے۔ ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھے ہیں کہ قومی دولت کو اس طرح سے ضائع کریں۔ وہ پروفیسر چلے گئے، لیکن یہ سوچتے رہے کہ اگر قومی سوچ بھی اسی طرح ہو جائے تو قومی دھارا تبدیل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی یونیورسٹی کے پیڑ پر ذاتی خط نہیں لکھا۔ یونیورسٹی کی اشیائے استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے ذاتی خطوط گھر کے پتے سے پوسٹ کیے جاتے تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے آفس سے اٹھتے تھے تو میز کا بلب بجھا دیتے اور آفس کی بتیاں بھی آف کر دیتے کہ بلاوجہ جلتی نہ رہیں اور بجلی نہ خرچ ہو۔ یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں اور عام طور پر انہیں نظر انداز ہی کر دیا جاتا ہے، لیکن آدی انہی سے پچھانا بھی جاتا ہے۔ یہی چیزیں شخصیت کو بڑا بناتی ہیں۔

وہ مالی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے دور میں مالی بحران کبھی نہیں آیا۔ حالات سکون، رسائی اور ہمواری سے چلتے رہے۔ مالیات کے ہر کاغذ کو نہایت باریک بینی سے دیکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ بغیر دیکھے دستخط کر دیے اور بعد میں کمیشن جب میں رکھ لیا۔

فانکوں کو غور سے دیکھتے اور ان پر نوٹ لکھتے۔ درستی نہیں

ری ہے۔ ایک بار یونیورسٹی کے میڈیکل افسر ریٹائر ہو گئے، اب انہیں مکان خالی کرنا تھا۔ انہوں نے درخواست لکھی اور آٹھوں میں آٹھ سوچے ان کے آفس میں چلے گئے۔ اپنی بھاری بارے میں بتایا۔ جمیل صاحب نے زیادہ استفسار نہیں کیا اور درخواست پر تین ماہ کی توسیع لکھ کر دستخط کر دیے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ ایک پروفیسر صاحب ریٹائر ہو کر غیر ملک چلے گئے اور وہاں ملازمت کرنے لگے۔ ان کے اہل خانہ کو مکان خالی کر دینا چاہیے تھا۔ مگر ان کی اہلیہ نے الٹا جمیل صاحب کے خلاف چالش کر اور وزیر تعلیم کو ہلکا لکھا کہ وکس چائلڈ میں پریشان کر رہے ہیں اور مکان خالی کرانا چاہتے ہیں، ہمیں بے گھر کر رہے ہیں۔ اب آپ ہی اس معاملے میں کچھ کیجیے۔

سرکاری ضابطے کے مطابق دونوں خط یونیورسٹی بھیج دیے گئے۔ مگر جمیل جالبی نے کچھ کہا نہیں۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ وہی صاحبہ درخواست لے کر ان کے پاس آئیں کہ توسیع دے دی جائے۔ جمیل صاحب نے اس درخواست پر تین ماہ کی توسیع دے دی۔

ان کے جانے کے بعد ایک پروفیسر جنہوں نے وہ خط پڑھ کر ملے تھے کہنے لگے کہ آپ نے ان صاحبہ کو اتنی رعایت دی؟ انہوں نے تو آپ کے خلاف محاذ بنالیا تھا؟ جمیل صاحب بولے۔ ”ان کا فعل اپنی جگہ ہماری نیکی اپنی جگہ۔ آپ کو معلوم نہیں ان کی بیٹی کا امتحان ہونے والا ہے۔ اگر اس موقع پر میں مکان واپس لے لیتا تو اس کی بہ حالتی پر برا اثر پڑتا۔“

یہ یونیورسٹی کے وکس چائلڈ کی آواز نہیں ایک ماہر تعلیم کی آواز تھی۔ ایسے لوگ شاذ ہی دنیا میں ملیں گے جو اپنے دشمنوں سے اتنا بہتر سلوک کرتے ہوں۔

جمیل صاحب نے یونیورسٹی سے بارہ علمی جریدے شائع کیے۔ بہت سی کتابیں مرتب کرا کے شائع کیں اور تدریس و تحقیق کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا اس کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اساتذہ سے ان کی تحقیق پر گفتگو ہوتی تھی اور رائے مشورے ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں مالی اعانت کی کوئی فکر نہیں کرتے تھے۔ سب کام سہولت سے ہوتا جاتا تھا۔ طلبہ کے لیے کمپنوں کے ہفتے کا اہتمام کرتے تھے اور خود ان کے ساتھ ہاکی بھی کھیلتے تھے۔ ان کے مسائل پر ان سے گفتگو بھی کرتے تھے۔

طلبہ کا انکیشن ہمیشہ سے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کی

وائس چانسلری سے پہلے جو انکیشن ہوا تھا اس میں ایک طالب علم مر گیا تھا۔ انہیں یہ بات معلوم تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کے لیے ایک لائٹ محل ترتیب دیا۔ ہر کام بڑے سلیقے اور سکون سے ہوا۔ نہ کوئی بد معاشی، نہ کوئی جھگڑا نہ سر پھٹوں۔ اساتذہ بھی خوش کہ انہوں نے بغیر کسی دباؤ کے کام کیا۔ شہر والے بھی حیرت زدہ تھے اور والدین کو بھی اعتبار نہیں آتا تھا کہ یونیورسٹی میں اتنے امن سے انکیشن کیسے ہو گیا؟

جب وہ چار سال کے بعد یونیورسٹی سے رخصت ہو رہے تھے تو ہر ایک شخص ملول و مضطرب تھا۔ بہت سی آنکھیں نمناک تھیں۔ ان کا کراہنا اساتذہ سے کچھ بھیج کر ہوا تھا۔ جب آئے تھے تو سب حیرت زدہ اور پریشان تھے کہ کیسے کیا ہوگا؟ اب چارہ ہے تھے تو لوگوں کے دلوں میں دوسرے چھوڑے جارہے تھے کہ معلوم نہیں آئندہ وکس چائلڈ کیسے ہوں گے؟ یہ ان کی بے غرضی اور بے لوث خدمت اور علم سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ وہ اردو کے ممتاز مؤرخ ہیں مگر اب خود تاریخ بن چکے ہیں۔

☆.....☆

1987ء میں انہیں ایک اہم سرکاری ادارے مقتدرہ قومی زبان کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں۔ ”وہ اسلام آباد میں ہر محفل میں شریک ہوتے، کبھی کبھی صدارت پر، کبھی مہمان خصوصی اور کبھی سامع کی حیثیت سے۔ ان کی شمولیت کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ ہیں یا نہیں۔ کبھی صدارت پر کبھی صدر بن کر نہیں بیٹھتے۔ لگتا ہے جیسے سامع ہوں۔“

اولی میدان میں مورین کر نہیں آتے، لگتا ہے جیسے کیڑے ہوں۔ ایسا کیڑہ جو غوغا غوغا نہیں کرتا۔ چھاتی چھلا کر نہیں چلتا۔ وہ محفلوں میں مقالہ بھی پڑھتے تو مدغم آواز میں اور غلط و متوازن الفاظ میں بات کر کے جھکی جھکی گردن سے اپنی نشست پر واپس آ جاتے۔ ایسے کہ پتا ہی نہیں چلتا ہے کچھ کہہ گئے ہیں۔

☆.....☆

انہوں نے ”مثنوی کدم راؤ پدم راؤ“ پر کام کیا۔ اس مثنوی کو پڑھنے کی چالیس سال سے کوشش ہو رہی تھی۔ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح سے یہ مثنوی شائع ہو۔ اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف ہے اور یہ بابر بادشاہ کے ہندوستان پر حملے سے تقریباً ایک سو پچیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جمیل نے جس طرح اس کام کو کیا ہے، یہ انہی کا حوصلہ ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کا نام فخر الدین تھا اور تخلص نظامی تھا۔ وہ دکن کے بہمنی فرماں روا احمد شاہ ولی (جس کا دور حکومت 1421ء سے لے کر 1435ء تک تھا) کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ گویا یہ مثنوی چھ سو برس پہلے کی ہے۔ اس مثنوی کی کہانی بھرا نگر کے راجا کدم راؤ اور اس کے وزیر پدم راؤ کے گرد گھومتی ہے۔ کدم راؤ انسان ہے اور پدم راؤ ناگ۔ اس مثنوی میں وہ سب کچھ ہے جو دیومالا کی قصوں میں ہوتا ہے۔ کہانی کے اعتبار سے یہ مثنوی کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی لیکن لسانی نقطہ نظر سے یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھ سو برس پیشتر ہماری زبان کی حالت کیا تھی اور اس پر کون کون سے لسانی اثرات غالب تھے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ کن کن زبانوں سے خوشہ چینی کا نتیجہ ہے۔ جمیل جالبی کہتے ہیں۔ ”اس مثنوی میں بیک وقت پنجابی، براہستانی، برہمی، گجری، مراٹھی اور مرہٹی زبان کے اثرات ہیں۔“

مثنوی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق شائع ہوئی ہے۔ ایک صفحے پر منظر طے کا عکس چھاپا گیا ہے اور سامنے کے صفحے پر اسی متن کو جدید رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح سے قاری بے اندازہ لگا لیتا ہے کہ اسے شائع کرنے میں کتنی محنت صرف ہوئی ہے۔

☆.....☆

مورخ، معلم، نقاد، محقق، لغت نگار اور کچھ شناس کے علاوہ وہ ایک اچھے مترجم بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جمیل جالبی نے ترجمے کی اہمیت کے دونوں پہلوؤں کے حوالے سے مغربی تنقید کے اردو ترجمہ کا بہت وقیع اور اہم ترین کام کیا ہے۔ انہوں نے مغرب کے شاہکار تنقیدی کارنامے ”ارسطو سے ایلینٹ تک“ کے نام سے اردو میں پیش کیے ہیں۔ ٹی ایس ایلینٹ کے چودہ عہد آفریں مضامین کا ترجمہ کیا ہے اور انہیں ایلینٹ کے بارے میں اپنے چار مضامین اور مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مقدمے میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ انہوں نے ترجمے کے لیے ایلینٹ کے تنقیدی مضامین کیوں منتخب کیے۔ وہ کہتے ہیں۔ ”حسن عسکری میرے ذہن سے کنکھو رے کی طرح چنے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا ان سے بچھا چھڑانا چاہیے۔ میں نے مغربی ادب کو ہاتھ میں لیا تو ٹی ایس ایلینٹ بھا گیا۔ گویا حسن عسکری کا کنکھو راہٹ گیا اور ایلینٹ کا سوار ہو گیا۔ ایلینٹ کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔ اس کا انداز بیاں اور زاویہ نظر مجھے بھاتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اور

گہرائی اور بات سے بات ٹکانے کا ڈھنگ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں نے اس کے تنقیدی مضامین سے انتخاب کر لیا۔ چونکہ صرف اپنے طور پر عہد آفریں ہیں بلکہ ان میں ادب و تہذیب کے مسائل کو عالمگیر ذہنی تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ ان ترجموں سے میں نے اپنے ذہن کی تعمیر کا کام لیا ہے۔ یہ ترجمے دراصل میرے لیے ریاض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے میں نے ایلینٹ کی فکر اور اس کے طرزِ ادا کو اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کی ہے۔“

☆.....☆

انہوں نے اپنی بے پناہ ادبی اور تنقیدی خدمات کے عوض چار بار دادِ ادبی انعام حاصل کیا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں۔ ”پاکستانی کچر“ ایلینٹ کے مضامین۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ تنقید اور تجربہ۔ ارسطو سے ایلینٹ تک۔ دیوان حسن شونی۔ دیوان نصرتی۔ میر تقی میر۔ جانورستان (ترجمہ)۔ حیرت ناک کہانیاں۔ ادب کچر اور مسائل۔ کلیات میراجی۔ اسلامی جدیدیت۔ تاریخ اردو ادب (تین جلدوں شائع ہوئی ہیں) قومی انگریزی لغت۔ قدیم اردو کی لغات۔

وہ کئی تنظیموں کے صدر اور رکن بھی بنے، جن میں انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر اشتیاق حسین اکیڈمی، اردو و کشمیری بورڈ، نیشنل لائبریری آف پاکستان، اکادمی ادبیات پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے کئی بیرونی ممالک کی ادبی کانفرنسوں اور مذاکرات میں خصوصی کچر دیے۔

اس کے علاوہ ان کے دوسرے زائد مقالات معیاری ادبی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ”ستارہ امتیاز“ اور ”ستارہ ہلال“ کے اعزازات سے نوازا۔ انہوں نے تنقید پر انتہائی سنجیدگی سے گردہ بندی سے لاتعلقی ہو کر کام کیا ہے۔ اسی لیے ان کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔

اس وقت سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں، چنانچہ ان کے لیے ہر خاص و عام کو دعا کا طالب ہونا چاہیے۔

جن کتابوں سے مدد ملی

پاکستان کی 100 نامور شخصیات۔

سیارہ ڈائجسٹ 1998ء..... ڈاکٹر جمیل جالبی۔

ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر گوہر نوشاھی..... یہ صورت

گر کچھ خوابوں کے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود.....

پاکستانیکا۔ سید قاسم محمود



شاعر انقلاب

سلمیٰ اعوان

نخل امید کے سب پات جھڑ رہے تھے لیکن وہ ناامید نہ تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے دل میں جوت جگانے کے لیے حروف کو چنگاری بنا رہا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ ایک دن اس کے خواب تعبیر پا لیں گے۔ ہم وطنوں میں دم بہ دم پھیلتی مایوسی ختم ہو کر رہے گی۔

اس شاعر کا تذکرہ جس کے اشعار سے کئی ممالک کے سربراہ نالاں تھے

تھی۔ جب میں نے باہر سے کتابوں کے بٹل اندر آتے دیکھے۔

یہ عجیب محفوظ کی ”ثرثرہ فوق ائیل“ اور ”قالت لی السراء“ نزار قبانی کی تھیں۔ اول الذکر نوبل انعام یافتہ نثر

نزار قبانی سے میری پہلی شاعمانی قاہرہ کی رعیمیں اسٹریٹ کی ایک بگ شاپ پر ہوئی۔ باہر ہواؤں میں بہت جھڑی اور خشکی تھی۔ قاہرہ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اندر میں کتابوں کو دیکھنے اور اُن کی پھولا پھرولی میں مگن

بوڑھے شامی کے پاس رک کر کتابوں کو دیکھنے لگی کہ تاگہاں بھاگ دوڑ، سیٹیوں کی آوازیں، شور و غل نے حیرت زدہ کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سامنے قدیم مگر شکستہ عمارتوں کی چھتوں پر لکڑی یا چورس پائی کا کھیل جاری تھا۔ فائرنگ کا بڑا کھلاؤلا جادو ہو رہا تھا۔ لوگ دائیں بائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ پہلے میں نے وہیں بیٹھے رہنے سے چھٹا چاہا۔ مگر وہاں پولیس کے کچھ لوگ آگئے تھے۔ ماحول میں عجیب سی دہشت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ جہاں بیٹھی ہوں وہ جگہ تو سیدھی نشانے پر ہے۔

میں اٹھ کر بھاگی۔ مگر فوراً ہی پلٹ آئی کہ لوگ گیارے کے اندر پناہ گزین ہو رہے تھے۔ میں بھی ڈری سہی سی ان کے ساتھ وہیں محسوس گئی۔ اور بیٹیں اُس بے حد پیار سے لڑکے سے ملاقات ہوئی جس کا نام احمد فاضل تھا۔ جو انگریزی بہت اچھی بول سکتا تھا۔ بینک میں ملازمت کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔ اس واقعے کے بائیں بنایا کہ چوری ڈکیتی کا کوئی کیس ہوگا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔

آج لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔ تب یہ کہاں معلوم تھا کہ یہاں چند ہی سالوں بعد قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔ یہ خوبصورت تہذیب و تمدن کا گہوارہ پُر اس سال ملک بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، اُن کے پروردہ غنڈوں پہلے القاعدہ بعد ازاں داعش کے ہاتھوں پور پور زخمی ہونے والا ہے۔

اس وقت اس چھوٹے سے واقعے نے ماحول کو ہراساں اور خوف زدہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی جیسے قلم کے کسی سین کی طرح سب کچھ غائب ہو گیا۔ لوگ باگ اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔ تاہم میرا احمد فاضل سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے باتوں کا سلسلہ پھیلتے پھیلتے نزار قبانی تک چلا گیا۔ میری اُس سے محبت اور لگن دیکھ کر اس نے پیش کش کی وہ مجھے اپنے دوست جس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہے ملانے لے جاسکتا ہے اس کا گھر یہیں پرانے دمشق میں ہی ہے۔

جی چاہتا تھا لڑکے کی بلا میں لوں۔ تو بھی یہ تو موسیقی ہو گئیں۔

”میرے بچے میں تو تمہاری حد درجہ شکر گزار ہوں گی۔“

کی کتاب اور موخر الذکر شاعری کا مجموعہ تھی۔

کتاب ہاتھوں میں تو مالک جس نے مجھے پاکستانی جان کر خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا تھا، نے اس پر نظر پڑتے ہی لطف و محبت و سرشاری سے کہا۔ ”نزار قبانی کا مجموعہ کلام۔ کیا شاعر تھا۔ عرب دنیا کا عظیم انقلابی شاعر۔“

میں نے انگریزی ترجمے کا پوچھا۔ مالک نے ملازموں سے کہا۔ مگر اُن کی جانچ پڑتال کے بعد پتا چلا کہ ختم ہو گیا ہے۔

بہر حال میری لگن اور کوشش کچھ کام نہ آئی۔ کتاب مجھے اسکندریہ سے بھی نہ ملی۔ تاہم نیٹ سے ”The Brunette told me“ مل گئی۔ شام کے اس شاعر سے میرا پہلا تعارف روایات سے باقی اور رومانوی شاعر کے طور پر ہوا۔

اب کوئی تین سال بعد جب میں شام کی سیاحت کے لیے آئی ہوں۔ پہلے ہی دن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا گیت لگا کر اور مجھے بتا کر میری بھولی بھری یادوں کو تازہ کرنے کا سامان کر دیا۔ واہ کیا حسین اتفاق ہے۔ گیت سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔

میری خاتون

میں دوسرے چاہنے والوں کے ساتھ

اپنا مقابلہ نہیں کرتا مگر

اگر دوسرا تمہیں بادل دیتا ہے

تو میں تمہیں بارش دوں گا

اگر وہ تمہیں لالین دیتا ہے

میں تمہیں چاند دوں گا

اگر وہ تمہیں شاخیں دیتا ہے

تو میں تمہیں درخت دوں گا

اگر وہ تمہیں بحری جہاز دیتا ہے

تو میں تمہیں سفروں پر لے جاؤں گا

شام کو زینبیہ واپس جاتے اور آج صبح پرانے دمشق آتے ہوئے شاعر سے مزید تعارف ہوئی۔

اس عظیم شاعر سے تفصیلی تعارف دمشق میں اس لڑکے کے توسط سے ہوا جو احمد فاضل تھا اور مجھے میرے شہر لاہور کے دہلی دروازے جیسی مشابہت رکھنے والے

Damascus Citadial کے گیارے میں ملا تھا۔ محبت اور غلوں سے بھرا ہوا لڑکا۔ میں اس دیوہیکل سے

گیارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کتائیں نکمیرے کھڑے

کھولتے ہی احمد فاضل کو نشست گاہ کا راستہ دکھایا تھا۔

نشست گاہ یا گھر کا ڈرائنگ روم عربی کچر میں دیوان مستطیل سی صورت کا تھا۔ گھر کے اندر دیوڑھی اور باہر کھلتے والے دروازوں اور کھڑکیوں کی پیشانیوں پر بحرانی صورت بنی پٹی آرٹ کی مینا کاری سے بھی کمرے کو انفرادیت دیتی تھی۔ چھت اونچی اور دو دیواروں میں بلندی کی سطح پر لمبوتری سی چار کھڑکیاں روشن دانوں کی طرز پر شیشوں سے روشنی آنے کا باعث تھیں۔ صوفے کا ایک سیٹ جدید وضع اور دوسرا قدیمی صورت لیے ہوئے تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں اور دونوں کے پٹ چوبی کندہ کاری سے مزین تھے۔

اجبی میں کمرے کے جائزے میں معروف ہی تھی کہ جب کبرت اندر داخل ہوا۔ ذکر یا محمد کبرت اونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا۔ محبت سے ملا۔ میں نے اُس کی چھاتی پر بوسہ دیا۔

میرے عین سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے اُس نے میرا حال احوال پوچھا۔ پاکستان کے بننے میں مختصر بات ہوئی۔ پھر گفتگو کا رخ اپنے موضوع پر آگیا۔ اُس کے ایک سوال پر میں نے بے اختیار ہی کہا۔ ”کبرت، تجی بات ہے میں بڑی جذباتی سی کیفیت میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ ڈیڑھ دن نے ہی مجھے بتا دیا ہے کہ شاعر دمشق کی ہر ٹیکسی، گاڑی میں گھسا بیٹھا ہے۔ ہر دل میں دھڑک رہا ہے۔ ہر لب پر ہچک رہا ہے۔ ہم جیسے سیاح جنہیں عربی کی پوری سمجھ نہیں پونجھنے پر جاتے ہیں اور جب جذبات میں مانوسیت کے رنگ کھلتے ہیں تو مرہ آتا ہے۔“

ذکر یا محمد کبرت کھٹکھٹا کر ہنسا اور بولا۔ ”آپ تو داستان گوئی میں بڑی ماہر لگتی ہیں۔“

میں ہنسی اور بولی۔ ”کھٹنے والی ہوں نا کبرت۔“

یہ بیسویں صدی کی عرب دنیا میں ایک بھی ایسا نایاب ہیرا نہیں جس نے عربی شاعری کو اتنی جدت اور توانائی دی۔ عورت کی محبت، اُس کے حسن، اس کے جسم کو موضوع سخن بنانے کی شاعرانہ روایت تو خیر صدیوں پرانی ہے۔ مگر اسے اس کی ذات کے اور اک سے آگاہی دینا شاعر کا عزم تھا۔ جو طبعی آگ کی مانند ہر گز اُس کی شاعری نے مسلسل ملکی، عرب دنیا اور اقوام عالم کے طاقتور لیڈروں کو متحدہ مشق بنایا۔ اس مقبول شاعر کی پیدائش پرانے دمشق میں ہوئی۔ سال 1923ء تھا اور اس کا پورا نام نزار توفیق قبانی تھا۔

اُس نے اسی وقت فون ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فوراً رابطہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر دونوں میں بات ہوتی رہی۔ پھر موبائل بند کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”ذکر یا محمد کبرت اس وقت دمشق یونیورسٹی میں ہے۔ وہاں وہ پڑھاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گھر پہنچے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ وقت ان کے اہل خانہ کے ساتھ گزار سکتی ہیں۔“

”ہائے کیا بھاگو ان دن ہے۔ کیسی خوبصورت پیشکش سے ابتدا ہوئی ہے۔ خدا بہت مہربان ہے اور یہ عنایت اس کا خاص الخاص تحفہ ہے کہ کسی مقامی کے گھر جانا اور وہاں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دیکھنا بھی تو کھٹے کھانے کے لیے اہم ہے۔“

قدموں میں تیزی، دل میں خوشی کا جل ترنگ اور نگاہوں میں دائیں بائیں کے ماحول کو دیکھنے اور جذب کرنے کی آتش شوق کا آلاؤ۔ چھتی دھوپ بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

تاہم جب میں راستے کے پھر منظروں پر اپنی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کا حال بند بچرے میں قید کسی نئے نئے فیلے پرندے کے پھڑ پھڑانے جیسا ہی تھا۔ روشن کالموں اور لمبے مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے بس ایک طائرانہ سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا کیا روح فرسا سا تھا۔ دل پاگل تو دہن بیٹھنے اور ڈیرے ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ بیانی آنکھیں بھی ان کمال کے منظروں سے سیر ہونے کے لیے جناب تھیں۔ میں نے دونوں کی دلداری کی۔

احمد فاضل دو بار غلط گلیوں میں گھس گیا۔ اس کے سرعت سے پلٹنے اور میرے سستی سے قدم اٹھانے میں میری نظر بندی ہی کے چکر تھے۔ طارق بن زیاد اسٹریٹ پر کہیں آگے جا کر گھر تھا۔

گھر کچھ اُس محاورے کا عکاس تھا کہ صورت کے نہیں سیرت کے ہم غلام ہیں۔ مرکزی دروازے کا گیٹ چوبی تھا۔ ڈیزائن سے گھٹا ہوا۔ دو منزلہ گھر کی بالکونیاں چوبی تھیں۔ عام سی جسامت والے ستون بھی غالباً چوبی ہی تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح بالکونیوں کے چھجے بڑے خوبصورت اور ڈیزائن دار تھے۔ تیل کی آواز پر دروازے کی گھونکی کھڑکی کھلی جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑا۔ اہنا گھر میں اطلاع بھی بھی تو ایک نو عمر لڑکے نے دروازہ

خاندان کا تعلق ترکی کے مشہور شہر قونیہ سے اور خاندانی نام اک بیک (Ak Biyik) تھا۔ ترکی زبان میں اس کا مطلب ”کس کی مونچھ“ ہے۔

دو بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانہ روایات کا اسیر ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی تھا۔ قبائی شای تھا جبکہ ماں ترکی نژاد۔ چاکلیٹ فیکٹری کا مالک باپ توفیق قبائی شام پر فرات میں تسلط کے خلاف لڑنے والوں کو نہ صرف اخلاقی بلکہ مالی مدد بھی کرتا تھا۔ یوں حکام کی نظروں میں رہتا تھا۔ کئی بار جیل بھی بھیجا گیا۔

آپائی گھر Milthnah Alshahm میں تھا۔ برانے دمشق کے ہمسائے میں۔ تعلیم بھی دمشق میں ہی ہوئی۔ قانون کی تعلیم بھی دمشق یونیورسٹی سے حاصل کی جو کہ پہلے سیریا یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی۔

روایت سے بغاوت کا عنصر اس کے خیر میں بچپن سے ہی تھا۔ اس کا واضح عملی اظہار چندہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس سے دس سال بڑی بہن وصال نے خود کشی کر لی تھی۔ وہ جس سے محبت کرتی تھی اس سے شادی کی اجازت نہیں ملی تھی اس دن اس سے چھوٹی بہن حیدہ کے گالوں پر زار زار بچتے آنسوؤں کو اس نے اپنی پوروں سے صاف کیا اور بولا تھا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں حیدہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“

اولڈ دمشق کی گلیوں میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا۔ ”میں ان رسوم کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔ میں شاعر بنوں گا۔ عرب دنیا میں محبت کرنا جرم ہے۔ عرب روح ایک بڑے سے قید خانے میں بند ہے، میں اسے آزاد کروں گا۔“ اور اس نے واقعی جو کہا تھا چکر دکھایا تھا۔

جب وہ ابھی کالج اسٹوڈنٹ تھا اس نے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور پہلا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔ قاتل بی اسمرام (براون ہالوں والی گوری عورت نے مجھ سے کہا) یہ ردمان اور جنس سے بھری شاعری تھی۔ ایسی شاعری جس نے عورت کو اس تنگ نظر معاشرے کی ٹھن زدہ حالت کا احساس دلانے اور اسے اپنے لیے آواز اٹھانے کے حق سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ شام جیسے پرانے قدامت پسند ملک میں ڈر لے کی ہی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یہ شاعری سوچ میں بنیادی تبدیلیوں کی عکاس تھی۔ یہاں عورت مرکزی تھیم کے طور پر نمایاں ہوئی

تھی۔ اس مجموعے نے بہت سارے مسائل پر قلم اٹھایا تھا۔ مرد عورت کے تعلقات پر ہر زاویہ اور ہر رخ سے روشنی پڑی۔ انسانی اور سماجی رویے، مذہب کی اندھی تقلید اور انسانی سوچ کی آزادی، بے باکی، معاشرے میں مرد اور عورت کا صحت مند تعلق اس کے بڑے موضوع تھے۔ اس مجموعے کی ملک میں شدید مخالفت ہوئی۔ یہ قلم پڑھنے اور تب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگائے۔

تہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں تھی یہی تمہارے طور طریقوں کے لیے وضاحت تھی کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے جو ایسا کہتے ہیں وہ دغا باز ہیں جو سوچتے ہیں

کہ انہوں نے عورت تخلیق کی اپنی پسلیوں میں ایک سے عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی کبھی نہیں

یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے اس چھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے

یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں خود کو دہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے ایک اور جگہ دیکھتے۔ اس کی سوچ کی گہرائی اور تجربے کا کیسا دلا آویز اظہار، عورت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کاوش اور عام فہم زبان اور قاری کو اپنے ساتھ لپٹا لینے کا فن۔

بہت گہری محبت مت کر جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ دوسرا بھی تمہیں اسی گہرائی سے پیار کرتا ہے آج تمہاری محبت کی گہرائی کل تمہارے دھم کا باعث بنے گی اس کی محبت کے جذبات سے لبریز نظموں نے اب سماں باندھ دیا تھا۔

میرا محبوب مجھ سے پوچھتا ہے کہ میرے اور آسمان کے درمیان کیا فرق ہے میرے محبوب فرق تو صرف یہی ہے

جب تم ہنستے ہو میں آسمان کو بھول جاتا ہوں
ارا سے سینے۔

چاند کو دیکھنا مجھے بہت پسند ہے
خاص طور پر جب

جب یہ ہلال کی صورت ہو

کیونکہ میں ہر اس چیز سے پیار کرتا ہوں
جس کا کوئی مستقبل ہو

قبائی نے عورت کے متعلق جس انداز میں سوچا اور
لکھا۔ ایسا پہلے بہت کم لکھا گیا۔ اس کی باغی سوچ نے عورت
کو نئے راستوں اور نئی سوچوں سے آگاہ کیا۔ ریت
اور رواج میں لپٹی عورت کو اس نے اہمیت دی اور اُسے اس
کے ہونے کا بھرپور احساس دلایا۔

اسے میری محبت، اسے میرے پیار

اگر تم میرے پاگل پن کے لیول پر آ جاتیں

تم اپنے زلیخات پھینک دیتیں

اپنے برسلٹ بیچ دیتیں

اور میری آنکھوں میں سو جاتیں

ایک اور جگہ دیکھئے۔

کبھی ایک ایسی عورت سے نا پڑ نہ توڑو

جو تمہاری بہت سی خامیوں کو جانتی ہے

اور پھر بھی تم سے پیار کرتی ہے

یہاں دیکھئے اس کا ایک اور منفرد انداز

وہ سب کتابیں لے لو

جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھیں

میری نوٹ بکس بھی لے لو

لے لو میرے سارے چاک

اور سارے قلم بھی لے لو

اور تختہ سیاہ بھی

بس مجھے ایک نیا لفظ سکھا دو

جو کان کی بالی کی مانند جھوٹے

میری محبوبہ کے کانوں میں

اُس وقت ملک چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا۔ تاہم
اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں نے اسے بہت
سرایا۔ ان سرانے والوں میں ایک بڑا نام اُس وقت کے
وزیر تعلیم کا تھا جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ملک کا ایک بڑا
قوی لیڈر بھی تھا۔

چونکہ تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ دمشق کا سوداگر

یکتارا

آسمان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر
ڈالا..... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز

نشام شب

ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ

کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا وافر یب احاطہ

باغی

ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ.....

سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان

وقت

دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان

کی آہٹ..... **حسام بٹ** کے خیالات کی رودانی

اکتوبر 2017 کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیاں کا مجموعہ

سرسبز شاخیں



مزید

مخلوط کی محفل
محفل شہر چٹائی

اور

ملک مندر حیات کی کہانیتو

نصر عباس۔ محمد یاسر اعوان، محمد فادوق انجم
تنویر ریاض۔ محمد الیاس اور اسما فادری کی خوبصورت کہانیاں

اسی کے علاوہ

گھرانہ۔ اس لیے اسے نہ مخالفت کی پرواہ تھی اور نہ موافقت نے کوئی اثر ڈالا۔ قانون کی تعلیم مکمل ہونے پر وہ وزارت خارجہ سے منسلک ہو گیا۔

1946ء میں شام فرانس کی غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔ کچھل اتاشی کے طور پر وہ بیروت، قاہرہ، لندن، استنبول اور میڈرڈ وغیرہ میں سفارت کاری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ڈیپلومک کیریئر نے اُس کے ذہنی افق کو بہت وسعت دی۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے شاعر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاعر جس نے 1956ء میں اپنی نظموں میں عام فوجیوں کو سراہا تھا۔ باوجودیکہ مصر جنگ ہارا تھا مگر اس نے جنگ ہارنے کے باوجود جیت لی تھی۔ لوگ خوش تھے۔ ناصر کے لیے جیت کا طوفان تھا۔ مگر 1967ء کی چھ روزہ جنگ شاعر کے اعصاب پر بجلی بن کر گر گئی تھی۔

”عوامش علی دفتر التکیہ“ کے عنوان سے اُس نے اپنا کلیجہ نکال کر گلیوں بازاروں میں پھینک دیا تھا۔

اے میرے غم زدہ وطن
بس ایک لمحے میں
تو نے جیت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں
خنجر تھما دیا ہے
ذرا ان اشعار کے اندر جھانکیے۔

ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا تھا
مگر

ہمارا تیل فاشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے
ہمیں بندوں پر مشتمل اس طویل نظم جس نے عرب قیادت کے لئے لیے۔ جمال عبدالناصر کو گیدا۔ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے لعن طعن کیا۔ خفیہ پولیس، حکومتوں کے کارپردازوں کو صیغہ جمع شکلم، ہم یعنی ذات کے دائرے میں سمیٹنے ہوئے تنقید کی سان پر چڑھایا۔ ذرا دیکھئے تو
”اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی
تو اُسے کو سومت
حالات کو بھی لعن طعن مت کرو
خدا انہیں فتح دیتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے
خدا کوئی ہتھیار گمڑنے والا لوہار تو نہیں
یاد رکھو

جنگیں کبھی جیتی نہیں جاتیں
طاؤس درباب کے ساتھ

ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کر نہیں آئے
وہ تو چوہو نیٹوں کی طرح

ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں
ذرا اور دیکھئے شاعر نے کیسے کلیجہ چیر دیا ہے۔
اگر اتفاق و اتحاد کو ہم ذہن نہ کر چکے ہوتے
اس کے نوخیز بدن میں سنگین نہ اُتار چکے ہوتے
اور اگر اتحاد باقی ہوتا

تو دشمن یوں ہمارے خون سے ہولی نہ کھیلتا
ایک طوفانی نظم عرب دنیا میں ہواؤں کے گھوڑوں پر
سوار ہو کر ہر جگہ پہنچی اور ہر زبان پر تھری۔ حتیٰ کہ لوگ
حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے کرتے اچانک ایک دوسرے
سے کہتے۔

”ارے تم نے نظارت باقی کی نظم پڑھی۔“
طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مصری حکومت نے ان کی
تمام کتابوں کو بین کر دیا تھا۔ وہ تمام نظمیں جنہیں ام کلثوم
نے لکھی تھیں جلا دی گئیں۔ جمال عبدالناصر سخت مشتعل
تھا۔ شاعر کے مصرعیں داغے پر پابندی لگا دی گئی۔ اردن کا
اصرار تھا کہ قبائی پر مقدمہ چلایا جائے۔

کہیں دایاں بازو تکتی چینی کر رہا تھا کہیں ہایاں بازو۔
مگر شاعر کو کچھ پرواہ نہیں تھی۔ وہ اگر شتر چلا رہا تھا تو ساتھ
بھی مایوس لوگوں کے دغوں پر بھاہے رکھ رہا تھا۔ وہ ان کی
دلی کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں آس اور امید کی
روشنی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا مایوسی بے عملی پیدا
کرتی ہے یا بے ادراک تشدد۔ اُس کی نظمیں نئی نسل سے
مخاطب تھیں۔

ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے
جو جوش و جذبے سے معمور ہو
جو آسمان میں تھمکے جانے پر قادر ہو
جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
ہمیں ایک نئی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیوں کو برداشت نہ کرے
جو گمناموں کے بل نہ جھکے
ہمیں جنوں جیسی نسل چاہیے
جو ہماری شکست پر غالب آ سکے

.....

عرب بچہ
سادون کے قطرہ

ہمارے بارے میں مت بڑھو
ہمارے نقش قدم پر مت چلو
ہم دعا دعا اور تماشا کروں گی قوم ہیں

عرب بچہ
آنے والے لکل کو بتا دو

تم ہماری زنجیریں توڑ ڈالو گے

لکھنے پڑھنے کی نصف صدی پر پھیلا اس کا کام شاعری
کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بڑے اہم اور ٹھوس
موضوعات پر ہوا، اخباروں میں مضامین کے ساتھ ...
”الہیات“ اخبار میں کالم نگاری بھی کی۔ پہلے بیروت میں
ذاتی پبلیشنگ ہاؤس قائم کیا۔ پھر اُس کی شاخ لندن میں بھی
قائم ہوئی۔ اُس کی زیادہ تر کتابیں یہیں سے چھپیں۔

اس نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی اس کی کزن تھی
زہرہ اک بیک۔ ایک بیٹی حدیدہ اور ایک بیٹا توفیق جو صرف
پانچ سال کی عمر میں لندن میں ہارٹ ایک میں چل بسا
بیٹے کی موت پر اُس کی نظم ”دمشق کا چاند“ بھی ایک شاہکار
تھی۔

دوسری شادی اس نے ایک عراقی ٹیچر بلقیس الرودی
سے کی جو اُسے بغداد کے ایک مشاعرے میں ملی تھی۔ بلقیس
سے اُسے بہت محبت تھی۔ نظار قبانی بیروت میں تھا۔ یہ
1981ء کا زمانہ تھا جب لبنان سول واری کلیٹ میں تھا۔ وہ
تو اخبار لینے کے لیے گھر سے نکلا تھا جب عراقی سفارت
خانے پر بم بلاسٹ ہوا۔ سفارت خانے سے قریب تر ہونے
کی وجہ سے اس کا گھر متاثر ہوا اور بلقیس تو عین موقع پر ہی دم
توڑ گئی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ بھر گیا
تھا۔ بلقیس سے اسے بہت پیار تھا۔ اُس کی موت پر اس نے
جو شاعری کی وہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اپنا جانی نہیں رکھتی۔

کہیں اس نے بلقیس کو بابل کی ملکہ کے عنوان سے
خطاب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کہیں نینوا کی
چکلی شاعری کہا۔ کہیں عراقی بلند ترین پام کے بوٹے سے تشبیہ
دی۔ کہیں وہ کونین اف شیتا تھی، کہیں میری بلوڑ چھپی۔ کہیں
دجلہ کی کوئی شعلی لہر، بہار کا بھول، حسین میکلس، کہیں بادقار
چال کی مورنی اور افریقہ کی مادہ بارہ سنگا۔

عرب کی ساری جغرافیائی اور ثقافتی تاریخ سے
تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ لگاتے ہوئے اُس نے لکھا۔

شکریہ۔

شکریہ میری بلقیس کو مارنے کا شکریہ
اب جاؤ اور جام نوش کرو

شہید کی قبر کنارے
میری نظم بھی قتل ہو گئی

اپنی محبت اور غم و درد کے سمندر میں اتر کر اس نے اپنے
قاری کو کس کس انداز میں اپنے احساسات میں شریک کیا۔

صرف چندا شعرا بطور نمونہ پیش ہیں۔
بلقیس

تم کیسے میرے شب و روز
اور میرے خوابوں کو اپنے ساتھ لے گئیں

تم نے سب کو بصورتوں
اور سب موسموں سے کنارہ کشی کر لی

او میری زندگی میری جان، میرا پیار
میری نظمیں اور میری آنکھوں کی بصارت

تم نے کیسے مجھے چھوڑ دیا
ایک لفظ کہے بغیر

اس کے جذبات کے بہاؤ کو مثالوں کے احاطے میں
لا نا دشوار ہے۔ ایک اور جگہ اس اظہار کا رنگ دیکھئے۔

بلقیس تم میرا درد ہو

وہ درد جو ظلم لکھتے ہوئے

مجھے اپنے دل اور آنکھوں میں

میں محسوس ہوتا ہے

1990 کی چالیس جگ پر اُس نے اپنی مشہور نظم میں کہا

گھٹکت ہوئی

اس کے بعد ایک اور گھٹکت

ہم کوئی جنگ کیسے جیت سکتے ہیں

اگر وہ سب

جنہوں نے فوٹو گرافر کے طور پر کام کیا

اور

بروڈیکسٹ انٹرنیٹ میں جنگ لڑتی سیکھی

بلقیس کی موت کے بعد اُس نے بیروت کو خیر باد کہہ

دیا تھا۔ وہ جنیوا اور بیجس کے درمیان متحرک رہا۔ پھر لندن

میں سیٹ ہو گیا۔

گو اُس نے خاصا وقت لندن میں گزارا۔ مگر اس کے

بادجو اس کی طاقتور شاعری اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ

عرب دنیا میں سنز کرتی رہی۔ دمشق ہمیشہ اس کی کمزوری

رہا۔ ایک طاقتور عنصر کے طور پر اُس کی شاعری میں جھانکتا رہا۔ اپنی محبت اور پیار کا اظہار اُس نے بہت بار کیا۔ اپنی وفات سے صرف ایک سال قبل اس نے ”میں دہشت گردی کے ساتھ ہوں“ جیسی شہرہ آفاق طویل سیاسی نظم لکھ کر خود کو امر کر لیا۔ نظم میں وہ دہشت گردانہیں کہتا ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جلاتے اور معصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔ قبائی جسے دہشت گردی مانتا ہے وہ گیارہ ستمبر والی نہیں نہ اس سے مراد فضول قسم کے دھماکے اور قتل ہیں۔ اس لازوال نظم کا ہر مصرع موتی ہے، ہیرا ہے۔

”میں دہشت گردی کا حامی ہوں“

امریکا کے لوگوں کی ثقافت کا دشمن

مگر خود ثقافت سے عاری

مہذب لوگوں کی تہذیب کا بیری

مگر خود تہذیب سے محروم

امریکا

ایک فلک بوس عمارت کا نام

مگر دیواروں سے خالی

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

ہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے

اگر ہم اسرائیلی بلند وزروں سے آکر

مرنے سے انکار کریں

اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کے

خلاف آواز اٹھائیں

وہ ہماری دھرتی ملیا میٹ کر رہے ہیں

ہماری تاریخ مٹا رہے ہیں

ہمارے قرآن، ہماری انجیل کی تذلیل کر رہے ہیں

اگر ہمارا گناہ یہ ہے تو

واللہ کتنی خوبصورت ہے دہشت گردی

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

اگر یہ مجھے

روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے

مہاجرین سے بچا سکے

یہ مہاجر فلسطین میں آجے ہیں

وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہیں

انہوں نے القدس کے مینار

افسی کے دروازے

اور محرابیں چرائی ہیں

میں دہشت گردی کی حمایت جاری رکھوں گا

جب تک نیو ورلڈ آرڈر

امریکا اور اسرائیل کے درمیان

مستحکم رہتا ہے

یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا

ان کے گلے کے تئوں کے آگے ڈالتا رہے گا

میں اپنی شاعری سمیت

اپنے لفظوں سمیت

اپنی ساری طاقت کے ساتھ آواز بلند کرتا رہوں گا

جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے

میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

اس نظم نے پوری عرب دنیا کے طول و عرض میں

طوفان برپا کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے بھی شدید غصے کا اظہار

کیا۔ مگر شاعر نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

اس کی موت پر جہاں دنیا بھر کے اخبارات نے

اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ وہیں دمشق کے گلی کوچوں میں

اشک بہائی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ملنے پر کہا تھا۔

”جانتے ہو آج دنیا سے کون رخصت ہوا ہے؟“

وہ شخص جس سے بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھے

والے چھوٹے اور بڑوں لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے

تھے۔ اُس کی آخری خواہش جس کا اظہار اس نے اسپتال

میں کیا۔ دمشق میں دفن ہونے کی تھی۔

”دمشق میرے لیے رحم مادر کی طرح ہے جس نے

مجھے شاعری سکھائی جس نے

مجھے تخلیق کار بنایا۔“

میں ملول تھی۔ شکر گزار تھی۔ عرب مہمان نوازی سے

لطف اندوز ہوئی تھی۔ شام کی ایک صاحب علم ہستی سے ملی

تھی اور اب باب میفیر جانے کی منتی تھی جہاں وہ عظیم شاعر

دفن تھا۔ جب میں گھر سے نکلی تھی۔ اس کی ایک خوبصورت

نظم میرے ساتھ ساتھ چلے گئی تھی۔

کمریوں میں سا چل پریم دراز

تمہارے بارے سوچتا ہوں

اے سمندر اگر تمہیں یہ پتا چل جائے

کہ تمہارے بالے میں نے کیا سوچا

تو تم اپنے ساحلوں، اپنی سیپوں، اپنی مچھلیوں کو

چھوڑ کر میرے پیچھے چل آتے



یہاں سے 52 میل کے فاصلہ پر ساؤتھ چارلسٹن منتقل ہونے کا حکم نامہ آگیا ابھی میں منتقل ہونے کے انتظامات کا سوچ رہا تھا کہ ایک اہم واقعہ رونما ہو گیا۔ میری عادت تھی کہ چھٹی والے روز، کسی ویران اور

یہ 2000ء کے شروع کا ذکر ہے، ان دنوں میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ریاست ویسٹ ورجینیا کے ایک چھوٹے سے قصبے 'اؤک ہل' میں رہتا تھا۔ ابھی یہاں صبح طور پر ایلبرٹ بھی نہ کر پایا تھا کہ میرا دل پانی اٹھ گیا.... اور مجھے

چرکی

شاہد لطیف

پراسراریت کی دھند میں ڈوبی شخصیات ہر ملک و ملت میں دل جاتی ہیں لیکن ان کو سمجھنا آسان نہیں کیونکہ عقل کی دھند پر انہیں پرکھا نہیں جاسکتا۔ مصنف سے بھی ایک ایسی ہی ہستی نکرائی تھی جو خود میں منفرد ثابت ہوئی۔

امریکا میں بسنے والے ایک پراسرار قبیلے کے وجدان کا تذکرہ



متروک قبرستان میں جا کر وقت گزاری کرتا۔ یہ دراصل مجھے شہر خوشیاں میں قبروں کے کتوں سے دلچسپی تھی۔ یہ کتے گزرے وقت کی کہانی سناتے ہیں۔ ان پر رقم معلومات سے ان کے دور کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اپنی 1989ء ماڈل کی ٹوپونا ٹرولر کے رکھل گیا تھا۔ ان ہی ایام میں ایک چرکی (جسے ہم لوگ چروکی کہتے ہیں) خاتون، نورا (Nora) سے ملاقات ہوئی جو اپنے آپ کو خالص چرکی کہلاتی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ مہرہ سب ہی ریڈ انڈین لگتا تھا۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے خاندانی لیکن متروک قبرستان میں لے آئی۔ اس قبرستان کے ٹوٹے اور جمولتے ہوئے مصدر دروازے سے داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں تو زمانے سے کوئی زندہ یا مردہ نہیں آیا میرے کہنے پر وہ مجھے قبرستان کے ایک قدیم مقبرے میں لے گئی جس کا آدھا دروازہ کب کا گر چکا تھا۔ بظاہر تو سورج کی روشنی کافی تھی لیکن اس مقبرہ میں کچھ کم محسوس ہوئی۔ اندر اوپر تلے کئی ایک تابوت رکھے نظر آئے۔ میں نے خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں دیکھنا ہے۔

اُس نے پوچھا کہ میں تابوت اور صاحبہ تابوت کیوں دیکھتا ہوں؟

میں نے جواب میں کہا کہ ”معلوم نہیں“۔ اس پر نورا نے حیرانی سے مجھ دیکھا پھر اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ہم نے اُس کمرے میں اوپر تلے رکھے 9 تابوت کھول کر دیکھے۔ کافی دیر بعد جب شام ڈھلے ہم اُس مقبرے سے واپس ہونے والے تھے۔ نورا نے کہا اگر تمہیں یہاں سے کوئی چیز بطور یادگار لے جانی ہے تو وہ تم لے جاسکتے ہو۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔

میرے انکار پر وہ کچھ نہ بولی لیکن جب وہ شام کو میری فارمی میں آئی تو میں نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے فارمسٹ سے اجازت لی اور نورا کے ساتھ باہر آ گیا۔ نورا نے پوچھا کہ قبرستان میں کیا پریشانی تھی تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی اہم بات نے تمہیں بے چین کر رکھا ہے۔ میں نے کہا۔ ”مجھے دفتر جوائن کرنے کے ساتھ ایک حکومتی ملکیت کا تخفیف شدہ کرایہ پر اپارٹمنٹ درکار ہے جو ریاستی ادارے کے تحت آتا ہو۔“

نورا مسکرائی اور کہا کہ فون بک یعنی ٹیلی فون ڈائریکٹری لاؤ۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کر فون بک لی اور سکین میں آگیا اُس نے اپنے پرس سے کچھ رنگین کپڑوں کے ٹکڑے

نکال کر ڈائریکٹری کے دائیں طرف رکھ دیے پھر آنکھیں بند کر کے تاش کے پتوں کی طرح ڈائریکٹری کے صفحات کو پھیرا۔ اُس کے بعد دو تین دفعہ کھولا بند کیا پھر بالآخر ڈائریکٹری کو کھول کر بند آنکھوں سے دائیں جانب کے صفحے پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیریں، ایک جگہ انگلی رکھ کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور بغیر دیکھے کہا کہ اس نمبر پر فون کرلو۔

اب جو میں نے وہ صفحہ دیکھا تو دائیں تلی انگلیاں آگئیں۔ یہ صفحہ اور اس سے ملحق کچھ اور صفحات ’ریئل اسٹیٹ‘ کے تھے اور خاص وہ صفحہ جہاں اُس نے انگلی رکھی تھی ہاؤسنگ ایجنٹ ماربن ڈیو پلینٹ والوں کی پر اپنی کا تھا۔

مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ بولی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اب ہمارے ہو“۔ یہ کہا اور اُس نمبر پر فون کھما دیا۔ اُن سے کیا بات ہوئی وہ الگ سے مگر کمال ہے ہوا کہ مخاطب بھی چرکی تھا۔ نورا نے کہا کہ وہ مجھے گھر دلانے میرے ساتھ 100 میل سے زیادہ کا آنا جانا بخوشی کرے گی۔ یوں ہم دونوں متعلقہ پتے پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ انٹر اسٹیٹ 64 موٹر وے (ایم 2) سے خاصی قریب تھی۔ ایک وسیع قطع میں قدرے نئے بنے ہوئے ایک منزلہ مکانات نظر آئے۔ رہائشی کے اشارات کی مدد سے ہم اس پمپکس کے دفتر پہنچ گئے۔ یہاں کے انچارج اور اُن کی بیوی بھی چرکی تھے۔ نورا نے آنے کا منشاء بتایا اور آنا فانا وہ سب کاغذی کارروائی ہو گئی جو سرکاری طور پر کئی دنوں میں ہوتی۔ چونکہ میری بیوی اور تین بچوں کو بھی یہاں رہنا تھا لہذا مجھے 3 کمروں والا ٹاؤن ہاؤس الاٹ ہوا۔ سامنے کی جانب ایک چھوٹی سی خوبصورت کیاری کے ساتھ مین گیٹ۔ نیچے کی منزل میں ایک بونگ روم، ایک بیڈ روم، ایک غسلخانہ اور باورچی خانہ اور اوپر کی منزل میں دو بیڈ روم اور ایک غسلخانہ۔ گھر کی پچھلی جانب چھوٹا سا باغ اور اسٹور روم۔ میرا گھر قطار کا آخری مکان تھا۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک خشک برساتی ندی تھی جہاں درمیان میں پانی بھی تھا۔ ندی کے پار غیر آباد علاقہ اور اُس سے آگے جنگل۔ میرے گھر اور ندی کے درمیان بلدیہ والوں نے ایک بڑا سا موٹے پلاسٹک کا کڑے دان رکھا ہوا تھا۔

واپسی کے سفر میں شدید برف باری ہو رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ نورا خوش تھی۔ اُس کو اُس کے ٹریلر ہاؤس میں چھوڑا تو نورا نے کافی کی پیشکش کی۔

”تم کب شفٹ ہو رہے ہو؟“ کافی پیتے ہوئے بغیر تمہید کے اُس نے سوال کیا۔

برف پر چلنے کے تازہ نشان دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دکھائی نہیں دیئے۔

فارسی سے چھٹی کے بعد اسلامک سینٹر چلا گیا وہاں سے انڈین اسٹور کے ٹھا کر ٹیل اور اُن کی بیوی کرن سے کپ شپ کی اور پھر گھر آ گیا۔ حسب معمول دروازہ کھولتے ہی والا تھا کہ وہی بے دوبارہ نمودار ہو گئے۔ وہی کل والی کہانی ہوئی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے آج کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کیا اور وہ گھر کا معائنہ کر کے میرے سامنے بی بیٹھ گئے۔ اسی طرح دو دن اور گزر گئے لیکن انہوں نے گھر میں کوئی گندگی نہیں کی نہ ہی دودھ پیا۔ یوں سبچر کا دن آ گیا۔ اب دو دن میری چھٹی تھی۔ میں دوپہر کو نور سے ملنے اُس کے ٹریڈر ہاؤس اوک نیل آیا۔ وہ تپاک سے مٹی۔

”کہو! مہمان آئے؟“ اُس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”آئے تو تھے! لیکن بات چیت نہیں ہو سکی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا؟“ اس نے کہا۔

”میں اُن کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا۔“ میں نے جواباً کہا۔ ”لیکن وہ میرے پاس خوش ہیں لیکن وہ ہیں کو؟“ ”لوہا گرم دیکھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

”ختم سے اور تمہاری اشیاء سے مانوس ہونے کے لیے بیسے گئے تھے۔ تم نے ہمارے پڑھنوں کو پسند کیا انہوں نے تم کو....“ وہ کچھ اور کہتی کہ ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کو بات کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد کسی سوال جواب کی ضرورت نہ رہی۔

میں نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس علاقے میں آنے کے بعد میں نے اپنا میوزک کا کام بھی شروع کر دیا۔ گھر، فارسی، میوزک اور گھومنا پھرنا۔ یہی مصروفیت تھی وقت گزر رہا تھا۔ یوں 2001ء آ گیا۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا اور دیکھتے تمبر کا مہینا آیا اور 11 تاریخ کو نیویارک ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دہشت گردی کے واقعات ہو گئے۔ اچھی کرسس اور نئے سال کی چٹھیاں شروع نہیں ہوئی تھیں جب مجھے میوزک پروگرام کے سلسلے میں ہفتہ اتوار کی چھٹی کے ساتھ ایک چھٹی ملا کر جرمن ٹاؤن، میری لینڈ جانا پڑا۔ واپس آیا تو لبنانی فارماسٹف کہنے لگی کہ ایف۔ بی۔ آئی والے تمہارا پوچھتے ہوئے آئے

”کل دوپہر تک“۔ میں نے جواب دیا۔

کچھ سوچ کر وہ یولی۔ ”کل رات تمہارے گھر مہمان آئیں گے اُن کی خدمت کرنا۔“ اس پر میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا اور بالی بانی کر کے چلا آیا۔

میری کیا تیاری ہو نا تھی اُس وقت تو صرف مسافری سامان ہی تھا جو کار میں آسانی سے سا گیا اور یوں میں دوپہر سے قبل ہی ٹاؤن ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔ فارسی کے مالک کی بیوی بھی میری مدد کرنے آئی اور میرے ساز و سامان کو دیکھتے ہوئے ازرا ہمدردی اپنے ہاں سے کچن کی روزمرہ استعمال کی اشیاء اور کچھ برتن وغیرہ بخود دیئے۔ میں ایک قصبہ سے آیا تھا اور یہ شہر... تھا لہذا گھونسنے پھرنے اور نئی کھٹلنے والی فارسی دیکھنے چلا گیا جہاں مجھے کل سے کام کرنا تھا۔ یہاں کی فارسیسٹ لبنانی تھیں۔ وہ مجھے شہر کے دو اعزین اسٹوروں میں لے گئیں جہاں سے میں رات گئے گھر لوٹا۔ اس وقت بھی ہلکی برقیاری ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے میں چابی گھمائی ہی تھی کہ میاؤں کی آواز کے ساتھ دو عدد بلی کے بڑے سائز کے بچے نظر آئے۔ بے اختیار میں نے اُن کو پچکارا تو وہ دونوں میرے پیروں سے لپٹنے لگے۔ دیکھنے میں تو عام سے تھے لیکن جو خاص چیز ان میں بالکل واضح نظر آ رہی تھی وہ یہ کہ اُن پر برف کا کوئی نام و نشان نہیں تھا نہ ہی نرم برف پر اُن کے چلنے سے پاؤں کے نشان پڑ رہے تھے جو کہ دونوں ہی چیزیں ناممکن تھیں۔ میں انہیں پچکار کر اندر لے آیا۔ پلیٹ میں کچھ دودھ ڈال کر اُن کے آگے رکھا۔ اور تھوڑی دیر اُن کو پیار کرنے کے بعد فرش پر بستر بنا کر لیٹ گیا۔ دونوں بلیاں میرے اوپر اچھل کود کرنے لگیں۔ رات کو سونے کے اعمال پڑھ کر بلند آواز سے اُن سے کہا کہ میں سوئے لگا ہوں اپنا گھر سمجھ کر رہیں اور برائے مہربانی گندگی سے پرہیز کریں۔ رات آرام سے ٹھوری۔ صبح اُن میں سے ایک میرے بازو پر دوسرا میرے پیٹ پر استراحت فرما رہا تھا۔ اُن کی پلیٹ دیکھی جو دیکھی ہی بھری ہوئی تھی۔ پھر مجھ میں نے وہ دودھ گرا کر پلیٹ کو اچھی طرح سے دھو کر دوبارہ دودھ ڈال کر اُن کے سامنے رکھا۔ جو کہ انہوں نے سوگھ کر چھوڑ دیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر فارسی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جبکہ وہ میرے ساتھ ساتھ منتہی رہے۔ دروازے سے باہر نکلا تو یہ بھی نکل کر کیاری میں بیٹھ گئے۔ گھر کے اندر ان کو چاہتے ہوئے بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا کیوں کہ معاہدے کے تحت میں اپنے گھر میں پالتو جانور نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ اور، دن کی روشنی میں ان کے

تھے۔ کم و بیش یہی بات میرے محلہ والوں نے کہی کہ ہاؤسنگ ایجنڈا رین ڈیولپمنٹ والے تمہارے بارے میں پوچھ کچھ کرتے پھر رہے تھے۔ میں گھر پہنچا تو ایک نظر میں علم ہو گیا کہ گھر کی تلاش لی گئی ہے۔

اگلے روز دن کے دس بجے میڈیکل ریپ کی طرح کے لمبے اور چھوٹے قد کے دو افراد فارسی میں آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ انتظار فرمائیں ”فارمسٹ ابھی آتی ہیں۔“ ”ہم تم سے ملنے آئے ہیں!“ اور اپنے ایف۔ بی۔ آئی کے بیج دکھائے۔

”ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں اُن دونوں کو لے کر سامنے رکھی کرسیوں تک آیا۔

انہوں نے کہا کہ وہ کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور کیجئے۔

”ہمارا پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ ہمیں دیکھ کر ڈرے کیوں نہیں؟“

مجھے ہنسی آگئی۔ ”جناب یہ ریاست ہائے متحدہ امریکا ہے۔ آپ دونوں یہاں کی ایف۔ بی۔ آئی سے متعلق ہیں تو ڈرنا کیسا؟ ہاں! اگر یہ پاکستان ہوتا اور آپ پاکستانی پولیس والے ہوتے تو میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بیساختہ کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتا، چاہے ہڈی ٹوٹ جاتی۔ کیوں کہ ہماری پولیس ہم جیسے عام آدمی کو پہلے مارتی ہے پھر سوال کرتی ہے۔ کم از کم آپ لوگ مجھے مار پیٹ کے بغیر پوچھ رہے ہیں تو کیسا ڈرنا؟“

میری اس بات پر لمبے قد والا ایجنٹ کہنے لگا کہ یہ صرف تمہارے ملک کا معاملہ نہیں بلکہ تمام تیسری دنیا کا یکساں مسئلہ ہے۔

اُس نے بہت سے سوالات کیے، ان میں بعض ذاتی اور نجی نوعیت کے بھی تھے۔ پھر جاتے جاتے یہ کہہ گئے۔ ”ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارے پاس اسلامک سینٹر کی جاپی ہوئی ہے، اور میوزک تمہاری روزی کا بواڑہ رہی ہے۔ قبرستانوں ویرانوں میں گھومنا پھرنا تمہارا شوق ہے۔ ہم دونوں ایک مرتبہ اور آئیں گے۔“ یہ کہہ کر دونوں چلے گئے۔

ایف بی آئی کا آتالبنانی فارمسٹ کے لیے پریشانی کا باعث تھا حالانکہ وہ تو مسلمان بھی نہیں تھی۔ کہنے لگی کہ اُس کا تجربہ ہے کہ خفیہ والے اتنی آسانی کے ساتھ پہچان نہیں چھوڑتے لہذا اب آئیں تو انہیں کہیں باہر ملنا۔ فارسی میں کاروبار متاثر ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا بہتر! آئے، تو اُن سے درخواست کروں گا کہ کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں۔

چند روز بعد وہ دونوں پھر صبح صبح وارد ہو گئے۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو آپ لوگوں کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں البتہ میری فارمسٹ کو ابھین ہوتی ہے۔“

لمبے قد والا شخص کہنے لگا۔ ”ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ میرے گرین کارڈ سے متعلق کچھ بات چیت کی اور کہا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو ہم درک ہم کر کے لائیں اور سامنے والے کے جوابات اُس سے 100 میل کھا جائیں۔ تم خوش قسمت ہو۔“ پھر کچھ توقف کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”اپنے قریبی ساتھیوں (ہم وطنوں) سے بہت ہوشیار رہنا۔ ہمیں اُن ہی کی اطلاع پر بھیجا گیا ہے۔ اور اپنی جیب سے ایک موزائک کاغذ کا پُر زانگالا۔ اس پر مچی پشیل سے ایک ٹیلیفون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اسے بڑھاتے ہوئے بولا۔ خبردار رہنا، تمہارے قریبی لوگ، اوچھا دار کریں گے۔ جب کبھی ایسا ہوا تو اس نمبر پر پیغام چھوڑ دینا۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ یہی کاغذ کا پُر زانگالا ایف۔ بی۔ آئی سے تمہارا صداقت نامہ ہے۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے پرزے کو ڈائری میں رکھ دیا۔

ایسی دوران پاکستان سے میرے والد صاحب، میری ہمشیرہ کے ہاں آگشتہ، جارچیا میں رہنے کے لیے آئے۔ ان کی وجہ سے بہن کی طرف بھی آ جانا ناگوار ہا۔ پھر وہ میرے خالہ زاد بھائی کے پاس کلینٹن، ریاست ایلاباما بھی گئے۔ اُن 7 ماہ میں میری ٹیویٹا ٹرسل نے 30000 میل کا سفر طے کیا۔ ہر ایک مرتبہ لمبے سفر پر جانے سے قبل میں اپنی وقادار ٹیویٹا ٹرسل باڈل 1989ء کو فارسی کے پڑوس میں واقع بریک ایجنڈ مینٹینینس کی ورک شاپ میں لے جا کر اُس کو سفر کے قابل کر داتا۔ گورے میاں بیوی، آئرا اور براہیہ کاروبار چلاتے تھے۔ واضح ہو کہ 1500 ڈالر کی خریدی ہوئی اس کار پر بتدریج اس سے کہیں زیادہ خرچ ہو چکے تھے۔ جیسے ورک شاپ والے کہتے ہیں دیے ہی کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ آخر وقت تک یہ چلتی رہی۔ بار بار آئرا کا کہنا تھا کہ انہوں نے میری اور کار دونوں کی مثال اپنے ریکارڈ میں رکھی ہوئی ہے کہ پرانی کار میں بھی 7 ماہ میں 30000 ہزار میل جاسکتے ہیں اگر موٹر ورک شاپ والوں کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔

میری کار کے بارے میں بار بار نے کہہ دیا تھا کہ اب اسے شہر سے باہر نہ لے جایا جائے۔ اور مجھے اُس نے اپنی

ماہنامہ سوسی نالجسٹ



اکتوبر 2017ء

کے شمارے کی

سحر انگیز کہانیاں

اہلہ پا

ایک سرکش تنہا اور بے حسین روح
کا ماجرا۔ سنسنی خیز رفتار مغربی ناول کی تلخیص
امجد رفیس کے قلم سے

انکارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپین
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نفس میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلیپلائی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پیکار نو جوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

کبیر عباسی اور محمد فاروق انجم
کی سرورق پر قیامت خیز کہانیاں

ان کے علاوہ

منظرِ امام، تنویر، باض، سلیمانور،
امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین رضا
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد وتر جملہ کہانیاں

جینی نکتہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی دلیپ باتیں... کھائیں

والدہ کی 1992ء کی پائینک کار 2500 ڈالر میں دلو
دی۔ نور اس کار سے بہت خوش تھی کہا کرتی تھی۔ ”اس کی قدر
کرو یہ تمہاری خدمت اپنے آخری دم تک کرنے والی ہے۔“

رائم کے ساتھ ماسی میں بار بار ایسے واقعات پیش آئے
تھے جن کا ”16“ کے عدد سے کوئی خوشگوار تعلق نہیں ہوا کرتا
تھا۔ میں تو ہم پرست نہیں لیکن ایمان وادری کی بات ہے اس
کار کا بھی سوہاؤں دن بری طرح سے تجسس میں گزرا کہ اب
کچھ ہوا کہ جب۔ اس کار کی عظمت یہ ہے کہ اس کا پہلا ہی
دن تھا سنچری کی چھٹی تھی، میں اپنی ہمشیرہ کے ہاں اگستا، جارجیا
جانے کی نیت سے نکلا۔ راستے میں نور کے گھر جیلو ہائے
نکرنے کے لیے رزکا ہی تھا کہ ایک بنگلہ دیشی طالب علم، شفقت
کا بیگھی، (اوکھیل کے پاس) شہر سے فون آیا کہ اس کا چھوٹا
بھائی نبیم جوڑھا کا سے آرہا تھا وہ چارلسٹن ویسٹ درجینیا کی
بجائے چارلسٹن سادھ کیرولینا جا آتا ہے۔ ظاہر ہے بے
چارے اسٹوڈنٹ کے اتنے وسائل کہاں کی بیگھی میں تقریباً
چار سو میل جا کر بھائی کو لے کر آئے۔ ماشاء اللہ میری اس کار
کی یہ پہلی خدمت خلق تھی۔

یوں 2003ء ہو گیا۔ نور سے ملنا جلنا اور اکٹھے
دیرانوں، پرانے قبرستانوں اور مقامہ میں آنا جانا جاری
رہا۔ اس دوران میوزک کی وجہ سے جب معاشی حالات
مزید اچھے ہوئے تو اپنی زندگی کی پہلی نئی کاری۔ میں ویک
اینڈر ہی میوزک سے پیسے کمایا کرتا تھا لہذا نور سے ملنا جلنا
اب کچھ کم ہو گیا تھا۔ گاڑی کو لیے چند روز ہوئے ہوں
گئے تو ایک ویک اینڈ پر کار دکھانے کے لیے نور کے پاس
گیا۔ اُس نے ایک نظر دیکھ کر کہا کہ ”اشارے ٹھیک نظر نہیں
آتے۔“ پھر خاموش ہو گئی۔

میں نے دور کسی ویرانے میں جلنے کی خواہش کا اظہار
کیا جس پر اُس نے کہا چلوں گی لیکن اپنی کھٹارا
میں۔ پورے راستے اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ لہذا میں
بھی چپ رہا۔ اُس کی موجودگی میں پتا نہیں کیوں ایسا لگتا
تھا کہ جیسے ہم کسی حفاظتی حصار میں ہیں اور ہمیں کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا۔

اب کی دفعہ وہ کسی دریا کی قدیم گزرگاہ میں لے
آئی۔ امریکی جس کو دریا کہتے ہیں وہ ہمارے ہاں کے دریاؤں
... کے مقابلے میں بہت کم چوڑے ہوتے ہیں۔ بہر حال
وہ بھی کسی پرانے دریا کی گزرگاہ رہی ہوگی لیکن اب چار سو
دھشت برس رہی تھی۔ وہاں کی خاک بھی برف آلود ہو چکی

رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک اسٹیٹ ٹروپر کی کار میں لیٹا ہوا تھا، کئی ایک پولیس والے بھی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے جسم میں کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ تو ایک ایسولینس اور پیرامیڈیکل اسٹاف بھی موجود تھا لیکن اللہ کے فضل سے ذہنی صدمے سے محفوظ رہا۔ اسٹیٹ پولیس والے نے بتایا۔ ”اس جگہ کچھ لوگوں نے کھیل بنا رکھا ہے کہ ہفتے کی رات کوئی نئی کار، سستی، مہنگی، لوکل یا ایپورنڈ جس پر عارضی نمبر پلیٹ ہو، چلانے والا یا والی اکیلے ہو اور رات گئے کا وقت ہو تو یہ لوگ اس اکیلے ڈرائیور کو ڈراڈرا کر مجبور کرتے ہیں کہ وہ کنکریٹ سے ٹکرائے۔ یہی ان کا کھیل ہے۔ موت کے اس کھیل میں اب تک ۲ سے زیادہ اموات بھی ہو چکی ہیں۔ اسٹیٹ پولیس کے لیے یہ گردہ در دوسرے بنا ہوا ہے۔ اب تک تو یہ لوگ محض ڈرا کر کھرانے پر مجبور کرتے تھے لیکن آج پہلی مرتبہ فائرنگ بھی کی کیوں کہ تم نے ان کو لفٹ ٹائم دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ انہوں نے سیدھے سیدھے ہمیں گولیاں نہیں ماریں صرف ٹائروں پر گولی چلائی۔“

میری گاڑی اتنا کچھ ہونے کے بعد صرف ایک طرف سے چکی تھی باقی انجن، ٹرانسمن، لائٹیں، بریک سب کچھ ٹھیک تھا۔ یہ کارروائی ایک پیچھے آنے والے ٹرک ڈرائیور نے دیکھی۔ جب اس نے دیکھا کہ کار کھرا کر کھڑی ہو گئی تو اس نے یہ اطلاع اسٹیٹ پولیس کو دی اور فوراً روڈ پر محتاط رہیں کے بہت سے چمکنے والے اشارے بجا پیچھے سے آنے والوں کے لیے رکھ دیے کہ کہیں کوئی پیچھے سے آنے والا مجھ سے دوبارہ نہ ٹکرائے۔ تمہاری بے ہوشی کے دوران تمام قانونی کارروائی کر لی گئی ہے۔ انشورنس کمپنی کو..... بھی پولیس رپورٹ بھیج دی گئی۔ استعمال شدہ گولیاں اور کچھ خالی شیل بھی ڈھونڈ نکالے اور پولیس مسٹیک نے گاڑی کی تسلی کر لی کہ وہ ساؤتھ چارلسٹن تک آرام سے جا سکتی ہے۔

ہم لوگ اٹھتے اٹھتے امریکا مردہ پا دیکھتے رہتے ہیں، راقم آج جو یہ سطور لکھ رہا ہے وہ کسی انسان دوست امریکی کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ منکا دنیا جہان کی کاروں میں صرف ایک اسپرٹ نائز ہوتا ہے۔ میری کار کے دو نائز کو لی مار کر پھاڑے گئے تھے۔ اب ان دونوں نائزوں کی جگہ میری کار میں دو اور نائز موجود تھے۔ ایک تو میری کار کا اسپرٹ نائز ہوا لیکن دوسرا کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔

تھی۔ مجھے لے کر وہاں آلتی پالتی مار کے خود پیٹھ مٹی اور مجھے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ معلوم نہیں البتہ ایسا کرنے سے مجھے بہت سکون ملا۔ ایسا لگا گویا گرمی میں ٹھنڈے پانی سے غسل کیا ہو۔ پھر ہم واپس اس کے ٹریلر ہاؤس آئے اور کافی فی کر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ کچھ رنگین پتلے پتلے کپڑوں کے ٹکڑے لائی اور میری نئی کار کے تمام شیشوں پر پھرا کر، بغیر کچھ بولے مجھے جانے کا اشارہ دیا۔ وہ رات کے ایک بجے کا وقت ہو گا جب میں اسے بائی بانی کہہ کر گھر روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں انٹر اسٹیٹ پر تھا۔ مجھے ابھی چلتے ہوئے آدھ گھنٹا ہی ہوا ہو گا کہ اپنے پیچھے کچھ بڑے محسوس ہوئی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے ہیچ در ہیچ سڑک کے موڑ شروع ہو رہے تھے۔ واضح ہو کہ ریاست ویسٹ ورجینیا بالکل مری کی طرح ہے۔ میری کار آٹو ڈرائیور 65 میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا گویا کوئی میرے عقب میں بمبر نو بمبر چلا آتا ہے۔ میں نے پیچھے سے آنے والے ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سڑک کے آہستہ رفتار والے حصہ کی جانب آنا چاہا تو پیچھا کرنے والے، جو میں ابھی سوچ ہی رہا تھا، وہ کبھی گزرے یعنی وہ خود آہستہ رفتار والے حصہ میں آ کر باقاعدہ مجھے کنکریٹ کے median (جیسے ہماری موٹر وے میں آنے اور جانے والی ٹریفک کے درمیان کنکریٹ کی رزکاوٹ ہوتی ہے) کی جانب دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ اب ایک طرف کنکریٹ کی ٹھوس رزکاوٹ اور دوسری طرف ایک کار جس میں کئی افراد سخت سردی میں بھی کھڑکیاں نیچے کیے تھیں لگا رہے تھے۔ میں نے حتی الامکان کنکریٹ سے بچنے کی کوشش کی اور گاڑی کو سیدھا رکھنے کی سعی کرنے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ اب تو وہ کار میری کار سے خطرناک حد تک قریب آ چکی ہے اور ڈرائیور کی پچھلی نشست سے میں نے شات گن کی نالی باہر نکلتے دیکھی۔ ٹھانیں! ایک فائر ہوا۔ میری کار کا ایک نائز پھٹ گیا۔ ٹھا! دوسرا فائر ہوا اور گاڑی یکدم قابو سے باہر ہوئی۔ میری کار کے دائیں جانب کا اگلا اور پچھلا نائز تباہ ہو گیا۔ آٹو ڈرائیور 65 میل فی گھنٹے کی رفتار سے میری کار ایک دھماکے سے کنکریٹ سے ٹکرائی۔ بیڑی والی ٹھکونا کاری طرح منہ سیدھا کر کے پھر اسی رفتار سے 2 پھنے ٹائروں کے ساتھ بے ڈھنگے طریقے سے چل کر ایک دفعہ اور ٹکرائی پھر مجھے ہوش نہیں

میں نے وہ کارٹھیک ہونے کے لیے انشورنس کمپنی کے منظور کردہ موٹر گیراج میں دے کر کمپنی کے کھاتے میں ویسی ہی ایک رینٹل کار لے لی۔ فوراً کوکار پر فائرنگ کا میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ حادثے کے فوراً بعد والے ویک اینڈ میں اُس کی طرف جانے کا پروگرام بنا۔ میرے ساتھ اوپر تلے ہونے والے واقعات کی وجہ سے نور اپریشان تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے ایک بزرگ کے ہاں لے کر جانے کی۔

جب میں اُس کے ہاں پہنچا تو کچھ دیر وہ بالکل خاموشی سے مجھے کھتی رہی۔ پھر جب میں نے کار کے حادثے کی تفصیل بتانا چاہی تو اشارے سے منع کر دیا۔ مجھے بٹھا کر اندر گئی پھر وہ مکمل چرکی چلیے میں جگ کر آ گئی۔ ہم دونوں اس رینٹل کار میں تقریباً 35 میل کے فاصلے پر واقع پریٹ Pratt روانہ ہوئے۔ تقریباً 45 منٹ کا یہ سفر خوشگوار گزرا۔ یہاں نور کے والد کے عزیز بچے تھے۔ یہ بہت ہی چھوٹا قصبہ تھا۔ مکان پر ایک نگاہ پڑتے ہی بخوبی اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی چرکی ریڈائن کا گھر ہے۔ وہاں زیادہ تر انہی کے چلیے والے بچے پچیاں کھیل کود رہے تھے۔ یوں لگا کہ نور بچوں میں کافی مقبول ہے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے مجھ سے ملے آئے۔ گھر میں دو بزرگ بھی تھے ایک مرد اور دوسری خاتون۔ دونوں تپاک سے ملے البتہ اُن بزرگ خاتون نے میرے بائیں کاندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا شروع کیا جو میرے سر سے گزر گیا۔ میں نے پہلے بزرگ پھر نور کے چہروں کی طرف دیکھا جس پر نور نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ تموڑی دیر کے بعد اُن بزرگ خاتون نے نور سے کچھ کہا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ مجھے نور نے بتایا کہ یہ اُن کے خاندان کی ایک بڑی روحانی شخصیت ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں؟ اصولاً تو اب تک مجھے خود اپنے تابوت میں ہونا چاہیے تھا۔ اب تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا چلوں لیکن یہی بات 8 سال قبل کراچی کی ایک روحانی شخصیت کہہ چکی تھیں۔ اور اُن کے کہنے پر کہ کراچی شہر سے فوراً نکل جاؤ، پر راتم نے عمل بھی کیا تھا۔ میں وہاں سے لوٹا تو بھی پریشانی ٹھیرے رہی۔

چھ مہینے اور گزر گئے، اب گرمیاں آگئیں اور میرے اقتصادی حالات مزید بہتر ہو گئے۔ میں نے میوزک اور اس سے متعلق سامان، جیسے 16 ٹریک کا ڈیو کسر، بھاری

سامان کے اٹھانے کے لیے فولڈ ہو جانے والی ٹرائی، ہال میں رکھے جانے والے بڑے اسپیکر، اسٹیج کے مانیٹر اسپیکر، اسٹیج لائٹنگ کا سامان، اسپیکر اور مائکروفون کی ایڈجسٹنگ وغیرہ کے لانے لے جانے کے لیے اپنی کار واپس کر کے بالکل نئی ڈانج کارواں وین لے لی۔ اس کی پچھلی سیٹیں نکال کر سامان برداری کی گاڑی بنا لیا۔ نور نے اپنے اعتقاد کے لحاظ سے گاڑی کے سامنے والے بمپر پر ریلین کپڑوں کے ٹکڑے باندھ دیے۔ وین کو لیے ابھی سولہواں دن تھا۔ میں دواؤں کی ڈیلیوری دے کر واپس فارمیسی آ رہا تھا کہ سامنے روڈ پر آگے جانے والے ایک فارم ٹرک نے اچانک بریک لگائی۔ اُس کی بریک لائٹ خراب تھی میں نے بھی بریک لگائی لیکن میری وین کا اگلا حصہ اُس ٹرک سے جا ٹکرایا۔ اسپرٹنگ ڈھیل اور ڈش بورڈ کے ایریک فلک آئے اور انجن میں کوئی ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ وین اشارت نہ ہو سکی۔ انشورنس کے منظور شدہ گیراج والوں نے کہا کہ ایک نیا مرکزی کمپیوٹر کارڈ لگے گا جو پڑوس کے ملک کولمبیا میں بننا ہے، یہ چھ ماہ سے قفل نہیں آسکا لہذا اب یہ وین اُس مدت کے بعد ہی بدل سکے گی۔ نیز یہ کہ معاہدے کے حساب سے میں اپنی وین سے ملتی چلتی ایک رینٹل وین زیادہ سے زیادہ 3 ماہ کے لئے ہی استعمال کر سکتا ہوں اُس کے بعد مجھے اپنا انتظام خود کرنا ہوگا۔

وقت گزرتا رہا اور میری ڈانج وین تیار ہو گئی۔ راوی جین ہی جین لکھ رہا تھا کہ ایک دن صبح وین کے اشارت کرنے پر ایک ایسی آواز آنے لگی جو پہلے نہیں سنا کی دی تھی۔ میں کھانے کے وقت میں وین کو فارمیسی کے پڑوس کے گیراج میں لے گیا۔ میری بات سن کر آڑے نے خود وین چلا کر ایک داؤ بٹل لیا۔

”مہارک ہو!“ آڑے نے خوش ہو کر کہا۔

”رکس چیر کی؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ کیوں کہ میں تو کوئی نئی خبر سننے کو تیار تھا۔

”گاڑی میں مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ اب تمہاری لائٹی نکل آئی سمجھو۔“

میرے تاثرات سے عاری چہرے پر اُس نے رحم طلب نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی بیوی باربرا کو آواز دے کر بلوایا۔ اور گاڑی میں خرابی کی تحریری رپورٹ دکھائی۔ فرط خوشی سے باربرا کا بھی چہرہ دکھ اٹھا۔

”مستر لطیف!“ باربرا نے کہنا شروع کیا۔ ”آڑے نے

تحریراً، مینوفیجرنگ فالٹ کی رپورٹ دے دی ہے۔ ہم لوگ چونکہ ڈانچ کمپنی کے منظور کردہ سروس اور ریپئر شاپ والے ہیں لہذا اس کی بنیاد پر تمہارے حق میں کچھ بہتر ہونے والا ہے۔ تم اسی وقت، جہاں سے گاڑی لی ہے اُسی ڈیلر کے پاس وین لے جاؤ۔“

راقم تقریباً ساڑھے تین سو میل دور پڑوس کی ریاست میری لینڈ میں ڈیمین ڈانچ والوں کے پاس، سوا پانچ گھنٹوں میں پہنچ گیا۔ باربرانے وہاں فون پر میری وین کی خرابی کا پہلے ہی بتلا دیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے رساؤ وین کو چلایا اور فوراً ہی مجھے زیر دست پیشکش کی، وہ یہ کہ میری پہلے والی 4 سیلینڈر، اسٹینڈرڈ ڈانچ کارواں وین، 23 انٹرٹ پرلی تھی۔ اب بغیر کسی انٹرٹ کے، 6 سیلینڈر والی فل لوڈڈ، گرانڈ کارواں اسپورٹس، جو اسٹینڈرڈ وین سے ایک فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی تھی، بل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سال کے لیے بیئرول بالکل مفت۔ اس کھت بڑھت کے بعد کہ میں نے یہ پیشکش اپنی رضامندی سے، بغیر کسی دباؤ کے قبول کی، مجھے یہی وین مل گئی۔ یوں میں تھکن وکن سب بھول کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

اگلی شام فارسی بند کر کے میں سیدھا حورا کے ہاں گیا۔ یہ خبر سن کر وہ بھی خوش ہوئی لیکن میری نئی وین میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

”آخر تم نے مسلسل یہ تیسری نئی گاڑی سلور رنگ ہی کی کیوں لی ہے؟“ نورا نے عجب سوال کر دیا۔

”پتا نہیں کیوں؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو تھا کہ کیا رنگ پسند ہے میں نے کہا کہ جو موجود ہو۔ اس جواب کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور میں جانے کے لیے اٹھ بیٹھا۔ ویسے بھی رات ہو رہی تھی اور مجھے اگلی صبح 9 بجے فارسی کھانا کھانا تھی۔

میں اس نئی وین میں نیو جرسی، نیو یارک اور اٹلانٹا، ریاست جارجیا بھی گیا، یوں 15 دن ہو گئے۔ اور سبواں دن آگیا۔ شام کے چھ بجے ایک اور ڈانچ وین والے نے میری وین کو پیچھے سے ٹکر مار دی۔ ڈانچ کے پچھلے اور اگلے بھر جاپانی گاڑیوں کی طرح پلاسٹک کے ٹیپس بلکہ لوہے کے ہوتے تھے۔ میری گردن میں جھکا آیا اور گاڑی میں پیچھے خفیف سا ڈینٹ۔ اُس کی وین کو بھی کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وین چلانے والا کوئی گورا تھا۔ کہنے لگا کہ پولیس کیس نہ کرنا۔ ڈیل یہ ہوئی کہ وہ اپنی جیب سے میری وین کا کام کرائے گا اور میں

پولیس اور انشورنس کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔ یہاں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں بھی 16 کے چکر سے واسطہ پڑ گیا۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ڈینٹر پیٹر نے مجھے بڑی عزت سے اپنے سرپرست گاہک کا درجہ دے دیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ سرپرست کی حیثیت سے میں آنے والی گاڑیاں مار کے اُس سے مرمت کروانے آؤں۔

حالات بتدریج بدلتے گئے۔ اور بقول ثاقب لکھنوی۔

باغیاں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن، یہ نیک تھا وہی ہے ہوا دینے لگے قصہ مختصر یہ کہ پہلے میری ہفتے کی چھٹی ختم کی گئی پھر میرے پیسے بھی کم کر دیے گئے۔ قانونی طور پر میں ابھی یہاں سے کام چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اسی فارمی سے میرا ورک پرمٹ بنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اب غلامی کا دور شروع ہوا۔ اوپر سے عین اُس زمانے میں فارمی والوں کے اس ”عمدہ سلوک“ کی وجہ سے بیوی بچے میرے پاس آنے سے رہ گئے۔ اگر میرا میوزک کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید سب ٹھیک نہ ہوتا۔ میں نے اس دوران روزانہ 5 سے 6 گھنٹے کی پورڈ کی خوب مشق کی۔ جب تک ممکن ہوا اس کو کیش بھی کرایا۔ میرے زیادہ تر میوزک پروگرام ہفتے کی رات اپنی ریاست سے باہر ہوا کرتے تھے۔ اب جب ہفتے کی چھٹی ختم تو وہ کام بھی ختم۔ یوں مجھے مجبور ہو کر دیوالیہ پن چھوڑ کر 7 کا آؤٹیک اسٹے لینا ہی پڑا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے دیوالیہ پن کے قوانین کے مطابق یہ حکم امتناعی فی الفور نافذ ہو جاتا ہے جس کا رو سے آپ کو قرض دینے والے، کریڈٹ کارڈ والے، گاڑی کی اقساط والے، کسی بھی قسم کے قرض خواہ اس چھوڑ کو فائل کرنے والے سے ایک ٹیڈی پانی کا تقاضا نہیں کر سکتے۔ اس کا فیصلہ بینک رپسی کی عدالت میں ایک ہی نشست میں کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کا شکر کہ وہ میرے حق میں ہو گیا۔ ڈان موٹر کمپنی، کریڈٹ کارڈ، کار انشورنس کمپنی کے نمائندوں نے عدالت میں اپنے موقف کے لیے کوئی وکیل یا نمائندہ سرے سے بھیجا ہی نہیں۔

ان سارے واقعات میں قارئین سمجھ چکے ہوں گے کہ چرکی خاتون نورا کے پاس ایسی کوئی ناہیدہ قوت ضرور تھی جس نے مجھے ہر بار حادثات سے بچائے رکھا۔ میرا نقصان خود بخود پورا ہوا۔



آواز کا جادوگر

سعید احمد خان

اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے ورنہ تو اس دنیا میں کوئی بھی بات نئی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے حروف کی گرہیں کھولتی، سماعتوں میں شہد کھولتی آواز جب ہوا کے دوش پر سفر کرتی، سات سمندر پار کے برصغیر پہنچتی تو اپنی الگ پہچان بنا کر ذہنوں کو اسیر کر لیتی۔ لوگ گھڑی پر نظریں جمائے اس آواز کو سننے کے لیے منتظر رہتے۔

فسوں ساز اندازِ بیاں کے ماہر کی روداد



ہیں تو وہ بھی اپنے اپنے دماغ میں سن چاہی تصویریں تخلیق کرنے لگتے ہیں۔

رضاعلی عابدی بھی اپنی مدھور آواز سے تصویریں بناتے تھے۔ جادو جگاتے تھے اور دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آواز کی

ریڈیو کی دنیا بہت کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں مصروف عمل اشخاص اپنی آواز سے لوگوں کو تعلیم تفریح اور معلومات پہنچانے کے لیے آواز کے آثار چڑھاؤ سے تصویریں بناتے اور سننے والوں کو دکھاتے ہیں۔ سامعین تک جب ان کے جملے پہنچتے

دنیا سے ان کا رابطہ بی بی سی سے ریٹائرمنٹ کے بعد ختم ہو گیا، لیکن اپنے حقیقی کالمز اور تحریر کی سلطنت میں اپنے کام کی بنا پر دنیا بھر کے کروڑوں اردو پڑھنے والوں سے رابطہ، تعلق اور رشتہ استوار ہے اور یہ وہ رشتہ ہے جس میں سدا سلامت رہنے کی بہت قوت اور طاقت ہے۔

آواز کی دنیا میں شامل ہونے سے پہلے رضاعلی عابدی اخبار سے جوئے ہوئے تھے۔ اس جہان رنگ و رعنائی میں اُن کی آمد تیس نومبر انیس سو چھتیس کو رُڈ کی اُتر پردیش میں ہوئی۔ یہ تاریخ پیدائش مختلف تحریروں کے مطابق ہے لیکن رضا علی عابدی نے ریڈیو پاکستان بہاول پور کے اسٹوڈیوز میں اُن کے اعزاز میں منائی گئی ایک شام میں اپنی حیات کے تمام بہار آفریں برسوں کی یادیں کچھ یوں کشیں۔

میری تاریخ پیدائش 1935ء کی ہے، 1947ء سے پہلے جب تحریک پاکستان عروجِ پستی میں کم کئی کے باوجود اس میں شریک تھا، اور ”لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان“ کے نعروں کی ہچکنا آوازوں میں ایک آواز میری بھی تھی، والد صاحب نے میرے لیے مسلم لیگ کے رضا کاروں کی یونیفارم سلوا دی تھی۔ میں ٹوپی اور یونیفارم پہن کر بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ جلسوں میں بھی شامل ہوتا تھا۔

بالآخر پاکستان بن گیا۔ ہم یوپی کے شہر رُڈ کی میں رہتے تھے، 14 اگست کی رات بڑی دلولہ انگیز تھی، اس کی یادیں ہمیشہ میرے ہمراہ رہتی ہیں، اُسی رات آل انڈیا کے پاکستانی حصے کو ریڈیو پاکستان بننا تھا تو اس رات ہم جاگ رہے تھے۔ پاکستان کو کو انگریزی کی فرمان کے مطابق بننا تھا اور 14 اگست کی رات کو ہم نے جشن منانا تھا۔ میرے والد کی گراموفون اور ریڈیو کی دکان تھی۔ وہ دوسری عالمی جنگ کی خبریں بہت شوق سے سنا کرتے تھے گھر میں بہت عمدہ ریڈیو تھا۔ چھت پ بہت بڑا ایریل لگا ہوا تھا، جس کی مدد سے وہ ریڈیو تہران، ریڈیو ماسکو، ریڈیو برلن سنا کرتے تھے، بعد میں بی بی سی شروع ہوا۔

14 اگست کی رات ریڈیو لاہور لگایا گیا اور ٹھیک 12 بجے وہاں سے مصطفیٰ اہدائی نے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کا اعلان کیا، جس سے تاریخ کا دھارا مڑ گیا اور نیا عہد جنم لے کر تازہ ہو گیا۔ اس وقت لیکن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا نغمہ بھی سنایا گیا۔ گلیوں میں جشن کا سماں تھا، لوگ ناچ رہے تھے، گارہے تھے۔

لوگوں نے قد ملیں بنائی تھیں ان کو روشن کر کے ہوا میں چھوڑا گیا۔ تاحہ نگاہ دائرے کی شکل میں قد ملیں روشن

تھیں۔ صبح ڈان اخبار میں پہلے صفحے پر پاکستان کا قومی پرچم اور صبح سرکاری پینشن دی گئی تھی۔ آزادی مل گئی، ہندوستان کی کچھری میں ساری رپورٹس ہندی میں لکھی جانے لگیں، یہ جذبہ دیکھیے کہ انہوں نے چندہ اگست کے بعد یہ کام شروع کر دیا تھا، ہم آج تک اردو کو نہیں اپنا سکے۔ شاید قومی جذبے میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

ریڈیو پاکستان بہاول پور کے آئگن میں سجا بی گئی شام میں رضاعلی عابدی کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کے فنی، تخلیقی اور تحقیقی سفر کی روداد کے دوران کہیں کسی جانب سے سوال اُبھرتا تو رضاعلی عابدی گزرے دنوں کی بازیافت میں مصروف ہو جاتے تھے۔

وہ بتاتے ہیں۔ ”بچوں کے لیے کہانیاں میں نے بچپن میں ہی لکھنا شروع کر دی تھیں۔ گھر میں مفت روزہ پھول آیا کرتا تھا، لیکن وہ اس کے آخری دن تھے۔ امتیاز علی تاج اس میں تھے، قرۃ العین حیدر جو عمر لڑکی تھیں وہ اس میں لکھتی تھیں، پھول بند ہوا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پیامِ تعلیم نامی بچوں کا رسالہ نکلتا شروع ہوا وہ ہمارے ہاں آتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر، حسان وغیرہ اس میں لکھتے تھے۔“

گزرے دنوں کی تصویریں بازیافت کریں تو اکثر دھندلی ہوتی ہیں لیکن رضاعلی عابدی کا حافظہ کمال کا ہے۔ انہیں ان تصویروں کے ایک ایک رنگ، انگ اور انداز سے واقفیت ہے۔ وہ اپنے بچپن کی بازیافت کر رہے تھے۔ ”انہی دنوں دلی سے بچوں کے لیے کھلونا شروع ہوا۔ اس رسالے میں کرشن چندر، راجا مہدی علی خان جیسے لوگ بچوں کے لیے لکھا کرتے تھے، وہ رسالے میں پڑھتا تھا اس میں اپنی تحریر بھی بیچنے لگا تھا لیکن کبھی کچھ چھپا نہیں۔ ایک تقریب کا سلسلہ تھا۔ بڑے بھائی کی شادی کے سلسلے میں لکھنؤ، بذریعہ ریل گاڑی جا رہے تھے، وہاں جیسے پہلی کتاب ملی، شفیق الرحمن کی لکھی ہوئی، حماقتیں۔ وہ میری پہلی بڑوں کی کتاب تھی جس میں عمدہ لطیفے تھے۔ میں نے حماقتیں کا لطیفہ کھلونا کو بھیجا وہ چپ گیا، بعد میں ادریس دہلوی سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے حماقتیں آپ سے پہلے پڑھ لی تھی، تو انہوں نے جواب دیا جی میں ایسے معاملات میں زور دیر کر دیتا ہوں بہر حال یوں میرا لکھنے کا سلسلہ جاری ہوا۔“

ہندوستان کی تقسیم نے مسلمانوں کو ایک نئی پناہ گاہ دی۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر جب ہندوستان، بھارت اور پاکستان کے نام سے ابھر کر سامنے آیا تو انگریز بہادر کو یہاں سے رخصت

ہوتا پڑا۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہجرت عمل میں آئی۔ بہت سارے خاندان اور افراد تقسیم کے فوراً بعد ہی لئے پئے قافلوں کے ہمراہ اپنے اپنے مقام رزق تک پہنچ گئے، کچھ خاندانوں نے تاخیر سے سفر جاری کیا۔ جوش ملیح آبادی یہاں دیر سے آئے، رضا علی عابدی کا خاندان بھی ذرا دیر سے آیا۔ ان دنوں کی یاد رضا علی عابدی صاحب کے حافظے میں یوں محفوظ ہے۔ ”1950ء میں ہم کراچی آ گئے۔ یہاں میں نے روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحے میں لکھنا شروع کیا، پھر دوستوں بڑھتی گئیں، فطرت میں صحافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، والد صاحب انجینئرنگ سے وابستہ تھے، میرے سارے بھائی بھی انجینئر بن گئے لیکن میں سب سے الگ تھا، کراچی آ کر میں نے میٹرک کیا۔ کالج میں داخلے کا وقت آیا تو فیصلہ ہوا کہ صحافت کی جانب جانا ہے، میرے لیے طے ہو گیا کہ یہ لڑکا ساری عمر جوتیاں پٹختا رہے گا اور خالی جب لیے دنیا گردی کرے گا، فائدے کرے گا۔ یہ بھی اور اس کے بال بچے بھی۔ صحافی اور وہ بھی اردو زبان کا! ہمیشہ بھوکا رہتا ہے۔ ان حملوں نے میرے عزم و حوصلے کو ڈمکایا نہیں، ہاں یہ احساس ضرور ہوا کہ تمام بھائیوں میں، میں ہی ناکارہ ہوں۔ بی اے کے لیے اکنامکس رکی۔ پوسٹیکل کا مضمون مجھے دلویا گیا۔ اسی دوران جنگ میں مجھے ملازمت مل گئی۔ 1957ء میں، میں اخباری صنعت سے وابستہ ہو گیا۔“

”مجھے پہلا بہت پسند تھے۔ میں نے میر غلزل الرحمان سے کہہ رکھا تھا، مجھے راولپنڈی ضرور بھیجے گا۔ چنانچہ مجھے تیس پینتیس کامیوں کے ساتھ، ریل کے ڈبے میں بیٹھا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا۔“

اخبار تیس پینتیس کامیوں کے ساتھ چلتا تھا۔ ایڈیٹر دس بارہ ہوتے تھے۔ اس وقت تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی۔ پنڈی میں پہلے دن جنگ نو ہزار، دوسرے دن گیارہ ہزار، تیسرے دن تیرہ ہزار چھپا، اور تیزی سے پندرہ ہزار کی تعداد تک پہنچ گیا اور ہماری تنخواہیں بڑھا کر دوسو روپی گئیں۔ اس تنخواہ میں بھی ہم اٹھ آنے کے سامان اور چار آنے کی چٹائی میں گزار کرتے تھے۔ صوبہ تین تھیں، لیکن یہی صوبہ تین انسان کو بڑا بناتی ہیں، سخت جان کرتی ہیں۔

اسی دوران ونچ بورڈ آگیا، ہماری تنخواہ 330 روپے ہو گئی، اور ساتھ ہی شادی بھی ہو گئی، اتنی (80) روپے کا قلیٹ کرایہ پر لیا، لیکن تنگی تھی۔ گزارہ مشکل تھا، حرج تھی کراچی سے 500 کی آفر ہوئی تو وہاں چلے آئے۔ اسی دوران برطانیہ میں

صحافت کی ٹریننگ کا موقع ملا، تو میں ویلز میں تین مہینے کی ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ یادگار اور خوشگوار دن تھے۔ وہ ملک مجھے بڑا منظم لگا۔ چنانچہ بی بی سی میں موقع ملا تو اطہر علی کی سفارش پر مختلف آزمائشوں سے گزر کر وہاں منتخب ہو گیا۔ یہ 1972ء کا واقعہ ہے۔“

اور یہی ایک صحافی کے براڈ کاسٹر بننے کا مرحلہ ہے۔ یہ عابدی صاحب کی زندگی کا اٹکھٹا تجربہ تھا جس میں عملی شمولیت نے انہیں شہرت عام بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا۔ رضا علی عابدی اس منظر نامے کو کس طور دیکھتے ہیں، ذرا انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ ”میں تحریری شعبے سے تقریری شعبے میں آگیا، یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ میری عبارت تقریری نہیں تحریری ہوا کرتی تھی، بی بی سی میں مجھے اپنی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنے کے سنانا تھا۔ بہت جلد میں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھال کر گفتگو کی زبان لکھنا شروع کر دی، کیونکہ دنیا بدل گئی تھی۔ اپنی لکھی ہوئی عبارت پڑھتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ کون سے الفاظ کی ادائیگی مشکل ہے، کن الفاظ سے اب گریز کرنا ہے، میں نے بہت جلدی یہ عہدہ پایا کہ گفتگو کی زبان، سب سے زیادہ شیریں اور اثر انگیز ہوتی ہے، چنانچہ میں نے اپنی تربیت کی اور مجھے اس پر ناز ہے کہ میں بول چال کے لفظ لکھتا اور بولتا ہوں۔ میری کوئی سی کتاب پڑھیں، آپ کو لگے گا میں بول رہا ہوں، گفتگو کی زبان سے زیادہ شائستہ، ہل زبان اور کوئی نہیں ہوتی۔“

”1972ء میں پہلے پہل جب ریڈیو کی دنیا میں داخل ہوا تو یہ گر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو۔ حقیقی تربیت گزرتے وقت نے کی، اور میں نے یہ گر، گرہ میں باندھ لیا کہ اپنی زبان سے نہیں، اپنے سننے والوں سے محبت کرو، میں خوش نصیب ہوں میں نے سننے والوں سے محبت کی جواب میں مجھے بھی محبت ملی۔“

اس واقعے اور تجربے کو رضا علی عابدی صاحب نے اپنی کتاب ریڈیو کے دن میں تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے اور اس میں انہوں نے اس امر کا بار و گرا اعتراف کیا ہے کہ سننے والے سے محبت کریں گے تو وہ آپ کو محبت، چاہت اور اپنائیت کے بلند و بالا راج سکھائیں پر بٹھا دے گا۔ جب آپ دوسروں کو اہمیت دیں گے تو جواب میں آپ کو محبت، توجہ اور رعایت ملے گی۔ اور پھر خلوص محبت کا تو کوئی مول ہی نہیں ہے۔ ہماری اخلاقی اقدار، رویے اور تعلیمات یہی سکھاتی ہیں کہ دوسروں کو اہمیت دیں۔ انسانیت کا پیغام ہی یہی ہے۔

بھی سفر نامہ ہے۔ میرے یہ سارے فیچرز ٹیوب پر موجود ہیں۔ بچوں کا پروگرام شاہین کلب ہوا کرتا تھا اُس میں ڈاکٹر عائشہ صدیقی کی والدہ جلیلہ ہاشمی مرحومہ بچوں کے لیے لکھ کر لایا کرتی تھیں وہ بھی یادگار درن تھے۔

بات ذرا چند برس پہلے کی ہے۔ ہمارے مزاج میں سبل فون شامل نہیں ہوا تھا۔ گفتگو اور رابطے کے لئے ٹیلیفون کا سہارا لیا جاتا تھا یا پھر چچا غالب کی پیروی میں خط لکھے جایا کرتے تھے۔ کیا دلکش، دلدار، سوتی، بجلی اور فنی روایت تھی۔ آدمی ملاقات کو الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی بے سے پوری ملاقات بنا لیا جاتا تھا۔ ریڈیو جو قوم اور عوام کے دل کی آواز ہے، اس کے سامعین مختلف پروگراموں سے منسلک رہنے کے لیے خط لکھا کرتے تھے۔ ہر اہم تہوار پر تہنیتی کارڈ بھیجے جاتے تھے۔ خطوط میں یوں لگتا تھا کہ ہم سب ایک قبیلے سے ہیں، جو پال جی ہوئی ہے، بیٹھک جی ہوئی ہے، داستانیں جی جاری ہیں، کہانیاں کبی جاری ہیں، شرویات سے تواسخ کی جاری ہے اور غنچیں بہار رنگ لٹانی پھر رہی ہیں۔ موبائل فون نے تعلقات کی ساری چاشنی چھین لی اور بدلے میں صرف باتیت پرستی دی۔

بی بی سی لندن اردو سروس کا ایک اور مقبول پروگرام تھا انجمن۔ اس پروگرام میں سامعین کے خطوط کے جواب شامل ہوتے تھے، رضاعلی عایدی سے پہلے یہ پروگرام تقی احمد سید کیا کرتے تھے۔ ایک بار تقی صاحب بیمار ہو گئے تو انجمن کا انتظام مجھے سونپ دیا گیا، اور پھر یوں ہوا کہ تقی صاحب صحت یاب ہو کر واپس آ گئے مگر انجمن پروگرام میرے ہی پاس رہا۔

”میں نے تیس سال تک سننے والوں کے کالوں میں شائستہ، حسد، نفیس زبان پہنچائی اور مجھے اس پر ناز ہے۔ میرا سننے والوں سے گہرا رشتہ بندھ گیا تھا۔ میں نے پروگرام کا مزاج ہی بدل دیا۔ ہم نے سامعین کے مسائل اُن تک پہنچائے، اُن سے خمیر کیے۔ ایک خط آیا اجیر شریف سے کہ برسوں گزر گئے ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی، ہمارے لیے دُعا کرائیے۔ ہم نے خط پڑھا، لاکھوں لوگوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سال بعد خط آیا کہ میری بیٹی پیدا ہوئی ہے، میں نے اس خط کو بھی نشر کیا۔ یہ اجیر، محلّہ شوگر گراں کا واقعہ ہے، میں وہاں دورے پر گیا تو خوشخبری والا خط رکھ کر لے گیا، مگر پہنچا، شرف نام تھا ان کا، بیٹی کا نام رضوانہ رکھا تھا۔ انہوں نے میری بڑی خاطر مدارت کی، بہر حال کہنا یہ تھا کہ میرا اس طرح جو رشتہ سامعین سے بنا وہ میرا قیمتی اثاثہ ہے، اس پر مجھے ناز ہے، وہ

بات زندگی آموز رویوں کی ہوئی، ہم ساری زندگی سیکھنے کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ دانشوروں کی باتیں بھی ہمیں زندگی کا حقیقی چہرہ عکس دکھانے میں معاونت کرتی ہیں۔

لوگ برطانیہ اور پاکستان کا موازنہ کرتے ہیں، میں انہیں سختی سے ٹوک دیتا ہوں، میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ موازنہ نہ کریں، وہ اور دنیا ہے، یہ اور دنیا ہے۔ ملتی جلتی دنیا کا موازنہ نہ کیا ہے۔ انگریزوں میں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت جلدی پرکھ لیتے ہیں اور خوبیوں کو اوپر لاتے ہیں، میرا ریڈیو سے تیس سال تعلق رہا ہے، میں جو لکھتا تھا اُسے نشر ہونے سے پہلے کوئی نہیں دیکھتا تھا، ایک دو مرتبہ حقائق میں تو معذرت کر لی، لیکن میں نے کبھی کچھ ایسا نہیں کہا جو ناگوار گزرے، بہر حال مجھ پر اعتماد کیا گیا تو میں نے اُسے ٹھیس نہیں لگائی اُس کے لیے محنت کی۔

جب مجھے پتا چلا کہ رضاعلی عایدی ایک حیثیت اختیار کر رہا ہے تو مجھ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوئی کہ اپنی شہرت میں کمی نہیں آنے دینی، اور اپنے آپ کو راہ سے ہٹنے نہیں دینا۔ آف دی ٹریک نہیں ہونے دینا، وہ احساس آج تک ہے، آج بھی جنگ میں چھ کالم کی سطر مجھ سے کہتی ہے دیکھو تمہارے نام پہ کس حرف نہ آئے، یہ بات سنا ہے اور یہی بات حوصلہ بڑھاتی ہے، اسی بات نے مجھے ایک مقام پر قائم رکھا ہے، اور یہی اپنے آپ کو دربان کرنا ہے۔

میں بے شمار لوگوں سے ملا، اُن سے گفتگو کی، مہدی حسن سے لے کر محمد رفیع تک، حکیم محمد سعید سے لے کر نوشاد علی تک اوگوں سے ملا، سیاست سے ہمیشہ گریز کیا، میرا رجحان فنی طرف زیادہ تھا سو بے مثال فیچرز پیش کیے۔ مجھے سہولتیں ملیں، وسائل ملے۔ جرنیلی سرگ کرنے کے لیے جب میں کراچی آیا تو پورٹ سے دلی جا رہا تھا تو غیر ملکیوں کا پنجاب سے انڈیا میں داخلہ اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے بند تھا، لیکن وسائل کے کمال کی وجہ سے میں کراچی سے دلی گیا، وہاں میں نے کتب خانہ فیچر پروگرام کیا، یہ انڈیا آؤں لاہیریری کی کتابوں پر تھا، پروگرام مقبول ہوا تو جرنیلی سرگ کیا۔

پشاور سے کلکتہ تک سفر کر کے یہ فیچر پایہ تکمیل تک پہنچا۔ پھر شیر دیا کے ساتھ سفر ہوا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے ریل کہانی ترتیب دی، اُس وقت تک فیچر کارہنجان ختم ہو رہا تھا اور کرنٹ انفیوز کے پروگرام مقبول ہو رہے تھے۔ بقیہ فیچرز کو تو میں نے جوں کا توں کتابی شکل میں ڈھال دیا، لیکن ریل کہانی کے لیے میں نے مزید تحقیق کی اور پھر اس کو مکمل کر کے چھاپ دیا۔ وہ

ثوبان رضی اللہ عنہ

(وفات 54ھ/673ء) صحابی۔ ابو عبد اللہ

کنیت۔ آپ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ثوبان غلام تھے آنحضورؐ نے خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا ”دل چاہے تو اپنے خاندان والوں میں چلے جاؤ اور دل چاہے پھرے ساتھ رہو۔“ حضرت ثوبان نے اس شرف کو خاندان پر ترجیح دی اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں طبیعت نہ لگی اور یہاں سے شام چلے گئے اور مدینہ میں سکونت اختیار کر لی۔ بعد میں مدینہ سے محض منتقل ہو گئے اور یہیں وفات پائی۔ ثوبان آنحضورؐ کے خادم خاص تھے اور مسلسل آپؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہیں آنحضورؐ سے استفادہ کرنے کا زیادہ وقت ملا تھا۔ انہیں 127 حدیثیں از بر تھیں بقول حافظ ابن عبد البر ثوبان ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔“ ثوبانؓ کے علاوہ میں محدان بن طلحہ، راشد بن سعد، جبیر بن نفیر، عبد الرحمان ابن غنم، ابو ادیس فولانی قابل ذکر ہیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جو جماعت صاحب علم وافتا تھی ثوبان اس کے ایک رکن تھے۔ لوگ ان سے احادیث سنتے تھے۔ ان کے معاصرین دوسروں سے سنی ہوئی حدیثوں کی تصدیق ان سے کراتے تھے۔ آنحضورؐ کی حیات مبارکہ میں اور وفات کے بعد بھی دونوں زمانوں میں آپؐ کا فرمان مبارک ثوبانؓ کے پیش نظر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ زبان نبویؐ سے جو کچھ سن لیا وہ ہمیشہ جان کے ساتھ رہا جس چیز میں بھی آنحضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہوتا وہ ہمیشہ اس سے محترز رہتے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، پشاور

فرزاند اب 33، 32 سال کی ہے، پہلے کھوٹی، اب ”تمیں سال بعد“ کے عنوان سے کتاب لکھی تو اس میں اس کا خوالہ بھی ہے، اب اس کے ہاں تین بچے ہیں، میں نے اُسے گھوکہ کہ مخاطب کیا تو کہنے لگی۔ ”اب میں گوری ہو گئی ہوں۔“ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد عوام میں ریڈیو کی حیثیت اُجاگر کرنا ہے۔“ انجمن میں تین طرح کے خطوط آتے تھے۔ تحریری کلمات سے بھرے ہوئے خط۔ دوسرے نمبر پر شکایتی خط اور تیسرے نمبر پر وہ خطوط آتے تھے جن میں انسانی جذبات کا اظہار کیا گیا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر دادا جان علیل تھے، چل بے۔ والدہ بیمار ہیں مگر اس حالت میں بھی پروگرام سنتی ہیں۔ باجی کے ہاں بچوں کا پیدا ہونے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان جذبات کا احترام کرتے ہوئے حسبِ حال جواب دیتا تھا اور یہی عنصر مقبولیت کو فروغ دیتا ہے، دلوں میں بٹھاتا ہے۔ جب ہم دوسروں سے اُن کی بان کے مزاج کی اور ان کے دل کی باتیں کرتے ہیں تو وہ ہمارے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ ”انجمن“ کا مرکز و محور برس تک بہار تھا۔ عابدی صاحب لوگوں سے ان کے دل کی باتیں کیا کرتا تھا اور یہ طے ہے کہ جو آپ سے آپ کی بات کرتا ہے، ہم سے ہماری ہی بات کرتا ہے ہم اس کو دل کی گہرائیوں میں برتر مقام دیتے ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ بات ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں اُتر جائے۔

انجمن نے ریڈیو کی ریت روایت کے مطابق سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے اور لندن سے بولنے والے صدکاروں کو محبت کے ایک رشتے میں پرو دیا۔ اور یقین کر لیجئے کہ محبت کے موتیوں سے پروئی ہوئی لڑکیاں بڑی پائیدار ہوتی ہیں، بہت مضبوط ہوتی ہیں۔

فیچر، خبر، لکھنے، پر فارم کرنے میں، سب سے مرکزی کردار زبان کا ہوتا ہے، چنانچہ زبان سادہ آسان اور عام فہم ہو تاکہ ابلاغ مکمل ہو سکے۔ دوسرے عناصر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہماری کوشش ہو کہ زبان عام اور بول چال کی ہو۔ بہاول پور، دارالسرور صحرائے چولستان کی سنگت میں سانس لینے والا خوبصورت ڈویژن ہے جس کے تین اضلاع ہیں، بہاول نگر، رجم یار خان اور بہاول پور۔ صحرا، جنگل، میدان، زرعی رقبے سے آراستہ اس ڈویژن کے سارے قدرتی منظر، اور تہذیبی روپے اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔ بہاول پور ما قبل اسلامی ریاست تھی۔ ثواب سر صادق محمد خان اس ریاست کے آخری فرمانروا تھے۔ انہوں نے پنڈت مہرو سے تاریخی جملہ

کہتے ہوئے ریاست بہاول پور کا الحاق پاکستان سے کیا تھا۔ وہ جملہ ہے۔ ”پاکستان میرے گھر کا سامنے والا دروازہ ہے اور بھارت پچھلا دروازہ۔ ہر شریف آدمی اپنے گھر کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوتا ہے، پچھلے دروازے سے نہیں۔ بہاول پور کی پہچان اس کی اعلیٰ علمی روایات، تہذیبی اقتدار اور ثقافتی روایتیں ہیں۔ یہاں تعلیمی اداروں کی کثرت ہے۔ اسی بنا پر میں نے بہاول پور کو تعلیمی اداروں کا، درس گاہوں کا جمعہ بازار قرار دیا۔

یہ سال دو ہزار تیرہ کے ماہ نومبر کی بات ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ کی صوفیانہ شاعری کی تاثر اس خطے کی ایک الگ شناخت ہے۔ صفت زبان شاعر کی صوفیانہ فکر سے آراستہ اس شہر کی اُم الدرس گاہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے علمی، ادبی، صحافتی اور براڈ کاسٹنگ خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر بیٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی اور یوں میری خدمات کو سراہا۔

اس کے علاوہ چند اور اعزاز اور ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہوں۔ تہذیب فاؤنڈیشن پاکستان نے مجھے دی لٹریچر ایوارڈ سے نوازا۔ پاکستان آرٹس کونسل کراچی نے سال دو ہزار چودہ میں اعتراف کمال شیڈ عطا کی۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے adjunct professor بھی مقرر کیا۔

نومبر دو ہزار تیرہ میں جب میں اسلامیہ یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری وصول فرمانے آیا تو ریڈیو پاکستان بہاول پور کے اسٹوڈیوز میں میرے اعزاز میں شام منائی گئی تھی جس کی صدارت جمیلہ ہاشمی صاحبہ کی دختر ڈاکٹر عائشہ صدیقی نے کی تھی۔ وہ مجھے ملنے کے لیے جناب سیاد پرویز کی دعوت پر خصوصی طور پر اسلام آباد سے تشریف لائی تھیں۔ انہیں اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو وہ یوں گویا ہوئیں۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ جب رضا علی عابدی شاہین کلب کیا کرتے تھے تو مجھے بھی اس میں بولنے کا موقع ملتا تھا، بچپن کی سنہری یادوں کے سنگ سنگ بے شمار برس گزار دیے، یقین چاہیے اُن خوشگوار دنوں کی خوشبو آج بھی خوشیاں نکھیر دیتی ہیں، ایک سہانی اور رسد ملی یاد یہ بھی ہے کہ ان دنوں ایک پروگرام میں شرکت کے گیارہ پاؤنڈ مار کرتے تھے، پیسے کا کر بڑی خوشی ملتی تھی، خرچے پورے ہوتے تھے۔ وہ ایک مختلف زمانہ تھا، جس میں بی بی سی کے پاس بڑے بڑے نام تھے، ساجد قریشی تھیں، اجلا شرا تھیں، یہ لوگ اتنا خوبصورت بولتے تھے کہ لطف آ جاتا، اُن کا بولنا ایسا تھا جیسے کوئی موسیقی سن

رہا ہو، اور اب اگر یہ کہا جاتا ہے کہ بی بی سی وہ بی بی سی نہیں تو یہ بھی حقیقت ہے، اب جو بچے وہاں پہنچے ہیں، وہ یوں بولتے ہیں ”آپ بتائیں نا آپ کیا کر رہی ہو؟“ یہ سن کر یوں لگتا ہے کہ بندہ سوچ میں پڑ جائے کہ یہ تحریر جاری ہے یا بند پڑی ہو رہی ہے، یہ ایک نئی اردو نے جنم لیا ہے، جو نہ تتر ہے نہ بتر، میں عابدی صاحب سے ایک سوال کرنا چاہوں گی کہ پچھلے دنوں لاہور میں آرٹ اینڈ فکچر کے نام سے ایک فیسٹیول ہوا، اس میں ایک سیشن تھا۔ جرنلسٹ خالد احمد اور انتظار حسین موجود تھے، اس سیشن میں اکثر باتیں لوگوں کے اوپر سے چلی گئیں، ایسی اردو سن کے یوں لگتا ہے کہ ہمارے سر کے اوپر سے گزر رہی، یہ Generation Change ہے، جس میں ہم لوگ اردو بھولتے جا رہے ہیں، اس گپ کو کیسے پورا کیا جاسکتا ہے، اپنی زبان کی خاص طور پر بول چال کی زبان کی ترویج اور تحفظ کیسے کریں گے؟“

اسی ایسے کو میں نے یوں دیکھا۔ ”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زبان کے امکانات تاریک ہیں لیکن زبان کی موت کا منظر نامہ نظر نہیں آ رہا، اس لیے گھرے پڑے حالات میں بھی اردو ایک توانا زبان ہے اور اپنے اظہار کے لیے تمام وسیلے اس کے اختیار اور رسائی میں ہیں، قصور حالات کا یہ ہے کہ زندگی میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آ رہی ہے، پہلے ٹیلی ویژن کی پلکار ہوئی پھر انٹرنیٹ نے جو راستے کھولنا شروع کیے وہ معاشرے کے رویوں کو بدل رہے ہیں، تین سال سے میں نے کسی کو خط نہیں لکھا، اب خط لکھنا بند ہو گیا ہے، ٹیلیفون نے رابطے آسان کر دیئے ہیں رہی سہی کسر SKYPE نے پوری کر دی ہے، یہ تمام چیزیں ایک دن زبان پر تو اثر انداز ہوں گی، ہمارے ادب کے قلم پارے نئی نسل سے دور ہو جائیں گے، لیکن ایک چیز ہے، برطانیہ میں لوگوں کو ٹیکسپیئر کے ڈرامے جدید زبان میں لکھ کے عام فہم بنانا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی، اور بیکل کالموں کو جدید انداز میں لکھا گیا۔ اسی طرح میری کتاب یہاں دستیاب تھی، مولانا محمد حسین آزاد کی حکایتیں جو انہوں نے 1880 میں لکھی تھی، میں نے انہیں نئی نسل کے لیے تمام زبان کو جدید زبان میں تبدیل کر دیا۔ آخر میں ایک قصیدہ لگا کر اُس کی اور بیکل زبان بھی رکھی، ایک ڈرچ کہ جو چاہے وہ بھی پڑھ لے، تو اس طرح کی صورتیں ہوتی تھیں، جیسے کہ میری خواہش ہے کہ میں اپنی کتابوں کا ایک نوجوانوں کا ایڈیشن بھی نکالوں، اسی کو دوبارہ لکھوں۔ برطانیہ میں سب عظیم کتابوں کے مختصر ایڈیشن بھی نکالتے ہیں، جلی، مونسے حروف میں بھی

کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس پر خوشنہی نے پانچویں موسم کی تلاش کرتے ہوئے ایران، زاہدان چلے گئے، وہاں انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ڈالی گئی سات سو کلو میٹر لمبی ریلوے لائن کو بننے سنورتے اور اس پر سفر کرتے جانوروں کو دیکھا اور یہ بھی کہ ریل کی پٹری جھجے سے پہلے اس بے آب و گیاہ دشت میں کسی بیماری کے پھیلنے سے اس راستے پر تین ہزار آدمی ایک ساتھ مر گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی ان کے ڈھانچے رہ گئے۔

دوران سفر ہر ایک بڑاؤ پر مقامی لوگوں سے ملنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن صرف انہی کے لیے جو مسافرت کے فائدوں سے لطف اندوز ہونے اور نئی نئی باتیں سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں۔ کوئٹہ سے نکلتے ہوئے عابدی صاحب ارد گرد کے سارے مناظر اور ممکن ہونے پر معاشی رویوں کا مطالعہ کرتے گئے، لوگوں کے مزاج سمجھتے گئے، ان کی باتوں سے، پراسرار گھاتوں سے حظ اٹھاتے گئے۔ ”آب گم“ میں جگہ کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو جواب ملا۔ ”یہاں اوپر پہاڑوں سے پانی آتا ہے، ادھر آگے گم ہو جاتا ہے۔ آب گم، یعنی پانی گم ہو گیا۔ ظاہری معنی اس کے یہی ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔“ یہ حیرت کا مقام ہے۔ ”کیسے بھولے لوگ ہیں۔ علمی تحقیق کا کام بھی اللہ پر چھوڑتے ہیں۔“

اللہ پر چھوڑنا، ایک طرح کی تن آسانی ہے کہ جستجو اور تحقیق کی روش کو اپنانا ہی نہیں ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے رویے تعمیر و ترقی کے راستوں میں ستر راہ بننے ہیں۔ یہ علم و دانش کے روشن درختوں اور راستوں سے دور رہنے کی روش ہے جو کسی طرح بھی قابل قبول اور قابل تقلید نہیں۔ آج ہم یورپ کی ترقی اور خوشحالی کو اپنے آباء کی تحقیقات کا ثمر سمجھتے ہیں، یہ کیوں نہیں سوال اٹھاتے اور سوچتے ہیں کہ ہم نے اب تک کیا کیا ہے اور تاحال کیا کر رہے ہیں۔ الزام لگانا، دوسرے کے سر ڈالنا سب سے آسان کام ہے اور اس کام کو ہم بڑے شوق سے کرتے ہیں۔

علم و دانش کے موتیوں کو یورپ میں دیکھیں تو بقول شاعر مشرق ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال، دل سے پارہ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم نے بائیسیت قوم علم و دانش کے اٹانے سے منہ جان بوجھ کر موڑ رکھا ہے۔ وقت و مکان کی بات ہے علم ہماری پہچان ہی، علم ہماری شناخت، کتابیں کہیں کہیں دستیاب ہوتی تھیں، ان تک رسائی ہر ایک کے بس میں ممکن نہیں تھا۔ مگر آفرین ہے شوق رکھنے والوں پر وہ طویل

حصہ بھی کم ہے، تو یہ افسوس ناک تصادم ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کئی وی کو فروغ ملا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ بہت عمدہ ٹیلی ویژن ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

یہ ریڈیو بھی تھا جس نے فلم کو محمد علی جیسا جذبات نگار فنکار عطا کیا۔ یہ ریڈیو بھی تھا جس نے مہدی حسن کو شہنشاہ غزل بنا دیا۔ یہ ریڈیو بھی تھا جس نے قصور کی اللہ وسائی کو ملکہ مہ ترنم نور جہاں کا درجہ دلوا دیا۔ مصطفیٰ قریشی، غلام محی الدین، روینہ قریشی ریڈیو ہی کی آوازیں تھیں جنہوں نے پردہ و پیمیں اپنی بھرپور آواز کی بدولت، معجبی ہوئی آواز کی بدولت حکمرانی کی۔

☆.....☆

رضاعلی عابدی صاحب ایک مسافر ہیں۔ اس مسافر نے جب ریل کہانی کے لئے سفر کا آغاز کیا اور کوئٹہ پہنچے تو وہاں سے سائین 1935ء کے زلزلے کی باتیں سنوائیں۔ ایک اور اہم واقعے سے روشناس کرایا۔ وہ مسافر کی زبانی کہتے ہیں۔

”کوئٹہ کا انٹین پیچھے رہ گیا۔ وہی انٹین جس کی عمارت 1935ء کے زلزلے میں ڈھس گئی تھی۔ اور پھر 28 اکتوبر 1939ء کو موجودہ عمارت کھولی گئی تھی۔ کوئٹہ ایک سپر سس بلوچستان کے پہاڑوں سے سندھ کے ریگزاروں میں اترنے کے لیے درہم دیولان کی طرف بڑھنے لگی۔ آگے مل کھائی ریلوے لائن نظر آنے لگی جو پورے ایک سو دس سال پہلے 1886ء میں ڈالی گئی تھی۔“

”اس وقت مرزا محمد ہادی رسوا یا آئے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ انہوں نے امرا و جان ادا بھی یادگار کتاب لکھی مگر اب کے یاد ہو گا کہ جب یہ ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی، مرزا صاحب کی ملازمت کوئٹہ میں تھی۔ وہ ریلوے کی انجینئرنگ کالج سے سند لے کر آئے تھے اور اس ریلوے لائن کے سروے میں شریک تھے۔“

”ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ ہادی رسوا نہ ہوتے تو ایک شریف گھرانے کی لڑکی کھٹے تک اور ہندوستان کے میداؤں کی ریل گاڑی کو کھٹے تک نہ جاتی۔“

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر رضاعلی عابدی صاحب ریل کہانی کا ارادہ نہ باندھتے تو ہم بے شمار تہذیبی، ثقافتی اور علاقائی رسوم، رواج، عقائد اور روایات سے نا آشنا رہتے۔

رضاعلی عابدی کا ایک رُخ متعین نہیں ہے۔ وہ چاروں کھونٹ دیکھنے، جانچنے، پرکھنے کے بعد پانچویں کھونٹ کی طرف بھی رخصت سفر باندھتے ہیں اور ہر جانب سے ایسے منظر ڈھونڈ کر لاتے اور دکھاتے ہیں جو فکر و نظر کے زاویوں کو روشن

سے طویل سفر طے کر کے دور دراز علاقوں میں جاتے اور سرگاہوں اور کتب خانوں سے مقدور سے بڑھ کر استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ واپس آتے اور دوسروں کو اپنے علم سے مستفیض کرنے کی سعی کرتے۔ پھر چھاپہ خانوں کا دور آ گیا۔ کتابیں چھپنا شروع ہو گئیں، لیکن پڑھنے والوں کا قحط رہا۔ نامساعد حالات میں کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ کتابیں چھپتی رہیں۔ کچھ کتابوں کو قاری میسر آ گئے، کچھ کتابیں اس نعمت سے محروم رہیں۔ قدرت کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہر شے کی ایک عمر ہوتی ہے مگر یادوں اور کتابوں کی عمر نہیں ہوتی، یہ انسانوں کی روانی تک اپنی کہانی کہتی رہتی ہیں اور سننے والے سنتے رہتے ہیں۔

رضاعلی عابدی پہلے صحافت سے وابستہ تھے۔ جانتے تھے کہ برصغیر میں لکھی جانے والی اور چھپ جانے والی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لندن کی اٹلیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری میں موجود ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں جو برطانیہ نہ جانتیں وہ ضائع ہو گئیں۔ اور اگر کچھ موجود ہیں تو ان تک رسائی بہت مشکل ہے۔ بار بار چھپنے والی اور مشہور کتب تو پڑھے لکھے گھرانوں میں دستیاب ہوتی ہیں لیکن وہ کتابیں جو قارئین کے نظر انداز کرنے کی بنا پر وقت کی دھول میں اٹ گئیں کہ اب کہیں نہیں دکھائی دیتی، ان کو تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ ہاتھ تو طے موضوعات کیا تھے۔ آگاہی تو ملے کہ لوگوں کی دلچسپی کا محور و مرکز کیا تھا۔ خبر تو ہوا اس وقت معاشرے کی اساس کن اصول و ضوابط پر تھی؟ اور یہ سب کتابیں ہی تلا سکتی ہیں کہ یہ اپنے عہد کی آئینہ دار عکاس ہوتی ہیں۔

رضاعلی عابدی نے سوچا کیوں نہ ان ساری کتابوں کی جستجو اور کھوج میں لگلا جائے۔ تلاش کر کے انہیں پڑھا جائے اور پھر بی بی سی لندن کے سامعین تک پہنچایا جائے۔ کام مشکل تھا۔ لیکن سوچ ہر مشکل کا حل ڈھونڈ لیتی ہے۔ بس جذبہ صادق ہونا چاہیے۔ عابدی صاحب جانتا جاتے تھے کہ مشہور و معروف کتابیں جب پہلے پہل شائع ہوتی تھیں تو کیا رنگ روپ رکھتی تھیں۔ ان کی زبان کا ڈاکٹہ کیا تھا، خیال کی لذت کیسی تھی؟ اور پیشکش کا انداز کیا تھا؟ مثنوی زہر عشق جب لکھنؤ میں شائع ہوئی تو عورتوں کو اسے دیکھنے، پڑھنے کی اجازت نہ تھی البتہ مردانے میں اس کا بہت چلن تھا، وہاں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھی۔ عابدی صاحب کے پیش نظر یہ بھی دیکھنا تھا کہ نظم اور نثر کی کتابیں جو ابتدا میں شائع ہوئیں ان کی تخلیق میں تخلیق کاروں کو کیسی کیسی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ کس طرح ان

کتابوں کو سجایا اور سنوارا گیا اور کس طورہ عوام کے ہاتھوں میں پہنچ کر قبولیت کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں اور یہ کہ انہیں قبولیت کا اعزاز ملا بھی کہ نہیں؟ کیا وہ وقت سے پہلے ہی مگر دفراموشی اودھ کر دینائے اذیان سے رخصت ہو گئیں؟ سفر طویل اور مشکل ہو تو کم زور راہ سے بات نہیں بنتی۔ وسائل کا خزانہ ضروری ہوتا ہے۔ رضاعلی عابدی کو بی بی سی کی تائید و حمایت کی صورت میں یہ زور راہ دستیاب تھا۔ یہ منصوبہ انہوں نے بی بی سی کی اردو سروس میں شمولیت کے کچھ عرصے بعد ہی ارباب اختیار کے روبرو رکھ دیا تھا۔ انہوں نے نادر و نایاب کتابوں کا احوال صرف بارہ ہفتوں یعنی ریڈیو کی زبان میں ایک سہ ماہی نشر کرنے کی اجازت وے دی۔

جھیل کی گہرائی کا اندازہ پانی میں اترنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ عابدی صاحب کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ علم و حکمت، دانش و دانائی کے کتنے بڑے سمندر میں غوطہ زن ہونے جا رہے ہیں۔

سال انیس سو پچھتر میں رضاعلی عابدی نے اٹلیا آفس لائبریری کے انچارج جناب سلیم قریشی اور برٹش لائبریری کے نگران قاضی محمود الحق سے ملاقات کی، مدعا بتلایا، یکٹالک دیکھا، کتابیں طلب کیں۔ انہیں کتابوں کی ترسیل کے لیے قواعد و ضوابط سے آگاہ کیا گیا۔ اور پھر سفر کا آغاز ہو گیا۔ رضاعلی عابدی کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں۔ ”اس روز میرے سامنے دو راوڑہ خادروں کھلا۔“

”انیسویں صدی کیسے بڑے آدمیوں کی کیسی عظیم صدی تھی۔ چھاپہ خانہ بنایا تھا۔ لوگوں میں کتب بنی تو کیا، حصول علم کا شوق اور شعور کم تھا۔ کیسے کیسے دکھ اٹھا کر اردو نا پ بنایا گیا تھا۔ کیسے کیسے جتن کر کے مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا قرآن کا اردو ترجمہ اور کلیات میر تقی میر جیسی ضخیم کتابیں کیوں کر کے چھاپی گئی تھیں۔ انہیں دیکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ دل ہوتا ہے سپارہ۔“

”مجھے صاحب تحقیق شروع ہوئی۔ تین کتابوں کے لیے درخواست دی گئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ایک ایک جلد میں چار چار پانچ پانچ کتابیں بندھی ہوئی ہیں۔ میں تین کتابیں دیکھنے گیا تھا، کوئی بارہ پندرہ کتابیں دیکھیں۔ اس کو انگریزی میں بولس کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھائی تین برس کی اس جستجو کے دوران میں نے انیسویں صدی میں چھپنے والی تقریباً ساری کتابیں دیکھ ڈالیں۔ میں کتابیں دیکھنا گیا اور حرمت کے سمندر میں ڈوبتا گیا۔“

جتو اور تحقیق کے اس سفر نے رضا علی عابدی کی فکر پر کون سے دریچے روشن کیے، ذہانت کے کون سے دروازے کھولے دانائی کے کون سے جہانوں سے شناسائی کرائی، یہ ایک طویل گفتگو ہے۔ رضا علی عابدی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں۔ ”اس میں ایک فائدہ ہوا اور ایک نقصان۔“

”فائدہ یہ کہ علم اور حکمت کے سینکڑوں نئے دیکھے اور جس قدر علم سیٹ سکتا تھا، سمیٹا۔“

”نقصان یہ ہوا کہ اب تک اپنے جس علم میں فخر کا کچھ عنصر شامل ہو گیا تھا، اس کی پوری عمارت نیچے آری اور اپنی کم علمی کے احساس نے ایسا زور مارا کہ باقی عمر کے لیے کتاب اور کتب بینی میرے وجود کا حصہ بن گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں کم مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور ہوس کا یہ عالم ہے کہ عمر کم ہے اور میرا منہ نکلنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ، بہت زیادہ۔“

اکساری کا انداز دیکھئے۔ ایسی ہی شخصیات جن کی ذات میں اپنے وجود کی اہمیت کا احساس نفی کی طرف رخ کر جائے مقبول ہوتے لگتی ہیں، یہ بھی تو درویشی ہے۔ ڈپٹی کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان بہاول پور جناب سجاد پرویز نے بھی اسی امر کی تائید کی کہ عابدی صاحب کو کتب بینی کا شوق جنون کی حد تک لاحق ہے۔ خدا کرے یہ علت ہر ایک مسلمان کو لگ جائے اور اپنی اصل کی جانب گامزن ہو جائیں۔ علم جو ہماری شناخت اور پہچان ہے اس سے ہم دور رہنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ہماری پہچان علم کیوں ہے اس بارے میں جناب رضا علی عابدی نے ایک خوبصورت توجہ پیش کی ہے۔ جب آپ پروگرام انجمن کیا کرتے تھے اور چار جانب سے آنے والے خطوط کے جواب دیا کرتے تھے، یہ تب کا قصہ ہے۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں۔ ”ایک بار باتوں باتوں میں دین اور عقیدے کا ذکر آ گیا۔ اس پر کراچی سے ایک انقلابی گھرانے کی خاتون کا خط آیا جنہوں نے غلطی کا اظہار کیا۔ اس روز چندہ منٹ کے پروگرام میں وہی ایک تہ خط تھا اور اس کا جواب تھا۔ چند لفظوں میں وہ جواب یہ تھا کہ جس زمانے میں جادوگری کا زور تھا۔ اس دور کے انبیاء نے ویسے ہی معجزے دکھائے اور جب طب اور معالجے نے زور پکڑا تو اس دور کے نبی نے مریضوں کو اچھا اور مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے دکھائے۔ لیکن جب علم و آگہی کا دور شروع ہونے لگا اور آسمان سے پہلی آیت اتری تو اس میں پڑھئے، قلم اور کتاب کا ذکر تھا۔ لوگ اپنے پیغمبر سے مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھائیے تو آسمان سے صدا آتی تھی کہ

یہ کتاب ہی ہمارا معجزہ ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ یہودیت کی بنیاد خوف پر، عیسائیت کی بنیاد پیار پر اور کوئی مانے یا نہ مانے اسلام کی بنیاد علم پر رکھی گئی۔“

تو ہم جو مسلمان ہیں ہماری اساس علم ہے، کتاب ہے، پڑھنا، لکھنا اور دیکھنا ہے۔ رضا علی عابدی صاحب نے جب کتب خانے کھولنے شروع کیے تو تفویض شدہ سہ ماہی کو صاحبان ادارہ کو بلا توقف اور بلا تکلف بڑھانا پڑا۔ کتب خانہ کی تعریف، پسندیدگی اور مشوروں سے آراستہ خطوط کی قطار بندھ گئی۔ سامعین میں ذی وقار شخصیات شامل ہونے لگیں۔ رضا علی عابدی فرماتے ہیں۔ ”تعریفوں نے طول کھینچا اور اوپر سے یہ کہ نہایت اعلیٰ طبقے کے اہل علم حضرات کے خط آنے شروع ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور، مولانا امتیاز علی خان عری زادہ اور ابن اشاء مرحوم کے خطوں نے بی بی سی کی انتظامیہ کو بہت متاثر کیا اور مجھے اشارہ مل گیا کہ بارہ ہفتوں کی پابندی ختم۔ جب تک جاہو پروگرام جاری رکھو اور ہر پروگرام جو صرف دس منٹ کا ہوتا تھا، اس کا دورانیہ بڑھا لو۔“

”بس پھر جو یہ دامن کشادہ ہوا تو میں کتب خانوں سے جھولیوں بھر بھر کر کتابیں لایا اور باقاعدگی سے سننے والوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں مالامال کر دیا۔“

رضا علی عابدی کا کتب خانہ تقریباً اڑھائی برس تک آن ایئر جاتا رہا، لوگوں کو قیمتی ذخیرہ ملتا رہا، پروگرام لوگوں سے پسندیدگی کی سند لیتا رہا۔ یہ ایک اعلیٰ اور عمدہ پروڈکشن تھی جس میں اسکرپٹ تو ظاہر ہے عابدی صاحب کا ہی ہوا کرتا تھا لیکن بعض مقامات پر پیشکش کو بے مثال بنانے کے لیے صدا کاروں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اداکار صدا کار محمود خان مودی، اداکار سعید جعفری، اداکار ایلا ارون، یادو عباس، نعمان الحق، سلیمہ ہاشمی، منصور مجر، راشد اشرف وغیرہ ان نایاب کتابوں میں سے اقتباسات وغیرہ پڑھنے میں شامل رہے۔ مقبولیت اور شہرت نے اس پروگرام کے قدم چومے۔ اڑھائی برس تک یہ پروگرام سامعین تک معلومات فراہم کرتا رہا اور پھر اختتامی لمحات کا نزول ہوا۔ کتب خانہ کے آخری پروگرام میں ابن اشاء نے بھی شرکت کی۔ بقول رضا علی عابدی۔ ”ابن اشاء علاج کے لیے لندن آئے ہوئے تھے اور یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ بے شمار لوگوں میں سکرا نہیں بانٹیں، تب رخصت ہوئے۔“

رضا علی عابدی کو اس بات پر حیرت ہے کہ انیسویں صدی میں جب چھاپہ خانہ تو آگیا لیکن لوگوں میں کتابیں تو کیا

پڑھنے ہی کا شعور نہ تھا۔ اس وقت باکمال جواہر پارے وجود میں آئے، لکھنے والوں کی طبائع کو روانی ملی، اور طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ جو نادر و نایاب اور انمول جواہر پارے رضاعلی عابدی کی جستجو بھری نگاہوں تک پہنچے ان کی تعداد بے شمار ہے، چند ایک ناموں سے واقفیت حاصل کر لیجئے اور سوچیے کہ ہم کن خزانوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ مگر اس سے پہلے ایک حوالہ، ایک سوچ، ایک کرن جو راستہ دکھائی ہے، اور یہ رضاعلی عابدی ہیں۔

”لیکن ان کتابوں میں اردو نثر کا جو تاریخی شہ پارہ شامل ہے، میرے علم کے مطابق اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا وہ اردو ترجمہ جو مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے 1790ء میں کیا تھا۔ جب اردو نثر لکھنے کا سرے سے رواج ہی نہیں تھا اور جو نثر لکھی جاتی تھی، اسے پڑھنا اور سمجھنا محال ہے۔ جب میر تقی میر اور سودا جیسے عظیم شاعر فارسی میں نثر لکھتے تھے اور جب انگریز حاکموں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ لکھی ہوئی زبان بول چال کی زبان کوئی نہیں لکھتا چنانچہ انہوں نے دینی سے نشیوں کو بلایا اور کہا کہ عام بولی کی زبان لکھو۔

اس ساری کارروائی سے بارہ تیرہ سال پہلے شاہ عبدالقادر عام بولی ضولی میں قرآن کا ترجمہ کر چکے تھے جو اتنا عام فہم تھا کہ بعد میں انگریزوں نے سنہ 1830ء کے لگ بھگ اسے لکھتے سے شائع کیا۔ اردو زبان خصوصاً نثر کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے لکھتے غالباً اس ترجمے کو ادب میں شمار نہیں کرتے۔ تصور کیجئے کہ جب شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کچھ ایسا ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ کتاب جنس شک بیچ اس کے راہ دکھائی ہے واسطے پرہیز گاروں کے۔“ اس وقت شاہ عبدالقادر یہی ترجمہ یوں کر کر رہے تھے۔ ”اس کتاب میں کچھ شک نہیں، یہ راہ بتائی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔“ اس کے علاوہ تفسیر میں تو شاہ صاحب نے بالکل آج کی زبان لکھی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”یہ سورۃ اللہ صاحب نے ہندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔“

اب دیکھئے وہ چند ایک کتب جن تک رضاعلی عابدی کی رسائی ہوئی۔ ویسے یہ فہرست بہت طویل ہے۔

اخلاق ہندی (1803ء)، رفاہ خلافت (1874ء)، نہایت الناصر (1876ء)، معالجات شافیہ (1847ء)، مہاس النساء (1874ء)، داستان جلیہ خاتون (1865ء)، لاکوں کا کھیل (1871ء)، تہذیب الاخلاق (1891ء)،

گلدستہ ریاست (1894ء)، دھارنا تیاگی (1870ء)، عجائب المخلوقات (1877ء)، عجائب و غرائب (1867ء)، مخزن حکمت (1870ء)، آثار الہسانید (1847ء)، تحقیقات چشتی (1864ء)، غرابت نگار (1876ء)، تاریخ راجستان (1877ء)، حال بنگ کابل (1851ء)، تواریخ یادگار صوبہ دارمطوبہ 1873ء، تاریخ عجیب (1880ء)، تاریخ کشمیر (1846ء)، اور دوسری بے شمار کتب اس فہرست میں شامل ہیں۔

یہ ساری کتابیں اپنا بھرپور تعارف لے کر کتب خانہ میں موجود ہیں۔ سال دو ہزار بارہ میں آرٹس کونسل پاکستان کراچی کے زیر اہتمام اس کی تقریب رونمائی ہوئی، عابدی صاحب سرخرو ہوئے۔ 1975ء۔ 1976ء میں پیش کیا جانے والا خیال حقیقت کے روپ میں ڈھلا تو چہرے چاندنی سے چمک گئے۔ ہندوستانی ادیبوں کے کمال کا اعتراف ”کتائیں اپنے آباء“ کی صورت میں بی بی لندن اردو درس سے بھرپور پذیرائی پہلے ہی حاصل کر چکا تھا جو کتابیں اس پروگرام میں شامل ہونے سے رہ گئیں تھیں وہ کتب خانہ میں آئیں۔ میں کئی انیس سو پچاسی میں سید ہاشم رضا نے فرمایا تھا: ”کتب خانہ ایسی کتاب ہے جو رضاعلی عابدی کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔“ یہ ایک بڑی شخصیت کا دوسری بڑی شخصیت کے لیے اعلیٰ اعتراف ہے۔

رضاعلی عابدی صاحب کی تخلیقات کا ذکر ہو تو صورت یوں سامنے آتی ہے۔

۱: جرنیلی سڑک۔ گریڈ ٹریک روڈ۔ پشاور سے نکلتے۔ بس پرسفر۔ بی بی سی سے یہ سفر نامہ مختلف اقساط میں نشر ہوا اور پھر 1986ء میں شائع ہوا۔

۲: شہر دریا۔ 1992ء (لڈاخ سے ٹھٹھہ تک سفر پاکستان میں)

۳: جہاز بھائی۔ 1995ء۔

۴: ریل کہانی۔ 1997ء کوئٹہ سے نکلتے 16 اقساط پر مبنی ریڈیو ڈراما میٹری تھی۔

۵: کتب خانہ: نایاب کتابوں اور لائبریریوں کی جستجو۔

۶: اردو کا حال

۷: اپنی آواز (شارٹ اسٹوریز)

۸: جان صاحب (شارٹ اسٹوریز)

۹: حضرت علی کی تقریریں

۱۰: جانے پہچانے

۱۱: ملکہ کنوریہ اور فشی عبدالکریم

۱۲: نغمہ گر

۱۳: پہلا سفر (۱۹۸۲ء میں ہندو پاک کا پہلا سفر۔ جون

2011ء میں آکسفورڈ نے چھاپا)

۱۴: ریڈیو کے دن (ذاتی یادداشتیں۔ 2011ء سنگ

میل)

۱۵: اخبار کی راتیں (سنگ میل)

۱۶: تیس سال بعد (پہلا انڈو پاک سفر۔ اور ہمارے

کتب خانے اضافوں کے ساتھ)

۱۷: پرانے ٹھگ: (انیسویں صدی میں برطانوی

ہندوستان میں ٹھگوں کی کہانیاں)

رضاعلی عابدی کی آواز میں جس طرح دوسروں کو گرفت

میں لے لینے کا اعجاز تھی، اسی طرح ان کی تحریریں بھی پڑھنے

والوں کو اپنے حصار میں جکڑ لینے کا ہنر رکھتی ہیں۔ ان کی ڈیجیٹر

ساری تصنیفات میں سے جاری بی بی اردو سروس سے دستیاب

کے دوران لکھی گئیں۔ رضاعلی عابدی صاحب اپنی ان کتابوں

کا بڑا خیال کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال سو فیصد درست

ہے۔ کتاب اپنے موضوع، اسلوب، خیال، انداز اور پیشکش کی

ہنر کاری کے بھرپور استعمال سے قامت کی قیامت تک رسائی

حاصل کرتی ہے۔ اور رضاعلی عابدی کی یہ چاروں ہی کتب بھی

ماں مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے نام جان لیجئے۔

۱: کتب خانہ

۲: جرنیلی سڑک

۳: شیر دریا

۴: ریل کہانی

پہلی دونوں کتابوں کی اشاعت میں کراچی کے اسماعیل

سجد صاحب کی کاوشوں کا رنگ بھرا ہوا تھا۔ تیسری اور چوتھی

تخلیق سنگ میل پبلیکیشنز کے نیاز احمد کی محبتوں کی مرہون منت

ہے۔ پہلی تینوں تصانیف بی بی اردو سروس کے لیے لکھے گئے

ریڈیائی پروگراموں کی تصاویر ہیں۔ البتہ ریل کہانی کی داستان

ذرا مختلف ہے۔ پہلی تینوں کتابیں ریڈیائی مسودوں پر مشتمل

تھیں۔ ریل کہانی کے ریڈیائی مسودوں میں بہت کچھ کہنے سے

رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس میں بعد میں اضافے ہوئے۔ رضاعلی

عابدی صاحب فرماتے ہیں۔ ”چوتھی کتاب ریل کہانی کا قصہ

مختلف ہے۔ کوئٹہ سے کلکتے تک ریل کے سفر کا احوال سنانے

کے لیے مجھے بہت کم وقت ملا تھا جبکہ میں نے لمبی چوڑی

ریسرچ کی تھی اور بہت سی دلچسپ باتیں ریڈیو پروگرام میں

شامل ہونے سے رگہ مکی تھیں جس کا مجھے قلق تھا۔“

”آخر یہ ہوا کہ جب میں اس پروگرام کو کتابی شکل دینے

بیٹھا تو وہ ہزار دلچسپیاں اس میں حلول کر گئیں اور اس طرح میں

ریل کہانی کو اپنی قیمتی تصنیف تصور کر رہا ہوں۔ اس دوران میں

بی بی سی سے ریٹائر ہو گیا اور ریل کہانی کی نہ کوئی تعارفی تقریب

ہوئی نہ کوئی منہ دکھائی۔ خیر اس کا مجھے اس لیے افسوس نہیں کہ

میرے قارئین نے نہ صرف کتاب پڑھی بلکہ مجھے ایک نوجوان

کی بات یاد ہے جس نے فون کر کے مجھ سے کہا کہ ریل کہانی

آپ کی بہترین کتاب ہے۔“

رضاعلی عابدی صاحب کا پہلا عشق کتاب ہے، کتاب

پڑھنا، کتاب لکھنا اور کتاب پڑھنے کی جانب دوسروں کو مائل

کرنا۔ یہ ایک جنون ہے، ایک جذبہ ہے، ایک شوق ہے، ایک

عشق ہے جو محکم کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ عشق اور

ٹھگ چھپائے نہیں جاتے۔ رضاعلی عابدی نے بھی کتاب سے

پیار کیا اور اس پیار کو کئی قلم، کبھی کاغذ اور کبھی آواز کے وسیلے سے

دوسروں تک پہنچایا۔

جرنیلی سڑک، گرینڈ ٹرک روڈ، شیر شاہ سوری کی محنت

اور محبت کا نشان صدیوں کی آوازوں اور پروازوں کو اپنا ہمراز

بنائے ہوئے ہے۔ بہت دل چاہتا ہے کہ سفر کے جرنیلی

سڑک کی ان نشانیوں سے من آگن روشن کیا جائے لیکن ہر اک

کے بس میں کہاں کہ وہ ابتدا سے انتہا تک کے ایک ایک پڑاؤ پر

یادوں کا الاؤ روشن کر سکے۔ رضاعلی عابدی نے یہ حوصلہ باندھا

اور ہمیں ہمارے شاندار ماضی سے متعارف کرایا۔ محبتوں کی

داستانیں روز روز نہیں لکھی جاتیں، اور جو داستانیں موجود ہیں

ان سے آگاہی و آشنائی حاصل نہ کرنا کوڑھ پشی کے زمرے میں

آتا ہے۔

الطاف گوہر جرنیلی سڑک کو زندگی بھر کی یادیں قرار دیتے

ہوئے کہتے ہیں۔ ”رضاعلی عابدی نے کیا کتاب لکھی ہے، ہر

صفحے پر جیسے رنگارنگ ٹھگنے گلے مل رہے ہوں، دھیمے مزاج کے،

لطیف نکتوں کے اور جذب میں ڈوبے ہوئے مشاہدات

کے۔ کیسی سادہ زبان میں کتنی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔ کتاب

پڑھ کر مصنف کے ایک تاریخی شاہراہ سے جذباتی لگاؤ کا اندازہ

پہنچا ہوا اور یوں بھی لگا جیسے پشاور سے کلکتے تک تمام راستے

زندگی بھر کی یادیں بھورے بادلوں کے ساتھ چلی آ رہی ہوں۔“

”رضاعلی عابدی ہلکے سے ایک تار چھیڑ دیتے ہیں اور

ذہن میں پورا ساری زندگی بھر اٹھتا ہے، بول سلگنے لگتے ہیں، خیال

بہراتے ہیں اور دھوپ میں چلتی ہوئی شاہراہ یادوں کا ایک سلسلہ

بن کر دیکھنے لگتی ہے۔“

گوہر مہمان خصوصی تھے اور مستنصر حسین تارڑ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے جو خود بھی سفر کے دہی ہیں اور کئی مقبول سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ کہتے ہیں۔

”اس تقریب میں سفر نامہ نگار کی حیثیت سے رضاعلی عابدی کو جو داد و تحسین ملی اس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ مجھے ان کا سفر نامہ ”جریلی سڑک“ پہلی بار پڑھنا آج تک یاد ہے۔ میں لندن میں تھا اور ماچھٹر کی بس میں سوار ہو رہا تھا، اسی وقت میں نے یہ کتاب خریدی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سفر کے دوران راستے کے سارے منظر دیکھوں مگر یہ کتاب عجب کام کر گئی۔ اس کے ورق کھولتے ہی میں برصغیر کے شہروں میں ٹھوکیا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ میں ماچھٹر نہیں بلکہ ہسرام جاؤں اور اپنی عقیدت کا خراج شیر شاہ سوری کی نذر کروں۔

رضاعلی عابدی نے جہاں جہاں کا سفر کیا، جس جس علاقے کا مشاہدہ کیا، جس جس خطے اور شہر کی سیر کی، اس کا پورا پس منظر اور پیش منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا جانچا اور پھر مربوط خیال کو اپنے سینے میں اتار کر لفظوں کے ہار بنا کر ایک ایک کے گلے میں ڈال دیا اور کہہ دیا کہ اب ہر کوئی اپنی فکر، بہت اور خیال کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوتا پھرے انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

پرت در پرت خیال کا جمال منفرد اور مختلف ہوتا ہے۔ رضاعلی عابدی کی سوچ میں بھی ہمہ پہلو رنگوں زاویوں اور ذائقوں کی آمیزش ملتی ہے اسی لیے ہم ان کی تحریروں دل کی آنکھوں سے پڑھتے اور اس کو باطن کی ہزار رنگ دنیا میں بسا لیتے ہیں۔ تحریر کو کمال کی اس منزل تک پہنچانے کے لیے یقینی طور پر مشاہدے اور مطالعے کی رفاقت کے ساتھ، حرف بٹنے کی ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ رضاعلی عابدی نے اپنے سفر کا آغاز سننے سے کیا تھا۔ تعلیم کی تحصیل ہو گئی تو لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ طویل عرصہ کاغذ، قلم اور اخبارات سے تعلق استوار رکھا۔ درمیان میں وقفے آئے لیکن ان وقتوں میں بھی آرام سے قلم پیٹھتے ہوں گے، سو قدرت اور فطرت کی رہنمائی میں آواز کی دنیا میں آگئے۔

عابدی صاحب آواز کی دنیا میں رہے تو محبتوں اور عقیدتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ دنیا بھر سے روزانہ محبتوں کا خراج ملنے لگا۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ فردزاں اور فرداواں رہے تو نس میں جوش و جذبہ اور توانائی لہریں لیتی، کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور اس کی ہر لہر میں ہر کوٹ میں عطاؤں کے ہزار رنگ ہوتے ہیں۔ رضاعلی عابدی بھی نوازے جاتے رہے۔

معروف داستان گو، نقاد اور افسانہ نگار جناب انتظار حسین نے رضاعلی عابدی کو سننے زمانے کا سند باوقار دینے میں اک ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ روزنامہ ڈان کے 29 اپریل 1994ء کی اشاعت میں اپنے کالم میں انتظار صاحب نے فرمایا۔ بی بی سی کے معروف براڈ کاسٹر رضاعلی عابدی بارہا پاکستان کے شہروں اور دور دراز علاقوں میں کھوٹے نظر آتے ہیں مگر اس بار وہ مختلف مہم پر ہیں اور سفر پر اپنی تیسری کتاب ”شیر دریا“ بغل میں دبائے۔ انہوں نے لاہور اور اسلام آباد میں ہونے والی تقریبوں میں شاندار خراج تحسین وصول کیا ہے۔ لاہور کی تقریب کی صدارت پنجاب کے اطلاعات کے سیکرٹری جناب منو چہر نے کی۔ جناب الطاف

کرلچی

پاکستان

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں، بہار و خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر تشویلیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

جرنیلی سڑک ایک شاہکار ہے۔ دریاؤں، میدانون، صحراؤں، سمندروں کی عکس گری تو اکثر کی گئی لیکن سڑک کو یہ مقام رضاعلی عابدی نے عطا کیا۔ جرنیلی سڑک میں سے ایک انتخاب دیکھئے۔

”ہم سنتے آئے ہیں کہ بستیوں کے مقدر دریاؤں سے جوے ہوتے ہیں، دریا اپنا کنارہ چھوڑ کر دور چلے جائیں تو آبادیاں ویرانوں میں بدل جایا کرتی ہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عظمتوں کی نشانیوں کے مقدر سڑکوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ سڑکیں اپنی راہ بدل جائیں تو یہ نشانیاں راہ میں ماری جاتی ہیں۔“

”شیر دریا“ میں رضاعلی عابدی نے دریائے سندھ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا سارا احوال پہلے ہی بی بی سی اردو سروس کی وساطت سے سنایا اور پھر کتاب کے ذریعے پڑھایا۔ ہر جگہ منفرد انداز نے دلچسپی کے سلسلے کو قائم رکھا۔ دوران سفر عابدی صاحب نے اپنی ایک آنکھ دریا کی لہروں پر رکھی اور دوسری دریائے کنارے آباد بستیوں پر اس طرح وہ انسانوں اور بہتے پانیوں کے میل ملاپ اور اس سے ابھرنے والے زندگی کے الاپ کو دیکھتے اور محسوس کرتے رہے۔ جناب انتظار حسین نے اس شہ پارے کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا تھا۔

”کتاب پڑھتے ہوئے خواہش بھی ہوئی کہ جا کر اس شیر کو دیکھوں جس کے منہ سے تبت والوں کے عقیدے کے مطابق دریائے سندھ کے دھارے چھوٹتے ہیں رضاعلی عابدی اس جگہ نہ پہنچ سکے۔ سند بادہوتا تو چہے بھی بننا شیر کے اس دہن تک جا پہنچنا جس سے یہ دریا ٹھانھیں مارتا ہوا نکلتا ہے۔“

”شیر دریا“ کی بات ہو کہ ”جرنیلی سڑک“ کی۔ ریڈیو کے دن ہوں کہ اخبار کی راتیں۔ کتب خانہ کی بات چلے کہ مفتی عبدالکریم ملکہ و کوکر یہ سے گفتگو کرے۔ جہاز بھائی ہوں کہ ریل کہانی۔ پرانے ٹھگ تو اب کتابوں میں ہی ملیں گے۔ رضا علی عابدی کی ہمت جوان ہے۔ تروتازہ جذبوں کے ساتھ پڑھنا، لکھنا اور زندگی کے سارے رنگوں سے لطف اندوز ہوتے رہنا اب بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔ وہ پڑھتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر، تجزیہ کاری اصولوں کے مطابق پڑھتے ہیں۔ معمولی اور ثبت عادتیں زندگی کے ہر ایک پل کو خوشوار بناتے ہوئے آنے والے ہر ایک پل کو مضبوط بناتی چلی جاتی ہیں۔ ریڈیو دنیا بھر میں اپنی وقت کی پابندی سے جانا، پہچانا اور مانا جاتا ہے، ریڈیو سے وابستہ لوگوں کی فطرت میں بھی وقت شناسی شامل ہو

جاتی ہے۔ رضاعلی عابدی کی سوچ، رویوں اور عمل میں بھی یہ مثبت خصلتیں نمایاں انداز میں موجود ہیں۔ اور ان کے ہر ایک کام میں چمکی رہتی ہیں۔

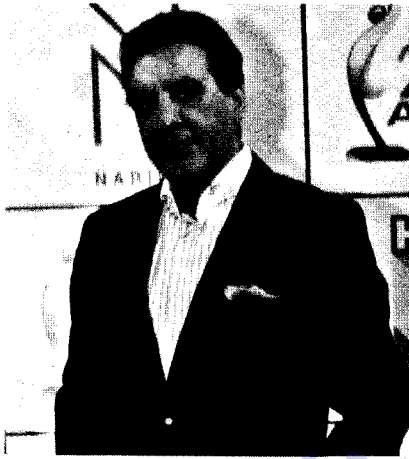
شوق کے ہزار رنگ، بہار سجانے میں جو دالہا نہ انداز دکھاتے ہیں، ان کا روپ انوکھا، نرالا ہوتا ہے۔ فصل بہار میں جب جان بہار انداز و اطوار کا جادوگر ہو جب کیفیات کس کمال کو چھوئیں گی اس کا اندازہ شاید ہی کوئی کر سکے، لیکن ہم نے ایسی بزم دیکھی جس میں شوق کے ہزار رنگ روشن تھے اور جتو کے ہزار زاویے جلوہ گر تھے۔ ہاں وہ محفل، آواز کی دنیا کے جادوگر، کئی کتابوں کے خالق، جانے انجانے، دیکھئے ان دیکھے راستوں کے مسافر، بی بی سی اردو سروس میں سیر بین کو شہرت کے بلند مقام تک پہنچا دینے والے رضاعلی عابدی کی رفاقت کا تھوڑی سی رضاعلی عابدی ایک بہت بڑا نام ہے، صحافت کا میدان ہو، ادب کا شعبہ ہو، آواز کی دنیا ہو، انہوں نے ہر جگہ شہرت و عظمت کے پرچم بلند کیے، اپنی ایک پہچان پیدا کی، اپنے سننے والوں سے ایک مضبوط رابطہ بنایا، تعلق قائم کیا اور اس کو نبھایا۔ انہوں نے آواز کے رابطے سے لوگوں سے جو رشتہ قائم کیا تھا، اس کے جواب میں دنیا بھر کے لوگوں نے انھیں جو محبت دی ہے، پزیرائی بخشی ہے، وہ بے مثال ہے۔ رضاعلی عابدی ہمارے دالہا نہ پن کو جانتے ہیں، انہیں ہماری جاتوں کی خبر ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کیا اس کو عروج تک لے گئے۔ اور سفر ابھی جاری ہے۔ خدا کرے محنت اور ریاضت کی سنت میں جاری یہ سفر ہم پر فخر و خیال کے سننے والے کے لئے کھولتا رہے، عابدی صاحب کا ہر بولتا رہے اور ہم سنتے، دیکھتے اور پڑھتے رہیں۔

”سفر جاری ہے“ سے یاد آیا بعض لفظ، کچھ جملے، چند ڈائلاگ ایک بار سننے جائیں تو زندگی بھر ساتھ بھٹاتے ہیں، جیسے پکڑا بھی پانی ہے میرے دوست، جیسے تاریخ یہ تاریخ ایسے ہی سفر جاری ہے۔

رضاعلی عابدی فیملی سمیت برطانیہ میں آباد ہیں، مگر ان کے دل میں پاکستان کے شہر، کلی کوچے، قریے، گاؤں، دیہات و حال ڈالے رہتے ہیں۔ ان کے ارد گرد، ان کے من آگن میں مشرق کی تہذیب، معاشرت، ثقافت اور رویت روایت کے سارے سہرے رنگ جھلکاتے رہتے ہیں۔

ہر دم دھمالی بارے سارے وجود میں
تم نے تو پور پور کو ٹھنکرو بنا دیا

☆☆☆



مرد و بحران

فلم نگری

انور فرہاں

اپنی جاذب نظر اداکاری کو اس نے زندگی کی صیقل پر چڑھا کر آب دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی الگ پہچان بنانے پر قادر ہوا کہ اداکاری بھی حقیقت لگتی۔ ممبئی کی فلم نگری میں پہنچتے ہی اس نے دھوم مچا دی۔

پاکستان کے ایک بڑے اداکار کے روز و شب کا احوال

دولت حاصل کرنے والا بھی کس قدر صبر آزما دور سے گزرا ہے۔ کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔ کس قدر مصائب و آلام سے گزرا ہے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری، صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ اپنی جدوجہد میں کی آنے نہیں دی۔ ہمیشہ یہی سوچا کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ آج اس نے دکھ دیا ہے تو کل کچھ بھی دے گا۔ اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر..... اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ اداکار، فلم ساز و ہدایت کار جاوید شیخ ہے جس سے آپ یقیناً بخوبی واقف ہوں گے۔ میں جاوید شیخ کے بارے میں اس کی کہانی سناتے ہوئے ایسی باتیں بتاؤں گا جو ان کہی ہیں، ان کے متعلق شاید آپ نے پہلے نہیں سنا ہوگا۔ مثلاً اپنے ڈراموں اور فلموں میں اتنی صاف، شستہ اور شائستہ اردو بولنے والا اہل لکھنؤ کی طرح شیریں لب و لہجہ میں مکالمہ ادا کرنے والا جاوید شیخ نسل پنجابی ہے۔ اس کی مادری زبان پنجابی ہے۔

اللہ اکبر..... اللہ بہت بڑا ہے۔ وہ ہم بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی کی قسمت میں دکھ لکھ دیتا ہے تو یہ اس کی مصلحت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جس بندے کو کبھی دکھ دیتا ہے اس سے پیار نہیں کرتا، دراصل وہ اپنے بعض بندوں کو آزماتا ہے۔ ان کے صبر و تحمل، عزم و ارادے کو دیکھتا ہے کہ میرے یہ بندے کتنے صابر و شاکر ہیں اور اس دکھ کی گھڑی میں بھی مجھے یاد رکھتے ہیں یا نہیں؟ آج میں آپ کو جس فنکار سے ملاؤں گا، وہ اداکار بھی ہے، ہدایت کار اور فلم ساز بھی ہے۔ بڑی اسکرین کے ساتھ ساتھ چھوٹی اسکرین کا بھی محبوب فنکار ہے۔ اس کا اور فیمیز میں بھی اپنے فن کی جولانی دکھاتا رہا ہے۔ ریڈیو ہے، ٹیلی ویژن ہے، اس کی آواز گونجتی رہی ہے۔ جب میں اس کی کہانی ملاؤں گا اس کے فنی سفر کی روداد بیان کروں گا تو آپ کو پتا چلا کہ اتنی کامیابیاں کیسے والہ، اس قدر عزت و شہرت اور

نہیں۔ رہ جاتے جب کبھی مار پڑتی تو روتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے وعدہ کرتے۔ ”ٹھیک ہے۔ آئندہ فلم دیکھنے نہیں جاؤں گا۔“

مکروہ جو بڑوں نے کہا ہے ”چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“ بہت سی بری باتیں، جیسے خود سری، بد نیزی، لڑنا جھگڑنا، ہم عروں کے ساتھ دنگا فساد وقت گزارنے کے ساتھ چھوڑ دی مگر فلم دیکھنے کا شوق ان کے سر پر سوار رہا۔

جاوید کی تمام بری باتوں کے باوجود ان کے بڑوں نے انہیں اچھا بنانے میں کبھی کسر نہیں چھوڑی۔ اسکول جانے کے قابل ہوئے تو اسکول میں داخل کرا دیا۔ شیخ جاوید اقبال کا پہلا اسکول ماڈل پبلک اسکول تھا جو راولپنڈی کے مرکز صدر میں واقع تھا جہاں انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے اسکول کی پڑھائی سے زیادہ فلم بینی پر دھیان دیا۔ برے اور آوارہ دوستوں کی صحبت نے ان کو پڑھائی سے ہی دور نہیں کیا بلکہ انہیں خود سر اور بد تمیز بھی بنا دیا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو ان کے بڑوں کے لیے قابل برداشت نہیں تھیں۔ تنگ آکر ان کے والد شیخ رحمت اللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ جاوید کو لے کر کراچی شفٹ ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ماحول کی تبدیلی سے ان کا یہ بڑا اوجھڑا سہرہ جاتے اور لکھنے پڑھنے پر دھیان دینے لگے۔ جب اس بات کا جاوید کو پتا چلا تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ میں کسی نئی جگہ امی اور بھائی بہنوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔“

چند دنوں تک تو ان کی یہ ضد برقرار رہی۔ امی جان بھی اس فیصلے سے اندرونی طور پر خوش نہیں تھیں مگر اس کے بہتر مستقبل کے لیے رضامند ہو گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد حیرت انگیز طور پر ناراض منا کراچی جانے پر رضامند ہو گیا۔ ”مگر میری ایک شرط ہے۔“

”کون سی شرط؟“

”جی کہ مجھے کراچی میں کسی بورڈنگ اسکول میں داخل نہ کرایا جائے۔ اباجی اگر میرے ساتھ رہیں گے مجھے وہاں چھوڑ کر واپس پنڈی نہیں آئیں گے تو میں کراچی چلا جاؤں گا۔“ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑے۔ ماں اور بھائی بہنوں کو ان کے آنسو دیکھ کر چتا دکھ ہوا اس سے کہیں زیادہ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر اس رضامندی کی وجہ کیا ہے؟

پاپت دراصل یہ تھی کہ جب انہوں نے اپنے دوستوں سے دل فرنگی کے ساتھ یہ کہا۔ ”دوستو! ظالم سانج ہمیں تم

اس کے والد شیخ رحمت اللہ راولپنڈی سے تعلق رکھتے تھے جب کہ ان کی والدہ جموں سے تھیں۔ جاوید شیخ کا گھریلو نام شیخ جاوید اقبال ہے۔

جو لوگ آج اس سے ملتے ہیں وہ اس کی شائستگی، خلوص، محبت اور نشست و برخاست کی تعریف کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! اتنا بڑا فنکار۔ اور اس قدر عزا و اکسار۔ اتنا خلوص و پیار۔

اس قدر تعریف کے قابل شخص کے بارے میں اگر میں آپ کو یہ کہوں کہ یہ بندہ جب بچہ تھا تو بہت گندا تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن کا بڑا حصہ برے اور آوارہ دوستوں کی صحبت میں گزرا تھا تو آپ کو بھینا تعجب بھی ہو گا اور دکھ بھی ہو گا مگر یہ سچ ہے، حقیقت ہے۔ اگرچہ یہ بہت پرانی بات ہے لیکن اس کا تعلق جاوید شیخ کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے بھائیوں کے برعکس جاوید بچپن سے ہی لالہ بانی طبیعت کے مالک تھے۔ بڑے لکھے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تھی تو کھیلنے کودنے اور شرارتیں کرنے کے علاوہ فلم بینی سے تھی۔ بس ہر وقت اسی فکر میں مبتلا رہتے کہ کس طرح فلم دیکھی جائے۔ گھر سے جو پیسے جیب خرچ کے طور پر ملتے تھے اسے کسی اور کام میں خرچ کرنے کی بجائے فلم کا ٹکٹ خریدنے پر ضائع کر دیتے۔ پیسے نہ ہوتے تو گھر کے کسی فرد کی جیب سے نظر سیجا کر نکال لیتے۔ بعد میں معلوم ہوتا، پکڑے جاتے تو سزا بھی ملتی، کئی بار والد سے مار بھی کھائی۔

ان کے والد شیخ رحمت اللہ بڑے سخت گیر تھے۔ اپنے دوسرے بچوں کے علاوہ خاص طور پر شیخ جاوید اقبال پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ جہاں اس کی ذرا سی بھی لغزش دیکھتے دھنک کر رکھ دیتے۔ کبھی کبھی پیار سے بھی سمجھاتے۔ ”دیکھو بیٹے! تم ایک اچھے اور شریف گھرانے کے چشم و چراغ ہو۔ اس لیے تمہیں بھی ایک اچھے لڑکے کی طرح رہنا چاہیے لکھ پڑھ کر اچھا انسان بننا چاہیے۔ وقت پر کھیلو دو ضرور۔ مگر اچھے اور شریف لڑکوں کے ساتھ۔ برے اور آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہو گے تو وہ تمہیں فلم دیکھنے جیسی بری بات سکھائیں گے۔“

جاوید دل ہی دل میں ہنستے۔ ”مجھے کوئی فلم دیکھنے کا سہن کیا پڑھائے گا؟ میں تو خود اپنے دوستوں کو کہتا ہوں۔ میں فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم جی چلو۔“ مکروہ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ اباجی کی بے خبری پر دل ہی دل میں



چلتی تھی۔ وہ ٹرام وے کمپنی والے محمد علی کہلاتے تھے۔ شیخ رحمت اللہ اپنے دوست کے ساتھ ٹرام کمپنی کی انٹیکسی میں اپنے بیٹے جاوید اقبال کے ساتھ رہنے لگے جو مارٹن روڈ پر واقع تھی۔ یہاں آکر جاوید پر شروع کے چند دن تو بہت بھاری گزرے لیکن جلد ہی وہ نئے دوستوں کے ساتھ مکمل مل گئے۔ مارٹن روڈ کی رہائش انہیں اس لیے پسند آگئی کہ یہاں سینماؤں کا حصہ بازار تھا۔ قدم قدم پر سینما موجود تھے۔ ایروز، جولی، پلازہ، گوڈین اور چند قدم آگے بندر روڈ پر ناز اور نشاط۔

کراچی پہنچ کر جاوید کے ابا جی نے انہیں صدر کے علاقے میں واقع ماڈل اسکول میں داخل کروادیا اور وہ تعلیم حاصل کرنے لگے مگر فلم بنی کا چکا اور فلمی بہروبن کر فلمی پردے پر جھگانے کا بھوت ان کے سر پر سوار رہا۔

دراصل ان کے دل و دماغ پر ایکٹر بننے کا بھوت لڑکپن ہی میں سوار ہو چکا تھا۔ جب وہ محض بارہ سال کے تھے۔ سینما گھر کے اندھیرے ماحول میں فلم کا لطف اٹھاتے ہوئے وہ خیالوں ہی خیالوں میں ان کہانیوں کا حصہ بن جاتے تھے اور تصور ہی تصور میں شیم آراء، صبیحہ اور رانی وغیرہ کے سحر میں گم ہو جایا کرتے تھے اور پھر جب ایکٹر بننے اور فلم اشارز کو قریب سے دیکھنے کا جنون اپنی انتہا کو پہنچا تو جاوید نے اپنے ہم خیال دوستوں کو اکٹھا کیا اور اپنے والد کی جب سے سو روپے اڑا کر لاہور بھاگ جانے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے مگر ٹرین میں عین اس لمحے دھریے گئے جب ریل گاڑی پلیٹ فارم چھوڑنے کی وسل بجا چکی تھی۔

اس واقعے کے بعد ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور

سے جدا کرنے پر تیار ہوا ہے۔

”ابے افلی ڈائلاگ مت بول۔“

”ہاں سیدھے سیدھے بتا، کیا بات ہے۔“

”اب انہوں نے جو بات بتادی۔“

”ارے پار! تو تو بڑا کلی ہے۔ کراچی جیسے بڑے شہر

میں تیرے ابا جی تجھے لے جانا چاہتے ہیں۔“

”کیوں.....! کراچی میں کیا بات ہے؟“

”کراچی میں فلم اسٹوڈیوز ہیں، فلمیں بنتی ہیں۔ جن

فلمی لوگوں کو تو سینما کے اسکرین پر دیکھنا ہے انہیں تو نگار

خانوں میں زندہ سلامت بھی دیکھ سکے گا۔“

”ایسا.....؟“

”ہاں..... ایسا!“

”مگر میرے فلم دیکھنے کا شوق؟“

”ابے! لو کی دم جس طرح تو یہاں اسکول سے

بھاگ کر نائغہ کر کے سینما گھر پہنچ جاتا ہے وہاں بھی اسی طرح

فلم دیکھنے کا شوق پورا کرتے رہتا۔“

”کیا وہاں..... میرا مطلب ہے کراچی میں سینما گھر

ہیں؟“

ایک دوست نے ان کی پیٹھ پر زور دے دھپ لگائی۔

”کراچی، پنڈی سے کہیں بڑا شہر ہے۔ پنڈی سے بہت

ریا دہ سینما گھر ہیں وہاں۔“

جب ان ساری باتوں کا علم ہوا تو وہ ہلکیے کراچی

جانے پر رضامند نہ ہوئے اور ایک دن ان کے والد انہیں

اپنے ساتھ لے کر کراچی پہنچ گئے اور اپنے دوست محمد علی کے

گھر جا پہنچے۔ محمد علی صاحب کراچی کی مشہور کاروباری

فصیحت تھے۔ کراچی میں محمد علی صاحب کی ٹرام صدر سے

انہیں ان کے آوارہ دوستوں سے اور ان کی محفل سے دور کر دیا گیا تھا مگر یہ چند دنوں کی بات تھی۔ پھر وہی دوست تھے اور وہ تھے مگر اب یہ ساری باتیں پرانی ہو گئی تھیں۔ اب وہ ان دوستوں سے بچھڑ کر کراچی آ گئے تھے اور جلد ہی یہاں کے کچھ نئے لڑکوں سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ماڈل اسکول سے وہ کچھ عرصے بعد میری گلاسکو یونیورسٹی اسکول میں منتقل کر دیے گئے۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں سے وحید مراد نے بھی میٹرک کیا تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد شیخ رحمت اللہ کی پوری فیملی کراچی آ گئی تو جاوید کے والد کو بلازہ سینما سے متصل ایک بلڈنگ میں ایک فلیٹ حاصل کرنا پڑا بعد میں ان کی فیملی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر انہیں گرین اسٹریٹ میں واقع جبرہ مینشن میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔ اس دوران جاوید نے والد کے دباؤ اور خوف کے باعث تعلیم پر توجہ دینا تو شروع کر دی مگر فلم بنی کا شوق اور اداکاروں، اداکاراؤں کی ایک جھلک دیکھنے کی شرک اپنی جگہ برقرار رہی۔ اسکول سے واپسی کے بعد جاوید کا ایک ہی مشغلہ تھا۔ سینماؤں پر جا کر قد آدم ہو رڈ ٹکڑ اور ہال کے اندر آویزاں پوسٹرز دیکھنا یا پھر فلم بنی۔ جب بھی کوئی فلم نئی جاوید پہلی فرصت میں اسے دیکھنے کی جستجو کرتے۔

بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ)، گارڈن اور مارن روڈ پر واقع سینماؤں کا اسٹاف جاوید اقبال سے خوب اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی تو جاوید اقبال کے ایسے دوست بن گئے تھے کہ فلم اشارہ بننے کے بعد بھی وہ ان دوستوں کو نہیں بھولے۔ اس دوستی اور شناسائی کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ کثرت کی قیمت ادا کیے بغیر فلم دیکھنے کی شرک پوری کرنے لگے۔ فلم دیکھنے کے علاوہ جاوید کو اداکاروں اور اداکاراؤں کے پوسٹرز جمع کرنے کا بھی شوق تھا جس کے لیے سینما اسٹاف ہی ان کے کام آتا تھا۔ اکثر وہ فلمی دفاتر یا سینماؤں سے فلموں کے پوسٹرز مانگ کر یا پھر چوری چھپے اٹھا کر لاتے اور اپنے دوستوں پر فلم والوں سے اپنے تعلقات کی دھاک بٹھاتے۔

بارہ برس کی عمر میں مگر سے بھاگ کر لاہور جانے کا واقعہ سنا چکا ہوں۔ جاوید شیخ کو آج بھی یہ واقعہ یاد ہے اور اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو کے دوران اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ ”میرے کچھ دوستوں نے لاہور جانے کا پروگرام بنایا کہ وہاں جا کر فلموں

میں کام ڈھونڈا جائے۔ میں چھوٹا تھا۔ ٹرین نکلنے ہی والی تھی۔ قسمت اچھی تھی کہ والد اور ان کے دوستوں نے ہمیں رکنے ہاتھوں پکڑ لیا۔ والد نہیں چاہتے تھے کہ میں کسی غلط راستے پر نکل جاؤں۔ میں ہیرو نہ بننا کچھ اور بن جانا اگر وہ ٹرین ہمیں لے کر نکل جاتی تو میں وہاں نہ ہوتا جہاں اس وقت ہوں۔“

جاوید شیخ کی زندگی کا یہ واقعہ ابھرتی ہوئی عمر کے نوجوانوں کے لیے بڑا سبق آموز ہے۔ جاوید شیخ کی طرح کمسن اور ناپختہ ذہن کے لڑکوں کو ہرگز غلط راستے کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ والدین جس طرح ان کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔

بات ہو رہی تھی جاوید کے اس دور کی جب انہوں نے کراچی کے سینما اسٹاف سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کراچی کی فلم انڈسٹری فعال تھی۔ یہاں کے اسٹوڈیوز میں فلموں کی شوٹنگ ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ایسٹرن اور ماڈرن اسٹوڈیوز میں بے شمار فلمی دفاتر قائم تھے جن میں وحید مراد کا ”فلم آرٹس“ سب سے بڑا پروڈکشن ہاؤس تھا۔ ایسٹرن اسٹوڈیوز میں دن بھر فنکاروں کا میلہ لگا رہتا تھا جب کہ شام ہوتے ہی یہ عالم ہوتا کہ گویا ستاروں کی کھلبلاں آسمان سے زمین پر اتر آئی ہو۔ وحید مراد، شبنم، محمد علی، شمیم آراء، دیبا، کمال، زاہد، ساقی اور زینا جیسے مقبول ستارے اکثر کسی فلوریلا لان میں فوارے کے ارد گرد شوٹنگ کرتے نظر آتے تھے۔ جاوید اقبال کو ان فنکاروں کی ایک جھلک دیکھنے اور شوٹنگ سے لطف اندوز ہونے کا ایسا جنون تھا کہ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پیدل ہی گاؤن روڈ سے سائٹ ایریا کا سفر کرتے ہوئے ایسٹرن اسٹوڈیو آتے، جہاں گیٹ پر پٹھان چوکیدار ان کے ارمانوں پر پانی پھیرنے کے لیے موجود ہوتا تھا۔ جاوید شیخ آج ان باتوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔

”آج ایسٹرن اسٹوڈیو کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ وہاں چوکیدار کی موجودگی بے معنی ہے۔ وقت اور حالات بدلے ہیں تو کیسی انتہائی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔“

جب جاوید شیخ، جاوید اقبال تھے، ایک ٹھری نوجوان لڑکے تھے۔ اسٹوڈیو کے گیٹ پر تعینات چوکیدار کی رعونت اور اکثرین قابل دید ہوا کرتی تھی۔ اسٹوڈیو کے گیٹ کا چوکیدار گویا کسی منٹل بادشاہ کے دربار کا پہرے دار نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی اسی احساس کے ساتھ سرانجام دیتا تھا کہ

اے کسی قلعے کا سپاہی مقرر کیا گیا ہے۔ جس کی پسپائی کا مطلب تھا سلطنت کا دھڑن تختہ۔

ان باتوں اور جذباتوں کا اظہار جاوید شیخ اب کرتے ہیں تو اس بات کا اعزاز ہوتا ہے کہ ان دنوں ان کے اور ان کے مفرک دوستوں کے دلوں پر کسی آری چلتی ہوگی۔

”اس فقیر، گھنڈی اور جنگجو چوکیدار کے ہاتھوں مہری اور میرے دوستوں کی کئی بار بے عزتی ہوئی مگر ہم جیسے دونوں کے ارادوں کو شکست دینا اس عاقبت ناعدلیش چوکیدار کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بے چارہ یہ شعور کہاں رکھتا تھا آج جس اسکول بوائے کو وہ عالمی فخر کی سمجھ کر دھکار رہا ہے، آنے والے وقت میں وہ اس تاج و تخت کا مدعی رہے گا اور قلمی ریاست کا نرس کہلائے گا۔“

سیدھے راستے سے انٹری نہ ملنے پر جاوید اقبال اور ان کے دوست چور دروازے سے اور اسٹوڈیو کے دروازے پر سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے۔ جسے ناکام بنانا اسٹوڈیو انتظامیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ٹھکر لڑکے اکثر نگار خانے کی دیواروں پر چڑھ کر لان میں بیٹھے فنکاروں کو دیکھ کر کہہ سکتے تھے کہ یہ کام بڑا مشکل تھا۔ اس کے لیے ابھی ایک دوسرے کے ذہن سے استعمال کرنے پڑتے تھے۔

ایک دن جاوید اقبال اور ان کے دوست ایسٹرن اسٹوڈیو کی دیوار پر چڑھ کر اندر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک قلم پیونٹ میں شامل ایک شخص کی نظر ان لڑکوں پر پڑی۔ اس موقع پر جاوید اور ان کے دوست گھبرا کر چھلانگ لگا کر بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اس آدمی نے جاوید کو بڑی اہانت سے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بعد وہ شخص ان کے قریب آ کر بولا۔ ”کیا قلم میں کام لے رہے ہو؟“

جاوید اقبال اور ان کے دوستوں کو اپنے کانوں پر
 ہنسنے نہیں آیا۔ وہ ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھنے لگے۔
 چہرے پر چور ہے ہوں۔ کیا یہ آدمی ہم سے مذاق تو نہیں کر رہا
 ہے؟

یہ تماشا دیکھ کر اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔
 ”میں ایک سٹراپلائز ہوں۔“ اور کہا۔ ”کیا تم لوگوں کو
 لالوں میں کام کرنے کی خواہش ہے؟“

”ہاں..... ہاں..... ہم فلموں میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ تمام لڑکوں نے بیک زبان کہا۔
اس کے بعد یہ لڑکے ایک سٹرا اسٹالرز کے ساتھ ایسٹرن

جاوید شیخ کی بھارتی فلمیں

شکھر، رفتہ رفتہ، جاں من، نمستہ لندن، اپنے،
اوم شانتی اوم، مائی نیم از آنھوئی گنواوس، جنت، ہنستے
ہنستے، منی ہے توہنی ہے، یوراج، روڈ تو سنگر، گھوسٹ،
صدیاں، کجراے، نہ جانے کب سے، آرزو کلک -

(یہ فلمیں 2014ء تک ریلیز ہونے والی ہیں)

سندھی فلم

اکھاڑہ ایک ایسی فلم ہے جو اردو اور پنجابی کے علاوہ سندھی زبان میں بھی ڈب کر کے دکھائی گئی۔

نیوی ڈرامے

انسان اور آدمی، شمع، آگ، کبھی، پڑھ لکھائیاں، ان
کبھی، دوسری لڑکی، ادھوری کہانی، چٹا، آنو گراف، مس
خفت، خوب صورت جہاں، ہاف سبھی، فکار، موسم،
چاندنی راتیں، دیوار، فرار، سبھی، آدور کی آنے کی
ارات، پت جھڑ کے بعد، جیسے جانتے نہیں، تم کہاں ہم
کہاں، تھوڑی سی محبت، بول میری پھلی، کمرہ۔ نہ کہا،
دولی کی آنے کی بارات، ذیل ٹریل، دل سے، دل سے
گلیفیز اور اوشن، رسم، عشق عبادت، ایک نئی سسٹم
باتنے کی آنے کی بارات، میرے چار و گریہ میں سبھی
سبھی، تھیں، ماتم، دل نہیں مانتا۔

(یہ وہ ڈرامے ہیں جو 2014ء تک آن ایئر ہو چکے ہیں)

سپر ہٹ پاکستانی فلمیں

کبھی الوداع نہ کہنا (ریلیز 1983ء ہدایت کار
نذر شباب)۔ شادی مگر آجی (ریلیز 1984ء ہدایت
کار کاظم شہباز)۔ مس کلیدی (ریلیز 1984ء ہدایت کار
نذر شباب)۔ لازوال (ریلیز 1984ء ہدایت کار محمد
باغدادی فاضل)۔ پچھل (ریلیز 1985ء ہدایت کار پرویز
ملک)۔ ہا ہا ک ک ک کے شعلے (ریلیز 1985ء ہدایت
کار جان محمد جمن)۔ جینے نہیں دوں گی (ریلیز 1985ء
ہدایت کار گیتیکا)۔ مہندی (پٹنالی) (ریلیز 1985ء
ہدایت کار الطاف حسین)۔ زنجیر (ریلیز 1986ء
ہدایت کار پرویز ملک)۔ یہ دل آپ کا ہوا (ریلیز
2002ء ہدایت کار جاوید شیخ)۔ نامعلوم افراد (ریلیز
2014ء ہدایت کار نیل قریبی)۔

انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ بہت مایوس ہوئے مگر ان کی یہ خواہش ضرور پوری ہو گئی کہ وہ اپنے فوٹو اداکار محمد علی سے ملاقات کر سکیں۔

اس دوڑے کا سب سے دلچسپ اور اہم حصہ یہ ہے کہ شوٹنگ کے خاتمے پر محمد علی نے ان لڑکوں سے کہا۔ کیا کہا؟ یہ جاوید شیخ ہی کی زبانی سنئے۔

”علی صاحب نے ہمیں اپنے قریب بلا کر کہا۔ تم لوگ بھینا اسکول سے بھاگ کر آیا اپنے گھروں میں اطلاع دیئے بغیر یہاں آئے ہو۔ آئندہ ایسا ہرگز مت کرنا، اگر ایکٹر بننے کا شوق ہے تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو اور والدین کی اجازت لے کر اس شعبے کی طرف آؤ۔ اگر تمہارے والدین کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی تو پھر کوئی تمہیں آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔“

جاوید شیخ آج تک محمد علی کی اس نصیحت کو نہیں بھولے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ”علی بھائی کی ان باتوں نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا اور میں پہلے سے زیادہ اپنی تعلیم پر توجہ دینے لگا۔“

شاعر نے کہا ہے۔ ”دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔“ جاوید شیخ کا کہنا ہے کہ اسے بڑے فلم اشارے اس پیار اور محبت سے ہمیں نصیحت کی تھی کہ میں پہلے سے کہیں زیادہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے پر اس لیے توجہ دینے لگا کہ علی بھائی نے کہا تھا۔ ”ایکٹر بننے کا شوق ہے تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔“ جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اداکار بننے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ بندہ پڑھا لکھا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں کو بھی سمجھایا۔ ”دوستو! ہمارے لیے اسٹوڈیوز کے چکر لگانے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم پہلے لکھ پڑھ کر کچھ بن جائیں۔“

ہاں یا راہ یہ ضروری ہے۔ ”ورنہ۔“ ایک لڑکے نے کھسیانی ہنسی بپتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں فلموں میں کام ملے گا بھی تو ایسا کہ ہم، ہم نہیں ہوں گے۔“

اس کے بعد ہم تمام دوست اپنی اپنی تعلیم پر توجہ دینے لگے۔ دوسروں کے بارے میں تو مجھے علم نہیں۔ میں تو جیسے علی بھائی کا مرید بن گیا تھا۔ اب میں نے فلمی ستاروں کے پوسٹر وغیرہ جمع کرنے کا شوق بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کی بجائے اخباروں اور فلمی رسالوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر میں علی بھائی کے بارے میں شائع ہونے والی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا۔ اس مطالعے سے مجھے علی بھائی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت سی اہم معلومات



اور ان کے اندر داخل ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آج کے سپر اسٹار جاوید شیخ نے فلم اسٹوڈیوز کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ ذرا سوچئے۔ ان کی اور ان کے دوستوں کی اس وقت مارے خوشی کے کیا کیفیت ہوگی۔

جاوید اور ان کے ساتھیوں کو اندر جا کر معلوم ہوا، انہیں جس فلم میں ”اداکاری“ کے لیے لایا گیا ہے۔ وہ ہدایت کار شیخ حسن کی فلم ”جاگ اٹھا انسان ہے“ جس میں محمد علی، زریا، وحید مراد، کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ 1966ء کی بات ہے۔ اس فلم کا پونٹ آؤٹ ڈور کے لیے منکھو پیر جا رہا تھا جہاں پہاڑیوں میں ایک قافلے کی عکسبندی کی جاتی تھی۔

پونٹ کے تمام لوگوں کے ساتھ جاوید اور ان کے دوستوں کو بھی منکھو پیر پہنچایا گیا۔ جب تمام لوگ لوکیشن پر پہنچ گئے تو جاوید شیخ اور ان کے دوستوں کو اونتوں پر سوار کروایا گیا۔ جاوید بہت خوش تھے کہ پہلی بار خود کو پردہ پسینے پر دیکھنے کا خواب سچ ہونے جا رہا ہے مگر اس وقت ان کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی، جب ڈائریکٹر شیخ حسن نے یہ آواز لگائی۔

”ان تمام لڑکوں کو دوپٹے پہنا دو۔“ دراصل پتویشن یہ تھی کہ محمد علی مستورات کے قافلے کی نگہبانی کر رہے تھے۔ چونکہ مطلوبہ تعداد میں ایک شرارگر لڑکا بندوبست نہیں ہو سکا تھا لہذا ان اسکول کے لڑکوں سے یہ کام لیا جا رہا تھا۔

جاوید اقبال کو جب اصل صورت حال کا علم ہوا تو ماہنامہ مسرگزنٹ

کامیاب فلمیں

فیصلہ (ریلیز 1986ء ہدایت کار محمد جاوید فاضل)۔ ایک سے بڑھ کر ایک (ریلیز 1987ء ہدایت کار نذر شایب)۔ قاتلوں کے قاتل (ریلیز 1988ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔ آگ ہی آگ (ریلیز 1988ء ہدایت کار جاوید فاضل)۔ غریبوں کا بادشاہ (ریلیز 1988ء ہدایت کار پرویز ملک)۔ استادوں کے استاد (ریلیز 1990ء ہدایت کار محمد جاوید فاضل)۔ چوروں کا دشمن (ریلیز 1990ء ہدایت کار زاہد شاہ)۔ آخری ہجرا (ریلیز 1993ء ہدایت کارہ شمیم آرام)۔ جیوا (ریلیز 1995ء ہدایت کار سید نور)۔ جوڑ گیا وہ مر گیا (ریلیز 1995ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ بھنو اینڈ روزز (ریلیز 1999ء ہدایت کار شان)۔ مجھے چاند چاہیے (ریلیز 2000ء ہدایت کار فیصل بخاری)۔ میں ہوں شاہد آفریدی (ریلیز 2013ء ہدایت کار اسامہ)۔

علاوہ محمود علی اور عرش میر جیسے کہنہ مشق فنکار بھی تھے۔ جاوید اقبال نے اپنا مختصر کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ رضی اختر شوق اس کی صداکاری سے متاثر ہوئے تھے۔

ان دنوں کراچی ریڈیو سے "اسٹوڈیو نمبر 9" ریڈیائی ڈراموں کا بڑا مقبول پروگرام تھا جس سے بڑے اچھے اور معیاری ڈرامے نشر کیے جاتے تھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ "اسٹوڈیو نمبر 9" کے کئی ڈراموں میں ابھرتے ہوئے صدا کار جاوید اقبال کو بھی صداکاری کا موقع ملا۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ ریڈیو اسٹیشن میں جانے پہچانے لگے۔ وہ اپنے پروڈیوسرز کی ہدایات پر پھر پور طور پر توجہ دیتے، عمل کرتے۔ اپنے مکالمے کی ادائیگی میں ہر طرح کوشش کرتے کہ پورے اتریں۔

کام کوئی بھی ہو۔ اگر نیک نیتی سے کیا جائے۔ محنت اور لگن سے انجام دیا جائے تو اس کے دور رس نتائج ہوتے ہیں۔ جاوید نے جی جان لگا کر اپنے کردار ادا کیے تو سننے اور ابھرتے ہوئے صداکار کی حیثیت سے ریڈیو کے پروڈیوسروں سے قریب ہوتے گئے۔ پروڈیوسر آفتاب افغانی ان پر بہت مہربان ہو گئے۔ اپنے ڈراموں کے علاوہ دوسرے پروڈیوسروں کو بھی اس کے لیے کام کی گنجائش نکالنے کی سفارش کرنے لگے۔ افغانی صاحب کی دوستی فی دی پروڈیوسروں سے بھی تھی۔ جن میں سے اکثر ریڈیو سے

مائل ہوئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا فی کی ریکارڈنگ میں صداکاری سے شروع کیا۔ پہلے ریڈیو پاکستان مندرآباد سے وابستہ رہے۔ پھر حیدرآباد سے کراچی آگئے اور ریڈیو پاکستان کراچی سے صداکاری کرنے لگے۔ یہاں انہیں بخاری صاحب جیسے براڈکاسٹر کی سرپرستی اور تربیت حاصل ہوئی اور پھر ریڈیو کی صداکاری سے ہی فلموں کی اداکاری کا موقع ملا۔ اس کے بعد میں نے سوچا۔ "کیوں نا میں بھی اداکاری سے پہلے صداکاری میں قسمت آزمائوں۔" اور پھر وہ موقع کی تلاش میں رہے کہ کس طرح ریڈیو تک پہنچا جائے۔ ایک طرف تو وہ اسکول میں جی جان لگا کر پڑھ رہے تھے دوسری طرف اسی دور سے صداکاری کی دوڑ میں شامل ہونے کی جستجو بھی کرنے لگے۔

ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ ریڈیو پاکستان کراچی میں ملی نغموں میں حصہ لینے کے لیے نئی آوازیں تلاش کی جارہی ہیں۔ لہذا وہ بھی آڈیشن دینے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ جاوید اقبال نے بھی آڈیشن دیا مگر اس امتحان میں، اس آزمائش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اپنے اردو تلفظ کی وجہ سے مارکھا گئے تھے۔ چونکہ ان کی مادری زبان پنجابی تھی اور ان کا بچپن راولپنڈی میں گزرا تھا اس لیے ان کے لب و لہجے میں پنجابیت کی جھلک موجود تھی۔ وہ اس معیار کی اردو نہیں بول سکے جس کی ضرورت ریڈیو پاکستان جیسے ادارے کو تھی۔

انہیں جب معلوم ہوا کہ وہ آڈیشن میں کس وجہ سے ناکام ثابت ہوئے تو انہوں نے اپنے لہجے کی یہ خالی دور کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے لڑکے جن کی مادری زبان اردو تھی ان کی بول چال پر توجہ دینے لگے اور انہی کی طرح بولنے کی کوشش کرنے لگے۔

ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ "میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح ابھی ہو مجھے ملی بھائی کی طرح ریڈیو کی صداکاری سے ہی اپنے فی کی کیریئر کا آغاز کرنا ہے۔ میں آڈیشن کی ناکامی سے گھبرایا نہیں۔ گانے کے امتحان میں ناکامی ہوئی تو کیا ہوا۔ میں دوسرے شعبوں میں صداکاری کروں گا۔"

اور دھن کے کچے جاوید اقبال نے ایسا ہی کیا۔ وہ گاہے بگاہے ریڈیو کے چکر لگاتے رہے اور وہاں کے لوگوں سے شاسانی بڑھاتے رہے اور پھر ایک دن انہیں ایک ادارے میں صداکاری کا موقع مل ہی گیا۔ یہ پروڈیوسر رضی اختر شوق کا ایک ڈراما تھا جس میں دیگر صداکاروں کے

ہی ٹی وی پر گئے تھے۔

ایک دن پی ٹی وی کے نامور پروڈیوسر امیر امام ان سے ملنے آئے تو اتفاق سے ان کے قریب جاوید اقبال بھی موجود تھے۔ انہوں نے امیر امام سے کہا: ”یار! اس لڑکے کو بھی کبھی اپنے کسی ڈرامے میں چانس دونا۔ بڑا ٹیلنٹ ہے۔ اپنی نوعمری کے باوجود بڑی دل جمعی کے ساتھ پر فارم کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ امیر امام بولے۔ ”دیکھتا ہوں اپنے کسی ڈرامے میں اس کے لیے کوئی جگہ نکلی تو اسے ضرور بلاؤں گا۔“

”تم مجھے فون کر دینا۔ میں اسے بھیج دوں گا۔“

چند روز بعد ہی افغانی صاحب کے پاس پروڈیوسر امیر امام کا ٹیلی فون آیا۔ ”کل اس لڑکے کو میرے پاس بھیج دو۔“

”ٹھیک ہے بھیج دوں گا۔ کون سا ڈراما ہے؟“

”ارے یار! وہی ڈراما سیریز ”آدمی اور انسان“ میں ایک کردار لگا رہا ہے۔“

جاوید اقبال کو آفتاب افغانی نے یہ خوش خبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ”شکریہ افغانی صاحب! آپ نے مجھے ریڈیو ڈراموں سے ٹی وی ڈراموں تک پہنچانے میں میری جرم مدد کی ہے اس کے لیے جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

”میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کرو۔“

جاوید اقبال پی ٹی وی وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ پروڈیوسر امیر امام نے انہیں ان کے کردار اور اس کی ادائیگی کے بارے میں بتایا۔

”دیکھو جاوید، طلعت حسین اس ڈرامے کے ہیرو ہیں۔ سین یہ ہے کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوران گفتگو وہ اپنے ملازم کو آواز دے کر کہتے ہیں۔ ”رمضو! چائے لاؤ۔“

تمہارا کردار رمضو کا ہے۔ تم بھاگتے ہوئے طلعت حسین کے پاس آتے ہو اور آکر کہتے ہو جی ابھی لایا۔“

”اور پھر تم اگلی انٹری میں چائے کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے چلے جاتے ہو۔“

”جی سمجھ گیا۔ بالکل ایسا ہی کروں گا۔ جیسا آپ نے بتایا ہے۔“

جاوید اقبال کو اپنی زندگی کا یہ پہلا ٹاکا شات دینے کا

موقع ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا۔ ”یا اللہ! میرا شات پروڈیوسر کے حسب مشافہ پسند آئے۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے طلعت حسین کے آواز دینے پر انٹری دی۔ طلعت حسین نے انہیں مخاطب کر کے ہوئے کہا۔ ”رمضو چائے لاؤ۔“

جس پر انہوں نے جواب دیا۔ ”جی ابھی لایا۔“ اور واپس لوٹ گئے اور پھر ڈراما دیر بعد چائے کی ٹرے لے آئے اور اسے رکھ کر خاموشی سے لوٹ گئے۔

شات اوکے ہو گیا۔ طلعت حسین نے بھی تعریف کی۔

”بھئی آپ کا یہ نیا فنکار تو بہت اچھا ہے۔ ڈرامہ نمبر گھبرا یا۔ پہلا ہی شات اوکے کر دیا۔“

رمضو کا یہ مختصر ترین کردار جاوید شیخ کے تیناک فنی سز کا پہلا قدم تھا جس میں ان کی پر فارمنس سے ڈراما پروڈیوسر خوش ہوا تھا جب کہ طلعت حسین جیسے فنکار نے بھی اس آزموز پر فارم کر کی تعریف کی تھی یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوا کہ رمضو نے ان کے لیے پی ٹی وی ڈراموں کے دروازے کھول دیئے اور وہ کئی چھوٹے اور مختصر کرداروں میں نظر آنے لگے۔ اسی دوران انہیں اسٹیج پر بھی اداکاری کا موقع ملنے لگا۔ دراصل ان دنوں پی ٹی وی کا میڈیا بہت مقبول تھا۔ پی ٹی وی پروگراموں میں شرکت کرنے کا مطلب تھا اس آرٹسٹ پر بھر دوسا کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنا کردار بھی بخوبی ادا کرے گا اور ناظرین کو بھی سزا شکرے گا۔

ریڈیو کے بعد پی ٹی وی اور پھر اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا تو جاوید اقبال کو اپنے آپ پر یقین آنے لگا کہ وہ آنے والے دنوں میں فن کی دنیا میں اپنے لیے ممتاز مقام بنالے گا۔ اس دوران اس نے اپنے فورٹ فنکار محمد علی کی نصیحت کو یاد رکھا اور اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتا رہا۔ ریڈیو کی طرح پی ٹی وی کے کرتا دھرتاؤں کو جب پتا چلتا کہ یہ نوعمر آرٹسٹ طالب علم ہے اور پڑھ رہا ہے تو اس کو کہتے۔ ”شاباش! تعلیم جاری رکھو۔ اب شو بزم میں ہی انہی لوگوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے گا جو پڑھے لکھے ہوں گے تعلیم یافتہ ہوں۔“

اس نے خود بھی محسوس کیا کہ شو بزم میں انہی لوگوں کی عزت ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ علی بھائی نے اس سے اور اس کے دوستوں سے بہت پہلے ایئرٹن اسٹوڈیو میں

۱۱۔ اسی کی تھی، جو صحت کی تھی وہ بھی تو یہی تھی کہ اگر ایکٹر آتا ہے ہو اور اس شعبے میں آنا چاہتے ہو تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔“

اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں جاوید شیخ نے کہا۔ ”میں لہذا طویل انتظار تو نہیں کیا۔ کیونکہ سر پر فنکار بننے کا جو ارادہ سوار تھا اس نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ فلمی سفر کے لیے جدوجہد کرنے پر مجبور کیا۔“

جب رب راضی تو پھر راستے کی رکاوٹیں ختم ہوتی ہائی ہیں۔ پہلے جس جاوید کی آواز لوگ ریڈیو سے سنتے تھے اس جاوید کو ٹی وی ڈراموں میں بھی دیکھنے کے اور پھر اسٹیج ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں بھی وہی جاوید نظر آنے لگا تو اسے دیکھنے والے اسے پسند بھی کرنے لگے۔ اس کی اہلی پرناظرین تالیاں بھی بجاتے اور اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرتے جب کسی آرٹسٹ کو عوام پسند کرنے لگتی ہے تو اشتہاری ادارے اسے اشتہاری فلموں میں بھی شامل کرنے لگتے ہیں۔ اب جاوید کو بھی کاغذ بگ ہے اشتہاری فلموں میں پیش کیا جانے لگا۔ یہ اشتہاری فلمیں ٹی وی کے علاوہ سنیما گھر میں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ ایسی اشتہاری فلموں کی لائسنس سے جاوید کو مزید پذیرائی ملی اور فیشن شوں میں بھی انہیں شامل کیا جانے لگا۔ بل بائیں ملبوسات کے تشہیری شوں میں انہیں ریمبرس پروڈاکس بھی کروایا جانے لگا۔

ریڈیو، ٹی وی، اسٹیج اور پرفیشن شوں، جاوید سب میں شامل ہو کر اپنے اندر کا فن اجاگر کرنے لگے مگر ابھی تک ان کے دل و دماغ کو تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ اس کے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کو معلوم بھی کہ ان کے یار ماہد اقبال کی منزل کوئی اور ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، اسٹیج اور فیشن شوں کے معر کے سر کرنے سے اس کے آگے بڑھنے کی جاس نہیں بھی ہے۔ یہ سب کچھ تو اس نے خود کو نوانے کے لیے کیا ہے۔ ”دیکھو لوگو! میں ہر روپ میں، ہر رنگ میں لاپاں نظر آ سکتا ہوں۔ مجھے جانو پچانو اور میری صلاحیتوں کا امتحان بڑی اسکرین پر لو۔“

اس کے دوست اچھی طرح جانتے تھے کہ جاوید کا طراب بڑے بڑے پر حکمرانی کا ہے۔ اس کی منزل سنیما انٹرٹین پر جلوہ گر ہونا ہے۔ وہاں پہنچ کر اپنے محبوب فنکار محمد علی کی طرح وہ بھی عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آج کا سپر اسٹار جاوید شیخ اس مقام تک پہنچنے کے لیے کیسے کیسے صبر آزما حالات سے نہیں گزرا۔ اسے اس

منزل تک پہنچنے کے لیے ایک ایک قدم آگے بڑھنا پڑا بقول شاعر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس کی قسمت میں مرزا نذیر بیک کی طرح ایک دم ندیم بن کر جگمگانا نہیں لکھا تھا۔ جاوید کو فلم انڈسٹری تک لے جانے والوں میں کسرا میں مدین علی مدین کا بڑا کردار ہے۔ مدین علی اس زمانے میں جب جاوید فنی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ایشیا ٹیک کے لیے کمرشل بناتے تھے۔ اشتہاری فلمیں، فلمز کے کیمروں سے ہی شوٹ ہوتی تھیں۔ جاوید نے پہلی بار ایک کمرشل فلم کے لیے جس کیمرے کا سامنا کیا اسے مدین علی مدین ہی آپریٹ کر رہے تھے۔ یہ ایک مشروب ساز ادارے کی برانڈ ”ایپل سڈرا“ کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس اشتہاری فلم میں جاوید کے ساتھ فاخرہ شریف نے ماڈلنگ کی تھی۔ واضح رہے کہ فاخرہ شریف، ہامہ شریف کی بڑی بہن ہیں۔ اس کمرشل فلم کے ہدایت کار مدین علی تھے۔ یہ بھی بتا چلوں کہ یہ مدین علی مشہور بھارتی ہیر وٹن صوفی علی کے والد تھے جنہوں نے بعد میں بہت سی پاکستانی فلموں کی عکاسی کی۔

جاوید کے اسٹیج پروڈاکسری کرنے کے تجربے نے ان میں خاصا اعتماد پیدا کیا۔ وہ ایک ایسے اداکار ثابت ہونے لگے۔ خصوصاً کامیڈی پرفارمنس کے حوالے سے جاوید نے اس قدر امپرور کیا کہ جب وہ فلم کے ہیرو بنے تو انہیں کاک کرداروں کے حوالے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ درحقیقت ان کے اندر چھپے ہوئے انتہائی باصلاحیت کامیڈی ہیرو کو محض چند ہدایت کار باہر لاسکے اور پھر خود جاوید نے بھی سنجیدہ سوشل ایکشن یا رومانوی کرداروں کو ترجیح دی ورنہ وہ زبردست کامیڈی ہیرو کی حیثیت سے یکتا مقام کے مالک بن سکتے تھے۔

تھیر نے جاوید کے اندر پوشیدہ شہریر اور حاضر جواب فنکار کی تسکین کا بہتر سامان کیا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں ہی اپنے وقت کے بڑے کامیڈی نر کو یاد کر لیا کہ وہ ترانوہ ثابت نہیں ہوں گے۔ جاوید نے اسٹیج کے بڑے فنکاروں شہزاد رضا، عمر شریف، رزاق راجو، لیاقت سولجر اور اسامہ علی تارک کے ساتھ ٹی ڈرامے کیے اور خود اسٹیج ڈرامے پروڈیوس بھی کیے۔ ان کا سب سے مقبول کھیل ”شادی ہو تو ایسی“ کے 100 سے زیادہ شوں مختلف شہروں میں ہوئے۔

وہ اپنے گروپ کے ساتھ حیدر آباد اور راولپنڈی سمیت کئی شہروں میں یہ ڈراما کرنے گئے۔

ان ساری کامیابیوں کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا تو بس یہی خواب تھا کہ سنیہا گھروں کی بڑی اسکرین پر ہیروین کر جلوہ افروز ہوں۔ قدرت کے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے مگر اس بے صبرے کا یہ عالم تھا کہ کل کی بجائے آج ہی فلم کے ہیرو بننے کا چانس مل جائے۔ بہر حال وہ وقت بھی آگیا اور کراچی کے فلم پروڈیوسر مولانا ہتھی نے اپنی فلم ”دھماکا“ کے لیے انہیں منتخب کر لیا۔ اس فلم ”دھماکا“ کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ یہ اس دور کے سب سے پاپولر جاسوسی ناول ”جاسوسی دنیا“ اور ”عمران سیریز“ کے ناول نگار ابن صفی کی کہانی پر بنائی جا رہی تھی۔ مولانا ہیرو ان کے ہدایت کار قمر زیدی، ابن صفی صاحب کے پیچھے پڑ گئے کہ ہمیں فلم بنانے کے لیے اپنا کوئی ناول عطا کیجیے وہ جاسوسی دنیا کا کوئی ناول ہو یا عمران سیریز کا ہو۔

ابن صفی جہاں دیدہ انسان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ فریدی اور حمید ہو یا عمران۔ فلم بنا کر ان کرداروں کا ایجنڈا خراب کر دیں گے اس لیے وہ انکار کرتے رہے۔ ”ارے بھئی! میرے ناولوں کا مزہ ناولوں ہی میں موجود ہوتا ہے۔ فلم کی صورت میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہوگا۔“ مگر پروڈیوسر مولانا ہتھی اور ڈائریکٹر قمر زیدی مان کر نہیں دیے۔ ابن صفی کے پیچھے لگے رہے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ابن صفی کے ناولوں کی طرح ان کی کہانی پر بننے والی فلم بھی شہرت اور مقبولیت حاصل کرے گی۔ یاد رہے کہ جو لوگ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں کرتے اپنی کامیابی کے لیے دوسروں کی بیسیاسی استعمال کرتے ہیں انہیں اکثر مایوسی حاصل ہوتی ہے۔

جب ان دونوں نے کسی طرح ابن صفی کا پیچھا نہیں چھوڑا تو انہوں نے ان سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی فلم کے لیے ایک کہانی لکھ دوں گا مگر اس میں نہ فریدی ہو گا، نہ حمید اور نہ ہی عمران۔ یہ بالکل نئے کرداروں کی کہانی ہوگی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ یہ جاسوسی کہانی ہوگی۔“

دونوں نے ابن صفی کی بات مان لی۔ شاید یہ سوچ کر کہ فلم کی کامیابی کے لیے ابن صفی کا نام ہی کافی ہوگا۔

ابن صفی صاحب نے ”دھماکا“ کی جو کہانی لکھی اس کے دو کردار ظفر الملک اور جنسن کلیدی کردار تھے۔ جنسن کا کردار تو خود پروڈیوسر مولانا ہتھی نے کیا جب کہ ظفر الملک

کے کردار کے لیے نئے اداکار کا انتخاب بذریعہ آڈیشن کیا۔ اس فلم کے کیراٹین مدن علی مدن تھے۔ مدن صاحب نے جاوید کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اس موقع پر قسمت آزمائیں اور پھر جب آڈیشن ہوا تو سلیکشن کمیٹی نے جس کے ایک ممبر مدن علی مدن بھی تھے جاوید کو اس انتخاب میں کامیاب قرار دے دیا۔

شاید ہے کہ اس کمیٹی میں ابن صفی بھی موجود تھے۔ انہیں جاوید اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے سوچا اگر ”دھماکا“ کامیاب فلم ثابت ہوئی تو عمران سیریز کی ایک کہانی پر ایک فلم خود بناؤں گا اور اس میں جاوید کو عمران کے کردار میں پیش کروں گا۔

ظفر الملک کے کردار کے لیے جاوید کا انتخاب ہو گیا تو ”دھماکا“ کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ جاوید کی اس پہلی فلم میں ان کی ہیروئن شبنم تھیں۔ جسے کبھی اسکرین پر دیکھ کر وہ ہیروز کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ جب کہ ”چندا“ اور ”تلاش“ کے سپر ہیٹ ہیرو رحمان، جاوید کے ساتھ سائیڈ ہیرو کے کردار میں کام کر رہے تھے۔ ایک تو جاوید کا کسی فلم کے لیے منتخب ہونا، سپر کے کردار میں پیش ہونا ہی ان کے لیے بہت بڑا بات تھی۔ اس پر شبنم اور رحمان جیسے بڑے فنکاروں کے ساتھ کام کرنا، ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ وہ بجا طور پر اپنی قسمت پر نازاں تھے۔ بڑی اسکرین کے ہیرو بننے کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا اس کی تئیر اتنی حسین ہو گئی، انہوں نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے رب العزت کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں یہ عزت اور مقام عطا کیا۔ ”دھماکا“، ٹھیک ہو گئی اور ایک دن سنیہا گھروں کی زینت بھی بن گئی مگر افسوس صد افسوس کہ جاوید شیخ کے کیریئر میں کوئی دھماکا نہ کر سکی۔ اس کی ہی نہیں اس فلم سے جڑے کسی بھی فرد کے لیے خوشی کا سبب نہ بن سکی۔ زبردست پبلیٹی کے باوجود باکس آفس پر سپر فلاب ثابت ہوئی۔ اس فلم کے ساتھ ہی فلم کے ہدایت کار قمر زیدی، فلم ساز مولانا ہتھی، رائٹر ابن صفی اور فلم کے ہیرو جاوید شیخ فلم انڈسٹری کے لیے شہر ممنوعہ قرار دے دیئے گئے۔

جاوید شیخ کی بات دوسروں سے مختلف تھی۔ ان کو سنیہاؤں کی اسکرین پر جلوہ بکھیرنے کا موقع تو ملا مگر فلم دیکھنے والوں نے انہیں قبول نہیں کیا، جو بڑے برائی انہیں ریڈیو کی صداکاری میں ملی، ٹی وی ڈراموں میں ملی، اسٹیج پر ملی، کرش اور فیشن شو میں ملی وہ فلم میں نہیں ملی۔

اردو اور پنجابی فلمیں

شیرنی (1988ء ہدایت کار داد جٹ)۔
 میڈم باوری (1989ء ہدایت کار نذر الاسلام)۔
 رنگیلے جاسوس (1989ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔ امیر خان (1989ء ہدایت کار یونس ملک)۔ انٹرنیشنل گوریلے (1990ء ہدایت کار عزیز تبسم)۔ جنگجو گوریلے (1990ء)۔ ہدایت کار عزیز تبسم)۔ راجا (1990ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔
 آخری ٹاکرہ (1990ء ہدایت کار سید رضا زیدی)۔
 زہریلے (1990ء ہدایت کارہ سنگیتا)۔ کالے چور (1991ء ہدایت کار نذر الاسلام)۔ سات خون معاف (1991ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔
 دولت کے پجاری (1991ء ہدایت کار اورلیس خان)۔ ٹانگ دیوتا (1991ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ حسن کا چور (1991ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ تین کیے تین چھکے (1991ء ہدایت کار جان محمد)۔ بد معاش ٹھگ (1991ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ بخاور (1991ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔ درندگی (1991ء ہدایت کار انیم مقبول)۔ دل لگی (1992ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ دہشت گرد (1992ء ہدایت کار وحید ڈار)۔ جوشیے (1992ء ہدایت کار امتیاز رانا)۔
 حسینوں کی بارات (1992ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔ محبت کے سوداگر (1992ء ہدایت کار جان محمد)۔ ڈاکو راج (1992ء ہدایت کار اورلیس خان)۔ نرگس (1992ء ہدایت کار نذر الاسلام)۔
 خون کا قرض (1992ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔
 پرندے (1992ء ہدایت کار ایم اشرف بٹ)۔
 عابدہ (1992ء ہدایت کار ایم اشرف بٹ)۔
 اکھاڑہ (1992ء ہدایت کار الطاف قمر)۔ خدا گواہ (1993ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ پیدا کیر (1993ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ جموٹے رئیس (1993ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ غرہ گوری وا (1998ء ہدایت کار اقبال کاٹھیری)۔ صاحب مٹی (1998ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔ حکومت (2001ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔

قلم ٹیم ورک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بہت سے تخلیق کار مل کر ایک فلم بناتے ہیں مگر قلم کی ناکامی کا سارا ملہا قلم میں اداکاری کرنے والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جاوید شیخ کو اس فلم کی ناکامی پر دکھ اس بات کا تھا کہ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ کامیاب ہوتی تو وہ بھی کامیاب ہیر و پشار کر لیے جاتے۔ اس کی ناکامی پر انہیں دودھ میں گری کھسی کی طرح اٹھا کر انڈسٹری سے باہر پھینک دیا گیا اور وہ دس سال تک تاساعد حالات کے پھیرے کھاتے رہے۔ آج جب وہ اللہ کے فضل و کرم سے ایک سپر اسٹار ہیں۔ اپنے ان دنوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ”دھماکا“ کی ناکامی کے بعد شروع ہونے والا سفر بڑا مشکل اور صبر آزما تھا۔ بڑے شیب و فراز سے گزرا۔ برے برے وقت کا سامنا کیا مگر ہمت نہیں ہارا۔ ایسے مواقع پر بہت سے لوگ ہمت ہار جاتے ہیں اور پھر ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں رہتا مگر میں حوصلہ نہیں ہارا۔ میری کوشش یہی رہی کہ اس برے وقت میں بھی اپنی جدوجہد جاری رکھوں۔ میدان چھوڑ کر بھاگوں نہیں اور پھر وقت اور حالات نے ثابت کر دیا کہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ثابت قدم ہوتے ہیں۔ اپنی محنت اور لگن کو اپنا رہبر بنا کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

جاوید شیخ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے حقیقت پسند بھی ہیں۔ اپنے بھلے دنوں میں انہیں اپنے برے دنوں کی فطرتی کا بھی احساس ہے۔

”میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا کہ میری اس خرابی میں میرا اپنا کردار بھی تھا۔ میں فلموں میں کام کرنے کے لیے اتنا بے تاب تھا کہ میں آنکھیں بند کر کے ”دھماکا“ میں کام کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ ان دنوں میں اتنا ”پنپ“ بھی نہیں تھا کہ مجھے فلموں اور قلم والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ شو بز کے بہت سے شعبوں سے وابستہ ہونے اور ان سے جڑے لوگوں سے واقف ہونے کے علاوہ میڈیا کے ذریعے بھی فلم انڈسٹری کی بہت سی باتیں مجھے معلوم تھیں۔ مجھے مولانا تپپی اور قمر زیدی کے بارے میں اچھی طرح چھان چھنک کے بعد ان کی فلم میں کام کرنا چاہیے تھا۔ ان دونوں کی اپنے شعبوں میں کوئی بہتر کارکردگی نہیں تھی۔ اگر وہ اچھے اور درد بین فلم والے ہوتے تو کسی جاسوسی کہانی پر فلم نہیں بناتے۔ جاسوسی فلمیں، رومانوی اور گھریلو فلموں کے مقابلے میں کم پسند کی جاتی ہیں۔ وہ بھی ایسی صورت میں

جب بتانے والا پختہ کار ہو۔ مولانا اپنی اور قریبی نے محض ابن مثنیٰ کے نام پر کامیابی کا خواب دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ اس فلم سے جڑے لوگوں کا بھی دھڑن تختہ کر دیا۔“

فلم ساز و ہدایت کار نے اپنی فلم کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی کہ ہم نے اس فلم کی نمائش کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور اس مہینے میں موسم بہت سرد ہوتا ہے۔ شائقین فلم اپنے گھروں سے کم ہی نکل کر سینماؤں کی طرف آتے ہیں۔

”دھماکا“ 13 دسمبر 1974ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ میں ان دنوں کراچی میں موجود تھا اور شوہر صحافی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اس لیے مجھے ساری باتوں، سارے حالات کا بخوبی علم تھا۔ جس روز ”دھماکا“ ریلیز ہوئی اسی دن حسن طارق کی فلم ”امراؤ جان ادا“ بھی نمائش پزیر ہوئی تھی جس پر دسمبر کا موسم بھی کئی طرح ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوا۔ ہر شہر اور ہر علاقے میں تماشاخیوں کا جم غیر سینما گھروں میں موجود تھا۔ فلم اچھی ہو تو فلم بینوں کو سینماؤں پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس فلم نے ہر سرکٹ میں کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔

دوسری طرف ”دھماکا“ کی ناکامی میں کئی عوامل کار فرما تھے جس میں بنیادی عنصر تو فلم کا اسکرین پلے تھا جو بہت برا اور ناقص تھا۔ اس کے علاوہ فلم کا ٹریٹمنٹ فلم کا سبکیٹ اور مس کاسٹنگ بھی ناکامی کا سبب بنے۔ اس دور کے سارے ہی ناقدین اور مصرین کی اجتماعی رائے یہ تھی کہ مولانا اپنی کا خود کو ہیرو کیے روپ میں پیش کرنا اس فلم کی ناکامی کی سب سے اہم وجہ تھی۔

ہماری فلم انڈسٹری کی ریت ہے کہ تصور جس کا بھی ہو، فلم کی ناکامی کا لمبا آرٹسٹوں پر ڈال دیا جائے۔ ”دھماکا“ کی ناکامی کا سارا لمبا جاوید شیخ پر یہ کہہ کر ڈال دیا گیا کہ وہ نان اشار اور کمزور انیکور تھا اس لیے فلم کو کامیاب نہ کر سکا۔ اس بہتان کے بعد اس پر فلم انڈسٹری کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد جاوید کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ لاہور کو الوداع کہہ کر واپس اپنے شہر کراچی آ کر نئے سرے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرے۔

کراچی واپسی کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد شیخ رحمت اللہ نے انہیں اس بات پر رضا مند کیا کہ اب فلم کا خیال دل سے نکال دو اور ملازمت کر لو۔ بدقت تمام جاوید

رضا مند ہوئے تو انہوں نے انٹرنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔

مگر اس ملازمت میں ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے شوہر سے جود لگا یا تھا تو ان کا دھیان اسی طرف ہی لگا رہا تھا۔ شاید اپنے آپ کو اس طرف سے نکالنے اور اپنے آپ کو ماضی کی یادوں سے بچانے کے لیے ایک دن وہ فرانس چلے گئے۔ غالباً انہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ ماضی کی تلخ یادوں کو بھول جائیں گے۔ شوہر سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے دردر کر لیں گے۔

فرانس یورپ کا بڑا خوب صورت ملک ہے۔ وہاں کے لوگ اور ان کے رسم و رواج بہت پیارے ہیں۔ جاوید کو بھی وہاں پہنچ کر وہاں کی آب و ہوا اور ماحول نے متاثر کیا۔ ایک دن ایک فرانسیسی لڑکی کیرولین سے جاوید کی ملاقات ہوئی جس نے پہلی ملاقات ہی میں انہیں بہت متاثر کیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کا تعلق ایک تہذیب یافتہ اور دولت مند خاندان سے تھا۔ کیرولین کے والد پیرس میں پئی آئی اے کے اسٹنٹ مینیجر تھے۔ اس فیملی نے جاوید کو بے پناہ پیار اور عزت دی۔ نب کہ کیرولین نے جاوید شیخ کو جنرل مین بننے میں مدد دی۔ انہیں مغربی دنیا کے طور طریقے سکھائے۔ فریج مجبو بہ کی دوستی نے اس دھماکارے ہوئے نوجوان کو پیار بھرا سہارا دیا۔ زندگی سے بھرپور زندگی گزارنے کی طرف مائل کیا۔ اسے اچھا لباس پہننے اور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی تربیت دی۔ پیرس میں جاوید شیخ نے اپنی زندگی کے وہ سہرے دن رات گزارے جن کی یادوں کی خوشبو وہ آج بھی محسوس کرتے ہیں۔ جب بھی انہیں فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں انہیں پیرس کے وہ شب و روز یاد آ جاتے ہیں اور وہ آہ بھر کر کہتے ہیں۔ ”آہ! کیا دن تھے وہ بھی!“

پیرس کا معاشرہ چونکہ آزاد تھا اس لیے کیرولین سے دوستی کے دوران اس کے بھائی سے بھی جاوید کی دوستی ہو گئی تھی۔ پھر جلد ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے یہ تینوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ہوں لیکن کیرولین کے لیے جاوید کے دل میں ایک خاص گوشہ تھا۔ اگر کیرولین کی فیملی اجازت دے دیتی اور وہ حسین فرانسیسی لڑکی پاکستان آنے پر رضا مند ہو جاتی تو ممکن تھا کہ جاوید شیخ کی زندگی میں وہ سب کچھ نہ ہوتا جس کی غلش ان کے دل پر اثر انداز ہوئی اور ان کے دل کے دورے کا موجب بنی۔ مگر خود جاوید

پروڈیوسر غضنفر علی کو متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک فرد نے قلم بنانے کی غرض سے دینی بلوایا اور انہیں پاکستانی اور بھارتی فنکاروں کے ساتھ ایک مودی بنانے کی پیشکش کی۔ غضنفر صاحب اس قسم کے ایڈوکیٹ کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لہذا پی ٹی وی کی ملازمت چھوڑ کر دینی جانچنے اور ایک قلم کی پلاننگ شروع کر دی۔

یادش بخیر۔ یہ 1980ء کی دہائی کے اوائل کا واقعہ ہے۔ غضنفر علی کے اس اقدام کو پی ٹی وی حکام نے بغاوت سے تعبیر کیا۔ موجودہ دور کے قارئین کی معلومات کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اب غضنفر علی صاحب پرائیویٹ پی وی چینل انڈس وٹن کے روح رواں ہیں۔

گھنفر علی صاحب نے دینی کے شاہی خاندان کے فرد کی آفر پر اپنی اچھی بھلی مستقل نوکری کو لات ماری اور قلم بنانے کے شوق میں پہلی فرصت میں دینی پہنچ گئے۔ متعلقہ شخص سے بات چیت ہوئی اور معاملات طے ہونے کے بعد انہوں نے مجوزہ قلم کا کام شروع کر دیا جس کا نام ”دوسرا کنارہ“ رکھا اور اس کی کاسٹنگ کے لیے پاکستانی اور ہندوستانی آرٹسٹوں کو اس قلم میں کام کرنے کی دعوت دی۔ پاکستان سے جن فنکاروں کو دعوت دی ان میں نمایاں نام جاوید شیخ، شعیب محمد اور بہروز سبزواری تھے جب کہ انڈین قلم انڈسٹری کے اشارز دہی نول اور کچھ اداکاروں کو لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی قلم میں پاکستانی اور ہندوستانی آرٹسٹوں نے ایک ساتھ کام کیا۔ ”دوسرا کنارہ“ کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر نسیم عرفانی تھے جنہوں نے بعد میں غضنفر صاحب کی جولانی طبعیت کی دلچسپ کہانیاں سنائیں۔ ان کے بیان کردہ واقعات سے بہت سی ان کہی باتیں سامنے آئیں۔ ان دنوں میڈیا آج کی طرح اتنا پورفل نہیں تھا اس لیے ادھر کی باتیں ادھر جھٹ پٹ نہیں پہنچتی تھیں۔ نسیم عرفانی صاحب کی زبانی غضنفر علی اور ان کی قلم ”دوسرا کنارہ“ کی کہانی سنئے۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”شیخ“ کی کامیابی کے بعد جاوید شیخ، شعیب محمد اور بہروز سبزواری پروڈیوسر ظہیر خان کی سیریل ”افشاں“ میں پرو فارم کر رہے تھے۔ جب کہ شعیب منصور کی ایک سیریل ”انجینی“ کے لیے بھی یہ نتیجے تک تھے جس کی ریکارڈنگ جلد ہی شروع ہونے والی تھی۔ غضنفر صاحب نے انہیں اپنی قلم میں اداکاری کرنے کی دعوت دی تو یہ لوگ تذبذب کا شکار ہو گئے۔

اما نا ہے کہ شاید کیرو لین کا پاکستان نہ آتا ہی اچھا فیصلہ تھا کہ وہ پاکستان آ بھی جاتی تو جلد ہی یہاں کے ماحول سے انا لڑنے دیں واپس لوٹ جاتی جب کہ میرے لیے اس میں مستقل ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے ہر حال میں واپس انا تھا اپنے ادورے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لیے۔

میرس میں جس حسینہ سے دل لگ گیا تھا اس نے کچھ دن تک تو ذہنی طور پر جاوید کو ذہنی طور پر شو بیز کی دنیا سے دور رکھا تھا مگر جیسے ہی کیرو لین کی چاہت کی بندھن ڈھیلی کرنے لگی، وہ ان کی رفاقت پر رضامند نہیں ہوئی، جاوید کو پھر انا وطن اور وہاں گزاری ہوئی مصروفیات یاد آنے لگیں۔ ایک بار پھر سے ایکٹریٹنے کی خواہش انہیں ہمیز کرنے لگی کہ کمر واپس چلو اور نئے سرے سے اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی کوشش کرو۔

کیا ہوا اگر چلے چلے تم نے ٹھوکر کھائی ہے اٹھو کپڑے جھاڑ کر پھر اس میں کیار سوائی ہے ایک مجبور کا ساتھ چھوٹا تو دوسری معشوقہ یاد آئی اور وہ ہر س کی حسین یادوں کو وہیں چھوڑ کر پاکستان آ گئے اور آتے ہی پرانی معشوقہ کو منانے کے لیے اپنی جدوجہد کا سفر شروع کر دیا اور اس بار قلم انڈسٹری کی طرف جانے کی بجائے پی ای ٹیشن کے چکر لگانے لگے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے اب پروڈیوسر قاسم جلالی، فاطمہ ثریا بیجا کے اسکرپٹ رائٹر ایک سیریل ”شیخ“ کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے جس کی کاسٹنگ ہو رہی تھی۔ جاوید نے بھی آڈیشن دیا اور منصور کے کردار کے لیے کفرم کر لیے گئے۔ جاوید کے ساتھ ایک پی ہیروئن غزالہ انجم کو لیا گیا جو بعد میں غزالہ کیفی ہو گئیں اور پی وی ڈراموں کی صف اول کی ہیروئن کہلائیں۔

قاسم جلالی کی ڈائریکشن اور فاطمہ ثریا بیجا کی کہانی دنوں نے مل کر ”شیخ“ کو سپر ڈراما سیریل بنادیا۔ اس کی اگلی قسط کے انتظار میں ناظرین بے تاب رہتے تھے اور مسب روایت وہی ہوا جو یہاں کی ریت ہے۔ ”شیخ“ کی عوامی مقبولیت نے اس کے دوسرے آرٹسٹوں کے علاوہ جاوید شیخ کو بھی چھوٹی اسکرین کا بڑا اشار بنا دیا جس کے بعد وہ پی ٹی وی کراچی کے ڈراموں کی ضرورت بن گئے۔ جاوید شیخ کی طویل عرصے کی بے قراری کو قدرے قرار آنے لگا اور وہ اپنے اداکارانہ فن کی پیاس پی وی ڈراموں سے بھانے لگے۔

پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ پی ٹی وی کے ایک کامیاب

”سرجی! ہماری سیریل ”افشاں“ کی ریکارڈنگ جاری ہے۔“

”اور شعیب منصور صاحب بھی ”اجنبی“ کی ریکارڈنگ جلد ہی شروع کرنے والے ہیں۔“

”کیا آپ اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتے جب ہم ان دونوں سیریلز سے فارغ ہو جائیں۔“

”نہیں انتظار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا پروڈیوسر ٹافٹ فلم شروع کر کے ٹافٹ ختم کرنا چاہتا ہے۔ تم لوگ ٹائم نہیں دے سکتے تو ہم فلمی اداکاروں سے معاملات طے کر لیں گے۔ میرا پروڈیوسر بھی یہی چاہتا ہے کہ فلمی فنکاروں کو اس فلم میں کاسٹ کیا جائے۔ میں تو تم لوگوں کے بہتر مستقبل کے لیے تمہیں فلمی اداکاروں پر ترجیح دے رہا ہوں۔“

غفنغر صاحب کی بات سن کر تینوں ٹی وی اشارز ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس پر غفنغر صاحب بولے۔ ”دیکھو ایک طرف ٹی وی ڈرامے ہیں۔ دوسری طرف فلم اور فلم بھی ایسی جو پاکستان میں ہی نہیں بھارت میں بھی دکھائی جائے گی۔ دنیا بھر میں اس کی نمائش ہوگی۔“

فلم کے لالچ میں تینوں دوستوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ جاوید شیخ کی تو اصل منزل فلم ہی تھی۔ اگر قدرت فلم میں کام کرنے کا موقع فراہم کر رہی ہے تو اسے ٹھکرا کر ان نعت ہو گا۔ یہ بات جاوید و دوسروں کو بھی سمجھاتا۔ جس کے نتیجے میں تینوں دوستوں نے پی ٹی وی کے پروڈیکٹ ”افشاں“ کو ادھورا چھوڑا اور خاموشی سے دینی پہنچ گئے۔

ان کے جینچے ہی غفنغر صاحب نے ”دوسرا کنارہ“ کی شوٹنگ شروع کر دی جو مسلسل دو ہفتوں تک جاری رہی۔

اس فلم پر 18 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی تھی جو اس دور میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اس زمانے میں پاکستان میں دو ڈوڑھائی لاکھ میں فلم بنائی جاتی تھی۔ غفنغر صاحب بہت خوش تھے کہ چھوٹی اسکرین کی فتوحات کے بعد اب وہ بڑی اسکرین کا میدان مارنے جارہے ہیں۔ ان کی فلم کامیاب ہو گئی تو وہ بھی فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنا مستقبل سنوارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دنوں وہ بہت موڈ میں رہتے تھے اور اکثر مجھ سے بھی کہتے تھے۔

”تسیم عرفانی! تیری قسمت میں بھی جوانی آنے والی ہے۔ تو بھی میرا اسسٹنٹ بن کر فلم انڈسٹری پر راج کرے گا۔“

”دوسری طرف جاوید، شفیع محمد اور بہروز یہ سوچنے لگے تھے کہ یہ فلم کرنے کے بعد ان کے لیے فلم انڈسٹری کے دروازے کھل جائیں گے۔“

چونکہ یہ تینوں پی ٹی وی کے پروڈیوسروں سے بغاوت کر کے آئے ہیں گویا اپنی کشتیاں جلا کر وہی آئے ہیں اس لیے پی ٹی وی کے دروازے ان کے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ اب انہیں جو کچھ آسرا تھا فلم انڈسٹری سے ہی تھا۔

بندہ کچھ اور سوچتا ہے اور قدرت کی رضا اور مرضی کچھ اور ہوتی ہے۔ تمام تر وسائل کے موجود ہونے کے باوجود ”دوسرا کنارہ“ سے اس کے تخلیق کاروں کی امیدیں بر نہیں آئیں۔ فلم مکمل ہونے کے بعد جب اس کی نمائش کا مرحلہ آیا تو یکے بعد دیگرے کئی رکاوٹیں سامنے آئیں۔

وقت گزرتا گیا اور ”دوسرا کنارہ“ کو کوئی کنارہ نہیں ملا، کوئی سہارا نہیں ملا۔ یہ غیر متوقع حالات ایسے تھے کہ تینوں دوستوں کی امیدیں آہستہ آہستہ دھندلانے لگیں۔ وہ اس فلم کی نمائش کو کھٹائی میں پڑا دیکھ کر انتہائی مایوسی کی حالت میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں واپس جا کر ٹی وی کا ہی دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ پاکستان واپس آ کر پی ٹی وی پہنچے اور اپنی غلطیوں کی معافی طلبانی کی تو انہیں کہا گیا۔ ”آپ لوگ ٹھہرے فلمی فنکار، جن کے لیے ہمارے ڈراموں میں نمائش نہیں، ہم تو چھوٹے موٹے ٹی وی آرٹسٹوں کو لے کر اپنے ڈرامے بناتے ہیں۔ اب ہمارے پاس تم لوگ آئے تو کیا آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ یوں بھی تمہارا جرم اتنا سنگین ہے کہ اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تم لوگوں نے رنگ ڈراموں کو ادھورا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ چوروں کی طرح منظر سے پس منظر میں چلے گئے۔ ذرا بھی نہیں سوچا کہ ”افشاں“ کے تخلیق کار کن مسائل کا شکار ہو جائیں گے۔“

واقعی ان کا جرم معافی طلبانی کے قابل نہیں تھا لیکن پروڈیوسر شعیب منصور نے ان کی جنگ جہم کر لڑی۔ ان کی سفارش میں ذاتی طور پر بڑی کوشش کی۔ ”ٹھیک ہے ان سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ بہت بڑی بھول ہوئی ہے مگر بھول چوک انسانوں ہی سے تو ہوتی ہے۔ یوں بھی ان کی غلطیوں کی سزا قدرت کی طرف سے انہیں مل چکی ہے۔ جس مقصد کے لیے انہوں نے ہمیں نقصان پہنچایا تھا ان کا وہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ اب جب وہ اپنی غلطی پر تادم ہیں اور

عافی کے طلب گار ہیں تو انہیں معاف کر دینا چاہیے۔ اللہ ہی توبہ کر لینے والوں کو بخش دیتا ہے۔ ہمیں بھی انہیں معاف کر دینا چاہیے۔“

شیعہ منصور کی اس سفارش پر جاوید، شفیع محمد اور ہر دسزوار کی کو معاف کر دیا گیا۔ ان پر لگی پابندی ختم ہو گئی اور یوں جاوید شیخ پھر سے اس پروجیکٹ کا حصہ بنے جو ایکٹرو کی بغاوت کی وجہ سے دو سال تک ملتوی رہا۔ پیریل ”آن لکھی“ کے نام سے آن ایئر ہوا اور جاوید شیخ لے اسٹارڈم کے حوالے سے سنگ میل ثابت ہوا۔

جاوید شیخ کیے بعد دیگرے ٹی وی ڈراموں میں پہلے لی طرح کا سٹ کیے جانے لگے اور ان کے کام کو ناظرین کی جانب سے بھی پہلے کی طرح پسند کیا جانے لگا لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اندر سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خواب نہ سینما گھروں کی بڑی اسکرین پر جھلکانا تھا۔ قدرت کی جیب ستم نظر لگتی تھی کہ فلموں کے چانس تو ملتے تھے مگر ان کے لبوں کی تعبیر نہیں ملتی تھی۔ دینی میں بننے والی فلم کے لیے انہوں نے اتنی بڑی قربانی دی کہ ٹی وی کی شہرت اور مقبولیت کو داؤد پر لگا دیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد۔

بہر حال وہ چھوٹی اسکرین کے بڑے اداکار کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور سوچتے رہے بھی تو بڑی اسکرین کا ہیرو بننے کا موقع ملے گا اور پھر کچھ عرصے بعد ایسا ایک دن آ ہی گیا۔ انہیں ایک فلم میں بطور ہیرو کام کرنے کی آفر مل گئی تھی۔ فلم کا نام تھا ”بیوی ہو تو ایسی“ جو ایسٹرن انڈیوڈ میں بنائی جا رہی تھی۔ اس کے ہدایت کار زاہد شاہ تھے اور فلم ساز غنیمت علی۔ وہی غنیمت علی جنہوں نے دینی میں ”دوسرا کنارہ“ بنائی تھی مگر جس نے انہیں کوئی سہارا نہیں دیا تھا اس کے لیے انہوں نے بی بی سی کی لگی بندھی نوکری کو قربان کر دیا تھا۔ جاوید شیخ، شفیع محمد اور ہر دسزوار کی کو تو بی بی سی کی حکام نے معاف کر دیا تھا مگر انہیں معاف نہیں کیا تھا کیونکہ وہ معافی مانگنے ہی نہیں گئے تھے۔ انہوں نے اب فلم ”میدیم کوئی اپنا کر اپنی جدوجہد جاری رکھی تھی۔ وہ جاوید شیخ کی اداکارانہ صلاحیتوں پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ بی بی سی ڈراموں میں بھی وہ اس کی اداکاری سے مطمئن تھے۔ اب کہ ”دوسرا کنارہ“ میں بھی اس نے بڑی خوب صورت اداکاری کی تھی۔ اس لیے اب جب وہ فلم سازی کی حیثیت سے فلم بنارہے تھے تو ہیرو کے کردار کے لیے جاوید شیخ ہی کو اسٹ کرنا مناسب سمجھا۔ ان کی فلم میں ایک بار پھر جاوید کو

صرف پنجابی میں بننے والی فلمیں

مہندی (ریلیز 1985ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ داغ (ریلیز 1988ء ہدایت کار اسلم ڈار)۔ پھولن دیوی (ریلیز 1989ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ بارش (ریلیز 1989ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ بانی (ریلیز 1989ء ہدایت کار حیدر چوہدری)۔ ننگی تلواری (ریلیز 1989ء ہدایت کار حیدر چوہدری)۔ زخمی عورت (ریلیز 1989ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ ہوشیار (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ وقت (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ پیسا ناچ نچائے (ریلیز 1990ء ہدایت کار رشید ڈوگر)۔ سرمایہ (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ اللہ شہنشاہ (ریلیز 1990ء ہدایت کار حسین)۔ سائرن (ریلیز 1990ء ہدایت کار ایم اسلم خان)۔ انتشار (ریلیز 1991ء ہدایت کار ایم سلیم جعفری)۔ لاہوری بد معاش (ریلیز 1991ء ہدایت کار شاہد رانا)۔ لشکر (ریلیز 1991ء ہدایت کار وحید ڈار)۔ فقیرا (ریلیز 1993ء ہدایت کار رشید ڈوگر)۔ رشتہ (ریلیز 1993ء ہدایت کار حسین)۔

فلاپ فلمیں

دھماکا، جھومر چور، ہم سے نہ ٹکرانا، دیوار، داغ، شیش ناگ، پھولن دیوی، ننگی تلواری، طوفانی، بجلیاں، وقت، پیسا ناچ نچائے، سرمایہ، اللہ شہنشاہ، آخری ٹاکرہ، سات خون معاف، انتشار، حسن کا چور، خظروں کے کھلاڑی، لشکر، دہشت گرد، جو شیعہ، محبت کے سوداگر، پامیلا، خون کا قرض، پرندے، اکھاڑا، صوبے خان، شیدائی، یادگار، وردی، رشتہ، علاقہ غیر، پناہ، ہم نہیں یاتم نہیں، بازی گر، آؤ پیار کریں، عقابوں کے تھمن، دل والے، غرہ گوری، دا، کھلنا ٹیک، مہلت، صاحب جی، صاحب بی بی اور طوائف، دنیا سے کیا ڈرنا، چاند بابو، میری توبہ، کہاں ہے قانون، جان تیرے نام، میں اک دن لوٹ کے آؤں گا، لو میں گم۔

کام کرنے کی دعوت ملی تو ان کے اراموں کی منہ بند کلی کھل گئی۔ جاوید شیخ کو ایک بہت پرانی بات یاد آگئی۔
 ”ارے یہ تو میرے ذاتی اسٹیج ڈراما ”شادی ہو تو ایسی“ سے ملتا جلتا نام ہے۔ میرا وہ ڈراما تو بہت کامیاب ہوا تھا اور اس کے کوئی سو شوز میں مختلف شہروں میں اسٹیج کیے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ فلم بھی اسی طرح کامیاب ہو۔“
 اس نے غضنفر علی کی دعوت قبول کر لی مگر اس شرط پر کہ اپنی ٹی وی کی مصروفیات ترک نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ ”سرجی! میں آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کروں گا مگر آپ کو بھی میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔“
 ”کیسا تعاون؟“

”میرے ٹی وی ڈراموں کی ریکارڈنگ کے وقت آپ اپنی شوٹنگ نہیں رکھیں گے۔“
 ”اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔“ غضنفر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس بات پر اپنی کشتیوں کو سلامت رکھنا چاہئے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ تم نے بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔“

اس کے بعد جاوید نے اس فلم کے معاہدے پر سائن کر دیا اور اس فلم کے لیے بھرپور تیاری شروع کر دی۔ اپنے کیریئر کو بڑی باریک بینی سے اسٹڈی کیا اور اداکاری کے دوران ان کو جو مکالمے بولنے تھے انہیں یاد کیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کردار کو خود پٹاری کرنے کی مشق کی۔
 اس فلم کی دیگر کاسٹ میں شبنم، آرزو، شفیع محمد، لہری اور کمال ایرانی شامل تھے۔ ایئرٹن اسٹوڈیو میں جہاں اس کا پروڈکشن آفس تھا روزانہ شام کو ہدایت کار زاہد شاہ اور فلم ساز غضنفر علی اسکرپٹ رائٹر کو ساتھ بٹھا کر اس کے ایک ایک سین پر بحث کرتے اور ہر طرح سے شوٹنگ سے پہلے اسکرپٹ کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔ سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے کہ شوٹنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے اچانک لاہور کے ڈسٹری بیوٹر نے فلم کی کاسٹ میں شامل ہنے ہیرو جاوید شیخ پر اعتراض کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسی صورت میں فلم کا سودا کرے گا اگر جاوید شیخ کی جگہ فیصل الرحمن کو کاسٹ کیا جائے گا۔ فیصل الرحمن ان دنوں جاوید کے مقابلے میں زیادہ مقبول اداکار تھا اور ہر دوسری فلم میں اسے کاسٹ کیا جا رہا تھا۔

گھنفر علی نے ڈسٹری بیوٹر کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ جاوید شیخ اپنے ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے گھر گھر میں

دیکھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ فلم میں بھی اسے فلم دیکھنے والے پسند کریں گے۔ یوں بھی جاوید بڑا ٹیلیوڈ اداکار ہے مگر ڈسٹری بیوٹر کسی صورت مان کر نہیں دیا۔
 ”ٹھیک ہے آپ جاوید کو لے کر فلم بنائیں۔ میں فیصل الرحمن کی کوئی اور فلم کا سودا کر لوں گا۔“
 جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو فلم ساز غضنفر علی نے ہتھیار ڈال دیے۔ فلم شروع کرنے سے پہلے کسی تقسیم کار کا ملنا بڑی بات ہوتی ہے۔ اس کے پیسے سے فلم ساز کو بہت سپورٹ حاصل ہوتا ہے۔ دل پر ممبر کا سل رکھ کر انہوں نے جاوید کو کسٹ کیا اور اس کی جگہ فیصل الرحمن کو کاسٹ میں شامل کر لیا۔

اس موقع پر شفیع محمد نے جاوید کی دوستی کے حوالے سے کہا۔ ”اگر جاوید فلم میں نہیں ہوگا تو میں اس میں کام نہیں کروں گا۔“
 مگر غضنفر علی کی بجائے انہیں جاوید شیخ نے سمجھایا۔ ”میری وجہ سے تم کیوں اپنا نقصان کرتے ہو؟“
 جاوید کے سمجھانے کے بعد شفیع محمد اس فلم میں کام کرنے پر رضامند ہو گئے مگر خود جاوید شیخ ”بیوی ہو تو ایسی“ کے شو پر (ہیرو) نہ نہ سکے۔

جاوید شیخ کو جو کہ جو صدمہ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتے۔

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے بن جائے شیش تو کوئی آگ لگا دے
 اس بات کا انہیں بے حد ملال تھا کہ ان کی تقدیر ان کے ساتھ کھلو اڑ کر رہی ہے۔ ”دھاکا“ بن کر ریلیز ہو گئی مگر سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ ”دوسرا کنارہ“ بھارتی فنکاروں کے ساتھ مکمل کروائی لیکن اس کی نمائش کا مرحلہ نہیں آیا۔ یہ نئی فلم ”بیوی ہو تو ایسی“ سے کچھ امید بندھی تھی مگر قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کر کند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
 چند دنوں بعد جب شوٹنگ شروع ہونے والی تھی جس کی میں نے بھرپور تیاری کر لی تھی میری جگہ کسی اور کو شامل کر لیا گیا اور مجھے دودھ کی مٹی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا۔

اس واقعے کو وہ اب تک بھولے نہیں ہیں۔ اکثر جب بیٹے دنوں کی باتیں کرتے ہیں تو اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

بیوی بن گئی۔ ذرا بھی تمہارا خیال نہیں کیا۔ احتجاج نہیں کیا۔
روٹی پختی نہیں چینی چلائی نہیں۔“

”زینت! تم مجھ سے ہمدردی کر رہی ہو یا..... یا
میری بد نصیبی کا مذاق اڑا رہی ہو؟“

”نہیں تمہاری قسمت یا تمہارا مذاق نہیں اڑا رہی
ہوں۔ میں تو یہ کہوں گی کہ اچھا ہی ہوا۔ تم ایسی بیوی کے
شوہر نہ بنے۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تمہیں کسی اچھی، پیاری
اور وفادار بیوی کا شوہر بنائے۔“

”ایسی بیویوں کا شوہر تو کئی بار بنا مگر میری قسمت ہی
بے دلفنگلی۔“

”میں فلموں یا ڈراموں کی بات نہیں کر رہی ہوں۔
تمہاری سچی سچی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔ ہاں جاوید اب
تم حقیقی بیوی کے حقیقی شوہر بن جاؤ شاید.....“

”شاید کیا؟“

”شاید تمہاری بیوی کی ہی وجہ سے تمہاری قسمت کی
گردش ختم جائے۔“

”جاوید شیخ نے زینت منکھی کو کوئی جواب نہیں دیا۔
بس یہ سوچا رہ گیا کہ یہ پہلی لڑکی ہے جس نے اسے اتنا
ہمدردانہ شور مچایا ہے۔“

زینت منکھی کو وہ بہت دنوں سے جانتا تھا۔ وہ ایک
ماڈل اور اداکارہ تھی جب وہ کمرشل میں خود ماڈل کی حیثیت
سے کام کرتا تھا تو اس دور میں بھی وہ اس کی تنگی سہمی ہوا
کرتی تھی۔ پھر اس کی طرح وہ ٹی وی ڈراموں کی پر فامر
بنی۔ دوسری اداکاروں کے مقابلے میں بڑے سوبر، منجیدہ
اور رکھ رکھاؤ کی حامل۔ اس کا کبھی کوئی اسکینڈل سامنے نہیں
آیا۔ نہ ٹی وی کے حلقوں میں نہ میڈیا میں اس کے متعلق کسی
نہ کچھ کہنا نہ کچھ چھپا۔

کئی دنوں تک وہ زینت منکھی کے بارے میں سوچتا
رہا۔ ”یہ لڑکی میری بیوی کی حیثیت سے کیسی رہے گی؟“

”پتا نہیں وہ میری بیوی بننا پسند بھی کرے گی یا
نہیں؟“

یہ اور اس قسم کی سوچ اور فکر میں وہ کچھ دنوں تک جلتا
رہا۔ پھر یہ فیصلہ کیا کہ اسے آزما یا جائے۔ دیکھا جائے کہ

میرے بارے میں وہ کتنی منجیدہ ہے۔
اس کے بعد اس نے زینت منکھی کے ساتھ ڈراموں

میں اداکاری کرنے کے بعد کچھ وقت اس کے ساتھ
گزارنے لگا۔ کبھی چائے پینے کے بہانے، کبھی یونہی محسن

”یار! میرے ساتھ کیا کیا کچھ نہیں ہوا۔ اتنی طویل
مدد جہد کے بعد جب بڑی اسکرین پر نمودار ہونے کے
واقعے ملے تو میری بد قسمتی نے بار بار مجھے مایوسیوں کے
اندھیرے میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس قدر سخت جان نہ ہوتا تو
بہت سے نئے اداکاروں کی طرح کمپانی کے اندھیروں میں
گم ہو جاتا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور نئے سرے سے
نئے عزم و ارادے سے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ اللہ اکبر! اللہ
بہت بڑا ہے۔ بہت رحیم و کریم ہے۔ شاید اسے میری یہی ادا
پسند آئی۔ میں ہر ناکامی کے بعد یہ سوچ کر، یہ جان کر اپنا
سفر جاری رکھتا تھا کہ مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ ایک نہ
ایک دن مجھے ضرور سرخورد کرے گا۔ کامیاب کرے گا۔ شاید
ابھی میری آزمائش کا وقت ہے۔“

جاوید نے ایک دانشمندی کا ثبوت دیا تھا نئی فلم ”بیوی
ہو تو ایسی“ کی اداکاری کی دعوت قبول کرتے وقت ”دوسرا
کنارا“ کے وقت کی غلطی نہیں کی تھی۔ ٹی وی سے اپنا تانا
نہیں توڑا تھا۔ اپنی نئی بیانی ساکھ سے رشتہ نہیں منقطع کیا
تھا۔

”پتا نہیں، وہ کیسی بیوی تھی میرے نکاح میں آنے
سے پہلے ہی بے وفا کی کرگئی کسی اور کی بن گئی۔“ جاوید شیخ
خوشگوار لہجے میں کہتے ہیں۔ ”مگر اس فلمی بیوی کی بے وفا کی
کے بعد ایک حقیقی بیوی کی رفاقت کا خیال مجھے ہمیز کرنے
لگا۔“ ”یار جاوید!“ میں ان دنوں اکثر اپنے آپ سے کہتا۔
”کیوں نہ میں سچ کچھ کی ایک بیوی کا شوہر بن جاؤں۔“
”اس سے کیا ہو گا؟“ میں اپنے آپ سے سوال
کرتا۔

”سنا ہے کہ عورت کی وجہ سے مرد کی مصیبت ختم ہو
جاتی ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو چلو شادی کر کے دیکھتے ہیں۔“
پھر جاوید شیخ اپنے ارد گرد دیکھنے لگے کہ کوئی ایسی لڑکی
ابھی مل جائے جو ان کی بیوی بن جائے لڑکیاں تو بہت
تھیں۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے خاندان میں ان کی
پرستار لڑکیاں بھی بہت تھیں لیکن جانے کیوں انہیں اپنی بیوی
بنانے کے قابل کوئی سمجھ میں نہیں آئیں۔ پھر ایک دن یوں
ہوا کہ ایک ڈرامے میں ان کے ساتھ کام کرنے والی
اداکارہ زینت منکھی ان سے پوچھی۔ ”مجھے اس بات پر بہت
اکھ ہے کہ تم ”بیوی ہو تو ایسی“ کے شوہر نہ بن سکے۔ تمہاری
ہائے فیصل الرحمن اسے بے اڑا اور وہ بھی بخوشی اس کی

دور کرنے کے لیے کہیں بیٹھ کر کپ شپ کرنے لگا ایسے ہی ایک موقع پر ایک دن زینت منکھی بول پڑی۔

”کیا ہوا شیخ صاحب! کوئی لڑکی ملی؟“
”روزانہ ہی بہت سی لڑکیاں ملتی ہیں۔“

”اوہو! میں عام لڑکیوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہی ہوں۔ اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جسے تم اپنی بیوی بنانے کے لیے منتخب کر سکو۔“
جادویش نے اپنے سامنے کافی کے کپ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے دیرے سے کہا۔ ”ہاں ایک لڑکی ملی تو ہے۔“

”گذا دیے تو بڑی اچھی خبر ہے۔ پھر شادی کب کر رہے ہو؟“

”ارے یا! ایسے کیسے شادی ہو جائے گی۔“
”پھر کیسے ہوگی؟“

”ابھی تو میں نے اسے پسند کیا ہے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔“
”تو کیا تم نے اسے بتایا نہیں؟“
”کیا بتایا نہیں؟“

”یہی کہ تم نے اسے پسند کر لیا ہے۔ کیا تم بھی مجھے پسند کرتی ہو؟ میرے ساتھ شادی کرو گی؟“

”نہیں، یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔“
”کیوں ہمت نہیں ہوتی؟“

”اس ڈر سے کہ اگر اس نے مجھے پسند نہیں کیا تو.....“

زینت منکھی نے کافی کے کپ سے ایک سپ لینے کے بعد کہا۔ ”شیخ صاحب! ہمت کرو۔ حوصلہ کرو اور ایک بار اس سے کہہ ہی دو۔ اگر وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر دے گی تو کیا ہوگا؟ وہ نہ سہی اور سہی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے کیا؟“

”نہیں اس کے انکار پر مجھے بہت دکھ ہوگا۔ اتنے دنوں کے بعد تو ایک لڑکی پسند آئی ہے اس نے انکار کر دیا تو میرا دل ٹوٹ جائیگا۔“

”ہوں۔“ منکھی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرو کہ اس لڑکی سے مجھے ملا دو۔ میں اس کی مرضی معلوم کروں گی۔ اگر اس نے نہ بھی کہا تو میں کوشش کروں گی کہ وہ ہاں کہنے پر راضی ہو جائے۔“

”ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔ میں اس سے تمہیں ملا

دوں گا۔“

”کب؟“

”بس یہاں سے جاتے وقت۔“

پھر جب وہ کافی پی کر اٹھے تو وہاں سے جاتے وقت ایک قد آدم آئینے کے پاس اسے کھڑا کر کے کہا۔ ”میں یہاں سے ہٹ جا رہا ہوں۔ جب تم اس سے بات کر لینا تو مجھے آواز دے کر بلا لینا۔“

”مگر وہ لڑکی کہاں ہے؟“

”تمہارے سامنے۔“

منکھی نے اپنے سامنے دیکھا۔ اس کے سامنے تو وہی کھڑی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو سر سے پیر تک گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ ”زینت! تجھ میں کیا ایسی بات ہے کہ اس کھنڈرے لڑکے کو تو بھاگتی؟“

ڈرا دیر بعد وہ آئینے کے پاس سے ہٹ کر اس کے پاس مٹی اور بولی۔ ”آؤ چلو۔“

”کیا ہوا؟“

”ہوگا کیا!“

”جلدی بتاؤ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔“
”اپنے آپ کو سنبھالو اور یہاں سے چلو۔ میں بتاتی ہوں۔“

جاوید بوجھل قدموں سے منکھی کے ساتھ آگے بڑھا۔ وہاں سے کچھ دور کھلی فضا میں جاکر زینت منکھی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ ”بھئی! اس لڑکی نے تو.....“

”بولورک کیوں گئیں۔ میں اس کا ہر فیصلہ سننے کو تیار ہوں۔“

اس لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ”میں تو اسے اس وقت سے پسند کرتی ہوں جب اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

”اتنی بڑی خوش خبری سنانے پر میرا جی تو چاہتا ہے کہ تمہارا منہ چوم لوں۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔“

”کیسا امتحان؟“

”ہمارے تمہارے بڑوں کی رضامندی کے بغیر کیے ہماری شادی ہو سکتی ہے۔“

”کیسے نہیں ہو سکتی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے؟“

”قاضی تو کچھ نہیں کر سکتا مگر اباماں کا راضی ہونا ضروری ہے۔“ منکھی نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”یہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ تم لوگ پنجابی ہو۔ کیا تمہارے بزرگ کسی لیر پنجابی خاندان کی لڑکی کو اپنی بیوی بنا پائیں گے؟“

”میرے گھر کا مسئلہ تو میں حل کر لوں گا۔ کیا تمہارے گھر میں بھی؟“

اور جب ایک دن مناسب موقع دیکھ کر جاوید شیخ نے اپنے گھر میں یہ اعلان کیا کہ ”میں جلد ہی اس گھر کی رونق میں اضافہ کرنے والا ہوں۔“

سب بہت خوش ہوئے اور پوچھا۔ ”کیسی رونق؟“

”ایک بہو کو اس گھر کی زینت بنا کر اس گھر کی رونق بڑھانا چاہتا ہوں۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ بس اب تم شادی کر لو۔ ہم تو بہت پہلے سے لڑکی کی تلاش میں ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ شریف گھرانے کے لوگ جب سنتے ہیں کہ ہمارا لڑکا اداکاری کے پیشے سے وابستہ ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔“

”آپ لوگوں کی اسی پریشانی کو پیش نظر رکھ کر میں نے خود ہی اپنی بیوی کا انتخاب کر لیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟“

”یہیں اسی شہر میں رہتی ہے۔ میری ہی طرح وہ بھی اداکاری کرتی ہے اور اس کا نام ہے زینت منکھی۔“

”یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

نادر شاہی حکم سنا دیا گیا اور جن باتوں کا زینت منکھی نے خدشہ ظاہر کیا تھا وہی باتیں جواز کے طور پر پیش کر دی گئیں۔ سب سے زیادہ مخالفت جاوید کے والد شیخ رحمت اللہ نے کی۔

”تم نے پہلے ہی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ہمارے خاندان کو بدنام کیا ہے اب کسی اداکارہ کو میرے گھر کی بہو ہا کر لانا چاہتے ہو۔ میں ایسا برگزین نہیں ہونے دوں گا۔ اپنے گھر کے ماحول کو مزید بگڑنے نہیں دوں گا۔“

”شادی تو میں اسی اداکارہ سے کروں گا۔ آپ کو اگر اپنے گھر کی عزت کا خیال ہے تو میں اپنی زینت کو علیحدہ گھر لے کر اس کی زینت بناؤں گا۔“

بھائیوں نے، بہنوں نے بہت سمجھایا۔ یہ باور کرایا کہ ہم اس سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی سے تمہاری شادی کرا لیں گے مگر جاوید پر کسی کی بات اثر انگیز ثابت نہیں ہوئی۔

نگار ایوارڈ

”غریبوں کا بادشاہ“ بہترین اداکار 1988ء۔ ”بارش“ (پنجابی) بہترین اداکار 1989ء۔ ”استادوں کے استاد“ بہترین اداکار 1990ء۔ ”کالے چور“ (پنجابی) بہترین اداکار 1991ء۔ ”زمانہ“ (پنجابی) بہترین اداکار 1993ء۔ ”زمانہ“ (پنجابی) بہترین اداکار 1993ء۔ ”مشکل“ بہترین اداکار 1995ء۔ ”کنز اینڈ روزز“ بہترین معاون اداکار 1999ء۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین فلم ساز 2002ء۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

گرینجویٹ فلم ایوارڈ

”میڈم بادی“ بہترین اداکار 1989ء۔ ”انٹرنیشنل گوریلے“ بہترین اداکار 1990ء۔ ”کالے چور“ بہترین اداکار 1991ء۔ ”دہشت گرد“ بہترین اداکار 1992ء۔ ”مشکل“ بہترین فلم ساز 1995ء۔ ”مشکل“ بہترین ہدایت کار 1995ء۔ ”مشکل“ بہترین اداکار 1995ء۔

نیشنل فلم ایوارڈ

”غریبوں کا بادشاہ“ بہترین اداکار 1988ء میں۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین فلم ساز 2002ء میں۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

بولان اکیڈمی ایوارڈ

”کالے چور“ بہترین اداکار 1991ء میں۔ ”جھوٹے رئیس“ بہترین اداکار 1993ء میں۔ ”مشکل“ بہترین اداکار 1995ء میں۔ ”چیف صاحب“ بہترین ہدایت کار 1996ء میں۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین فلم ساز 2002ء میں۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا ہے۔ وہ کسی بھی لڑکی کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر اس گھر کی بہو کے روپ میں اپنے آپ کو ڈھال لے گی۔ آپ میں سے کسی کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔“

جاوید شیخ کی ضد اور پھر اس کی یقین دہانی پر گھر والوں کو اس کی بات ماننی پڑی۔ زینت منکھی کو کبھی اسی طرح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کی ضد کے آگے بھی کسی کی نہ چل۔ جب دونوں خاندان والے ایک دوسرے سے ملے تو ان کے خدشات قدرے کم ہو گئے اور وہ دونوں کی شادی خاندان آبادی پر رضامند ہو گئے۔

زینت جاوید کی بیوی بن کر اس کے گھر آئی تو اس نے بہترین بہو بن کر دکھایا۔ گھر کے کسی فرد کو کبھی کسی بات کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ جاوید اور زینت نے ایک مثالی جوڑے کی طرح خاندانی اقدار کی پاسداری کی اور اچھے میاں بیوی ثابت ہوئے۔

یہ ساری پریم کہانی ہم جیسے کھوجیوں تک بہت بعد میں پہنچی اور ان دونوں پریمیوں کے ذریعے ہی۔ بہت بعد میں چھپنے والے ان دونوں کے انٹرویوز کے ذریعے یا ان کے قریب ترین دوستوں کی زبانی۔ ورنہ یہ اندرون خانہ باتیں کیسے باہر آسکتی تھیں۔

زینت منکھی نے جاوید شیخ کی بیوی بن کر یہ ثابت کر دیا کہ بیوی ہو تو ایسی نہ صرف شوہر کو پھر پور محبت دی بلکہ اس کے گھر کی زینت بن کر سچ اس کے گھر کی رونق میں اضافہ کیا۔ بے شک وہ ایک اداکارہ تھی مگر اس نے ایک شریف گھرانے کی بہترین بہو بن کر ثابت کر دیا کہ عزت اور شرافت میں، میں بھی کسی سے کم نہیں۔ اس کے بہترین سجاوے اس کے اچھے عادات و اطوار سے گھر والے بھی خوش تھے۔ منہ سے کوئی کہنا نہیں تھا مگر دل ہی دل میں ضرور سب ہی کہتے تھے۔ ”جاوید کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ اس نے واقعی بہت چھان بین کے بعد اپنی بیوی کے لیے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔“

زینت منکھی کو جاوید اور جاوید کو زینت منکھی مل گئی تو کچھ دنوں تک ایسا لگتا تھا کہ دونوں کو دنیا جہان کی خوشیاں مل گئی ہیں۔ دونوں کی اس پیار بھری رفاقت کے نتیجے میں ان کے گھر آگن میں دو پھول بھی کھلے۔ شہر آشوب اور مول شیخ کے روپ میں۔ جناب شیخ رحمت اللہ کے گھر کی رونق اب دوبالا ہو گئی تھی۔ اس دور کی سب سے اہم بات ہے کہ

زینت منکھی بے حد خوش قدم ثابت ہوئی۔ جاوید کی زندگی میں زینت کا آنا اس کی خوشحالی کا سبب بننے لگا۔ ”ان کما“ ٹی وی سیریل کی ہلاک بستر ڈاکمیا کی کے بعد قلم والوں نے بھی اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ شاب کیرالوئی اور ان کے دونوں بچے نذر شاب اور ظفر شاب اس اصول پر کارفرما تھے کہ اپنی ہر قلم میں بڑے اور پراشارز کے ساتھ نئے اور ابھرتے ہوئے اداکاروں کو بھی کاسٹ کرتے تھے۔ اس طرح کاسٹنگ کے بد میں پیسا بچانا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں شاب صاحب کی قلم ”میرا نام ہے محبت“ خاص کامیاب رہی تھی جس میں غلام محی الدین اور بارہ شریف جیسے ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کو لے کر قلم بنائی اور کامیاب رہے۔ جاوید شیخ کی عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے نذر شاب نے اپنی قلم ”بھئی الوداع نہ کہنا“ میں چالس دیا اور قلم ریلیز ہوئی تو ٹوٹ ہو گئی۔ اگرچہ اس کامیابی کے پیچھے کا عوامل کارفرما تھے۔ شاب پروڈکشن ایک مستحکم قلم ساز ادارہ تھا۔ وہاں خاص فی منصوبہ بندی کے تحت قلم بنائی جاتی تھی۔ کہانی، موسیقی اور ہدایت کاری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی تصویر بھی قلم کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی تھی اور جاوید شیخ کے خوانے سے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس بار ان کی بیوی ان کے لیے گڈ لک ثابت ہوئی تھی۔ ۱۱ جو کہتے ہیں کہ ہر کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے شاید یہ بات بھی سچی تھی الوداع نہ کہنا کے بعد جاوید شیخ کے لیے قلم انڈسٹری کے سارے بند روازے کھل گئے اور ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو کوئی نہ روک سکا۔ نذر شاب کی اس قلم ”بھئی الوداع نہ کہنا“ کی کاسٹ میں شاب کے علاوہ سینا اور نضا بھی شامل تھے۔ یہ قلم ایک بے وقاشوم کی ازدواجی زندگی اور ایک مثالی بیوی کے کرداروں کا احاطہ کرتی ہے جس میں جاوید نے بیک وقت دو عورتوں میں تقسیم مرد کا کردار بڑی خوب صورتی سے نبھایا۔ ان دنوں اس ٹائپ کی فلموں کا رجحان تھا۔ لہذا سماجی موضوع پر چٹا والی ”بھئی الوداع نہ کہنا“ باکس آفس پر زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور یوں فلمی افق پر ایک نئے پراشارز کا جنم لیا جسے بعد میں ندیم کے سب سے مضبوط حریف کا دم حاصل ہوا۔

”بھئی الوداع نہ کہنا“ کی بڑی کامیابی کے بعد جب جاوید شیخ قلم والوں کے لیے ہاٹ ٹیک بن گئے تو ان کا زیادہ سے زیادہ وقت لاہور میں گزرنے لگا۔ ایسے حالات

اب لسی ادا کار کو بیک وقت بہت سے فلم ساز اپنی فلموں میں کاسٹ کرتے ہیں تو ان میں ہر طرح کی فلمیں ہوتی ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ بھی اس دور میں ایسا ہی ہوا۔ انہیں ہلومت کے کرداروں میں پیش کیا گیا۔ ایسا وقت بہت اربابی ہوتا ہے، کچھ اداکار اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناکام ثابت ہوتے ہیں لیکن جاوید شیخ چونکہ اس امت کی سیاحتی میں خاصا وقت گزار چکے تھے اور یہ بات بھی فنی کہ انہیں جنون کی حد تک اداکاری کا شوق تھا اس لیے ہر کردار کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر ادا کیا اور حتیٰ بات یہ ہے کہ اپنی قدرت بھی ان پر مہربان ہو گئی تھی اور ان کی بے پناہ مہارت والی بیوی زینت منٹھی کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا بھی اثر تھا کہ انہیں اردو اور پنجابی فلموں میں جو سامی، رومانوی، طریہ اور ایکشن کرداروں میں پر فارم کرنے کا موقع ملا، ان میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ دراصل اداکار ہیں۔ ہر طرح کی اداکاری میں پورا اترنے پر فلم انڈسٹری میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ ان کی فلمیں کامیاب ہوئیں تو انہوں نے اچھا پڑوس بھی کیا۔ فلم والے انہی اشارز کی قدر کرتے ہیں جن کی فلمیں چلتی اور کما کر دیتی ہیں۔

اس دور میں جاوید شیخ کی جن فلموں نے نئے رکارڈ بنائے ان میں اردو فلموں میں شادی مگر آدمی، گھر لے سامنے، بولی، کرائے کے گھر، مس کوہلو، پھل، اک کنگ کے شعلے، زنجیر، فیصلہ جب کہ پنجابی فلموں میں ہندی، بھائی دیاں چوڑیاں، بارش وغیرہ شامل ہیں۔

ابتدائی دور میں سنم اور سری لکھن اداکارہ سیتا کے ساتھ جاوید کی جوڑی بے حد پسند کی گئی جس کے بعد باہر ٹرلہ، سلمیٰ آغا، کویتا، نیلی، نادرہ اور رینا کے ساتھ بھی جاوید شیخ کی کامیاب جوڑیاں بنیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جو جیتا وہی سکندر۔ تو جاوید شیخ کی یہی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ان کی فلمیں کیے بعد دیگرے کامیاب ہوئیں تو فلم انڈسٹری کے کبھی ہدایت کاروں کے ساتھ انہیں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جن میں ڈاکٹر الاسلام، محمد جاوید فاضل، سید نور، اقبال کاشمیری، مسعود علی، نذر شباب، ظفر شباب، شمیم آرا، سنگیتا، پرویز ملک، ہانم، حسن عسکری اور الطاف حسین وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح فلمی صنعت کے تمام ہی بڑے فلم سازوں سجاد گل، مہمل چند آندہ، میاں فرزند علی، میاں خالد فیروز اور جمشید ظفر نے جاوید کو اپنی فلموں میں بطور ہیر و کاسٹ کیا۔

جاوید شیخ کی کامیابی کے اس سفر میں جہاں انہیں بے حد عروج حاصل ہوا وہاں ان کی گھریلو اور ازدواجی زندگی متاثر ہوئی۔ لاہور کی فلموں میں کام کرنے کے لیے وہ کراچی سے لاہور جاتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں زینت منٹھی انہیں بہت مس کرتی تھیں مگر یہ ان کی مجبوری تھی۔ شوہر روزگار کے لیے اکثر باہر جاتے ہی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ جاوید کی جدائی برداشت کرتی رہی۔ ابتدائی دنوں میں وہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد گھر آتے تھے اور چند روز رہ کر واپس چلے جاتے تھے مگر ان کی لاہور میں مصروفیات جیسے جیسے بڑھنے لگی گھر آنے کا وقفہ بھی طویل ہوتا گیا۔ زینت منٹھی بھر کے یہ دن رات بھی یہ سوچ کر گزارتی رہی کہ شاید جاوید کو بھی مجھ سے دوری کھتی ہوگی۔ شاید اس دوری کو دور کرنے کے لیے وہ لاہور میں گھر لے کر گئے۔ مگر وقت گزرتا گیا اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پھر میڈیا کے ذریعے زینت منٹھی تک یہ باتیں پہنچنے لگیں کہ جاوید شیخ اپنی فلموں کی ہیر و منمز میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ایسی خبروں کو پہلے پہل تو دفا شعار بیوی نے انواز کچھ کر نظر انداز کیا مگر جب جاوید شیخ سے ملاقات ہوئی تو ان کا موڈ مزاج بگڑا ہوا ملا پہلے جیسی بات دکھائی نہ دی۔ بیوی نے کوئی شکوہ شکایت کرنے کی بجائے کہا۔ ”اب تمہاری مصروفیات لاہور میں بہت بڑھ گئی ہیں اس لیے وہیں گھر لے کر مجھے ہلاو۔ یہاں آنے کی رحمت گوارا نہیں کرتی پڑے گی۔“

”گویا تم میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننا چاہتی ہو؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں اور تمہاری ترقی میں رکاوٹ بنوں گی؟ یہ بات تم نے کیسے کہہ دی؟“

”اگر میں لاہور میں گھر لے کر تم لوگوں کو وہاں بلا لوں گا تو میری فلموں پر توجہ کم ہو جائے گی۔ مجھے تم لوگوں میرا مطلب ہے تم اور تمہارے بچوں کے لیے وقت نہیں نکالنا پڑے گا؟ میں جو اب ساری فکر سے آزاد ہو کر اپنی ساری توجہ اپنا سارا وقت اپنی کارکردگی کو بہتر سے بہتر طور پر بنانے پر صرف کرتا ہوں۔ وہ مٹ نہیں ہوگا؟“

”مگر میں جو یہاں تمہارے بغیر متاثر ہوتی ہوں۔ اس کا تمہیں کوئی خیال نہیں؟“

”ٹھیک ہے میں تمہارا خیال کرنے کے لیے لاہور میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس چلا آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر جاوید نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ زمین پر

دے مارا۔ ”یہ بھی نہیں سوچتی یہ عورت کہ یہ دن رات محنت میں اس کے اور اس کے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے کر رہا ہوں۔“

زینت منکھی سمجھ گئی کہ یہ اب پہلے والا جاوید نہیں رہا ہے۔ فلموں کی کامیابیوں نے اب اس کی نظر میں میری قدرو قیمت کچھ نہیں رکھی ہے۔ اخباروں میں چھپنے والی خبریں محض افواہ نہیں ہیں۔ اس کی ساری ولچھپیاں اب اس کی ہیرنٹوں پر مذکور ہو گئی ہیں۔

کچھ دنوں تک زینت نے انتظار کیا کہ جاوید کے رویے اور سلوک میں کچھ بہتری آتی ہے یا وہ یونہی مجھ سے بیزار رہتا ہے مگر جب جاوید کی طرف سے کسی بہتری کی امید نہیں رہی تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ جاوید سے علیحدگی اختیار کر لے۔

جاوید کے گھر والے بھی جاوید کے اس نامناسب رویے اور لالباہی طبیعت سے نالاں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جاوید کی بیوی جواب اس کے دو بچوں کی ماں بھی ہے جاوید سے اپنا رشتہ منقطع کر لے۔ مگر وہ زینت کی مجبور یوں کو بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ آخر اس کی بیوی تھی اور میاں کے جیتے جی کوئی بیوی کیسے اس سے دور رہ سکتی ہے۔

بے پناہ محبت کا وہ رشتہ جو زندگی بھر ساتھ بھانے کے لیے جوڑا گیا تھا ایک دن ٹوٹ گیا۔ زینت منکھی نے جاوید شیخ سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی دنیا الگ بسالی۔ اب اس کے دونوں بچے ہی اس کے زندہ رہنے کا سہارا بنے رہے۔ دونوں اس محبت کی نشانی تھے جس نے اسے پیار کے رشتے سے جوڑا تھا۔ وہ رشتہ جواب برقرار نہیں رہا تھا۔ ایک یا دین کر رہ گیا تھا۔

زینت منکھی نے جاوید شیخ سے علیحدگی کے بعد اپنے لیے کسی نئے شریک حیات کا سہارا نہیں لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جاوید سے اب بھی اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ کسی دن اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ دوبارہ اسے اپنا لے گا۔

دوسری طرف جاوید بڑی اونچی اڑان اڑ رہا تھا۔ اسے ٹوٹنے والے رشتے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ کوئی غم نہیں تھا کیونکہ اس کے ارد گرد محبت کی چٹنگیں بڑھانے کے لیے منت مخالف کی کمی نہیں تھی۔ اس کے لیے اس کے ساتھ فلموں میں کام کرنے والی کئی ہیرنٹیں اس کے اشاروں پر

ٹانجنے کے لیے تیار تھیں چونکہ ان دنوں اس کی قسمت کا ستارہ جگمگا رہا تھا۔ اس لیے اس پر اشارے کے سہارے کئی اداکارائیں آگے بڑھنا چاہتی تھیں۔ مگر جاوید شیخ کی نظر پر زیادہ بلندی کی طرف تھیں۔ ان دنوں ایک پاکستانی نژاد برطانوی اداکارہ سلمیٰ آغا بھارتی فلم ”نکاح“ میں کام کرنے کے بعد اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس کی اداؤں پر جاوید شیخ کا دل چل گیا اور وہ اس اونچی اڑنے والی چھٹی کو اپنے پیار کے بچہ کے لیے بند کپڑے کی منسو بہہ بندی کرنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب زینت منکھی سے ان کی علیحدگی ہو چکی تھی۔

سلمیٰ آغا کی بھارتی فلم ”نکاح“ نے کامیابی حاصل کی تو پاکستانی فلم سازوں کو بھی اسے ہیرنٹ بنانے کا خیال آیا پہل جس نے کی وہ ہدایت کا حسن عسکری تھے۔ اسے اپنی فلم ”ہم اور تم“ میں کام کرنے کی دعوت دے دی۔ سلمیٰ آغا نے یہ آفر قبول تو کر لی مگر اس شرط پر کہ اس کی تمام تر فلم بندی لندن میں کی جائے۔ کیونکہ اس کی مستقل رہائش برطانیہ میں ہی تھی۔ حسن عسکری اور ان کے فلم ساز رضامند ہو گئے اور اپنی اس فلم کے لیے اس وقت کے سپر اسٹار جاوید شیخ کو بطور ہیرنٹ کا سٹ کیا۔ جاوید کی تو گویا لاشی نکل آئی۔

اس طرح جاوید شیخ، سلمیٰ آغا کے ہیرنٹ کے طور پر پر فارم کرنے کے لیے یونٹ کے ساتھ لندن چلے گئے اور حسب پروگرام ”ہم اور تم“ کی ساری شوٹنگ لندن اور اس کے اطراف میں مکمل کی گئی۔ سلمیٰ آغا کے ساتھ جاوید کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران جاوید نے سلمیٰ آغا کے ہیرنٹ کے طور پر کچھ اس طرح پر فارم کیا کہ دونوں فلم کے ہیرنٹ ہیرنٹ نہیں رہے حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ہیرنٹ ہیرنٹ بن گئے۔ جب یونٹ واپس پاکستان آیا تو دونوں

میاں بیوی کی حیثیت سے متعارف ہو رہے تھے۔ ”ہم اور تم“ کے ڈائریکٹر حسن عسکری ان دونوں کے اس نئے تعلق سے جس قدر پریشان تھے اس کا اظہار انہوں نے لندن سے واپسی کے اگلے روز ہی میڈیا کے سامنے کر دیا۔ یہ بتایا کہ جاوید شیخ نے لندن میں شوٹنگ کے دوران مجھے اور میرے یونٹ کو بہت تنگ کیا۔ ان کی ساری دلچسپی سلمیٰ آغا سے تھی۔ سلمیٰ آغا نے بھی فلم سے زیادہ جاوید میں دلچسپی لی۔ ان دونوں نے اکثر ہمیں لوکیشن پر گھنٹوں انتظار کر دیا۔

لاہور واپس آنے کے بعد بھی جاوید کو اپنی اس فلم سے زیادہ سلمیٰ آغا ہی کی رفاقت عزیز رہی۔ انہوں نے اپنے

کوڈک گولڈ میڈل ایوارڈ
”یہ دل آپ کا ہوا“ بلاک سسٹم ایوارڈ 2002ء۔

وحید مراد میموریل ایوارڈ
”محبت کے سوداگر“ بہترین اداکار 1992ء۔
”زمانہ“ بہترین اداکار 1993ء۔ ”مشکل“
بہترین اداکار 1995ء۔

پرائیڈ آف پرفارمنس
حکومت پاکستان کی جانب سے فلم، ٹی وی اور اسٹیج
پر طویل خدمات کو سراہتے ہوئے 2011ء میں جاوید شیخ کو
پرائیڈ آف پرفارمنس کے اعزاز سے نوازا گیا۔

جاوید شیخ پر خصوصی ایڈیشن
2014ء میں جب جاوید شیخ کے فنی سفر کے
چالیس سال مکمل ہوئے تو ان کے پرستاروں نے ان
کی فنی خدمات پر ہفت روزہ نگار کا خصوصی ایڈیشن
نکلوا دیا۔ جس کے لیے ان کے پرستار اعظم عبدالجبار
ساگر بلوچ اور ان کے ساتھیوں نے جاوید شیخ کی
شخصیت اور فن پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا بلکہ
شید ہے کہ اپنے پاس سے اور فیڈریشن کے فنڈ سے
بھی مالی اعانت کی۔ 16 صفحات پر مشتمل اس
ایڈیشن کی قیمت 40 روپے تھی جسے جاوید کے
پرستاروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اپنے دور دراز کے
دوستوں اور عزیزوں کو بھی اپنے خرچ پر ارسال کیا۔

سلی آغا کے سپورٹ اور سہارے کی ضرورت تھی۔
بہنیں پہنچ کر جاوید شیخ کو اپنی جگہ بنانے میں زیادہ
دشواری نہیں ہوئی۔ زیادہ وقت نہیں لگا۔ کیونکہ وہ بولی ووڈ
والوں کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ ان کے یہاں آنے
سے بہت پہلے ان کی کچھ فلموں سے بولی ووڈ کے کچھ فلم
والے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ جن میں ”بولی“ خصوصی
طور پر بہت اہم فلم تھی جو 1984ء میں پاکستان میں ریلیز
ہوئی تھی اور جس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس
فلم (بولی) کی کہانی پر بھارت میں تین فلمیں چلائی، انمول
اور دادا گھری بٹانی جاچکی تھیں۔ جب وہ (جاوید شیخ) سلی
آغا سے شادی کے بعد اپنی اشار وائف کے ساتھ بہنیں پہنچے تو
انہیں اپنے تعارف کے سلسلے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

کیرئیر کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ ان کی ساری دلچسپی سلی آغا
تک محدود رہی۔ یہاں تک کہ وہ ”ہم اور تم“ کی ڈبنگ کے
لیے بھی دستیاب نہیں ہوئے۔ لہذا ہدایت کار کو جاوید کی
اب تک فردوس جمال سے کرائی پڑی۔

سلی آغا کی وجہ سے جاوید شیخ کو اس فلم سے کوئی
دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے اس فلم کو جو نقصان ہوتا جا چے تھا
وہ ہوا اگرچہ یہ فلم سلی آغا کے ساتھ ان کی پہلی فلم تھی لیکن سلی
آغا کی رفاقت میں وہ ایسے پاگل ہوئے کہ شروع سے ہی فلم
کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لندن میں بھی شوٹنگ کے دوران
اس دلچسپی، لگن اور محنت کا مظاہرہ نہیں کیا جو اب تک اپنی
فلموں میں کرتے رہے تھے۔

سلی آغا کو کاسٹ کر کے جس نیت اور مقصد کے لیے
”ہم اور تم“ بنائی گئی تھی نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ یہ فلم
پر فلاپ ثابت ہوئی۔ جاوید شیخ کے اس عروج کے دور میں
یہ پہلی فلم تھی جو زبردست ناکامی سے دوچار ہوئی مگر جاوید کو
اس ناکامی کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس لیے کہ اب وہ بولی ووڈ کا
اشار بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے
کہ سلی آغا کے تعلقات کا سہارا لے کر بھارتی فلموں میں
جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ”نگاح“ کی
کامیابی کے بعد سلی آغا بولی ووڈ میں اچھی طرح قدم جما
چکی تھی۔

اسی سوچ کی وجہ سے وہ سلی آغا کے پیچھے پیچھے بہنیں
پہنچ گئے۔ ادھر لاہور میں جاوید شیخ کی اس طرح بھارت
چلے جانے پر فلم ساز پریشان ہو گئے۔ سلی آغا میں ان کی حد
سے زیادہ دلچسپی ہی فلم سازوں کے لیے کچھ کم پریشانی کا
سبب نہیں تھی کہ وہ چپکے سے سلی آغا کے ساتھ بہنیں چلے
گئے۔ اس موقع پر فلم والوں نے یہی سمجھا کہ اب وہ وہاں
سے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ سلی آغا کے ساتھ بولی ووڈ کے
ہی بن کر رہ جائیں گے۔

اس دور میں فلم سازوں کی اولین پسند جاوید شیخ
ہوتے تھے۔ جاوید کی عدم موجودگی کی وجہ سے فلم سازوں
نے دوسرے بہرہ واز کو کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ جو فلمیں
جاوید کو ملنے والی تھیں وہ اظہار قاضی، اسماعیل شاہ اور فیصل
الرحمن کو ملنے لگیں۔ یہ خبر بہنیں تک پہنچیں، جاوید کو بھی معلوم
ہوئیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ مسکرا کر رہ گئے۔ ان کو اس
نقصان کی کب پروا رہی کیونکہ وہ تو بولی ووڈ میں اپنا کیریئر
مانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جس کی تعبیر کے لیے انہیں

کام کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ معاملہ چونکہ میاں بیوی کے تعلقات کا تھا اس لیے انہوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش نہیں کی اور جاوید کے انکار پر کبیر بیدی کو اس کی جگہ کاٹ کر لیا۔

اگر جاوید نے یہ فلم کر لی ہوتی تو آج شاید جاوید شیخ کی سوانح میں بہت کچھ بدلا ہوا ملتا۔ سہلی آغا کے لیے اس کی بہت بڑی قربانی تھی مگر وہ ایک بے وقاف عورت ہی رہی۔ وہ بار بار بیوی کی بے وفائی کو نظر انداز کرتے رہے مگر سہلی آغا کے رویے میں کوئی مثبت تبدیلی آنے کی بجائے سچ رویہ بڑھتی ہی گئی۔

پہلاج نہلائی سے معذرت کرنے کے بعد وہ ممبئی میں حزید کبیر کے سیدھے پاکستان واپس آ گئے۔ انہیں رہ کر کرینٹ منسٹیجی یاد آ رہی تھی۔ وہ بھی تو بیوی تھی اس کا تعلق تو شو بڑے بہت پرانا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ کیسی بیوی ہے۔ جبرے ساتھ کیا تکلیف دہ برتاؤ کر رہی ہے۔

جاوید شیخ کو آج بھی اس بات کا دکھ ہے کہ انہوں نے ایسی چاہنے والی اور وفا شعار بیوی کی قدر نہیں کی۔ اپنی کامیابیوں کے نفع میں اسے دکھ دیا۔ شاید قدرت کی طرف سے انہیں اسی بات کی سزا ملی۔ اسے ٹھکرا کر جسے اپنایا۔ اسی نے تڑپایا، ستایا اور شاندار مستقبل کو تباہ کر دیا۔

جاوید شیخ لاہور پہنچے تو ان کو ایک اور دھچکا لگا۔ فلم انڈسٹری نے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا۔ ”اچھا ہوا، تم لوٹ کر آ گئے۔“

”یار! ہم تو تمہارے بغیر بے سہارا ہو گئے تھے۔“ جس نے دیکھا نہ پھیر لیا۔ نولٹ دیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے بغیر بھی فلم انڈسٹری کی گاڑی چل رہی ہے ان کی جگہ دوسرے اداکار کام کر رہے ہیں۔

کچھ فلم والوں سے ان کی بڑی دوستی تھی ان سے ملے تو انہوں نے شکایت کی۔

”یار تم نے بہت برا کیا۔ ایک عورت کے چکر میں پڑ کر فلم انڈسٹری کی باوشاہی کو شوکر مار دی۔ تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”تمہیں بمبئی جانا تھا تو فلم سازوں سے کہہ کر جاتے۔ بتا کر جاتے کہ چند دنوں بعد آ جاؤ گے۔“

”تم جس طرح یہاں سے گئے لوگوں نے یہی سمجھا کہ اب واپس نہیں آؤ گے۔“

وہ با آسانی فلم میکرز کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بولی ووڈ میں پاکستانی ایکٹرز کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ محسن حسن خان اور طلعت حسین بھارتی فلموں میں کام کر کے پزیرائی حاصل کر چکے تھے۔ جاوید شیخ کو جلد ہی دو تین پروڈیکٹ مل گئے۔ جن میں سب سے بڑی آفر پہلاج نہلائی کی فلم ”خون بھری مانگ“ کی تھی۔ اس فلم میں وہ ریکھا اور سونو الیا کے ساتھ ہیر وکاسٹ کے جارہے تھے۔ تمام معاملات تیزی سے طے ہو گئے۔ راکیش روشن کو ڈائریکٹر لیا گیا۔ شوہر پر حاوی رہنے کی خواہش مند اداکارہ وگلکارہ کو جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا شوہر نامدار بیوی کی بیباکھی کے بغیر بولی ووڈ میں جگہ بنانے جا رہا ہے تو اس نے اس کی پزیرائی اور مقبولیت سے خائف ہو کر پہلے تو یہ پروڈیکٹ چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ اس کے بعد اس کے خلاف شفی پروڈیکٹس شروع کر دیا اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے مجھ سے یہ شادی ذاتی مفاد کے لیے کی تھی تاکہ وہ بھارتی فلموں میں میرے حوالے سے کام حاصل کر سکے۔

جاوید شیخ نے اس کے اس منفی رویے کے باوجود اسے سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی جس پر وہ چراغ پا ہو گئی اور اس نے جاوید سے یہاں تک کہہ دیا۔ ”اب تم یہاں سے فوراً اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلے جاؤ۔“

بمبئی میں اس وقت جاوید سہلی آغا کی ذاتی رہائش گاہ میں قیام پذیر تھے کیونکہ وہ اس کے شوہر تھے اس لیے اس کے ساتھ ہی رہ سکتے تھے۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو جاوید شیخ کو اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر ہوٹل شفٹ ہونا پڑا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ سہلی آغا سے اپنی محبت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ رشتہ بچانا چاہتے تھے۔

اگلے روز جاوید نے پہلاج نہلائی کے پاس جا کر معذرت کر لی کہ وہ ان کی فلم ”خون بھری مانگ“ میں کام نہیں کرے گا۔ وہ اس انکار کی وجہ سمجھ گئے۔ ان تک بھی یہ بات پہنچ چکی تھی کہ سہلی آغا اس بات پر خوش نہیں کہ اس کا شوہر اس کی بیباکھی کے بغیر اپنے لیے کوئی ممتاز جگہ بنائے۔ وہ جانتی تھی کہ جاوید اس کے مقابلے میں ایک تجربہ کار اداکار ہے اس لیے وہ اسے اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ فلم والے بھی جانتے تھے کہ جاوید بیوی کو بہت چاہتا ہے اور اسی کی اتان کی تسکین کے لیے اس فلم میں

”اب واپس کیوں آگئے ہو؟ کیا وہاں تمہارا مشن اہم سہل نہیں ہوا؟ بولی ووڈ کے فلمیں ریلیفٹ کر دیا وہاں جانے پر مجبور کر دیا۔“

جاوید نے سب کی بات سن کر ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی پھر بولے۔ ”نہیں یہ بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

اب جاوید نے شرمسار لہجے میں اپنی دکھ بھری کہانی سنا دی جسے سن کر سب کو آنسوؤں میں ڈوبنے لگا۔ ”تم نے ایسی بے وفا اور بے مروت عورت کی بات پر غلٹی کرتے ہوئے اتنی بڑی اور شاندار آفر کو ٹھکرادی؟“

”ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اس سماجی عورت کو ٹھکر مار کر اپنی بہتری کے لیے پہلانا چھوڑنا اور راکشش روشن کی فلم مکمل کرتے۔“

”تم نہیں جانتے جاوید! تم نے اس فلم کو چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“

”ارے بچے! سلی! آغا جیسی عورتیں تو ایک ہزار ایک مل سکتی ہیں مگر بولی ووڈ میں ایسا شاندار موقع دوبارہ نہیں مل سکتا۔“

اب عالم یہ تھا کہ جاوید نہ اصرار کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ یہاں سے وہ پھر بلیک میل چھوڑ کر وہاں آگئے تھے اور وہاں سے اپنے بہترین سسٹم تک کو ٹھکر مار کر واپس آگئے تھے۔ ان کے حالات سے آگاہی کے بعد پچھلے فلم والوں کو ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کچھ کو غصہ بھی تھا کہ جاوید نے صرف اپنے مفادات کے لیے ہم لوگوں کے نفع نقصان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بہر حال آہستہ آہستہ انہیں پھر فلموں میں کاسٹ کیا جانے لگا۔

اس عرصے میں یہ ہوا کہ سلی آغا بھی بمبئی سے واپس لاہور آ گئیں۔ شاید ان کے بلیک بولی ووڈ میں وہ حالات ہاتھ نہیں رہے تھے جو جاوید شیخ کے ساتھ بمبئی آنے تک تھے۔ ان کے اپنے شوہر کے ساتھ جو سلوک رہا۔ اس سے بمبئی فلم انڈسٹری کے لوگ بخوبی واقف ہو چکے تھے اور وہ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اس سے کسی کو بہتری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ جو اس قدر چاہنے والے شوہر کی نہ ہو سکی، وہ کسی دوسرے کے لیے کیا سودمند ہوگی۔ وہاں تو شوہروں کے لیے فرمایاں ہو جاتی ہیں اگر یہاں اداکاری کر کے کامیابی حاصل کرتا تو اس کا فائدہ تو اسی کو تھا۔ یہاں بھی اس کے کردار سے فلم والے واقف ہو چکے

تھے۔ اس لیے اب اسے وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔

محبت کا مارا جاوید شیخ اس موقع پر بھی سب کچھ بھول کر اس سے مفاہمت کرنے پر تیار تھا مگر اس بد مزاج عورت کی بد مزاجی اب بھی برقرار تھی۔ جاوید اسی نتیجے پر پہنچے کہ وہ اب مجھ سے کوئی تعلق برقرار رکھنا نہیں چاہتی۔ قدرت کو بھی شاید یہی منظور تھا کہ ان حالات میں دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔

جاوید، سلی آغا سے علیحدگی کے بعد چند روز تک تو پریشان رہے کہ جسے اس قدر ٹوٹ کر چاہا تھا اس نے ساتھ چھوڑ دیا پھر وہ نارمل ہو گئے اور اپنی فلموں سے دل لگانے لگے اور ان کے چاہنے اور چاہے جانے کی طبیعت نے ایک بار پھر انگڑائی لی اور وہ پھر کسی زلف گرہ کیے کے سیر ہو گئے۔

ان کی دل چھینک طبیعت نے انہیں زیادہ دن تہا رہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس بار ان کے دل و دماغ میں پھل چانے والی اداکارہ نکلی تھی۔ پنجابی فلموں سے اپنے کیریئر کی ابتدا کرنے والی حسین دہیل نکلی جب جاوید شیخ کے قریب آئی تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے مگر نیلی کی لکڑی کی طرح تھی۔

یعنی وہ فوراً ہی جذبات کی آگ میں جل اٹھنے والی نہیں تھی۔ اس کے دل میں بھی جاوید کی محبت کی آگ ایک دم نہیں بجڑی۔ وہ عشق و محبت کے معاملے میں بہت سیانی نکلی۔ اس نے جاوید کو خوب داؤ پیچ دکھائے اور ہار کر لایا کہ وہ اتنا آسان شکار نہیں کہ وہ (جاوید) اسے ایک ہی نوالے میں نگل جائے۔ نیلی کو یقیناً جاوید کی رومانی ہنسی معلوم تھی۔ زینت منگھی کے بعد سلی آغا سے پیار کے رشتوں کا بھی علم ہوگا۔ اس لیے بہت محتاط انداز میں آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔ محبت میں طے کیے جانے والے روایتی عہد و پیمان ضرور ہوئے لیکن دونوں جانتے تھے کہ یہ سمجھوتے کا ٹکن ہے۔ دونوں نے اس رشتے کا خوب خوب فائدہ اٹھایا اور پھر آنے والے دس سال تک ہر ایک کی زبان پر نیلی اور جاوید کے نام تھے۔ ایک کامیاب جوڑی۔ دو مثالی دوست اور قابل بھروسہ راز داراں۔

نیلی اور جاوید کی جوڑی ویسے ہی زیر بحث رہی جیسا کہ ماضی میں صبیحہ ستوش، زیبا محمد علی یا بارہ اور شاہد کی جوڑیاں مشہور تھیں۔ دونوں نے خوب انکسھ وقت گزارا۔ ڈھیر ساری اردو پنجابی فلموں میں کام کیا۔ رنگیلے جاسوس، میڈم باوری، درندگی، پامیلا، عابدہ، آخری ہجر، سات

خون معاف، بختاور، زمانہ، کالے چور، طوفانی بجلیاں، یہاں تک کہ جاوید نے ڈائریکشن کی فیلڈ میں قدم رکھا تو ”مشکل“ میں کہانی کا سارا پوچھ نیلی کے کاندھوں پر ڈالا۔

”چیف صاحب“ میں بھی نیلی کو برابر کا کریڈٹ دیا اور پھر جب نیلی جاوید کی فلموں سے آڈٹ ہوئی تو جاوید کا ڈاؤن فال شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک فلم فلاپ ہوئی۔ پہلے جاوید کی ڈائریکشن میں بننے والی فلموں کو عوامی حلقوں سے مسترد کیا جانے لگا۔ اس کے بعد بطور اداکار بھی فلم میکرز جاوید سے گھرانے لگے۔ نیلی نے جاوید سے دوری کیا اعتبار کی ایسا محسوس ہوا قسمت جاوید سے روٹھ گئی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب جاوید شدید مالی بحران کی زد میں آ گئے لیکن اس کڑے وقت میں بھی وہ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ناکامی کی اتھاہ گہرائی میں جا کر بھی خدا کی قدرت سے دوبارہ ابھرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ اسی عزم نے جاوید کو ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار کرایا۔

جاوید کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ جاوید کو بنانے اور سنوارنے میں عورتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ بیس میں اسے جو فرانسیسی لڑکی کیرولین ملی تھی، اس نے اسے مہذب اور شائستہ انسان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پھر زینت منجھی نے اسے اپنا کراس کی گھریلو زندگی بہت خوشگوار بنا دی تھی۔ اسی طرح نیلی کا بھی کردار ہے۔ (بس ایک سلیمی آغا ہی تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی) نیلی کے ساتھ جاوید کی جوڑی پاکستانی سینما کی چند بے حد کامیاب جوڑیوں میں سے ایک تھی جسے دونوں کی رومان پرور فطرت کے باعث شہرت حاصل ہوئی۔ کوئی فلمی اخبار یا میگزین ایسا نہ تھا جس نے نیلی اور جاوید کے رومانس کی تکمیل داستان اور لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی ان کی محبت کو باقی لائٹ نہ کیا ہو۔ سچ پوچھیے تو جاوید اور نیلی کو اس شہرت کی ضرورت بھی تھی۔

جاوید شیخ نے بطور ڈائریکٹر ایک نئے دور کی ابتدا کی اور ”مشکل“ کے بعد نیلی کے ساتھ سپر ہیٹ فلم ”چیف صاحب“ بنائی جس میں اپنے بھائی سلیم شیخ کو بریک دیا۔ اس فلم کے ذریعے جاوید شیخ کو سنہیلنے کا موقع ملا اور وہ انڈسٹری جو جاوید شیخ کو بطور ہیرو مسترد کر چکی تھی ڈائریکٹر کے طور پر قبول کرنے کے لیے مجبور ہوئی۔

اس سے پہلے کہ جاوید شیخ کی ہدایت کاری پر مزید بات کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاوید کے بارے میں

ایک پرانی یاد تازہ کر دوں۔ جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جاوید میں ہدایت کارانہ صلاحیتیں بہت پہلے سے موجود تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سلیمی آغا سے جاوید کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ جاوید سلیمی کی وجہ سے سبھی کی فلم چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سلیمی آغا بھی لاہور آ کر یہاں کی فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ابھی ان کی علیحدگی نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران سلیمی آغا کے البم کے ایک گانے کی ویڈیو جاوید شیخ نے تیار کی۔ اس کی شاعری مسرور انور کی اور موسیقی امجد بولبی کی تھی۔ یہ مہدی حسن اور سلیمی آغا کا پہلا ڈوئٹ البم تھا جس کی ڈائریکشن، پروموشن اور مارکیٹنگ جاوید شیخ نے خود کی تھی۔ یہ ڈائریکشن کے میدان میں جاوید کا پہلا قدم تھا۔ اگرچہ ان دنوں سلیمی آغا سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کے باوجود جاوید نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ قدرت نے ان کی یہ نیکی رائیگاں نہیں جانے دی۔ جب انہوں نے خود اپنی فلم بنانے کا ارادہ کیا تو اس بات کا بھروسہ تھا کہ وہ اس کی ہدایت کاری بھی کر سکتے ہیں۔

”چیف صاحب“ کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد جب اس بات کی توقع ہو چلی تھی کہ اداکار جاوید شیخ بطور ہدایت کار اپنے کامیاب سفر پر گامزن ہو جائے گا تو ایک نیا محاذ جاوید کے خلاف کھل گیا۔ ہدایت کاروں کی ایک بڑی تعداد نے انہیں لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں مختلف طریقوں سے پریشان کیا جانے لگا۔ کبھی ان کی فلم میں کام کرنے والے ایکٹرز کو شوٹنگ سے روکنے کی کوشش کی جاتی تو کبھی سرمایہ کاروں اور تقسیم کاروں کی جانب سے عدم تعاون کا مظاہرہ کروایا جاتا۔ ان حربوں کے باوجود جاوید نے ہار نہیں مانی۔ وہ مسلسل فلم بناتے رہے۔ ”چیف صاحب“ نے کراچی کے ایک ہی سینما نشاٹ میں 28 ہفتے چلنے کا نیا ریکارڈ بنایا۔ اس حوالے سے بھی سازش کی گئی کہ کسی طرح یہ فلم سلو جوئی نہ کر سکے اور 25 ویں ہفتے سے قبل اتار لی جائے مگر جاوید کے ارادے آڑے آ گئے اور سازشی اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آپ بھینا یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ لاہور میں جاوید کے خلاف ایک لابی محاذ آرائی پر اتر آئی؟ آپ کی طرح مجھے بھی اس بات کی جستجو تھی۔ میں نے اس سلسلے

ایک یادگار واقعہ

کبھی کبھی فنکاروں کے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ ایسے حالات میں بھی انہیں اپنی فنی ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ بھی ایسے کئی واقعات پیش آئے جن میں سے ایک خاص واقعہ کا ذکر خود ان کی زبانی سنئے۔ ”نذر شباب نے اپنی فلم ”کبھی الوداع نہ کہتا“ میں مجھے شبنم اور سری لکھن اداکارہ بیتا کے شوہر کا چیلنجنگ رول دیا تھا۔ اس فلم کا کلاسک فلمایا جانے والا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں کہ اچانک میری والدہ کا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا۔ لہذا نذر شباب سے خصوصی اجازت لے کر مجھے تجنیز و تکفین کے لیے پٹنئی جانا پڑا۔ جاتے وقت میں نے ہدایت کار سے وعدہ کیا کہ میں دو دن بعد واپس آ جاؤں گا۔ کیونکہ ہمارا سیٹ مکمل تھا اور فلم کو عید الفطر کے موقع پر ریلیز ہونا تھا۔ میں والدہ کی تدفین کے فوراً بعد حسب وعدہ واپس لاہور آ گیا اور سیٹ پر آ کر فلم کے کلاسک مناظر عکس بند کرایا۔ یہ میرے لیے بے حد آزمائشی مرحلہ تھا۔ دل و دماغ پر غم و الم کے اٹھا ہوا دل چھائے ہوئے تھے مگر مجھے اسکرپٹ کے مطابق سین پکچر انز کروانا پڑا۔“

اور واقعات انسان کو ایسے ہی راستے پر گامزن کر دیتے ہیں۔

ان باتوں کے باوجود جاوید کے سینے میں ایک درد مند دل ہے اور اس دل سے مجبور ہو کر وہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ سلمیٰ آغا نے ان کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا مگر طبعیت کی سے پہلے تک وہ سلمیٰ کے کام آتے رہے۔ اسی طرح جب نیلی کا ”ڈاؤن فال“ شروع ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر دوٹی کا حق ادا کیا۔ جاوید نے اپنی محبوبہ کو یہ احساس تک نہیں ہونے دیا کہ اس کا وقت ڈھل چکا ہے یا اس کی شہرت و مقبولیت کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ اس سے جہاں تک ممکن ہوا اس دور میں بھی اس نے نیلی کی دلجوئی کی۔ اس کے ساتھ گزراے ایچھے دنوں کا حق ادا کیا۔ پھر ایک دن اچانک نیلی کہیں غائب ہو گئی۔ نیلی کے اس طرح منظر سے پس منظر میں چلے جانے کی وجہ سے اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہو گیا ہے۔ وہ جیسی بھی تھی اس کی وجہ سے اسے

میں اسے کھوئی آزمائے تو مجھے چند باتوں کا اندازہ ہوا۔ جاوید شیخ نے ”کبھی الوداع نہ کہتا“ کے بعد جس تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، ان سے فلم میکرز کا طبقہ تو ان سے فائدہ اٹھاتا رہا مگر جن اداکاروں کو اس کے اس عروج سے دھچکا لگا وہ اندر ہی اندر اس کے دشمن بننے لگے۔ اس کی یہ فنی اچھائی بھی کچھ لوگوں کو بری لگی کہ وہ عوامی طور پر ہر ہیروئن کے ساتھ پسند کیا گیا۔ اس بات نے بھی اس کی رقابت میں کچھ ہیروز کو طے پر مجبور کیا پھر جب وہ بھریا میلہ چھوڑ کر سلمیٰ آغا کے چکر میں مبتلی چلا گیا۔ تو اسے تمام افراد نے کھل کر اس کی مخالفت کی آگ بجڑ کاٹی۔ جاوید کے خلاف ہر ممکن طرح پریشانی اقدام کیا۔ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بھی بھر کر روڑ غلایا کہ جاوید ایک مفاد پرست اداکار ہے۔ اسے پاکستانی فلموں اور فلم انڈسٹری کی بہتری اور بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ جب وہ کراچی کے کئی وی ڈراموں میں کام کر رہا تھا اس وقت بھی اس نے دینی میں بننے والی فلم ”دوسرا کنارہ“ کا ہیرو بننے کے لیے ڈراما پروڈیوسروں کو اسی طرح نقصان پہنچایا تھا۔ وہ سراپا مفاد پرست ہے جو بھی اس پر بھروسہ کرے گا وہ اسے اسی طرح نقصان پہنچائے گا۔ وہ قابل بھروسہ شخصیت کا مالک نہیں۔ پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ یہی میں جاوید کی بات نہیں بنی اور تھوڑے ہی دنوں بعد وہ لاہور واپس آ گیا۔ مخالفین نے اس کے خلاف جو آگ بجڑ کاٹی تھی اس کی چنگاریاں ایک بار پھر سنگ اٹھیں۔ کچھ دنوں تک وہ بالی کاٹ کا شکار رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے لیے بند روڑا زے کھلوانے میں وہ کامیاب ہوتا گیا۔ برے سے برے وقت میں وہ ہمت نہیں ہارا جس سے سازشی ٹولے کو ایک بار پھر سرگرم کر دیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جاوید سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ جن باتوں کو بنیاد بنا کر مخالفین نے ان کے خلاف محاذ آرائی کی ان کے مرتکب ہونے کی وجہ سے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی مگر ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ جاوید نے کبھی بھی ندیم کی طرح سوچ سمجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ بے چین طبیعت کے مالک ہیں۔ اپنے فنی سفر کے ابتدائی دنوں میں انہیں جن صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا اس نے انہیں بے صبر بنا دیا۔ ہر چھتکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے حصول کے لیے لپکے۔ لمحہ بھر ٹھہر کر یہ نہیں سوچا کہ اس کے لیے ہمارے دوڑنے سے فائدہ ہو گا یا نقصان؟ کبھی کبھی حالات

تہائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص جو پچیس برس پہلے تہائی کا عادی رہا تھا۔ اس بار زیادہ شدت سے اکیلے پن کے احساس سے دوچار ہو گیا۔ پوری فلم انڈسٹری میں کوئی نہ تھا جو اس کا دکھ بانٹ سکتا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ نیلی یوں اچانک جاوید شیخ کی زندگی سے اور فلم انڈسٹری سے نکل کر روپوش ہو گئی۔ کہیں کم ہوگئی۔ اس سوال کا جواب شمس وقت جاوید کو ملا اور نہ اسے اب تک مل سکا ہے۔

جس طرح نیلی کے ان کی زندگی میں آنے کے بعد ان کی خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل گئے، بالکل اسی طرح نیلی کے جانے کے بعد سارے کھلے دروازے بند ہو گئے۔ ”چیف صاحب“ کے بعد جاوید شیخ کی کوئی فلم نہ چل سکی۔ ”لیس باس“ نے اسے زبردست نقصان پہنچایا جس سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بطور بدایت کاران کی لگاتار تین فلمیں لیس باس، مجھے جینے دو اور کہیں پناہ نہ ہو جائے فلاپ ہو گئیں۔ ان کے ریکارڈ پر ڈیڑھ سو برسز الونو والے سجاد گل، گلی ایرانی سرکس والے میاں فرزند علی اور اپور ریڈی پکچرز کے شیش چندا نند تھے۔ تینوں بڑی پارٹیاں جاوید شیخ سے مایوس اور ناراض ہو گئیں۔ ان حالات میں جاوید کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ غیر معیاری فلموں میں کمزور کردار قبول کر کے اپنا پکچن چلائیں۔

ایک طرف مالی مشکلات، قرضوں کا بوجھ تو دوسری طرف میڈیا کی تند و تیز تنقید نے انہیں ذہنی و باؤ میں مبتلا کر دیا۔ افسوس کہ ان حالات میں بھی جاوید کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے حالات میں انہیں کسی غم گسار کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جب کہ وہ تنہا تھے۔ ان مصائب سے لڑنے کے لیے ان کا کوئی تسلی ساھی نہ تھا۔ تخلص دوستوں امجد بوٹی، اسماعیل تارا، بہروز سبزواری کی قربت کے باوجود جاوید کی زندگی میں ایک غلاموجود تھا جس کی خلش انہیں زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ انہی دنوں شام ان کی زندگی میں آئی۔ دونوں ایک فلم ”مجھے جینے دو“ میں کام کر چکے تھے لیکن اس وقت تک شام، جاوید کے لیے محض ایک ساھی اداکارہ تھی۔ جاوید شیخ اور شام کی قربت دراصل ”یہ دل آپ کا ہوا“ کی شونٹک کے دوران قائم ہوئی اور پھر سات برس تک دونوں خاموشی کے ساتھ اس پیار کے رشتے کو نبھاتے رہے مگر کبھی اس تعلق کا اقرار نہیں کیا۔ اس ریلیشن شپ کی اصل کہانی اس وقت سامنے آئی جب شام نے اچانک جاوید شیخ سے ہر تعلق توڑتے ہوئے ایک اسام

نام ایکٹر فخر امام سے پہلے منگنی اور پھر شادی کا اعلان کیا۔ جو لوگ جاوید شیخ کو جانتے ہیں۔ پہچانتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جسے چاہتے ہیں، ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ چاہے وہ ان کے دوست ہوں یا وہ عورتیں جو مختلف ادوار میں ان کی زندگی میں آئیں۔ جاوید محبت کے معاملے میں ہمیشہ انتہا پسند ثابت ہوئے۔ شام کے معاملے میں بھی ان کی یہی انتہا پسندی قائم رہی۔ یہی وجہ تھی کہ شام کی بے وفائی کا اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ انہیں دل کے دورے پڑنے لگے۔ جس کے نتیجے میں انہیں اسپتال جانا پڑا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی خبر نہیں تھی۔ میڈیا کے ذریعے ایک عالم کو معلوم ہو چکا تھا کہ جاوید شیخ ہر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ان کی تیار داری کے لیے بہت سے لوگ آئے مگر ”وہ بے وفا“ نہیں آئی جس کے لیے ان کی نگاہیں راہ دیکھ رہی تھیں۔

اس بار بھی ان کی سخت جانی کام آئی اور وہ کچھ دنوں کے علاج کے بعد صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے۔ ایک بار پھر زندہ رہنے کے لیے روزگار کی ضرورت محسوس ہوئی مگر اب صورت حال یہ تھی کہ نہ کوئی فلم میکر انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کر رہا تھا نہ پی ٹی وی والوں کی طرف سے بلاوا آرہا تھا۔ لہذا وہ اسٹیج ڈرامے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جاوید برسوں بعد اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ امان اللہ ڈرامے کے ہیرو تھے۔ کھیل اچھا گیا۔ جاوید کو پیسے بھی ٹھیک ٹھاک ملے مگر میڈیا والوں کو ان پر تنقید کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ انہوں نے نہ یہ دیکھا نہ سوچا کہ جاوید اسٹیج پر کیوں برقرار م کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہ غریب تو اسے بڑے وقت کوٹالنے کے لیے یہ کر رہے تھے۔ ابھی ایک فلم ”یہ دل آپ کا ہوا“ کا ڈر آیا تھا۔ اس فلم کے نزول کی بھی ایک کہانی ہے۔ ایک دن اچانک جاوید کی ملاقات ان کے ایک دیرینہ دوست اکبر خان سے ہوگئی۔ دونوں دنوں دنوں جذبات سے لپٹ گئے۔ علیحدہ ہوئے تو اکبر خان بولے۔ ”ارے یار جاوید خان! تو کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟“

جاوید نے اسے گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں بولا۔ ”اتنے دنوں بعد ملنے والے دوست کو اپنا حال احوال بتا دوں گا تو کیا اسے دکھ نہیں ہوگا؟“

اسے سوچتا ہوا دیکھ کر اکبر خان بولا۔ ”بتاتا کیوں نہیں؟“

”کیا بتاؤں اکبر خاناں! بس ٹھیک ہوں۔“

ریاض الرحمن ساغر تھے جو نامور نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر تھے۔

”یہ دل آپ کا ہوا“ کی ابتدائی کاسٹ میں شاہ رخ خان کا نام بھی شامل تھا مگر ان کی مصروفیات اور عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستانی اشارزہ ہی سے کام لیا جائے۔ لہذا کلیدی کرداروں کے لیے سلیم شیخ، معمر رانا اور ثناء کا انتخاب کیا گیا۔ ثناء کے لیے یہ ایک زبردست بریک تھرو ثابت ہوا۔ واضح رہے کہ ”یہ دل آپ کا ہوا“ سے پہلے چھ سالہ کیرئیر میں ثناء کے کریڈٹ میں ”سنگم“ کے علاوہ کوئی قابل ذکر فلم نہیں تھی۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے بعد بھی وہ بکواس قسم کی فلموں میں اپنا ایجنج برادی کرتی رہی۔ جس کے بعد جاوید شیخ نے اسے اپنی اگلی فلم ”کھلے آسمان کے بچے“ میں اسے باوقار انداز میں پیش کیا۔ درحقیقت ثناء کا کیرئیر جاوید کی ڈائریکشن میں بننے والی انہی دو فلموں پر انحصار کرتا ہے۔

فلم کی سیکنڈ ہیروئن کے لیے نور، زارا شیخ اور سارا چوہدری کے ناموں پر غور کیا گیا مگر قرعہ قائل وینا ملک کے نام نکلا۔ اس وقت تک کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ فلم اتنی بڑی اور سہٹ ثابت ہوگی۔ جاوید شیخ کو ایک ٹکڑا پروڈیوسر مل گیا تھا جو اس فلم پر پانچ کروڑ کی سرمایہ کاری کرنے پر رضا مند ہو گیا تھا لیکن فلم انڈسٹری میں جاوید شیخ کے مخالفین سے اس کی یہ کامیابی ہضم نہیں ہوئی کہ ایک ناکام ہدایت کار کو دوبارہ اپنے بھروسے پر کھڑا ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ فلم انڈسٹری کے حلقے اپنے ایک ساتھی کی کامیابی اور کوشش میں اس کا حوصلہ بڑھانے کی بجائے جاوید کی مسلسل حوصلہ شکنی کر رہے تھے۔ یہ کہا جانے لگا کہ پانچ کروڑ روپے کی فلم بنانے کا فیصلہ ہی احمقانہ ہے۔ کیونکہ پاکستان میں سنیما کا سرکٹ محدود ہے۔ اس لیے اس سرمائے کی واپسی ممکن نہیں ہے لیکن یہ لوگ جاوید کے عزم اور ارادوں سے واقف نہیں تھے۔

”یہ دل آپ کا ہوا“ کی شوٹنگ اسپین اور سویٹزر لینڈ میں ہونا تھی مگر جب فلم کے یونٹ کے پاسپورٹس ویزوں کے حصول کے لیے مذکورہ سفارت خانوں میں درخواست جمع کرائے گئے تو آنکشل ایگریگیشن حکام کی جانب سے جاوید شیخ کے یونٹ کو ویزے دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ انہیں جاوید شیخ کے خلاف ایک درخواست موصول ہوئی ہے جس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس یونٹ کی آڑ میں انسانی

”نہیں تو ٹھیک نہیں ہے۔ تیری حالت سے تو لگتا نہیں کہ تو ٹھیک ہے۔ سچ سچ بتا دے۔ ورنہ میں روٹھ جاؤں گا مجھے دکھ ہوگا۔“

اب جاوید نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی دکھ بھری کہانی سنادی۔

”یہ جان کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا کہ تو نے شو بزنس میں اتنا نام بھی کمایا۔ شہرت بھی حاصل کی۔ اس بات پر بڑی خوشی حاصل ہوئی مگر وہ اس بات کا ہوا کہ آج کل تیرا حال بہت پتلا ہے۔“

جاوید نے اکبر خان کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ کہتا بھی کیا۔ ہوا وہی جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اکبر خان رو دواؤ غم سن کر دھکی ہو گیا۔

”جاوید خان! تیرے یار اکبر خان کے ہوتے ہوئے اب تجھے کسی غم کی فکر کی ضرورت نہیں۔ تو بھر فلم بنا میں تجھے پیسے دوں گا۔“

جاوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اکبر خان نے مسکرا کر کہا۔ ”اب میں وہ پچھلے اکبر خان نہیں ہوں۔ بہت بڑا بزنس مین ہوں۔ میں یورپ میں آئل کا بزنس کرتا ہوں۔ مولانا کی مہربانی سے میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ روپے نہیں ڈالر ہے۔ اپنی دولت سے اگر اپنے یار کا مددگار نہیں ہوا تو مگر مولانا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“

ذرا دیر تک تو جاوید کو اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا کہ اگلا کیا کہہ رہا ہے۔

”بجٹ کی کوئی پروا نہ کرتا۔“ اکبر خان بولا۔ ”بس فلم ایسا ہوگا کہ انہیں فلموں کی فکر کا ہو۔“

جاوید شیخ جیسا اداکار و ہدایت کار جو اب تک پانچ لاکھیں ڈائریکٹ کر چکا تھا۔ ان دنوں اس قدر مالی بحران کا شکار تھا کہ جب اکبر خان نے اسے پانچ لاکھ کا ایک چیک دے کر کہا۔ ”یہ ایڈوانس کا رقم ہے۔ تم ایک دم فلم کا تیاری شروع کر دو۔ پیسے کا فکر مت کرو۔ دل کھول کر خرچ کرو۔ کامیابی کی گرانٹی کے لیے اگر دل چاہے تو بولی ووڈ کے گنگ خان، شاہ رخ خان کو بھی کاسٹ میں شامل کر لو۔“

اتنا ٹکڑا پروڈیوسر پا کر جاوید کی خوشیوں کی انتہا نہیں تھی۔ بغیر کسی تاخیر کے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کی تیاری شروع کر دی۔ جاوید اپنی فلموں کے نام عموماً کہانی لکھنے سے پہلے ہی ایبائیڈ کر لیتے ہیں۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ جیسا رومانوی ام لہائی لکھنے سے پہلے رکھ لیا گیا اور اس نام کے خالق

اچھی خاصی ایڈوائس ادا کی گئی کہ باوجود جاوید اختر نے گانے لکھنے میں کئی مہینے لگا دیئے۔ اگرچہ رقم کی ادائیگی کے لیے جاوید اختر نے نیویارک میں فارن ٹرنکی اکاؤنٹ میں رقم وصول کی لیکن جب کئی مہینوں کے بعد بھی گیت لکھ کر نہیں دیئے اور جاوید شیخ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے پروڈیوسر کی مرضی کے خلاف جاوید اختر کی جگہ ندا فاضلی سے گانے لکھوا لیے۔ اس پر اکبر خان کی ہفتوں تک جاوید شیخ سے ناراض رہے لیکن جب پروڈیوسر نے ندا فاضلی کے لکھے گانوں کی ریکارڈنگ سنی تو انہیں بھی پسند آئی اور انہوں نے کہا۔

”اچھے ہیں، تم نے اس غریبے جاوید اختر سے چھپا چھڑا کر اچھا کیا۔“

”اگرچہ ہم ان کا منہ مانگا معاوضہ دینے پر تیار تھے۔“ جاوید نے کہا۔ ”اس کے باوجود انہوں نے وعدہ خلافی کی اور ہمیں خواہ مخواہ انتظار کی سو لی پر لٹکا رکھا۔“ بھارتی ماہر نص سروج خان نے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے گانوں کی کوریوگرافی کی تھی۔ سروج خان اگرچہ اس سے پہلے شہزاد گل، ریمیا خان اور شہزاد رفیق کی فلموں کے گانوں کی کوریوگرافی کر چکی تھیں۔ لیکن اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا۔ ”جاوید شیخ پاکستان کا بہترین پروڈیوسر ڈائریکٹر ہے۔“

پروڈیوسر اکبر خان نے دل کھول کر اس فلم میں سرمایہ کاری کی تو جاوید شیخ نے بھی بے شمار کاٹوں اور مشکلوں کے باوجود اپنی بہترین فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ہر طرح سے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کو ایک کامیاب فلم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستانی سینما گھروں میں اس نے کامیابی کا جھنڈا اٹھایا بلکہ کئی بیرونی ممالک میں بھی بھارتی فلموں کے مقابلے میں زبردست بزنس کیا۔ خصوصاً برطانیہ میں اس فلم نے بے حد کامیابی حاصل کی اور باکس آفس پر زبردست بزنس کیا۔

اس فلم کی تکمیل کے دوران جہاں جاوید شیخ بہت پریشان ہوئے وہاں ان کی رومانی طبیعت نے بھی بڑی انگڑائی لی۔ ان کے معاشی حالات بہتر ہوئے تو وہ عشق و محبت کی وادیوں کے پھیرے بھی لگانے لگے۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران انہیں فلم کی ہیروئن شام سے قریب آنے کا موقع ملا تو اس کی جاہت میں آہستہ آہستہ کھونے لگے۔ شام نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ ان کی محبت کا جواب اپنے پیار

اسٹنگک جیسا گھناؤنا جرم عمل میں لایا جا رہا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اسپین میں شوٹنگ کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ جاوید کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کے مخالفین اسے اس کی کوششوں میں نا کام کرنے کے لیے ایسی مذموم حرکت کریں گے۔ وہ اس صورت حال پر پریشان تو ہوئے مگر حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے ایک دوست کے توسط سے اسپین کے سفارت کاروں سے ملاقات کی اور ان سے اپنا کیس ڈسکس کیا اور یقین دلایا کہ ان کے کچھ دشمنوں نے ان کے خلاف غلط الزام لگایا ہے۔ آپ میرا ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ میں شوہر سے تعلق رکھنے والا ایک اداکار، فلم ساز اور ہدایت کار ہوں اور کسی غلط کام سے کبھی میرا تعلق نہیں رہا ہے۔ بڑی مشکلوں سے وہ سفارتی عملے کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے پاکستانی یونٹ کو اسپین میں داخلے اور شوٹنگ کی اجازت دی۔

جاوید شیخ کے ساتھ جانے والے فنکاروں میں سے بھی کچھ نے انہیں شوٹنگ کے دوران بہت تنگ کیا جس کا اظہار جاوید نے واپس آنے کے بعد کیا کہ باہر علی اور عمر رانا نے شوٹنگ کے دوران مجھ سے تعاون کرنے کی بجائے جی بھر کر پریشان کیا پھر اس فلم کی نمائش سے پہلے اس کی تشہیری مہم کے موقع پر بھی غائب رہے۔

”یہ دل آپ کا ہوا“ جاوید شیخ کی بہت بڑی فلم تھی مگر اس کی تکمیل میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں قدم قدم پر پیش آئیں۔ جاوید شیخ کا دل ہی جانتا ہے وہ کس قدر تکلیف دہ تھیں۔ اسپین میں جاوید شیخ کا یونٹ پاکستان کی مہنگی ترین اور پہلی DTS فلم بنانے کے لیے فنکاروں کا منتظر تھا اور دوسری طرف باہر علی اور عمر رانا بے فکری سے لاہور کے پروڈیوسروں کی فلمیں مکمل کرانے میں مصروف تھے۔ اس فلم کی کہانی لکھنے کے لیے چار فلم رائٹروں کو ڈے داری دی گئی تھی، یہ رشید ساجد، تنویر کاظمی، ایوب خاں اور آغا حسن امتثال تھے۔ انہوں نے اپنے اسکرپٹ مکمل کر کے جمع کرائے مگر جاوید کو ان میں سے کسی کا اسکرپٹ پسند نہیں آیا جس کے بعد باہر کا شمیر کی لکھی کہانی جاوید کے علاوہ پروڈیوسر اکبر خان کو بھی اچھی لگی۔ جس پر کام شروع ہوا۔ پروڈیوسر کی خواہش تھی کہ اس فلم کے گانے بھارتی نغمہ نگار جاوید اختر سے لکھوائے جائیں۔ ان سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لکھ دوں گا۔“

ہے دیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے عہد و پیمان ہوئے اور وہ فاصلے جو صدیوں میں طے ہوتے ہیں لمحوں میں سمٹ آئے۔ یہ بڑا انوکھا رشتہ تھا۔ ایک جواں سال اداکارہ اور عمر کی پھٹی دہائی میں داخل ہدایت کار کے درمیان قائم ہونے والا یہ پیار کا رشتہ بے حد خاموشی سے پروان چڑھا۔ پھر بپ میڈیا تک یہ رومانی کہانی پہنچی تو جاوید یا ثناء نے اس تعلق کی ترویج بھی مناسب نہ سمجھی جس سے یہ واضح ہو گیا کہ ثناء پوری طرح فلم انڈسٹری کے بگ شو میں بکڑی جا چکی ہے لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ جو فاصلہ طے کرنے میں دنوں نے لمحے بھی نہ لگائے تھے ابھی ہی تیزی سے بے وفا ثناء جاوید کی زندگی سے دور ہو کر کسی اور کی ہانہوں میں سام گئی۔

”یہ دل آپ کا ہوا“ کے فوراً بعد جاوید نے اپنی اگلی فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ بنانے کا اعلان کر دیا جس میں حسب توقع ثناء ہیروئن تھیں۔ جاوید نے اپنی یہ فلم بھارت میں بنانے کا فیصلہ کیا جس کے پیچھے یہی تاثر تھا کہ یہ مقصد بھی کارفرما تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی زیادہ سے زیادہ قربت کے خواہش مند تھے۔ اس فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ کے فلم ساز وہ خود تھے جس کے لیے فنانس جمع کرانے کا ٹاسک بھی تھا۔ لہذا بولی ووڈ میں میوزک ریکارڈنگ کے دوران انہیں جب چند بھارتی پروڈیوسرز کی جانب سے بھارتی فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی تو جاوید بخوشی رضامند ہو گئے۔ اس مرحلے میں انہوں نے جان پیٹھم جیسے ڈائریکٹر کی ایک بڑی فلم ”شیکسپیر“ بھی کی جس میں انہیں ایسا بھجن کا چھوڑا ہوا رول دیا گیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جاوید شیخ بولی ووڈ کے لیے کوئی اجنبی اداکار نہیں تھے۔ سلیبی آغا کے ساتھ جب وہ ممبئی آئے تھے تو فلم ساز بہلا ج نہلائی اور ہدایت کار راکیش روشن نے انہیں اپنی فلم ”خون بھری ماگ“ میں کاسٹ کیا تھا مگر سلیبی آغا نے انہیں اس فلم میں کام کرنے نہیں دیا اور وہ معذرت کر کے لاہور لوٹ گئے تھے۔

جاوید شیخ ایک تجربہ کار اور مجھے ہوئے اداکار تھے۔ انہوں نے ”شیکسپیر“ میں اپنی پرفارمنس سے متاثر کیا تو دوسرے بھارتی فلم میکرز نے بھی ان کی خدمات حاصل کرنا شروع کر دیں جو دوسری فلمیں انہیں ملیں ان میں جان من، مے لندن، جنت، مٹی ہے تو ہنی ہے، مائی نیم از انھونی گونز الوں ہیں۔ لیکن جاوید شیخ کی وہاں سب سے اہم فلم

نامعلوم افراد

”نامعلوم افراد“ جاوید شیخ کی بطور اداکار ایک ایسی فلم ہے جس کو پسندیدگی کی سند بولی ووڈ کے فلم میکرز نے بھی عطا کی ہے۔ جاوید شیخ کہتے ہیں۔ ممبئی سے ہدایت کار امتیاز علی نے فون کر کے مجھے مبارک باد دی کہ کیا فلم بنائی ہے۔ کیا کمال کام ہوا ہے اس فلم میں۔ میں نے یہ فلم دیکھی ہے۔ اس لیے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ سنی سنائی نہیں۔ آنکھوں دیکھی ہے۔ تمہاری اداکاری بھی بلندی پر ہے۔ نشاط اور ایئر ٹیم سینماؤں کے روح رواں نواب حسن صدیقی کا کہنا ہے۔ ہدایت کار نیل قریشی کی فلم نامعلوم افراد 2014ء کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس نے اپنی نمائش کے دوران بھارتی فلموں کا جنازہ نکال دیا۔ اس کے تمام شعبوں کی کارکردگی کا معیار بہت بلند ہے۔ جاوید شیخ کی اداکاری اس فلم میں عروج پر ہے۔

جاوید شیخ کی ذاتی فلمیں

”مشکل“ ریلیز 1995ء، ہدایت کار... جاوید شیخ، باکس آفس پر اوسط درجے کی رہی۔ ”چیف صاحب“ ریلیز 1996ء، ہدایت جاوید شیخ، باکس آفس پر کامیاب فلم۔ ”میں باس“ ریلیز 1997ء، ہدایت جاوید شیخ، باکس آفس پر اوسط درجے کی رہی۔ ”مجھے جینے دو“ ریلیز 1999ء، ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر فلاپ۔ ”یہ دل آپ کا ہوا“ ریلیز 2002ء، ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر کامیاب رہی۔ ”کھلے آسمان کے نیچے“ ریلیز 2008ء، ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر فلاپ فلم۔

شاہ رخ خان کے ساتھ ”اوم شانتی اوم“ ثابت ہوئی۔ جس میں وہ شاہ رخ خان کے باپ کا کردار ادا کرتے نظر آئے۔ بھارتی فلموں میں مصروفیت کی وجہ سے جاوید کی اپنی پروڈکشن ”کھلے آسمان کے نیچے“ غیر معمولی تاخیر کا شکار ہوئی لیکن انہیں بھارت جا کر فلم بنانے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اپنی فلم کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اسی طرح ثناء بھی کسی نقصان کی بجائے فائدے

میں رہی۔ جاوید کی فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ کی تکمیل کے دوران اسے جاوید کی سفارش سے دو بھارتی فلموں میں مرکزی نوعیت کے کردار مل گئے۔ جن میں سے ایک فلم سنی دیول کے ساتھ ”قافلہ“ تھی جو مکمل ہو کر ریلیز ہو گئی جب کہ جاوید شیخ کے ساتھ دہلی میں فلمائی جانے والی فلم ”ستم“ حالات کا شکار ہو کر مکمل نہ ہو سکی۔

”کھلے آسمان کے نیچے“ جاوید کی فلم ان کی خواہش کے مطابق بھارتی لوکیشن میں تیار ہوئی لیکن ان کی خواہش کے مطابق کامیاب نہ ہو سکی۔ ان کے توقعات پر پوری نہ اتری۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جاوید کی بھارتی فلموں میں مصروفیات نے اس کی تکمیل میں غیر معمولی تاخیر کر دی تھی۔ اکثر دیر سے مکمل کی جانے والی فلمیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ فلموں کی کیمشری یہ ہے کہ جتنی جلدی مکمل ہو کر ریلیز ہو اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

”کھلے آسمان کے نیچے“ کی باکس آفس پر ناکامی سے جاوید کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ انہوں نے اس فلم میں اپنا سب کچھ ڈال دیا تھا۔ اس فلم کی ناکامی کے ساتھ کچھ اور ”حادثے“ بھی پے در پے رونما ہوئے۔ جن کی وجہ سے یقیناً وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہو گئے ہوں گے مگر..... مگر وہ جاوید شیخ ہی کیا جو بحرانوں اور حادثوں سے شکست کھا جائے۔ یہ مرد بحران ابتدا ہی سے تند تیز مخالف ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ بدترین حالات میں بھی وہ حوصلہ نہیں ہارا۔ اس بڑی ناکامی کے موقع پر بھی ثابت قدم رہا اور آج بھی اپنی اسی ثابت قدمی کی وجہ سے اپنی جگہ ایک چٹان کی طرح ڈٹا ہوا ہے۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ والد محترم شیخ رحمت اللہ صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد ان پر اپنے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں بھی آئیں تو انہوں نے ایک شفیق بھائی کی حیثیت سے ہر ممکن طریقے پر ان کے لیے نگرانی کا کردار ادا کیا۔ جاوید شیخ ایک اچھے اداکار ہی نہیں بہت اچھے ساتھی اور دوست بھی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ جس طرح خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اسی طرح اپنے بھائی بہنوں کے لیے بھی خلوص و محبت کا بیکر ہیں۔ اپنی بہن سہینہ، بہنوئی بہروز سبزواری اور بھائیوں ناصر، سلیم، ظفر اور طارق شیخ سے بھی بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ جاوید شیخ نے بھی اپنے بھائی بہنوں کو احساس ہونے نہیں دیا کہ ان کے والد دنیا میں

نہیں ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں رہے اور بھائی بہنوں کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ براہوتے رہے۔

آج جاوید شیخ کا گھرانا فنکار گھرانہ کہلاتا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے شوہر کی دنیا میں قدم رکھا تھا جس پر انہیں والد کی طرف سے بڑی سختی کی گئی کہ وہ اس چکر میں نہ پڑیں۔ اس دور میں شرفا اس شعبے اور اسے اپنانے والوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ جناب شیخ رحمت اللہ نے جہاں تک ان سے ممکن ہوا اپنے ہنر کو روکنے کی کوشش کی مگر اللہ ان کے درجہ جات کو بلند کرے وہ اپنی جہد مسلسل میں کامیاب نہ ہو سکے۔ باپ کی سختی، مار دھاڑ، پیار محبت، ہر طریقہ کار کے باوجود وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور اس جنونی لگن کے سلسلے میں بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ اس کامیابی میں انہیں ایک طویل عرصہ لگا مگر دھن کے کپے جاوید اقبال نے جاوید شیخ بن کر شوہر کی دنیا میں اپنا ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ شوہر کی دنیا میں قدم جمانے کے بعد انہوں نے

دوسرا انقلابی کارنامہ یہ انجام دیا کہ شوہر کی دنیا سے ہی اپنے لیے اپنی پہلی شریک حیات کا انتخاب کیا۔ یہ ماڈل اور اداکارہ زینت منہسی تھی۔ اس موقع پر بھی گھر کے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور زینت منہسی کو اپنے والدین کی بہو بنا کر ان کے گھر کی زینت بنایا۔ ان کی پسند کی اس شادی کے نتیجے میں مول شیخ اور شہزاد شیخ نے جنم لیا۔ آج مول شیخ اور شہزاد شیخ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور فنکار کی حیثیت سے شوہر میں اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ مول شیخ نے فلموں کے علاوہ ٹی وی ڈراموں، ماڈلنگ اور ایئر پرسن کے طور پر نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے مشہور ٹی وی ڈرامے سی رقص، میرے جیون ساتھی، بھابی، یعنی کی آئے گی بارات اور سوتیلی ماں شامل ہیں۔ جب کہ مول نے اپنے والد جاوید شیخ کے ساتھ ایک بھارتی فلم میں بھی اہم کردار ادا کیا جو بوجہ پاکستان میں ریلیز نہ کی جاسکی۔ علاوہ ازیں پاکستانی فلم ”میں ہوں شاہد آفریدی“ میں بھی ان کی پرفارمنس کو سراہا گیا۔

شہزاد شیخ نے بھی اپنے بڑے فنکار باپ کے حوالے سے شوہر میں اپنا فی بھر مرقر ار رکھا ہے۔

جاوید شیخ کے بھائی سلیم شیخ بھی ٹی وی اور فلم کی دنیا

ججوع

جنجوعہ کے صدر مقامات مشرقی کوہستان نمک ہیں لیکن وہ سارے ملتان و وزیرہ جات ڈویژنوں کے اندر تھوڑی بچت اٹھا دینا پائے جاتے ہیں۔ جنرل کننگھم کی رہائش میں وہ ہوشیار پور میں آریائی ہیں جو انوان، انوانا، انوانو کے بیٹوں کی ایک شاخ ہیں۔ ان کے نام کے پہلے حصے میں جنج ہے اور اپنڈی میں ایک علاقہ جنج کو درپائے سندھ پر ہند کے پرانے بادشاہوں سے جوڑتا ہے، جو جنج یا جنج نام کے حامل تھے۔ مشر کرپنٹن اس خیال پر راجب نظر آتے ہیں کہ وہ یادو بنی راجپوتوں کی شاخ ہیں جس کی نمائندگی مرکزی طور پر اب بھی ہوئی ہے۔ بھی کشمیر میں پنجاب پر اسلامی غلبے تک آباد تھے۔ ابو الفضل بھی انہیں یادو ماخذ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ان کا اپنا یہ کہنا ہے کہ وہ راجا راجا راجا کی نسل ہیں جو تقریباً 980ء میں جوہ پور یا قنوج سے جہلم کو ہجرت کر گیا اور مالوت تعمیر کیا۔ جنجوع سلسلہ ہائے نسب راجا راجا سے لے کر صرف 18 تا 23 پشتیں بتاتے ہوئے حریت انگیز ہمہ گیریت ظاہر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا ”جود“ کہلاتا تھا جو کوہستان نمک کا پرانا نام ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ڈائمنڈس از سر ڈینزل ایلٹن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

آرٹس رہی ہیں نہ جاوید شیخ کی منکوحہ۔ وہ صرف مول اور شہزاد کی متا بھری ناں ہیں جس نے ان دونوں کو جب وہ بچے تھے اور ان کا باپ ان سے دور کسی اور کے ساتھ وقت گزار رہا تھا انہیں لوریاں سنائیں۔ راجا رانی کی کہانیاں سنائیں۔ انہیں پال پوس کر بڑا کیا اور انہیں باپ کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا مگر ان کا حقیقی وارث ان کا باپ ہی تھا۔ جب وہ بھٹکا ہوا سافر لوٹ کر گھر آیا تو اس کی امانت اسے سونپ دی۔ اس ماں کا درد، درد مند دل رکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے لیے ہوتا ہے اور دُخم بھرنے کے لیے۔ آج جاوید شیخ اپنی اولاد کے ساتھ ہیں اور ان کو وہ تمام خوشیاں دے چکے ہیں جو انہوں نے کسی اور کی جھولی میں ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر خوشیاں جس کے نصیب میں ہوتی ہیں اسے ہی ملتی ہیں۔

آج حادہ شیخ سے جزا ہر رشتہ جاوید شیخ سے خوش

میں اپنی فنکارانہ حیثیت منوا چکے ہیں۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں سے اپنی فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کی مشہور سیریل ”دکھ دکھ اور راجا“ قابل ذکر ہے۔ جب فلموں میں قدم، ایک اور لوستوری، چیف صاحب، یہ دل آپ کا ہوا، کھلے آسمان کے نیچے وغیرہ شامل ہیں۔ سلیم شیخ کی بھی دو بیٹیاں ہیں۔ ابھی تک وہ شوہر کی طرف نہیں آئی ہیں۔

بہروز سبزواری کا نام ٹی وی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ وہ بچپن ہی سے ٹی وی پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی پہلی ڈراما سیریل ”خدا کی بستی“ تھی۔ بہروز ٹی وی کے زمانے سے ہی جاوید شیخ کے دوست تھے۔ دونوں کے درمیان گھریلو مراسم بھی تھے۔ اس دوستی کے ذریعے ایک نیا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ جاوید کی بہن سفینہ سے بہروز سبزواری کی شادی ہو گئی اور اس طرح وہ جاوید کے بہنوئی بن کر ان کے فنکار گھرانے کا بھی ممبر بن گئے۔ سفینہ نے بھی شوہر میں قدم رکھا اور کئی ٹی وی شوز میں نمودار ہو چکی ہیں جب کہ جاوید شیخ کی فلم ”یہ دل آپ کا ہوا“ میں بطور ڈریس ڈیزائنر بھی اپنے فن کا جوہر دکھا چکی ہیں۔

بہروز سبزواری اور سفینہ کا بیٹا شہروز سبزواری نے بچپن ہی سے اداکاری کے شعبے میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے کئی کرشل بھی کیے ہیں۔ ”تنہائیاں“ ڈراما سیریل کا سیکول ہا تو بہروز سبزواری اور شہروز سبزواری نے اس میں باپ بیٹے کا کردار ادا کیا۔ شہروز، جاوید شیخ کے فنکار بھانجے ہیں۔ حال ہی میں سید نور کی تازہ ترین فلم ”چین آئے نہ“ میں شہروز نے کلیدی کردار ادا کیا ہے جسے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ڈراما سیریل ”تنہائیاں“ کے سیکول میں جس لڑکی نے شہروز کی شگیتہ کا کردار ادا کیا وہ سائرہ یوسف تھی۔ اسی ڈرامے کی تکمیل کے دوران یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ سائرہ یوسف، سائرہ شہروز سبزواری بن گئیں۔ یوں وہ بھی اس فنکار گھرانے سے وابستہ ہو گئیں۔ سائرہ کی ڈراما سیریلز میں ”میرا نصیب“ پہلی سیریل تھی جب کہ یہی اہم سیریل بھی تھی۔ ڈراما سیریل ”درمیان“ بھی ایک کامیاب سیریل تھی جس میں مدنان صدیقی اور ثانیہ سعید نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

آج جاوید شیخ اپنی فنکاری میں بہت خوش ہیں۔ سٹی آغا اور نیلی ان کی زندگی سے نکل چکی ہیں مگر زینت علی مول شیخ اور شہزاد شیخ کی ماں کی حیثیت سے جاوید شیخ علیحدگی کے بعد بھی جڑی ہوئی ہیں۔ آج زینت نہ

ہے۔ بس ایک کک اور پچھتاوا جاوید شیخ نے زینت منگھی کے دل میں چھوڑ دیا ہے۔ کیا وہ کک اور یادیں زینت کو بے چین نہیں کرتی ہوں گی؟ کیا ان سب رشتوں کے ساتھ یہ رشتہ پھر جڑ سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوا جائے تو کیا بات ہے۔

اس مرد و بجران کی داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بولی ووڈ میں اڑان کی بات تفصیل کے ساتھ نہ کی جائے۔ بولی ووڈ کی فلموں میں کام کرنا، ان کی بہت پرانی خواہش ہے، بڑا دیرینہ خواب ہے۔ ان کے خوابوں کا بھی عجیب سلسلہ ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ فلموں میں اداکاری کرنے کا خواب دیکھتے تھے۔ جب یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو وہ سپر اسٹار بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ جب ٹی وی اور فلموں کے سپر اسٹار بن گئے تو وہ لالی ووڈ کی فلموں کی طرح بولی ووڈ کی فلموں کے خواب دیکھنے لگے۔

ایک خواب کی تعبیر سے دوسرے خواب کی کامیابی تک بہت رگڑے ملے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ممبئی کی فلموں میں کام کرنے کی لکھ میں انہوں نے مسلم لی آغا کا سہارا لیا۔ اس کوشش میں جو دو چار ہاتھ جب لب بام رہ گیا تو مسلم لی آغا نے ان کی وہ کندھی کاٹ دی جس کے سہارے وہ لب بام پہنچے ہی والے تھے۔ پھر ایک عالم کے ساتھ مسلم لی آغا نے بھی دیکھا کہ اس پنجرے کے پنچھے نے کیسے اس پنجرے سے باہر آکر انڈین فلم ”شیکھر“ میں سپر اسٹار زاہد دیو بن گئے اور شاید پورے ساتھ ایک اہم رول لے لیا۔ یہ فلم جان میٹھم کی فلم تھی جس میں اسے ایک پنچھے ہوئے سادھو جی کے اہم کیریئر میں پیش کیا گیا تھا۔

دھن کے بچے جاوید شیخ نے جب ”شیکھر“ کی آفر قبول کی تو وہ خود اس تذبذب کا شکار تھے کہ بھارتی فلم والے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے کیونکہ ندیم کو فلم ”درویش“ اور محمد علی زینا کو فلم ”کلرک“ میں اداکاری کرانے کے باوجود ان کی فلموں کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ان کے پیش نظر تھا وہ سوچتے تھے۔ ”کیا میرے ساتھ بھی بھارتی فلم میکر یہی کچھ کریں گے؟“ میرے کام کو کٹا چھانٹ کر مافی میں ندیم اور علی زینب کے ساتھ کیے گئے وہی سلوک دہرائیں گے۔ مگر ”شیکھر“ میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ انہیں اس بات پر افسوس ضرور ہوا کہ ”شیکھر“ باکس آفس پر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ 2005ء میں ریلیز ہونے والی یہ بھارتی فلم اس لحاظ سے حوصلہ افزا رہی کہ بھارتی اخبارات و جرائد کے ناقدین اور مبصرین نے جاوید شیخ کو ان کے کردار کے

حوالے سے سو فیصد کامیاب اداکار قرار دیا اور انہیں اس اداکاری پر اپوارڈ سے بھی نوازا۔ اس کے بعد انہیں چھوٹی موٹی اور سی کلاس بھارتی فلموں میں بھارتی کے کرداروں میں کاسٹ کیا جاتا رہا۔ ”شیکھر“ کے بعد کی فلم ”رفتہ رفتہ“ جو بعد میں ”ری اسپید“ کے ٹائٹل سے ریلیز ہوئی۔ یہ فلم قابل ذکر نہیں تھی مگر جاوید شیخ کا جو بھی کردار تھا اس کی پرفارمنس اچھی تھی اور ناظرین اور مبصرین نے اس کی تعریف کی۔

یہ وہ دور تھا جب بال ٹھا کرے کی دہشت گرد تنظیم شیو سینا پاکستانی اداکاروں کی مخالفت میں سرگرم تھی۔ جاوید شیخ کو بھی ان مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ”جان من، اپنے، ہنی ہے تو منی ہے اور پورا جیسی فلموں کے لیے انہیں جہاں شیو سینا کی مخالفت کی مار سبھی پڑی وہاں جاوید کے پرستاروں کی شدید مخالفت نے بھی جاوید شیخ کے صبر و سکون کو تہہ و بالا کر دیا۔ جاوید کے پرستاروں کی شدید مخالفت نے اس بات پر ان سے زبردست ناراض ہوئے کہ پاکستان کا ایک سپر اسٹار بھارتی فلموں میں ایسے بھرتی کے اور معمولی کرداروں میں کیوں اپنی ساکھ کو داغ دار بنا رہا ہے؟ ان مخالفتوں کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ جو کام وہ شروع کر دیتے ہیں اس میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اس طرح انہیں کامیابی بھی ہوئی اور ناکامی بھی۔ بالی ووڈ کے شو مین سبھاش گئی کی فلم میں انہیں سلمان خان، انیل کپور اور زیڈ خان کے باپ کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں ان پر بیشتر مناظر فلمانے کے باوجود انہیں صرف مرحوم کے حوالے سے تصویر لٹکانے کے منظر میں دکھایا گیا۔ جاوید شیخ پر کیا گزری؟ جو بھی دکھ ہوا وہ تو اسے برداشت کر گئے مگر ان کے پرستاروں کے لیے یہ کاری وار تھا۔ ان کی بہت دل آزاری ہوئی تھی۔ ان کے نام پر بنائی جانے والی انجمن، آل پاکستان سپر اسٹار عوامی ہیرو جاوید شیخ فیڈریشن کے مرکزی چیئرمین عبدالجبار ساگر بلوچ احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے۔ اپنے پرستاروں کے جذبات کا انہیں احساس تھا مگر ان کی سوچ یہ تھی کہ وقت اور حالات کے تحت بہت سی ناپسندیدہ باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بھارتی فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے۔ مجھے وہاں قدم جمانے کے لیے کچھ بڑی فلموں کے بینر سے آراستہ فلموں میں اپنی پی آر شپ بڑھانے کے لیے اس طرح کی



دلچسپ دو لکھ از تحریروں سے سجا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ

پاکینہ

کراچی

ماہنامہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول

سیمما رضا ردا کا نئی ناول ہم کو عبث بدنام کیا اختتامی مراحل میں

اسما قادری کی ایک نہایت شاندار تحریر..... بد صورت

ہما بیگ، نیلم احمد بشیر اور صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں

نگہت سیمما کا خوب صورت اندازِ بیاں..... پُر لطف ناول صیدِ ضیافت کی صورت

دینی معلومات پر مبنی پر عقیدت مضامین

ماضی کی اداکارہ دیبا کی

ہونہار فنکارہ صاحبزادی مدیحہ رضوی

سے دل پزیر ملاقات

سم ساجد کی اچھوتی تحریر..... عنان گیر کمل ناول کی صورت

اس کی علامت

عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،

ہاجرہ ریحان و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ محو کن شاعری، خوش ذائقہ تراکیب، متحرک ترانے اور بہت کچھ صرف آپ جیسے پُر ذوق پڑھنے والوں کے لیے

فلوں میں کام کرنا میری مجبوری ہے۔ مانا کہ ساگر بلوچ جیسے بے شمار فنکار جو ایڈیٹنگ نے کمزور بھارتی فلموں کی وجہ سے ہرٹ کیا مگر جاوید شیخ بھی آخر کار سچ ثابت ہوئی۔ انہیں ”نمستے لندن“ کی صورت میں رشی کپور کے ہمراہ ایک بہت بڑا کردار ملا۔ اس فلم میں جاوید شیخ کے ہمراہ اکشے اور کترینہ کیف جیسی سپر اسٹارز بھی تھے۔ اس فلم کے ہر سین میں جاوید شیخ نے خوب رنگ جمایا۔ اسی طرح 2007ء میں خاتون ہدایت کارہ فرح خان کی فلم ”اوم شانتی اوم“ میں جاوید شیخ نے بولی ووڈ کے ٹنگ خان (شاہ رخ خان) کے باپ کے کردار میں زبردست پرفارم کر کے اپنا نقادوں کا جیواں اور اپنے لیے بولی ووڈ کے بند روڈوازے کھلا دیے۔ ”نمستے لندن“ کے بعد ”اوم شانتی اوم“ جاوید شیخ کی دوسری بلاک بسٹر اور کامیاب ترین فلم تھی۔ اس فلم میں ایک گانے میں بولی ووڈ کے سینئر جوئیر آرٹسٹوں کے ہمراہ ”اوم شانتی اوم“ کے ٹائٹل ساگ میں جاوید شیخ کے نام گانے کی رفرائنس کو خوب سراہا گیا۔ اسی دوران ”مائی نیم از انتھونی گنواوس“ میں جاوید شیخ کے پولیس آفیسر کے کردار کو بھی بے حد پسند کیا گیا مگر یہ فلم بھی آفس آفس پر اپنا رنگ نہ جھاسی جب کہ ”جنت“ جاوید شیخ کی پہلی بولی ووڈ فلم تھی جو پاکستان میں بیک وقت پیش کی گئی۔ یہ فلم 2008ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ ”جنت“ میں بولی ووڈ کے عمران ہاشمی ہیرو تھے جب کہ جاوید شیخ کرکٹ میں بیچ کنگسٹ پر اکسانے والے منفی کیریئر میں دکھائے گئے جس میں جاوید شیخ نے حقیقت سے قریب تر اداکاری کر کے خوب داد سینی جس کے بعد انہیں بے شمار انٹرنیشنل فلموں کی آفر ہوئی۔ ”جنت“ نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ 2010ء میں پاکستانی اداکارہ مونالیزا کو جاوید شیخ کی سفارش پر فلم ”سجرا رے“ میں کاسٹ کیا گیا۔ اس فلم میں جاوید شیخ نے پاکستانی پولیس انسپٹر کے رول میں بڑی خوب صورت اداکاری کی جسے دیکھ کر جاوید شیخ کے عام پرستار خوشی سے جھوم اٹھے مگر افسوس کہ یہ جاوید شیخ کے پرستار پاکستانی اسکرین پر دیکھ نہیں سکے۔ 2011ء میں ریلیز ہونے والی انٹرنیشنل فلم ”روڈ ٹو سنگم“ ایک ایسی فلم تھی جسے بھارتی نقادوں نے جاوید شیخ کی رفرائنس کی بڑی تعریف کی۔ یہ فلم کین بین الاقوامی فلم فیسٹیولز میں بھی خاصی سراہی گئی۔ فلم کا موضوع ہندو مسلم دوستی اور گاندھی کے آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر مبنی اس فلم میں جاوید شیخ نے اس مہارت سے جذبہ ملی اور فطری اداکاری کی

کہ ناظرین اور ناقدین دونوں نے دل کھول کر ان کی پذیرائی کی۔

ایک اور فلم ”صدایان“ جو آزادی کے حوالے سے جاوید شیخ کی یادگار ترین کردار نگاری سے آراستہ تھی جس میں جہانمائی بریڈیکا، رشی کپور جیسے بڑے اسٹار جاوید شیخ کے ساتھ شامل تھے۔ جاوید شیخ کا کردار سب پر حاوی نظر آیا مگر افسوس کہ ایک بار پھر یہ فلم اپنے بولڈ موضوع کی وجہ سے پاکستانی سینما گھروں میں پیش نہ کی جاسکی۔ کیونکہ سنسر بورڈ نے ”صدایان“ کو ممنوع قرار دے دی تھی۔ یہ ہدایت کار راج کپور کی غالب آخری فلم تھی۔ جو کمزور کاسٹنگ کی وجہ سے باکس آفس پر بری طرح ناکام ہو گئی۔ راج کپور اس فلم کی ناکامی برداشت نہ کر سکے اور اسی صدمے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

”آزمکھ“ بھارتی پنجاب کے سکھ کمیونٹی کی فلم تھی۔ اس فلم میں بھی جاوید شیخ کی کردار نگاری کو بے حد سراہا گیا۔ جاوید شیخ اگر پہلا پنجابی غلامانی کی فلم ”خون بھری ماگ“ میں بطور ہیرو کام کر لیتے تو آنے والے دنوں میں بولی ووڈ کے وہ کامیاب ہیروؤں کی صف میں شامل ہوتے مگر ان کی بد قسمتی نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ ایک طویل عرصہ بعد انہوں نے ایک بار پھر بالی ووڈ میں اداکاری کے شعبے میں قسمت آزمائی کی مگر اب پہلے جیسے حالات نہیں تھے۔ اب وہ، وہ جاوید شیخ نہیں تھے جو ”خون بھری ماگ“ کے وقت میں تھے۔ اب وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کے ہو گئے تھے۔ اس لیے انہیں چالوئی اور کیریئر ٹرول ہی میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ فلموں کی یہ ایک اچھی یا بری ریت ہے کہ ہیرو ہیروؤں کو جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ دیگر کرداروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ جاوید شیخ کو بھی اپنی کے اس دوسرے دور میں وہی پذیرائی اور کامیابی مل سکی جو چالوئی کردار کرنے والوں کو مل سکتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے 18 بھارتی فلموں میں اداکاری کی اور اپنی فنی صلاحیتوں سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا کامیابی حاصل کی۔ کیریئر ٹرول کے حوالے سے ان کی فلم ”تمشا“ بھی ایک اہم فلم ہے جو ریلیز ہو کر پسند کی جا چکی ہے۔ اس میں جاوید شیخ کے ساتھ سپر اسٹار رینیر کپور اور پریکا کوکرن مرکزی کرداروں میں پیش ہوئے۔ آج بھی جاوید شیخ کو بھارتی فلمیں آفر کی جاتی ہیں مگر اب ان کی زیادہ وجہ تو یہ فلموں کی طرف جذبہ دل ہے۔





دھرتی کا بوجھ

مریم اے کاشف

اس وقت جب عراق کی سرزمین کو امریکی فوجی روند رہے تھے۔ عراق کے ہرگلی کوچے میں قتل و خون ریزی عام تھی ایسے وقت میں کچھ اپنے بھی ظلم و جور میں حصہ ڈال رہے تھے۔ وہ دھرتی کا بوجھ بن چکے تھے کہ حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔

جنگ زدہ ملک سے ایک عبرت اثر واقعہ

ایمکن نے زمین پر چھوٹا سا بچہ مارتے ہوئے دیکھا۔ گاؤں کے دائیں طرف سے گاڑیوں کا ایک قافلہ مٹی اڑاتا ہوا حارث خالد کے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔ حارث شمالی عراق میں ایک چھوٹے سے کرد گاؤں کا سردار تھا۔ وہ کوئی جدی پشتی سردار نہیں تھا اور نہ ہی گاؤں والوں نے اسے سردار بنایا تھا۔ حارث ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ نوجوانی میں اس نے عراقی آمر صدام حسین کی بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے بعد وہ اتنا طاقت ور ہو گیا

رکھے ہوئے تھا۔ کیونکہ یہاں کی اکثر آبادی کرد تھی اور کردوں کی عربوں سے لڑائی تھی۔ اس لیے جب عرب نژاد قبیلوں نے امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد شروع کی تو شمالی عراق میں بسنے والے کردوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ لڑائی سے بالکل الگ رہے تھے۔

چالاک حارث موقع کی مناسبت سے کام کرتا تھا پہلے وہ صدام حکومت اور بعث پارٹی کو خوش کرنے کے لیے اپنے ہم قوم افراد پر ظلم و تشدد کرتا تھا تو اب اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے گاؤں میں آباد عرب نژاد افراد کو تنگ کرنے لگا۔ صدام حسین غشیات کے خلاف تھا اس لیے حارث کو کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور اسے خوف بھی لگتا تھا کہ وہ پکڑا نہ جائے۔ جب امریکی آئے تو انہوں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ جو چاہے کرے۔

اب حارث کھل کر سامنے آ گیا، اسے بھرپور انداز میں اپنا کھیل بھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے علاقے کی ساری زمین کو اپنی ملکیت قرار دے دی اور حد بندی کر کے غشیات کاشت کی جانے لگی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی زمین پر کاشت کریں گے اور فصل بھی ان کو ملے گی لیکن اس کے ساتھ یہ وہ اس کے لیے بھی کام کریں گے۔ لوگ حیران تھے کہ وہ اس کے لیے کیا کام کرتے کیونکہ یہ غربت کا ارا خطہ تھا جہاں وہ بہ مشکل اپنی ضرورت بھر کا اناج اگا پاتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس میں سے حارث کو کیا دیتے جس کے پاس ڈالرز کی ریل پیل تھی۔ پہلے اس کے پاس سادہ سی حویلی تھی اب اس نے ایک عالی شان سا قلعہ نما محل بنالیا تھا جس میں دنیا جہاں کی آسائشیں تھیں۔

حریت پسندوں کے خوف سے حارث نے اس قلعے کو بہت مضبوط اور مستحکم بنایا تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں مزاحمتی تحریک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے باوجود اسے خوف لگا رہتا تھا کہ اس کے قلعے پر حملہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے آس پاس بسنے والے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کے چاروں طرف مکان بنا کر ان میں رہیں۔ حارث کا مقصد تھا کہ یہ لوگ اس کی ڈھال کی طرح ہوں اور ان کی وجہ سے اس کے قلعے پر حملہ نہ ہو۔

جب حارث، کے دل سے حریت پسندوں کا خوف نکل گیا تو وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے گاؤں والوں کی زمینوں پر قبضہ کیا اور ان کو مجبور کرنے لگا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق کاشت

کر اس گاؤں کا سربراہ بن گیا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حارث کے خلاف بات کرتا۔ کرد باشندے خود کو عراق کا حصہ نہیں مانتے ہیں اور خاص طور سے صدام حسین سے وہ بے پناہ نفرت کرتے تھے کیونکہ اس کی دور حکومت میں عراق میں بسنے والے کردوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تھے۔

کرد ایک قدیم قوم ہے اور کہتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد دنیا میں بننے والا سب سے پہلا قبیلہ کرد تھا اور بعد میں دوسری قومیں ان کردوں سے نکلیں۔ کرد شروع سے ایران ترکی اور عراق کی سرحدوں کے ملنے والی جگہ پر آباد ہیں اور وہ اس علاقے میں عظیم کردستان بنانا چاہتے ہیں لیکن ان کی بد قسمتی کہ ان کو تین بڑے طاقت ور ممالک کی فوج کا سامنا ہے اور وہ اکیلے ان سے لڑ رہے ہیں۔ آزاد کردستان کی لڑائی میں اب تک لاکھوں کرد باشندے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ ان کی منزل ابھی بہت دور ہے لیکن وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

صدام حسین کے دور میں حارث مستقل قوت بڑھانے میں لگا رہا اس نے دولت کمانے کے لیے غشیات اگائی اور اس دولت سے اس نے بد معاشوں کی ایک فوج بھرتی کر لی۔ کیونکہ وہ اس علاقے میں بعث پارٹی کا صدر بھی تھا اس لیے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا۔ یہاں کی انتظامیہ بھی اس کے تابع تھی۔ پھر حالات بدلے اور مہلک اسلحے کی تلاش میں امریکا کی سرکردگی میں مغربی طاقتیں عراق پر حملہ آور ہوئیں۔

حارث موقع پرست شخص تھا۔ اسے صدام حسین سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے اس کی حمایت کر کے طاقت حاصل کر لی تھی۔ جب عراق میں امریکی آئے تو اس نے وفاداری تبدیل کرنے میں ایک دن بھی نہیں لگایا اور جب امریکی دستے اس علاقے میں اترے تو وہ ان کا استقبال کرنے میں پیش پیش تھا۔ اس نے امریکیوں کے ساتھ کچھ ایسی والہانہ عقیدت دکھائی کہ وہ اس علاقے میں ان کا سب سے با اعتماد آدمی بن گیا۔ اس نے بعد میں اپنی کارکردگی سے بھی اپنی وفاداری ثابت کی اور اس کے صلے میں امریکا نے اسے اس علاقے میں من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ یعنی اس کی سربراہی پہلے ہی کی طرح قائم رہی۔

حارث کے ساتھیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا اور پھر ان کو امریکیوں کی مدد بھی حاصل تھی اس لیے وہ آسانی سے اس علاقے پر قبضہ پر قرار

کریں۔ جب گندم لگانے کا وقت آیا تو اس کے آدمیوں نے زمین کی حد بتا دی کہ وہ اس جگہ کاشت کریں اور اس جگہ کاشت نہیں کر سکتے۔ جب مقامی لوگوں نے گندم لگا دی تو حارث کے آدمیوں نے خالی چھوڑی جانے والی جگہ پر ہست کاشت کروائی اور یہ کام بھی انہوں نے گاؤں کے لوگوں سے لیا۔ اب انہیں... پتا چلا کہ حارث نے ان کی زمین پر قبضہ کیوں کیا تھا۔ عربوں کی تو ساری زمین اس نے قبضے میں لے لی تھی لیکن کرووں کی کچھ زمین چھوڑ دی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ وہ اس کے خلاف نہ ہو جائیں۔

حارث چالاکی سے گندم کی آڑ میں نشیات کاشت کر رہا تھا وہ بھی اس طرح کہ اگر حکومت ایکشن لے تو وہ سارا الزام گاؤں والوں کے سر رکھ کر صاف بچ جائے۔ آنے والے دو تین سالوں میں اس نے مزید پر پزے نکالے تھے۔ نشیات کی دولت کی مدد سے اس نے مزید آدمی بھرتی کیے اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ گاؤں والوں کے مقابلے میں اتنا طاقت ور ہو گیا ہے کہ وہ بغاوت پر اتر آئیں تو ان کی بغاوت دبا سکے۔ اب وہ ان کے مال و آدمی پر ڈاکا زنی کرنے لگا تھا۔ اسے پتا چل جاتا کہ کس گھر میں دولت ہے یا کوئی خوب صورت عورت ہے تو اگلے ہی دن اس کے آدمی وہاں پہنچ جاتے اور زبردستی مال اور عزت چھین کر لے جاتے تھے۔ اگر کوئی راہ میں مزاحم ہوتا تو اسے بلا جھجک گولی سے اڑا دیا کرتے تھے۔ ایسے کئی واقعات ہوئے تو لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور چپ چاپ مایاں دے دیا کرتے تھے جن گھروں میں لڑکیاں یا جوان عورتیں تھیں وہ ان کو چھپانے لگے تھے۔ وہ کسی سے داد فریاد بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس ملک میں جنگل کا قانون تھا۔

بہت سارے لوگ حارث اور اس کے ساتھیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر علاقہ چھوڑ گئے تھے ان میں اکثر عرب تھے جو عرب اکثریت والے علاقوں کی طرف چلے گئے مگر کرد بے چارے کہاں جاتے۔ بہت سارے ایسے غریب عرب بھی تھے جو کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ پھر لوگ جاتے بھی تو کہاں جاتے کہ اب تو ہر طرف حارث جیسے لوگوں کا راج تھا۔ اس لیے گاؤں اور علاقہ چھوڑ کر جانا بھی مسئلہ کا حل نہیں تھا۔ مگر جب عزت پر بن آئی تو ان کے جانے میں ہی مالیت ہوتی تھی۔ سب جا بھی نہیں سکتے تھے ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے سر پر کوئی بڑا یا مرد نہیں تھا۔ عورتیں تھیں یا بچے تھے۔ ان کا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔

جن گھروں میں مرد نہیں تھے ان میں ایک ایمن کا گھر بھی تھا۔ وہ مشکل سے پندرہ سال کی تھی۔ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن جوان تھی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حارث اور اس کے آدمی کسی جوان لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ایمن کا باپ اس وقت مرا تھا جب وہ صرف ڈھائی سال کی تھی۔ ایمن کا چھوٹا بھائی قادر رشدا بھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ باپ کے مرنے کے چار مہینے بعد پیدا ہوا تھا۔

جب حارث گاؤں کی زمین پر قابض ہوا تو ایمن کی ماں سے اس کی زمین بھی چھین گئی کیونکہ وہ عرب نژاد تھے۔ اس تھوڑی سی زمین پر ایمن کے باپ نے حبیب کا باغ لگایا تھا۔ یہ باغ حارث کے آدمیوں نے کاٹ ڈالا اور ایمن کی ماں کو حکم دیا کہ وہ اس پر گندم کاشت کرے گی۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ گندم کی کاشت کس طرح ہوتی ہے۔ سیب کے باغ کی دیکھ بھال وہ کسی نہ کسی طرح کر لیا کرتی تھی۔ اسے کھیت میں کام کرنا پڑا تو اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور پھر اس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں موجود واحد ڈاکٹر نے خدشا ظاہر کیا کہ اسے فی بی ہو گئی ہے لیکن تو اس کا کوئی ٹیسٹ ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی دوا دستیاب تھی۔ کیونکہ سوائے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر اس پورے علاقے میں ڈاکٹر زور دوائیں نایاب تھیں۔

امریکیوں کے آنے سے پہلے حالات پھر بھی بہتر تھے اب تو عراق میں سوائے موت اور بربادی کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایک طرف امریکی مار رہے تھے اور دوسری طرف آپس کی خانہ جنگی ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھی۔ ایسے میں ایمن کی ماں کو دوا اور علاج کہاں سے ملتا اس لیے وہ خون تھوکتی تھوکتی مر گئی۔ صرف ایمن کی ماں ہی نہیں بلکہ علاقے میں اور بھی کئی افراد تھے جو اسی طرح بی بی کا شکار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ان کے علاقے میں فی بی نہیں ہوتی تھی مگر جب سے ایک قریبی گاؤں پر امریکی طیاروں نے بمباری کی اور وہاں پر ایسے بم پھینکے جن سے مکانات تو تباہ نہیں ہوئے لیکن انسانوں میں جو جہاں تھا وہیں مر گیا۔ اس کے بعد سے اس علاقے میں بھی عجیب و غریب امراض پھوٹ پڑے تھے۔ ان میں ایک مرض فی بی کا بھی تھا۔

ایمن تیرہ برس کی تھی جب اس کی ماں مری اور اب اس کا دنیا میں سوائے بھائی کے کوئی نہیں تھا۔ قادر اس سے تین سال چھوٹا تھا اور ماں کی جگہ وہ دونوں زمین پر کام

کرنے لگے۔ اس سے یہ ہوا کہ ان کو کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ملتا رہا تھا۔ ایمن کی ماں کو مرتے مرتے یہ فکرتھی کہ اس کے بعد ایمن کا کیا ہوگا اور وہ حادثہ جیسے درندے سے کس طرح بچے گی۔ جب وہ عورتیں بھی نہ بچ سکیں جن کے گھر میں چار چار مرتے تھے تو ایمن کیسے بچتی کہ اس کے سر پر نہ باپ تھا اور نہ بڑا بھائی۔ لیکن وہ سوائے فکر مند ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال اس نے ایمن کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے اپنی عزت کی حفاظت کرنے کو کہا تھا۔

ایمن نے ماں کی ہدایات یاد رکھی تھیں اور وہ گھر سے کم نکلتی تھی اور جاتی بھی تو خود کو اچھی طرح چادر سے ڈھک کر جاتی تھی۔ خود کو غیر نمایاں اور دبلا رکھنے کے لیے وہ کھاتی بھی کم تھی۔ ان کو ویسے بھی جتنی خوراک ملتی تھی اس سے بہ مشکل جسم و جان کا ناظر برقرار رکھا جاتا تھا۔ اس میں سے بھی ایمن زیادہ قادر کو کھلا دیا کرتی تھی اور خود معمول سے بھی کم کھاتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اٹھان اتنی تیز تھی کہ وہ گھر میں واحد آئینے میں خود کو دیکھتی تو ڈر جاتی تھی۔ شکل و صورت اچھی نہ تھی لیکن اس کا جسم آواز دینے لگا تھا۔ وہ اسے کہاں چھپاتی۔ گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چل سکتا تھا باہر جانا بھی تھا۔ وہ اور قادر زمین پر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے لیے پانی اور چوہے کے لیے لکڑیاں وہ چن کر لاتی تھی اور کبھی کبھی نزدیکی جھاڑیوں سے پکانے کے لیے ساگ پات بھی اسے لانا پڑتا تھا کیونکہ زمین سے ان کو صرف سال بھر کی گندم ملتی تھی۔

اس روز بھی ایمن جھاڑیوں میں کوئی سبزی تلاش کر رہی تھی۔ بارش کے بعد اکثر یہاں خود رو سبزی اگ آتی تھی۔ وہ ایک جگہ سے سبزی چن رہی تھی کہ اس نے حادثہ کے قلعے کی طرف گاڑیاں جاتے دیکھی تھیں۔ یہ سب امریکی بکتر بند گاڑیاں تھیں اور میپے میں ایک دو بار اس علاقے میں ان کا چکر لگتا تھا۔ گاڑیاں قلعے کے سامنے جا کر رک کر نہیں بلکہ ان کے پاس پہنچتے ہی قلعے کا دروازہ کھلا اور بکتر بند گاڑیاں اندر چلی گئیں۔ ایمن نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ یہ لوگ اس کے ملک اور لوگوں کے دشمن تھے کتنے ہی بے گناہوں کا خون ان کے سر تھا۔ حادثہ جیسے لوگ تھے جو اپنوں کو مردا رہے تھے اور امریکیوں سے ڈالرز وصول کر رہے تھے۔

ایمن واپس جانے لگی کہ اس نے جھاڑیوں سے تین افراد کو نکلے دیکھا۔ انہوں نے شانوں پر بھاری بیگ اٹھا رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایمن ٹھک

مٹی تھی کیونکہ ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ حریت پسند تھے انہوں نے موسم کی مناسبت سے خاکی رنگ کی ٹی شرٹس اور سبز رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ شاید کوئی کارروائی کرنے جارہے تھے۔ ان کا رخ اس شاہراہ کی طرف تھا جس سے گزر کر امریکی وہاں آئے تھے۔

ایمن نے جانے کا سوچا لیکن پھر تجسس نے اس کے قدم روک لیے تھے وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ لوگ کیا کر رہے تھے۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان میں ان کا پیچھا کرنے لگی۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھی اس لیے ان لوگوں کے علم میں لائے بغیر اسے تعاقب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ لوگ بھی بہت محتاط تھے اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ شاہراہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپنے بیک زمین پر رکے اور اس میں سے گول چھنی سی پلٹ نما چیزیں نکالیں۔ ان کا قطر ایک فٹ سے زیادہ تھا۔ ایمن کو ان چیزوں کے بارے میں پتا نہیں تھا لیکن اسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ کوئی ہتھیار ہے۔

یہ بارودی سرنگیں تھیں جو عام طور سے بڑی گاڑیوں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسے فوجی ٹرک یا بکتر بند وغیرہ۔ حریت پسندوں نے بارودی سرنگیں شاہراہ پر بچھانے کے بجائے جھاڑیوں میں آنے والے ایک راستے پر بچھانا شروع کیں۔ یہ راستہ تنگ تھا اور انہوں نے بارودی سرنگیں بھی اس طرح بچھائی تھیں کہ اس راستے سے گزرنے والی گاڑی لازمی ان میں سے کسی کے اوپر سے گزرتی۔ اس کے بعد انہوں نے اس راستے سے ذرا آگے ایک راستے پر بارودی سرنگیں اسی طرح بچھائیں۔ کیونکہ اس علاقے میں زمین سخت اور پتھر پٹی تھی اس لیے وہ زمین توڑی سی کھود کر اس میں بارودی سرنگ بکتر بند بادی تے۔

ایمن دل چسپی سے ان کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ کام کر کے انہوں نے جھاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ان کا نشانہ واضح طور پر حادثہ کے قلعے میں آنے والے امریکی فوجی تھے۔ مگر ایمن کی کچھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ جب امریکیوں کو نشانہ بنانا تھا تو بارودی سرنگیں شاہراہ پر کیوں نہیں لگائی تھیں۔ دل چسپی کے ساتھ اسے خطرے کا احساس بھی ہو رہا تھا کیونکہ اگر حریت پسند اسے دیکھ لیتے تو راہ داری رکھنے کے لیے اسے مار بھی سکتے تھے اس لیے وہ بچنے آنے لگی اور اس نے ایک کسی قدر بلند نیلے پر جگہ سنبھال لی۔ یہاں سے وہ سب کو دیکھ سکتی تھی اور کوئی اسے نہیں دیکھ

لگا تھا۔ اس جگہ سے حادثہ کا قلعہ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد قلعے کا دروازہ کھلا اور اس سے تینوں بکتر بند گاڑیاں باہر آئی تھیں۔

جب وہ شاہراہ پر آئیں تو ایمن نے تین میں سے ایک کو اٹھ کر شاہراہ کی طرف جانے دیکھا تھا۔ اس کا انداز لگتا تھا جیسے وہ ٹہل رہا ہو۔ پھر جب بکتر بند گاڑیاں پاس آئیں تو وہ سامنے آگیا۔ اس کے بعد اس نے بکتر بندوں کی طرف دیکھا اور پلٹ کر جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔ ایمن نے گاڑیوں کی رفتار تیز ہوتے دیکھی۔ حریت پسند اس راستے سے جھاڑیوں میں گھسنا جہاں انہوں نے بارودی سرنگیں بجھائی تھیں۔ اسے جھاڑیوں میں گھسنے دیکھ کر پہلی بکتر بند اس کے پیچھے آئی تھی اور جیسے ہی وہ اس راستے پر مڑی کسی بارودی سرنگ پر اس کا ٹائر چڑھا اور دھماکا ہو گیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ ایمن کا منہ کٹی گئی تھی۔ بکتر بند ہوا میں اچھل کر جھاڑیوں میں جا گئی۔ یہ دیکھ کر اس کے پیچھے آنے والی بکتر بند آگے نکل گئی تھی اور اس نے دوسرے راستے سے اندر ہانے کی کوشش کی۔ اس کا بھی وہی انجام ہوا تھا دھماکے کے بعد وہ الٹ گئی تھی۔ ان گاڑیوں کے اندر موجود فوجی زندہ تھے یا مر گئے تھے لیکن گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھیں۔ پھر ایمن نے تباہ شدہ گاڑیوں سے امریکینوں کو نکلنے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی تینوں حریت پسندوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔

فوج جانے والی بکتر بند باہر ہی رک گئی تھی اور اس سے حریت پسندوں کے خلاف جہادی کارروائی کی جانے لگی تھی۔ مگر حریت پسند جھاڑیوں میں تھے اور وہ امریکینوں کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ تباہ شدہ بکتر بندوں سے نکلنے والے بیشتر امریکن فائرنگ کا شکار ہو گئے تھے۔ جو مر گئے تھے وہ ساکت پڑے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ زخمی ہو کر چلا رہے تھے۔ تیسری بکتر بند سے فوجی اتر کر جھاڑیوں کے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنے فوج جانے والے ساتھیوں کی مدد کر سکیں مگر ان کو بنا آڑ کے جھاڑیوں کے اندر آتے ہی ڈر لگ رہا تھا۔

اس دوران میں قلعے سے حادثہ کے آدمی بھی نکل کر آ گئے تھے اور انہوں نے جھاڑیوں کو گھیرنا شروع کر دیا۔ تمام کا وقت تھا اور ڈوبنے سورج کی روشنی میں وہاں ایک ٹول ناک معرکہ شروع ہو گیا۔ ایمن اس سے پہلے ہی وہاں آگ لگائی تھی ورنہ وہ بھی اس معرکہ کی لپیٹ میں آسکتی

تھی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ سات امریکی مارے گئے تھے جب کہ دوحریت پسندوں کی لاشیں ملی تھیں تیسرا نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد گاؤں والے ہم گئے تھے کیونکہ جس آبادی کے قریب امریکینوں پر حملہ ہوتا تھا اس پر نقصا سے بمباری کی جاتی تھی یا اسے نشانے کے طور پر چن لیا جاتا تھا اور بعد میں کسی بہانے سے بمباری کر دی جاتی تھی جیسے کسی شادی کی تقریب میں کی جانے والی ہوائی فائرنگ کو بہانہ بنا لیا جاتا تھا یا کوئی جنازہ ان کو حریت پسندوں کا جھوم نظر آتا تھا۔ اس قسم کی وحشیانہ بمباری میں سینکڑوں بے گناہ افراد مارے جاتے تھے۔

اصل میں امریکی حادثہ کے قلعے میں عیاشی کرنے آتے تھے۔ اس کے پاس روس سے اسمگل ہو کر آئی بہترین شراب ہوتی تھی اور ارد گرد سے اغوا کر کے لائی گئی لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں وہ بے غیرت امریکینوں کو پیش کر دیا کرتا تھا۔ اس روز بھی امریکی عیاشی کر کے جا رہے تھے کہ دست اجل نے ان کو اچک لیا تھا۔ ایمن کو اس خبر سے بہت خوش ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بعد حادثہ کے آدمیوں نے پورے گاؤں کو الٹ پلٹ دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ حریت پسندوں کی مقامی افراد نے مدد کی تھی۔ انہوں نے گاؤں کی تلاشی لی اور جس پر شک ہوا اسے بے دریغ تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ بات غلطی مگر گاؤں والے بے بس تھے۔

اس حملے کے بعد سے امریکینوں نے قلعے میں آنا جانا بند کر دیا اور حادثہ کے آدمی بھی باہر نکلنے میں احتیاط کرنے لگے تھے۔ حالانکہ اس علاقے میں حریت پسندوں کا یہ اولین حملہ تھا۔ گردبا شندے عام طور سے حریت پسندوں کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ مگر امریکینوں اور حادثہ کے اشتراک نے ان کو اتنا تنگ کیا ہوا تھا کہ اس حملے پر یہاں کے باسی بہت خوش تھے۔ بعد میں ان کو بلاوجہ نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ ایمن نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے قادر کو بتا دیا اور اسے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائے۔ قادر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو یہ بات نہیں بتائے گا۔ یوں بھی قادر کو حریت پسندوں میں شامل ہونے کا شوق تھا لیکن اتنی عمر میں اسے یہ خیال بھی تھا کہ اگر وہ چلا گیا تو پیچھے اس کی بہن کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ محفوظ نہیں ہوئی۔ یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ بھی محفوظ نہیں رہی تھیں جن کے کئی کئی بھائی تھے۔

اس واقعے کے دو مہینے بعد حریت پسندوں نے ایک

رات حارث کے قلعہ پر حملہ کر دیا اور جس وقت وہ اپنا دھواں گھونٹ رہا تھا۔ عین اس وقت حریت پسندوں کی ایک اور ٹولی نے حارث کی پوست کی کھڑی فصل کو آگ لگا دی۔ جب اس نے قلعہ کی بلندی سے اپنے کھیتوں میں شعلوں کو بلند ہوتے دیکھا تو وہ ہلکا ہلکا ہوا تھا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ باہر نکل کر حریت پسندوں کا صفایا کر دیں۔ لیکن اس کے آدمیوں کو زندگی سے پیار تھا انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حارث بے بسی سے اپنی دولت تباہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جب ساری فصل جل گئی تو حریت پسند اس وارننگ کے ساتھ واپس لوٹ گئے کہ اب حارث نے مقامی لوگوں پر ظلم کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔

مگر حارث جیسے فرعون اتنی آسانی سے کہاں مانتے ہیں۔ اگلے روز جب صبح ہوئی تو یہ گاؤں والوں کے لیے بھی ایک بری صبح تھی کیونکہ ان کی بھی فصلیں آگ کا نشانہ بن گئی تھیں۔ پھر روشنی ہوتے ہی حارث کے گھر سے باہر آئے اور انہوں نے گھروں سے لوگوں کو مار مار کر باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ایمن اس وقت نزدیکی جھاڑیوں سے لکڑی سمیٹ کر آ رہی تھی جب اس نے حارث کے آدمیوں کو دیکھا تو جلدی سے جھاڑیوں میں واپس چلی گئی تھی۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہوئی تھی اسے معلوم تھا کہ ایک بار ان درندوں نے اس کی ہوسنگھ لی تو جب تک اسے اپنا شکار نہیں بنا لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اسے یہ نہیں معلوم ہوا کہ گاؤں والوں پر کیا گزری لیکن کبھی کبھی اسے گاؤں کی طرف سے فارتنگ اور عورتوں کے چپٹے چلانے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ اسے قادر کی فکر بھی تھی کیونکہ وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کب حارث کے آدمی واپس جاتے ہیں اور وہ گاؤں میں داخل ہو۔ دوپہر تک وہ جھاڑیوں میں چھپی رہی تھی۔ دوپہر کے قریب اس نے حارث کے آدمیوں کو گاڑیوں میں سوار ہو کر واپس جاتے دیکھا تو وہ باہر نکلی اور گاؤں میں داخل ہوئی۔ جہاں تین ہو رہے تھے۔

اس روز گاؤں کے لوگوں پر قیامت گزر گئی تھی۔ ان کی جان و مال اور عزت پہلے بھی لٹی رہی تھی لیکن اس روز تو یہ سب سرعام ہوا تھا۔ حارث نے گاؤں کے جن لوگوں کو کھیتوں میں اپنی پوست کی فصل کی حفاظت کا کام سونپ رکھا تھا ان کو اور ان کی عورتوں کو گھروں سے نکال کر گاؤں کے میدان میں لائے پہلے مردوں کو باندھا اور پھر ان کے

سامنے ان کی عورتوں کو بے آبرو کیا اور جب اپنے شیطانی کھیل سے فارغ ہو گئے تو جاتے جاتے ان مردوں کو ٹولی مار گئے تھے۔ گاؤں والے سخت مشتعل لیکن بے بس تھے ان کے سارے ہتھیار ان سے چھین لیے گئے تھے دو غیر متعلقہ افراد نے مزاحمت کی تو ان کو بھی مار دیا گیا اور اس کے بعد کسی میں ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جن گھروں کے مرد مارے گئے تھے اور عورتیں بے حرمت ہوئی تھیں وہ تو جیتے جی مر گئے تھے۔ اس روز بیشتر گاؤں والوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہیں گے۔ وہ کہیں اور چلے جائیں گے۔

قادر نے پہلی بار جانا تھا کہ اگر آدمی کی کوئی عزت ہو اور وہ اس طرح سرعام لٹ جائے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ جب اس نے ایمن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں یہ سوال اتر آیا کہ اگر وہ بھی ان عورتوں میں شامل ہوتی تو وہ کیا کر لیتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مر سکتا تھا ایمن کو لٹنے سے پھر بھی نہیں بھا سکتا تھا۔ اس نے ایمن سے کہا۔ ”ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم بھی چلے جائیں گے۔“

”لیکن ہم کہاں جاسکتے ہیں؟“ ایمن نے پوچھا تو قادر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا ان کا کوئی دوزور لا کا رشتے دار بھی نہیں تھا جس کے ہاں جا کر وہ پناہ لے سکتے۔ ان کے تھوڑے بہت رشتے دار اسی گاؤں میں تھے۔ ان میں اور وہ خود پناہ کے لیے کہیں اور جانا چاہ رہے تھے۔ ان میں کوئی اتنا نزدیک رشتے دار نہیں تھا جو اپنی ذمے داری محسوس کرتا اور ان کو بھی ساتھ لے جاتا۔ قادر نے ایک دور رشتے داروں سے بات کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ ان کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جائیں گے اس لیے ان دونوں کو کیسے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی پڑ بھتی۔

گاؤں والوں کو معلوم تھا کہ حادثہ ان کو آسانی سے جانے نہیں دے گا اس لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آنے والی رات میں گاؤں سے ان لوگوں کے قافلے نکلے تھے اور باقی رہ جانے والے ان کو حسرت سے دیکھ رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کی کہیں جانے کی استعداد بھی نہیں تھی۔ ان میں ایمن اور قادر بھی تھے۔ وہ جانیں سکے تھے لیکن گاؤں کی حدود سے ان لوگوں کو جانا دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ہوا جس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو حارث کے آدمیوں سے مزاحمت کی توقع کر رہے تھے لیکن انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ان پر نقصانے حملہ ہوگا۔ ان کے قافلے میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ اور ۱۱

گاؤں سے کچھ دور گئے تھے کہ ان کے قافلے کو گن شب ہیلی
اپروں نے گھیر لیا اور اس سے پہلے کہ وہ نکلے ان پر شینگ
نے کل۔

راکت اور بم برسنے لگے جو لوگوں کے پر نچے اڑا
ہے تھے اور ان کے لیے کہیں بھی اماں نہیں تھی۔ بعض
لوگوں نے بھاگ کر گاؤں واپس آنے کی کوشش کی تو ان کو
مہلت نہیں ملی۔ بیس منٹ کے اندر امریکی گن شب ان
بڑے لوگوں کو خاک و خون میں نہلا کر جا چکے تھے۔
آخری سب مارے جا چکے تھے اور جو معدودے چند بچے
ہے وہ بھی شدید زخمی تھے۔ جب گاؤں والے گن شبس کے
واپس جانے پر ان لوگوں تک پہنچے تو یہ زخمی بھی آخری دموں
ہے۔ دوسرا افراد پر مشتمل قافلے میں کوئی زندہ نہیں بچا
تھا۔ ان پر سکوت طاری ہو گیا تھا ان لوگوں نے کبھی ایسی
اردنگی کا سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اگرچہ گاؤں والوں نے چند سالوں میں بہت مظالم
ہے لیے تھے لیکن اس روز تو ان کی بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔
سب ہی دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے
لہریں کھودیں۔ لاشیں اتنی تھیں کہ سب کے لیے الگ الگ
لہر کھودنا ناممکن تھا اس لیے بڑے بڑے گڑھے کھود کر ان
میں لاشوں کو دفن دیا گیا۔ بہت ساری لاشیں تو کھڑوں میں
بٹ گئی تھیں اور ان کی پہچان بھی دشوار ہو رہی تھی کہ وہ مرد
کی ہے یا عورت کی ہے اس لیے ہتھیار کی پہچان بہت ساری
افسوں کے کھڑوں کو ایک ساتھ ہی دفن دیا گیا تھا۔ نماز جنازہ
میں اجتماعی پڑھائی گئی تھی۔

ایک پھر ان کی نظروں سے یہ سب دیکھ رہی
تھی۔ صرف اس کا نہیں بلکہ سب کا یہی حال تھا۔ جب
افسوں کی تدفین ہو گئی تو حارث کے قلعے سے گاڑیاں نکلیں
اور گاؤں کے پاس آ کر انہوں نے میدان کو گھیر لیا۔ ایک
گاڑی میں حارث خود بھی تھا۔ اس کے آدمیوں نے میگافون
تمام گاؤں والوں کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ ان کے
اس ٹیکل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کو معاملہ تھا کہ حکم
دلی کا کوئی فائدہ نہیں تھا جو خود سے نہیں جانے گا وہ ذلت
اور تکلیف سے لایا جائے گا۔ ان کو حکم سن کر گھروں سے
اٹھ پڑا تھا۔

جو فرد میدان میں آتا حارث کے آدمی اسے تلاشی
لے کر ایک طرف بٹھا دیتے تھے۔ وہ عورتوں کی تلاشی بھی
لے رہے تھے اور کسی میں احتجاج کی ہمت نہیں تھی۔ ایک

چادر اوڑھ کر آئی تھی۔ اس کی تلاشی لینے والے نے اسے
چادر اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے دیر کی تو اس نے چادر کھینچ
لی۔ پھر اسے دیکھ کر تلاشی لینے والے کی آنکھوں میں ہنک آ
گئی تھی۔ اس نے ٹٹولنے کے انداز میں ایک کی تلاشی لیتے
ہوئے کہا۔ ”تو اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں۔“

ایک کاغذ سے برا حال تھا۔ وہ چپ رہی اور تلاشی
لینے والے نے اسے جانے دیا۔ گاؤں میں اب تھوڑے
لوگ ہی رہ گئے تھے۔ ان میں سے بھی زیادہ تر بوڑھے اور
بچے تھے۔ جن کے اوپر کوئی جوان نہیں تھا وہی پیچھے رہ جانے
پر مجبور ہوئے تھے اور وہی بچے تھے۔ جوان عورتیں اور
لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ تلاشی لینے والے ان کو
خاص طور سے دیکھ رہے تھے۔ جب تمام گاؤں والے آگئے
تو حارث نے اپنی گاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر ان سے
خطاب کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی طاقت کی بات کی اور اپنی
نا فرمانی کرنے والوں کو عبرت ناک موت کے انجام سے
ڈرایا پھر اس نے کہا کہ آج سے گاؤں کے تمام لوگ اس کے
غلام ہیں اور وہ زمین پر اس کے لیے پوست کاشت کریں
گے۔ وہ سب گاؤں میں رہیں گے اور جس نے فرار کی
کوشش کی اسے مار دیا جائے گا۔ ان کا کھانا پینا حارث کے
ذمے ہوگا۔

تقریر کر کے حارث واپس اپنے قلعے میں چلا گیا لیکن
اس کے آدمیوں نے پورے گاؤں کو اس طرح گھیر لیا کہ ان
کی نظروں میں آئے بغیر کوئی وہاں سے باہر نہیں جاسکتا تھا
کیونکہ گاؤں میں زیادہ تر عام لوگ رہ گئے تھے اس لیے ان
لوگوں کو مزاحمت کا خوف بھی نہیں تھا بس یہ دھڑکا تھا کہ رہے
ہے بھی فرار نہ ہو جائیں۔ ان لوگوں کو فرار سے روکنے کے
لیے انہوں نے گاؤں کے چاروں طرف مٹی کی مدو سے
اونچے مینار بنالے اور وہاں سے نگرانی کرتے تھے۔

گاؤں کے بچے کچے لوگوں کو اپنا غلام بنالینے کے بعد
حارث مزید بے باک ہو گیا تھا۔ پہلے لوگ زیادہ تھے اور ان
میں جوان مردوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے حارث اسلحے کی
طاقت کے باوجود ان سے ڈرتا تھا۔ اب کم لوگ رہ گئے تھے
اور ان میں بھی بیشتر بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس لیے اس
نے بے خوف ہو کر گاؤں کی ساری زمین پر قبضہ کر لیا۔ وہ
اس پر پوست اور حبش کے پودے کاشت شروع کرانے لگا
اور اسے دوسروں کی نظروں سے چھپانے کے لیے زمین
کے ارد گرد اور درمیان میں جھاڑیاں لٹکانا شروع کر دیں۔

راز داری کا یہ سارا اہتمام وہ امریکنوں کے لیے کر رہا تھا جو اس کے مربی اور آقا تھے اور اس کی ساری منشیات امریکا ہی جاتی تھی۔ امریکی ایک ایسے ناگ کی پرورش کر رہے تھے جو اس کے لوگوں کو بھی اپنے زہر کا عادی بنا رہا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیا کی نوے فیصد ہیروئن اور شیش گولڈن ٹرائی اینگل سے آتی تھی۔ مشرق بعید میں تھائی لینڈ، لاؤس اور برما کے درمیان پھیلا ہوا گولڈن ٹرائی اینگل صرف منشیات اور دہشت گردی کی وجہ سے مشہور ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک خطہ سنہری ہلال کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ سنہری ہلال ایران، ترکی اور عراق کے درمیان میں ایک خطہ ہے اور یہاں کے لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ منشیات اگانا اور اسے فروخت کرنا ہے۔ اس سارے خطے میں گرد قوم آباد ہے۔ گویا کردوں کا سب سے بڑا پیشہ یہی ہے۔ حارث نے بھی اپنا آبائی پیشہ اپنا رکھا تھا۔

گاؤں کے بوڑھے، بچے اور عورتیں کمانے والوں سے محروم ہو گئے تھے اس لیے اب ان کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ حارث کو ان سے کام لینا تھا اس لیے وہ ان کو خوراک مہیا کرنے لگا لیکن یہ بس اتنی تھی کہ جسم و جان کا ناطہ برقرار رہے۔ ایمن بھی قادر کے ساتھ زمین پر کام کرتی تھی۔ ابھی فصل کی بوائی جا رہی تھی۔ جب ان کو روکا گیا تھا تو ایمن کا خیال تھا کہ حارث کے درندے کچھ دن میں گاؤں کی بچی ہوئی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو لے جائیں گے۔ لیکن جب ان کی طرف سے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا تو اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک عورت نے ایمن کو بتایا۔

”یہ اتنے اچھے نہیں ہیں۔ درندوں کو بھی بیم پر رحم آ سکتا ہے لیکن ان کو نہیں آ سکتا۔“ عورت نے سچی سے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ ان کو ابھی زمین پر کام کرنے والوں کی کمی ہے اس لیے یہ عورتوں اور لڑکیوں کو نہیں اٹھا رہے ہیں جب ان کا کام نکل جائے گا تو یہ بھوکے کتوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔“

ایمن دہشت زدہ ہو گئی تھی اس نے بے ساختہ کہا۔ ”نہیں میں مر جاؤں گی لیکن ان لوگوں کو خود کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔“

”ہمارے اختیار میں اپنی مرضی سے مرنا بھی کہاں ہے؟“ عورت نے کہا تھا۔

ایمن سوچنے لگی کہ خدا کے سوا ان کو کون بچا سکتا ہے تو

اس کے ذہن میں حریت پسندوں کا خیال ہی آیا تھا۔ لیکن وہ بے چارے خود مارے مارے پھرتے تھے ان کی مدد کے لیے خاص طور سے کیے آتے۔ ویسے بھی ان کے ایک بار کے حملے کی سزا اب تک وہ لوگ بھگت رہے تھے۔ ایمن اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ حارث کے قلعے پر حریت پسندوں کے حملے کے جواب میں گاؤں کے لوگوں پر بمباری کی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے سزا تھی جو عام لوگوں کو حریت پسندوں کی خاموش حمایت پر دی جا رہی تھی۔ امریکیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھا کہ وہ جن کی حمایت کر رہے تھے اور جن کو اس ملک کا مالک بنادیا تھا وہ سب جھٹے ہوئے بد معاش اور ظالم تھے۔ ان کے ہاتھ پہلے بھی بے گناہوں کے خون سے رنگے تھے لیکن جب وہ امریکی مدد سے ملک پر قابض ہوئے تو انہوں نے لوگوں پر قیامت ڈھا دی تھی۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عورتوں کی بے حرمتی کا طوفان امنڈ آیا تھا۔ ان کے مظالم کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور ان کی حمایت متحارب قوتوں سے بڑھ گئی تھی اور ان کو کسی کی سزا بلا وجہ کی بمباری سے دی جا رہی تھی۔ ایسے پے در پے واقعات کی وجہ سے حریت پسند اپنی کاروائیوں میں محتاط ہو گئے تھے اور ان کی کوشش ہوئی تھی کہ حملے آبادیوں سے دور رکھیں۔

ایمن نے ایک رات سونے سے پہلے قادر سے کہا۔ ”کیا تو یہاں سے نکل نہیں سکتا ہے؟“

”میں نکل کر کہاں جاؤں؟“ قادر نے سوال کیا۔ ”تو جا کر حریت پسندوں کا مدد لا سکتا ہے وہی ان لوگوں سے ہمیں نجات دلا سکتے ہیں۔ ورنہ کچھ دن بعد....“ ایمن کہتے کہتے رک گئی۔ اسے بھائی کے سامنے یہ سب کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ قادر تیرہ سال کا تھا لیکن حالات نے اسے وقت سے پہلے سمجھ دار بنادیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن اور دوسری جوان عورتوں کو اپنی عزت کی فکر لاحق ہے۔

”اگر میں گیا تو یہ تجھ سے پوچھیں گے نہیں۔“ ”نہیں میں کہہ دوں گی کہ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تجھے باری کا بخار ہو گیا ہے اس لیے تو دو تین دن نہیں آ سکتا۔“

”اگر ایسا ہے تو میں جا سکتا ہوں۔ لیکن مجھے زیادہ دن ہو گئے تو؟“

خود ایمن کے ذہن میں بھی یہ خدشہ تھا کہ قادر کو زیادہ

دن بھی لگ سکتے تھے اور یہ بھی ممکن ہو تھا کہ وہ ناکام رہتا اور واپس ہی نہیں آ پاتا۔ اس صورت میں ایمن کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ لیکن ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھی اس کا اور یہاں موجود دوسری عورتوں کا بھی انجام ہوتا۔ صرف زمین پر کام کرنے کی وجہ سے وہ بچی ہوئی تھی۔ اس بہانے اگر قادر نکل جاتا اور اس کی جان بچ جاتی تو ایمن کے لیے یہ سودا بھی مہنگا نہیں تھا۔

”تم اللہ کا نام لے کر نکل جاؤ۔“ ایمن نے کہا۔ ”ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ آگے اللہ مالک ہے۔“ قادر کو خیال آیا۔ ”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ ”نہیں ہم دونوں غائب ہوئے تو ہماری تلاش شروع ہو جائے گی اور یہ ہمیں پکڑ لیں گے۔ تم جاؤ گے تو میں چھپا لوں گی۔“

قادر مان گیا اس نے تیاری کی اور آنے والی رات چپکے سے گاؤں سے نکل گیا۔ اس ساری رات ایمن بے چینی سے جاگتی رہی تھی۔ ملکی سی آواز پر اس کا دل دھڑک جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ابھی فائرنگ کی آواز آئے گی اور اگلی صبح قادر کی لاش آئے گی۔ لیکن رات بھر امن رہا کوئی فائر نہیں ہوا۔ صبح جب وہ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے باہر آئی تو حارث کے نگرانی کرنے والے آدی نے اس سے کہا۔ ”تیرا بھائی کہاں ہے؟“

”اسے رات سے بہت تیز بخار ہے ابھی تو بے ہوش پڑا ہے۔“ ایمن نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا اگر نگران اس کی بات کا یقین نہیں کرتا اور قادر کو دیکھنے پر اصرار کرتا تو اس کا راز یہیں کھل جاتا۔ لیکن نگران نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اور اس کے ساتھی روز صبح گاؤں والوں کو جمع کر کے زمین پر لے جاتے تھے اور ان کو شام سورج غروب ہونے کے بعد واپس آنے کی اجازت ملتی تھی۔ حارث کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ رقبے پر غشیات کاشت کرے۔ صرف بہت بوڑھے، معذور اور دس سال سے کم عمر بچوں کو چھوٹ تھی۔ باقی ہر شخص کو کام کرنا پڑتا تھا۔

آج کی دنیا میں غشیات کا مطلب دولت ہے اور دولت سے اسلحہ خریدا جاتا ہے اور جس کے پاس زیادہ اسلحہ ہوتا ہے وہی زندہ رہنے کا حق دار ہوتا ہے۔ اس لیے عراق کے بہت سارے جنگجو سردار جو امریکیوں کی حمایت سے اپنے لوگوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ دولت سے اسلحہ اور جنگجو حاصل کرتے تھے۔ دولت کے لیے غشیات کاشت

کرتے تھے۔ امریکی جوان کی حمایت کے محتاج تھے وہ ان کی غشیات کی فصلوں سے سرف نظر کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ عراقی میں چند سال پہلے غشیات کی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی اب وہاں بہت بڑی مقدار میں غشیات پیدا کی جا رہی تھی اور مغرب کو بھیجی جا رہی تھی۔

حارث صرف ایک تھا اور ایسے ہزاروں جرائم پیشہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور خاص طور سے سرحدی علاقوں میں غشیات کاشت کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن وہ صرف غشیات کاشت نہیں کر رہے تھے بلکہ اس سر زمین پر تشدد اور مظالم کی ایسی فصل بو رہے تھے جو آنے والے دنوں میں خونریزی کی نئی کھیتی بننے والی تھی۔ ایک لادا تھا جو اندر ہی اندر ان کے خلاف پک رہا تھا اور لوگ ان سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کو بھی معلوم تھا کہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ پر ہیں جب تک ان کے مربی اور سرپرست امریکا یہاں ہیں جس دن امریکی عراق سے رخصت ہوئے اور اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں آیا اس دن ان کو بھی یہاں سے بھاگنا ہوگا۔

ایمن اور اس کے گاؤں کے لوگ منتظر تھے کہ کب ان لوگوں کے مظالم سے نجات ملتی ہے۔ وہ مایوس تھے موجودہ حالات میں موت ہی ان کو نجات دلا سکتی تھی اور موت آ جاتی تب بھی وہ اس کے احسان مند ہوتے۔ ذلت کے جینے سے عزت سے مر جانا بہتر تھا۔ مگر یہاں تو مرنا بھی اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ ایمن واپس گھر آئی اور اس رات اسے بہت ڈر لگا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور سٹائے میں ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تھی تو وہ اچھل پڑتی تھی۔ شدید گرمی میں بھی وہ دروازہ اندر سے بند کر کے سوئی تھی۔

اگلے روز نگران نے پھر اس سے پوچھا تو اس نے قادر کے بارے میں کہا۔ ”اس کا بخار ابھی تک نہیں اترتا ہے۔ وہ تو چلنے کے قابل بھی نہیں ہے۔“

”اگر وہ کل نہیں آیا تو اس کے حصے کا راشن نہیں ملے گا۔“ نگران نے ایمن کو دھمکی دی۔ ”مفت خوروں کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”وہ بستر سے نہیں اٹھ پارہا ہے۔“

”اگر اٹھ نہیں سکتا تو بھوکا مرے۔“ نگران نے سفاکی سے جواب دیا۔

ایمن شام کو گھر آئی تو اسے فکر ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اگر کل بھی اس نے یہی بہانہ کیا تو نگران خود دیکھ

اُہائے گا کیونکہ ان دنوں کام جاری تھا اور ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ قادر کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا وہ میت پسندوں تک پہنچا تھا یا نہیں پہنچا تھا۔ تیسرے دن امین کام کے لیے گھر سے نکلی تو نگران نے اسے اکیلا دیکھ کر کہا۔ ”آج سے تیرے بھائی کا راشن بند ہوگا۔“

”وہ پہلے ہی بیمار ہے خوراک نہ ملی تو مر جائے گا۔“ امین نے التجا کی۔ اس کا مقصد تھا کہ نگران کو شک نہ ہو کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

”مر جائے۔“ نگران نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمارے پاس صرف کام کرنے والوں کے لیے خوراک ہے۔“

امین زمین پر آئی جہاں پودوں کی بوٹی جاری تھی۔ وہ کام کرنے لگی۔ دوپہر کو حارث خود زمین کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے قادر کی کمی محسوس کر لی تھی۔ اس نے نگران سے پوچھا۔ ”ایک لڑکا نظر نہیں آ رہا ہے؟“

”وہ اس لڑکی کا بھائی ہے اور اس کی طبیعت دو دن سے خراب ہے۔“ نگران نے امین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حارث نے بغور امین کو دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ہوس ہلک رہی تھی۔ ”کیا ہوا تیرے بھائی کو؟“

”وہ بیمار ہے۔“ امین نے اس کی نگاہوں سے سہم کر اپ دیا۔

حارث نے نگران کی طرف دیکھا۔ ”تو نے اس لے بھائی کو دیکھا کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہی ہے؟“

امین کا سانس رک گیا تھا اور نگران بھی پریشان نظر آ لے لگا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ گھر پر ہی ہے اور بیمار ہے۔“

نگران نے اس لیے جھوٹ بولا تھا کہ اگر وہ سچ بولتا تو حارث یہیں اس کی کھال اتار دیتا اور یہ بھی ممکن تھا وہ اچھے گولی مار دیتا، اپنے آدمیوں کے معاملے میں بھی وہ کم ناک نہیں تھا۔ نگران کی بات نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر لپٹائی نظروں سے امین کی طرف دیکھا اور نگران سے متنی خیز لہجے میں کہا۔ ”اس کا خاص خیال رکھنا۔“

نگران اس کی بات سمجھ گیا تھا اس نے دانت نکال کر کہا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔“

نگران سمجھ گیا تھا کہ امین حارث کی نظروں میں آگئی

تھی۔ وہ بلا کا عیاش آدمی تھا۔ وہ اب اس تباہ شدہ گاؤں کی بچ جانے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں پر قابض ہونے کی فکر میں تھا۔

حارث کے جانے کے بعد نگران امین کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا۔ ”تیرا بھائی گھر پر ہی ہے نا؟“

”ہاں۔“ امین نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔“ نگران اس کے لہجے سے اور بھی کھٹک گیا تھا۔ ”اگر وہ وہاں نہیں ملا تو سوچ سکتی ہے تیرے ساتھ کیا ہوگا۔“

امین لرز گئی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ اس نے جتنی انداز میں کہا۔ ”اللہ کے لیے.... میرا بھائی گھر میں نہیں ہے۔“

نگران بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ”پھر کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ امین نے جھوٹ بولا۔ ”وہ تین دن سے گھر سے غائب ہے۔“

یہ سن کر نگران کے ہوش اڑ گئے تھے۔ کیونکہ اس نے حارث سے کہہ دیا تھا کہ وہ امین کے بھائی کو گھر پر دیکھ چکا ہے۔ اگر حارث کے اس کے جھوٹ کا پتا چل جاتا تو عبرت ناک موت اس کا مقدر بنتی۔ نگران نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور کسی کو پاس نہ پا کر امین سے کہا۔ ”تم نے مجھے بھی مروا دیا ہے۔ اگر تمہارا بھائی نہ ملا تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ وہ کہاں گیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“ امین سہم گئی۔

نگران نے امین کا بازو سختی سے پکڑا اور بولا۔ ”آج شام تک اگر تیرا بھائی نہ ملا تو میں تجھے سردار کے سامنے لے جاؤں گا۔“

امین نے ذرا جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ”اگر تم مجھے اس کے سامنے لے گئے تو میں تمہارے جھوٹ کا بھی بتا دوں گی۔“

نگران کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا اگر قادر نہ آتا تب بھی اس کی شامت تھی اور اگر وہ حارث کو سب سچ بتا دیتا تب بھی مارا جاتا۔ وہ امین کو ڈرانے دھمکانے لگا کہ وہ بتا دے قادر کہاں چھپا ہے۔ امین نے کہا۔ ”میں خود نہیں جانتی شاید وہ گاؤں سے چلا گیا ہے۔“

نگران الجھ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح نکلے۔ شام ہوئی تو سب کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ امین بھی ہوئی مگر تک

آئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کا انجام قریب تھا کیونکہ کل قادر نہیں ہوتا تو حارث کو لازمی شک ہو جاتا اور وہ اس کے گھر کی تلاشی لیتا تو قادر نہیں ملتا اور اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہوتا تھا اس کا سوچ کر ہی ایمن کی روح لرز رہی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ ایسا وقت آنے سے پہلے کچھ ہو جائے اگر قادر حریت پسندوں کی مدد لے کر نہیں آتا ہے تو اسے موت ہی آجائے۔

یہ رات اس نے بہم بہم کر گزار دی تھی۔ جیسے جیسے صبح قریب آ رہی تھی ایمن کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گی۔ صبح سے پہلے اسے ایک خیال آیا کہ وہ کوشش کیوں نہ کر خود بھی گاؤں سے نکل جائے۔ اگر وہ کامیاب رہی تو فوج جائے گی اور ناکام رہی تو ماری جائے گی۔ اس طرح بھی وہ کم سے کم ان درندوں کا شکار ہونے سے فوج جائے گی۔ وہ ڈر رہی تھی لیکن صبح سے پہلے اس نے ہمت کر لی اور گھر سے نکل آئی۔ اس نے جھاڑیوں والے میدان کا رخ کیا۔ اس طرف کی مگرانی ذرا کم تھی اور وہ ان جھاڑیوں سے اچھی طرح واقف تھی اگر وہ ان میں گھس جاتی تو کوئی اسے مشکل سے ہی تلاش کر سکتا تھا۔

وہ گلیوں میں چھپتی چھپاتی ہوئی جھاڑیوں کی طرف جانے لگی تھی۔ وہ گاؤں کی آخری حد تک آئی۔ جس کے بعد ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس کے بعد جھاڑیاں شروع ہو جاتیں۔ اصل مرحلہ اس میدان کو عبور کرنا تھا۔ اس دوران میں پہریداروں کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ اسے گولی مار دیتے۔ چاند نہیں تھا لیکن ستاروں کی ہلکی سی روشنی تھی۔ ابھی وہ میدان عبور کرنے کی ہمت کر رہی تھی کہ اسے قلعے کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ وہ بہم کرا کر ایک ویران مکان میں گھس گئی۔ فائرنگ کی آواز میں دم بہ دم تیزی آ رہی تھی پھر اس میں دھماکے بھی شامل ہو گئے۔ ایمن نے ہمت کر کے مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھا۔ حارث کے قلعے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایمن خوش ہو گئی یقیناً وہاں پر حریت پسندوں نے حملہ کیا تھا لیکن حارث کے آدھی بھی شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ یہ گھر قلعے سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ایمن کو فائرنگ کرنے والے تک نظر آ رہے تھے۔ حریت پسندوں نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جلد حارث کے بچے کچے ساتھیوں پر حاوی آجائیں گے اور اس کے بعد حارث اور

اس کے ساتھی کتے کی موت مارے جائیں گے۔

لیکن عین اس وقت جب حریت پسند قلعے میں گھسنے کے قریب تھے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ ہی فضا میں دو امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے اور انہوں نے آتے ہی حریت پسندوں پر شیلنگ شروع کر دی۔ چند منٹ میں جنگ کا پانا پلٹ گیا۔ حریت پسند جو کامیابی کے قریب تھے اب اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آسمان سے برسی آگ سے نہیں جائے اماں نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کے سامنے والا میدان حریت پسندوں کی لاشوں سے بھر گیا تھا اور جو زندہ تھے وہ شدید زخمی تھے۔ امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر اپنا کام کر کے وہاں سے روانہ ہوئے تو اندر سے حارث اور اس کے بچے کچے ساتھی نکلے اور انہوں نے زندہ بچ جانے والے حریت پسندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان کو پکڑ کر اور ان کے ہاتھ باندھ کر ان کو قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات تھی۔ پھر ایمن نے دیکھا ان میں اس کا بھائی قادر بھی تھا۔ وہ شدید زخمی تھا اور اس کے ایک بازو سے مسلسل خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی پرواہ کیے بغیر اسے بھی قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد حارث اور اس کے آدمیوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب بھی اپنے خون میں نہا گئے تھے۔ ایمن نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں روکی تھیں۔ وہ منہ دبا کر رو رہی تھی ورنہ اس کی دھاڑیں قلعے تک جاتیں جس کا بیشتر حصہ اب آگ کی لپیٹ میں تھا۔

حارث اور اس کے بچ جانے والے آدمی قلعے سے اپنا سامان اور اسلحہ نکال رہے تھے ان کے پاس تین چار گاڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے سامان اور اسلحہ نکالنے کے بعد گاڑیوں پر گاؤں کا رخ کیا۔ پہلے تو ایمن بھی کہ وہ شاید گاؤں والوں کو قتل کرنے آ رہے ہیں۔ مگر ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اصل میں قلعے کی تباہی کے بعد حارث کے لیے اس جگہ رہنا ممکن نہیں تھا اور اب اس کے پاس زیادہ آدمی بھی نہیں رہے تھے جو باقی بچے تھے ان کی تعداد درجن سے زیادہ نہیں تھی اور اتنے آدمیوں کے ساتھ وہ یہاں اپنی حکمرانی قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور جاتے جاتے وہ گاؤں میں رہ جانے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے آدمیوں کو معلوم تھا کہ عورتیں اور لڑکیاں کن

کن گھروں میں تھیں۔ وہ ان گھروں سے ان کو کھینچ کھینچ کر باہر لانے اور گاڑیوں میں ڈالنے لگے۔ ایک بار پھر شور مچا تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں چلا رہی تھیں ان کے گھروالے شور کر رہے تھے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ نے مزاحمت کی تو حادث اور اس کے آدمیوں نے بلا تکلف ان کو شوٹ کر دیا۔ ایمن نے دیکھا کہ حادث عمران کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گویا وہ اسے بھولا نہیں تھا۔

ایمن کو خطرے کا احساس ہوا وہ لوگ اسے گھر میں نہیں جانتے تو لازماً گاؤں میں تلاش کرتے۔ یہاں چھپنے کی جگہ نہیں تھی وہ جلد یا بدیر اسے تلاش کر ہی لیتے۔ چھپنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی جگہ تھی۔ یعنی جھاڑیاں جن میں وہ کس جاتی تو اسے تلاش کرنا آسان نہ ہوتا۔ وہ مکان سے نکلی اور حیر کی طرح جھاڑیوں کی طرف بھاگی۔ مگر انی کرنے والی چوکیوں سے پہریدار حملے کے وقت ہی چلے گئے تھے۔ اس لیے وہاں سے اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن بد قسمتی سے عین اس وقت جب وہ جھاڑیوں میں گھسنے والی تھی۔ حادث کے ایک آدمی کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے چلا کر دوسروں کو خبردار کیا۔ فوراً ہی ایک گاڑی اس کے پیچھے آئی۔ لیکن اس دوران ایمن جھاڑیوں میں کس جگہ چکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھسکی گئی اور ان جھاڑیوں کے سب سے کھنکھے میں آ گئی۔

باہر شور مچا اس کی تلاش میں حادث کے آدمی جھاڑیوں میں کس کس آئے تھے۔ ایمن نے حادث کے چلانے کی آواز سنی وہ اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا کہ ایمن کو ہر قیمت پر تلاش کریں۔ وہ خود بھی جھاڑیوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایمن کو محسوس ہوا کہ وہ اس جگہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ اس لیے وہ آہستہ آہستہ وہاں سے بھی دور جانے لگی۔ حادث اور اس کے آدمی منظم طریقے سے پھیل کر اسے تلاش کر رہے تھے اور وہ ایک ایک جھاڑی دیکھ رہے تھے۔ اب ایمن کو احساس ہوا کہ یہ جھاڑیاں اتنی بھی محفوظ نہیں تھیں اور تلاش کرنے والے زیادہ ہوں تو وہ جلد یا بدیر کسی کو بھی ان جھاڑیوں میں تلاش کر سکتے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ ایمن کے قریب آرہے تھے اور وہ ان سے دور جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے احتیاط سے حرکت کرنا پڑی تھی کیونکہ اگر وہ آہٹ کرتی تو اسے تلاش کرنے والے جان جاتے کہ وہ

ایجاد و صنعت کے لحاظ مسلمانوں کا اہم کام کاغذ کا رواج ہے۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے۔ مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق، نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لیے استعمال کیا۔

موسسہ لیہان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریروں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے 1205ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ ول ڈیوران لکھتا ہے کہ اسپین کے ایک مسلمان ابن فرنانس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اول عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی اور سوم ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپہ خانہ بھی اسپین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اول (788ء) کے احکام چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہ خشب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک شخص حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند خشب کے ایک کنوئیں سے لٹکا، اندازاً سومر بلع میل کے رقبے کو نور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور طبلہ کی گلواریں، عدن کے ادنی کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقعہ کے صابن، ایران کے قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

کہاں ہے۔ اس وجہ سے اس کی رفتار سست تھی جب کہ اس کے پیچھے آنے والے تیز حرکت کر رہے تھے۔ پھر کسی نے اس کی جھلک دیکھ لی اور چلا کر دو میروں کو خبردار کیا۔ ایمن جلدی سے دوسری جھاڑیوں میں گھسی اور پھر بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کے پیچھے شکاری کتے ہوں جو اسے پھاڑ کھانا چاہتے ہوں اور حقیقت میں کچھ دیر میں ایسا ہونے والا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دو میروں والے کتے تھے اور اصلی کتوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھے۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں اس کی چادر ابھی اور اس نے چھڑانے کی کوشش کی مگر چادر زیادہ ہی الجھ گئی تھی مجبوراً وہ چادر چھوڑ کر بھاگی۔ اس طرح اسے آسانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں جہاں راستہ نظر آ رہا تھا گھسی جا رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی کیونکہ پیچھے آنے والوں کا شور کچھ زیادہ ہی سنائی دینے لگا تھا۔ وہ کچھ شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ اسے ٹھوکر لگی اور اس نے دیکھا وہ شاہراہ کے سامنے تھی لیکن اس کی عافیت ایسی ہی تھی کہ وہ جھاڑیوں میں رہے اس سے باہر نکلی تو فوراً ہی پکڑی جاتی اور اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوتا اس کا سوچ کر ہی اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ لیکن جیسے ہی اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کا پاؤں مٹی میں دلی کی چیز پر گیا اور ملک کی آواز آئی۔ اس کا پاؤں وہیں رک گیا تھا اور ایک لمحے کو اس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ یہ جگہ اسے جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی یہیں حریت پسندوں نے امریکی بکتر بند گاڑیوں کو تباہ کرنے کے لیے بارودی سرنگیں بچھائی تھیں۔ انہوں نے زیادہ تعداد میں سرنگیں استعمال کی تھیں جن میں سے کچھ ان کے کام آئی تھیں اور کچھ باقی رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بارودی سرنگ پر اس کا نام لکھا تھا۔ اس کا پاؤں اس پر آتا تھا اور وہ اس وقت موت پر کھڑی تھی۔

بارودی سرنگیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جن پر جیسے ہی مطلوبہ وزن آتا ہے وہ پھٹ جاتی ہیں اور دوسری جب ان پر وزن آتا ہے تو وہ ایٹمی ویٹ ہوتی ہیں جیسے ہی وزن ہٹتا ہے وہ پھٹ جاتی ہیں یہ بکتر بند گاڑیوں کو تباہ کرنے والی بارودی سرنگ تھی اور یہ ایٹمی ویٹ ہو کر پھٹتی تھی جب بکتر بند کا ٹائر ان پر سے گزر جاتا اور فرش والا حصہ ان کے

اوپر ہوتا۔ اس طرح نقصان زیادہ ہوتا تھا۔ اگر وہ پاؤں لپیتی تو سرنگ فوراً ہی پھٹ جاتی۔ اس کے لیے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب اس کی زندگی اس وقت تک تھی جب تک وہ بارودی سرنگ پر دباؤ ڈالے ہوئے تھی۔ جیسے ہی اس کا پاؤں ہٹائی وہی اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہوتا۔

لیکن وہ پاؤں نہ ہٹاتی تب بھی بیخ نہیں نکلی سکتی تھی۔ اس کے پیچھے لگے شکاری کتے کسی بھی لمحے اس تک پہنچنے والے تھے۔ وہ اسے یہاں سے لے جانے کے لیے بارودی سرنگ سے ہٹا دیتے۔ گویا ہر طرح سے موت ہی اس کا مقصد تھی۔ ایمن نے گہری سانس لی۔ تعاقب میں آنے والے پاس آگئے تھے۔ وہ درندوں کی طرح غرار ہے تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اسے پانے اور پھر پھاڑ کھانے کے لیے بے چین تھے۔

ایمن ان کی منتظر تھی پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا اور مسکرا دی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اس دنیا سے اکیلے نہیں جائے گی بلکہ کچھ خالوں کو اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔ اسے تو مرنا تھا اگر وہ اس دھرتی کا کچھ بوجھ کم کر دیتی تو یہ سودا زیادہ برا نہیں تھا۔ پہلے وہ ان لوگوں سے بھاگ رہی تھی اور اب اسے ان کا انتظار تھا۔ ان لوگوں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں اور جب سب سے آگے حارث نمودار ہوا تو اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسے سکون سے کھڑے دیکھ کر وہ بھی رک گیا تھا پھر اس نے دانت نکوس کر کہا۔ ”تجھے پتا چل گیا نا... ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔“

”ہاں مجھے پتا چل گیا ہے میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ ایمن نے قمرش لہجے میں کہا ویسے بھی اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ”آؤ مجھے لے چلو۔“

”تجھے لینے کے لیے تو آیا ہوں اب تو ہی تو ایک لڑکی بچی ہے۔“ حارث اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایمن چادر کے بغیر تھی اور وہ حریص نظروں سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

ایمن زور سے ہنسی۔ ”تم مجھے لینے کے لیے آئے ہو



شمشال لورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا اٹھارواں حصہ

شاید وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ہوا کیا ہے مگر میں نے جواب دینے کی بجائے جیکٹ پہنی اور انہیں نظر انداز کر کے باہر آگیا۔
آج سردی پورے زور پر تھی۔ تیز بخ بستہ ہوئیں چل

میں نے نرسن کو فون کیا۔ فون بند ہونے کے بعد کچھ دیر تک میں پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ سوچتا رہا پھر سر کو جھٹکا اور مڑا تو دیکھائیں میری جانب سے۔ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔

ری تھیں۔ ہم سے اپنی جیکبسن بھی سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں۔ مارچ میں یہ موسم ایک ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوا تھا۔ پھر بھی وہ سب میرے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ سب خاموشی کی چادر اوڑھے رہے پھر یکایک سر جی کی آواز گونجی۔ انہیں مختلف سمت چلتی تیز ہوا کی وجہ سے آگے بڑھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ کپکپاتے ہوئے ہوا سے مخاطب ہوئے۔ ”آج تو تیرے یہ مزاج ہیں کہ آج چلوں پھر نہ چلوں گی۔“

شہباز اپنے سر پر اپنی ٹوپی کو نیچے کھینچتے ہوئے بولا۔ ”سرجی کے دماغ میں شاید فراسٹ ہائٹ ہو گیا۔“ ہم اس عالم میں اپنی اپنی کھد رہے تھے اور جواب کسی کو نہ دیتے تھے۔

ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ جسم کو چھید رہی تھی۔

سرجی کی بات بجا بھی۔ بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے رہنا دشوار تھا۔ شاید میری طرح ان سب کے دل و دماغ میں ایک ہی دعا گونج رہی ہو کہ بس جلدی آجائے لیکن دور دور تک بس کا پتہ نہ تھا۔ شاید ٹھنڈی وجہ سے انتظار کا وقفہ طویل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم مایوس ہو چلے تھے کہ سڑک پر دور بہت دور ایک دھبسا نظر آیا جو دھیرے دھیرے واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بس تھی جو ہمارے لیے خوشیوں کی نوید بن کر چلی آرہی تھی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ سرجی نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”ایسے آئے خوشی جیسے چلے پردالی۔“ ”اپنا سپاہ بند کرو۔“ شہباز نے جھڑکا۔

سرجی بس کے پائیدان پر رک کر تیز نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ میں پہلے ہی ٹرسن کے الٹی میٹم سے پریشان تھا کہ کہیں یہ دونوں لڑ نہ پڑیں اس لیے انہیں آگے کی طرف دھکیلا۔ وہ ہوں ہوں کرتے ہوئے بس میں داخل ہو گئے۔

بس کے اندر حدت تھی۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مفتی نے کہا۔ ”اب ایک گھنٹے تک ٹھنڈا ستائے گی نہیں۔“ ”کیوں؟ کیا ایک گھنٹے بعد بس کی تمام کھڑکیاں کھول دی جائیں گی؟“ سرجی نے پوچھا۔

”نہیں نہیں بس سے نیچے دھکا دے دیا جائے گا۔“ شہباز نے عادتاً جملہ کر۔

ہم ایک گھنٹے میں اس اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں سے

ہمیں ٹرسن پکڑنی تھی۔ بس کے بعد ٹرسن پر بیٹھے اور مارسم جاپنچے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر کچھ دیر انتظار کیا اور ٹھنڈے رہے۔ سردی کی شدت پر سر جی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ایک لمبی سی گاڑی آرکی۔ ایک باوقار خاتون نے شیشہ کھولا اور جلدی سے ہمیں گاڑی میں بیٹھنے کو کہا پھر شیشہ بند کر دیا۔ ہر ایک ہوا کے پھیڑوں سے بچتا چاہ رہا تھا، اسی لیے ہم دروازہ کھول کر پھرتی سے اندر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک ٹانگ گاڑی میں رکھی ہی تھی کہ باوقار خاتون نے گاڑی چلا دی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ آدھا گاڑی میں اور آدھا باہر تھا مگر دروازے کو پکڑے ہوئے تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سر جی نے چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا اور ان خاتون نے گاڑی روک لی۔

رکنے پر گاڑی چلانے والی خاتون نے بھرپور محذرت کی اور میں شرمندہ شرمندہ سا بیٹھا ”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں“ کی تسبیح کرنے لگا۔ حالانکہ میری ٹانگوں سے ٹیسٹیں اٹھ رہی تھیں مگر وقار بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا، اپنے ساتھ خاتون کا بھی۔

گھر بھی گاڑی کی طرح شاندار تھا۔ ہم لاؤنج سے کچن میں آئے۔ ایک بڑا انڈیس کچن تھا۔ کاؤنٹر پر بونے لگا تھا۔ کاؤنٹر کے آگے بریک فاسٹ ٹیبل رکھی تھی۔ ٹیبل کے پیچھے ایک ٹل امریکن کچن تھا۔ بڑا کوکنگ ایریا ایسے بڑا تھا کہ جیسے کسی استعمال بھی نہیں ہوا ہو۔ اوپر کینٹ کے پاس میک رو دو ہوتا تھا۔ کچن کی ساری مشینیں صاف و شفاف پڑی تھیں جیسے چیخ کر کہہ رہی ہوں کہ ہم کو کوئی کام میں لے آؤ۔

مفتی نظروں ہی نظروں میں ہمیں ہدایات دے رہا تھا کہ کوئی بدتمیزی سرزد نہ ہو۔ یہاں مجھے معلوم ہونا شروع ہوا کہ مفتی ہمارے علاوہ سب سے دب کر رہتا ہے۔ خاتون خانہ نے ہم سے پوچھا کہ کھانا ابھی تناول کرنا ہے یا بعد میں؟

ہم نے سوالیہ نظروں سے مفتی کی جانب دیکھا اور اس نے اسی نظروں سے خاتون خانہ کی جانب دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

بالآخر اس مسئلہ کا حل انہی خاتون نے نکالا کہ پہلے ہم ہاتھ منہ دھوئیں گے اور پھر کچن میں پندرہ منٹ بعد حاضر ہوں گے۔ ہم کو سیرھیاں چڑھا کر مفتی ایک کمرے میں لایا۔ پہلے یہ تاکید کی کہ چڑھتے وقت لکڑی کی سیرھیوں پر آواز بلند نہ ہو۔

شہباز بولا۔ ”کیا ریک کر چڑھیں؟“

مفتی نے کہا۔ ”نہیں انسانوں کی طرح۔“

سرجی ہنسنے کو تھے کہ انہیں زبردستی روک دیا گیا کہ یہاں زور سے ہنستا جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دہانے کو لٹکی۔ اپنے ہی دونوں ہاتھ سے بند کر لیا۔

ایک کمرے میں دو بیڈ تھے۔ میں نے ایک سنبھال لیا اور دوسرا سرجی نے مفتی نے شہباز سے کہا کہ ہم دوسرے کمرے میں سوئیں گے۔ شہباز سرگوشی سے بولا۔ ”میں کمرے میں نہیں سو سکتا۔“

وہ سرگوشی میں اس لیے بول رہا تھا کیونکہ اونچی آواز میں بولنا دربار کے آداب کی مکمل خلاف ورزی تھی۔

ہم نے احترام سے ہاتھ منہ دھوئے جیسے آپ زحرم کا استعمال کر رہے ہوں۔ کپڑے درست کیے اور آہستگی سے چھوڑ آئے۔ سرجی کان میں بولے۔ ”ایسے تو بلیاں بھی نکلتی چلتی ہوں گی۔“

بچن میں پہلے کی طرح سناٹا تھا۔ کھانا کا ڈنٹر پر لگا تھا۔ خاتون خانہ بھی کہیں سے نمودار ہوئیں اور ہم سب با ادب ہو گئے۔ انہوں نے مسکرا کر ہمیں کھانے کا اشارہ کیا اور ہم ایک ردیوٹ کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ مفتی نے ہمیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے کرسی گھنٹنے کی آواز نہیں آنی چاہیے۔ سرجی نے کرسی اٹھا کر پیچھے رکھی اور بمشکل میز اور کرسی کے درمیان سے نکلے۔

خاتون خانہ پھر کہیں چلی گئیں مگر مفتی موجود تھا۔ کھانے میں حلیم، پائے بریانی اور تورمہ تھا۔ شہباز نمیدہ ہوا مگر مفتی کا بروقت اشارہ دیکھ کر سو برہن گیا۔ ایک پیٹ میں پہلے مفتی نے دو کھانے کے پیچ کے برابر چاول ڈالے۔ پھر ساتھ تورمہ کی گارش کی۔ پائے میں پیچ ڈال کر اسے ہلکا سا تھکایا اور چاولوں کے اوپر برکت کے لیے گول گول ٹمھایا۔ حلیم کو پیچ کے کونے پر رکھا اور اپنی پیٹ میں اٹھیل دیا۔ کچھ تورمہ بھی شاید ڈالا تھا جو نہ ہمیں دکھتا تھا اور نہ پیٹ کو محسوس ہوا ہوگا۔ ہم تینوں مفتی کو رزق حلال کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر مفتی نے نان کی بجائے چھری کا ٹائٹاٹھا لیا اور ساتھ دو چار ٹیکن بھی لے لیے۔

پھر ہماری باری آئی تو مفتی کرسی پر بیٹھا نہیں بلکہ ہمارے سر پر کھڑا ہو گیا۔ شہباز آگے تھا اور میں نے یہ منہاٹ اس کی جانب سے آتی ہوئی محسوس کی۔ ”یار کیا سا پا ہے۔“

سرجی کی کہنی مارنے پر وہ مودب ہوا۔ مفتی نے اپنے سے زیادہ شاید کسی کو نہ کھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ شہباز ذرا گستاخ ہوا اور ایک پایا بھی اپنی پیٹ میں ڈال لیا۔ سرجی یہ کہتے سنے گئے۔ ”تم تو سدا کے بھوکے ہو۔ آج کم کھا لو گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔“

شہباز نے آنکھ بجا کر کچھ حلیم بھی اپنی پیٹ میں ڈال لی۔ وہ فارغ ہوا تو سرجی کی باری آئی۔

مفتی نے سرگوشی میں سرجی سے کہا۔ ”آپ میری والی پیٹ لے لیں۔ میں دوسری خود بیٹا لوں گا۔“

سرجی نے اس کی پیٹ میں جھانکا تو کچھ نہ پایا۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ ”میں اتنا زیادہ کسے ہضم کر پاؤں گا؟“ پھر اپنی پیٹ میں تھوڑا بہت ڈالا اور شکر اللہ کہتے ہوئے اپنی کرسی پر احتیاط سے بیٹھ گئے۔ اب میری باری تھی۔ شہباز میری جانب دیکھ رہا تھا۔ مفتی نے بھی اپنی نظروں میں مجھے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک بڑا پیالہ اٹھایا۔ اس میں آدھے پائے پلٹے۔ دو نان اٹھائے۔ ایک خالی پیٹ بڑیوں کے لیے لی۔ سپرائٹ کی پوری بوتل میز پر رکھی اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ایک پیچ ساتھ لانا نہ بھولا۔ سب حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے اور کوئی کہیں بھی متوجہ نہ تھا۔ مفتی نے آنکھیں نکال کر مجھے اشارہ کیا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

میں نے جواب میں کہا۔ ”آپ کو حلیم چاہیے؟“ وہ خاموش رہا۔ میں نے پیٹ بھر پائے کھائے۔ ہائی کا شور با پیچ سے چڑھا گیا۔ مفتی کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ میں نے سپرائٹ پینے کے بعد مفتی کی جانب دیکھا۔ وہ بت بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔ سرجی اور شہباز نے میری واردات دیکھ کر کچھ جبارت کی اور اپنے لیے کچھ اور کھانے کو لے آئے۔ میں نے مفتی کو دیکھ کر کہا۔ ”اگر تم اس طرح مجھے گھورتے رہے تو میں شہباز سے کہوں گا کہ کھانے کے بعد ڈکار بھی مارے۔“ مفتی ڈھیلا پڑ گیا اور نظروں نظروں میں التجا کرنے لگا۔

میں نے مفتی سے راز دارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”باجی واقعی اتنی سخت ہیں یا آپ بہت زیادہ ڈھیلے ہیں؟“ میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا اور سرگوشیوں میں بولا۔ ”یہ لوگ پچھلے پچیس سال سے یہاں پر ہیں اور ان کا طرز زندگی مکمل تبدیل ہو چکا ہے۔“ اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہمیں بہت زیادہ سلجھے ہوئے انداز سے یہاں ایک رات بسر کرنی ہوگی۔

مجھے معلوم نہیں کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ مفتی اپنی

بہن کو بہت زیادہ سیریس لے رہا ہے۔ وہ ایک سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ہمارا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ مفتی نے اس گھر کو شیشے کا مکان ہمارے لیے بنایا ہوا تھا کہ ذرا سی آہٹ اسے زمین بوس کر دے گی اور سب کے علاوہ مفتی اس کی کرجیوں سے زخمی ہو جائے گا۔

سرجی اپنی پلیٹ پر نظریں رکھے اسے گھورے جا رہے تھے۔ شہباز بھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ ہم خاموش بیٹھے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔

پھر اس خاموشی میں ایک طوفان اٹھا۔ سرجی کی ایک فلک شکاف چیخ بلند ہوئی۔ میں بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا ہوا تھا کہ ایک سوئی تازی ملی نے کہیں سے سرجی پر لینڈنگ کی تھی۔ اس آفت پر سارا جھوٹ گیا۔ سرجی کی چیخ نے ملی کو ہلا دیا تھا اور ملی سے زیادہ ہم کاتب رہے تھے۔ مفتی کی ہمشیرہ بھاگی بھاگی آئیں اور ٹھنڈی ملی کو گود میں اٹھا کر چومنا شروع کر دی۔ ملی کا دھڑپر کہیں دیکھی نہیں تھی۔ مفتی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ملی کو کوسے یا سرجی کو۔ ملی خاتون خاندن کی بیٹیوں میں لڑکی کن انھیں سے سرجی کو دیکھتی اور داد دلا کرتی تھی۔ خاتون خاندان سے دل سے دیتی نظر آ رہی تھیں۔ شکر ہے کہ میں پایوں کا پیالہ پہلے ہی چڑھا چکا تھا ورنہ اس سانچے کے بعد کچھ بھی کھانا میرے لیے دشوار ہو جاتا۔

میں جس شہر یا محل میں ملا بڑھا تھا وہاں بلیوں کو دیکھ کر جوتا اٹھالیا جاتا تھا نہ کہ ان کو گود میں ڈال کر چوما جاتا۔ وہ بھی ایسی بد تیز ملی کو جو سیدھا آپ کی پلیٹ میں چب لگاتی۔ مفتی کی بہن اس بات پر زیادہ پریشان تھی کہ ملی خوف سے دل گئی ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے کہ میرے بچوں کو شوق چرایا کہ وہ کوئی ملی گھر پر لائیں گے۔ میں سالوں سے ان کی یہ فرمائش رد کرتا آیا تھا مگر بچوں کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ ٹورنٹو اور ڈیلاس میں میری جاننے والی فلیسیر رہتی ہیں۔ ایک بار ٹورنٹو گیا تو دیکھا کہ انہوں نے گھر میں ملی پال رکھی تھی۔ ان کے گھر کا ہر فرد مجھ سے زیادہ ملی سے باتیں کر رہا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ ہماری ساری ڈپریشن اس ملی کے آنے سے دور ہو گئی ہے۔ ڈیلاس میں بھی دوست کی بیوی اپنی ملی کو گود میں لیے یہی بات کرتی نظر آئی۔

میرے بچوں نے ملی لانے کا تقاضا کیا تو مجھے ہامی بھرنی پڑی۔ ہمارے ہاں لوگوں کے جیم خانے ہوتے ہیں تو یہاں امریکا میں کتوں اور بلیوں کے ہوتے ہیں۔ بچوں نے

ایک ایسے ادارے سے رابطہ کیا۔ وہاں کی مگر ان خاتون نے پہلے ایک فارم ای میل کیا جس میں مختلف سوالات پوچھے گئے تھے۔ جب ان سوالوں کا اسے تسلی بخش جواب ملا تو میرے بچوں کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ ان سوالوں میں چند سوال ذیل ہیں۔

آپ کے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں؟ گھر کے کمرے کتنے ہیں؟ کسی کو جانوروں سے الرجی ہے؟ کیا آپ کی سالانہ آمدن اتنی ہے کہ کوئی ملی پال سکیں؟ اگر کبھی ملی اداس یا پریشان ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟ ملی کا آپ کس طرح سے خیال رکھیں گے؟ ہفتی بار آپ ملی کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جائیں گے؟ بلیوں کے لیے مقوی غذائیں کیا کیا ہوتی ہیں؟ کیا آپ کا گھر ملی کے لیے اتنا محفوظ ہے کہ وہ آرام سے آزادانہ چوم پھر سکے؟ آخری سوال بہت بھینکا ہوا تھا کہ اگر آپ کی وفات ہو جائے تو کون ملی کا خیال رکھے گا؟

اس سوالات کے بعد ہی سی ہدایات بھی تھیں کہ ملی کا نام یہ ہے اور اگر آپ اس کا نام تبدیل کرنا چاہیں تو پہلے ہم سے اجازت لیں گے۔ کہیں آپ کھونے جائیں تو ملی کے لیے بے بی سیٹنگ کا انتظام کریں گے۔

جب اس مرحلے کو پار کیا تو تین دنوں تک ملی کے آنے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ آن لائن اس کا ایک گھر، کھلونے، کھانے کے برتن، ادون کے گولے اور معلوم نہیں کیا کچھ منگوایا گیا۔ بیٹا مجھے یہ دکھلا رہا تھا اور میں کھڑا اپنا سر کھج رہا تھا۔

سرجی کی کوئی دادرسی نہ کرتا تھا مگر ملی کی فکر سب کو پڑ گئی تھی۔ میں سرجی کو سہارا دے کر کمرے میں لایا۔ ان کو لٹایا، کبل ڈالا تو کچپی ختم ہوئی اور پھر وہ سو گئے۔ میں بھی تھکا ہوا تھا اور جلدی سو گیا۔

رات نیند میں بے آرام رہا۔ وجہ وہ سیٹیاں تھیں جو سر جی کے منہ سے نچ رہی تھیں۔ مجھے صبح معلوم ہوا کہ سرجی کو جب بخار چڑھتا ہے تو وہ سیٹیاں بجاتے ہیں۔ صبح اٹھے تو انہیں بخار چڑھا تھا۔ ان کا ماتھاپ رہا تھا۔ مفتی کو اطلاع دی گئی۔ وہ کچھ بخار اتارنے کی پلو لے آیا۔ سرجی سے بخار کی وجہ پوچھی تو انہوں نے میرے کان میں ہلے کو قصور وار ٹھہرایا۔ کہہ رہے تھے کہ مجھے رات بھر یہ خواب آتے رہے کہ میں اور بلا ٹم گھٹا ہیں اور بلا حاوی ہو رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ”خاتون خاندان فرما رہی تھیں کہ بے کبھی

ڈارفر کا بحران (Darfur Crisis)

سوڈان کا مغربی شورش زدہ علاقہ، فردری 2003ء میں اس علاقے میں وہ سیاہ فام افریقی بائیسوں کے بائین ڈارفر میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اس قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے باہمی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دونوں گروپ مسلح تصادم پر اتر آئے۔ طالع آزما عناصر نے سوڈانی حکومت کے مخالف عناصر نے اسے عرب قبائل اور سیاہ فام افریقی قبائل کے بائین محاذ آرائی کی کسی کیفیت پیدا کر دی اور 1989ء میں جنجاوید (Janja Weed) تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں قبیلوں کی باہمی لڑائی کے نتیجے میں ایک لاکھ افراد سے زائد ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب کہ دو لاکھ ہمسایہ ملک چڈ کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ فریقین کے مابین اپریل 2004ء میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی طے پایا تھا، لیکن فریقین نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مصالحت کنندگان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ فرانس کے سائر کے برابر علاقے میں خود دونوں کی اشیاء فراہم نہ کر سکیں۔ علاقے میں خوراک کی عدم دستیابی کے باعث وہاں کے لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ 30 جولائی 2004ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی، جس میں سوڈان کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 دنوں کے اندر ڈارفر کے بحران کو حل کرے ورنہ اقتصادی پابندیوں کے لیے تیار ہو جائے۔ سوڈانی وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی دی گئی مدت کو ناقابل قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوڈان کو اس سلسلے میں 120 دن درکار ہیں، کیونکہ ڈارفر کا بحران بڑا پیچیدہ ہے، تاہم اگست 2004ء میں سوڈانی حکومت اور اقوام متحدہ کے مابین ڈارفر کے بحران کے حل کے لیے لائحہ عمل کے معاہدے پر خطوط میں دستخط کر دیے۔ جس کی رو سے سوڈانی حکومت تیس دن کے اندر مہاجر کیمپوں کے علاقوں کو محفوظ بنائے گی، تاکہ شہریوں کو خوراک اور پانی کے حصول کی سہولت حاصل ہو سکے اور وہ کسی حملے کے ڈر کے بغیر یقینی بازاری کر سکیں، نیز سوڈانی پولیس ڈارفر میں چوکیاں اور محاصرے بھی قائم کرے گی اور عرب ملیشیا کے حملے روکنے کے لیے پولیس اور فوج مل کر کام کر سکیں گے۔

مرسلہ: مہینہ صدیقی، شور کوٹ

رات بھر بخار رہا اور اسے بھی آپ ہی کی طرح کے خواب آتے رہے۔ میں نے تو مذاق کیا تھا مگر وہ اسے سنجیدہ لے گئے۔ کہنے لگے۔ وہ خونخوار بلا جھوٹ بول رہا ہے۔“

سرمی کو کچھ افادہ ہوا۔ ہم نے انہیں یہ پیشکش کی کہ وہ گھر پر ٹھہر جائیں۔ نماز پڑھ کر ہم واپس آجائیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ سولی چڑھ جاؤں گا مگر اس گھر میں نہیں رکوں گا۔ ہم نے شلوار قمیض پہنی جو پاکستان سے ساتھ لائے تھے۔ مفتی سے اس کے پرفیوم کے چند جھینٹے ہر ایک نے مستعار لیے۔ اپنی طرف سے بن ٹھن کر نیچے چمن میں ناشتا کرنے آ بیٹھے۔

ناشتا اس طرح کیا کہ گھروالوں نے بلے کو سرمی سے چھپایا ہوا تھا اور ہم سرمی پر پھر دے رہے تھے۔ خوف کے سائے میں کچھ ناشتا کیا اور چائے پینے کے بعد ہم اس خوفناک گھر سے باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گھروالے بھی ہم سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

ہم مفتی کے بہنوئی کی ایک اور بڑی گاڑی میں بیٹھ کر عید کی نماز پڑھنے پکریگ (Pickering) گئے۔ مفتی کا بہنوئی بہت ہنس مکھ انسان تھا مگر صرف ہمارے لیے۔ کیونکہ اس کا نشانہ مفتی ہی رہتا تھا، اسی لیے وہ منہ بنائے بٹھارہا اور اس کے بہنوئی قہقہے برساتے رہے۔ اب مجھے مفتی کے دب کر رہنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ ان کے بہنوئی تھے جو مفتی کو روندتے رہتے تھے۔

ہم پکریگ کی عید گاہ پہنچے۔ وہ ایک بڑی عمارت تھی بلکہ ایک فلی مارکیٹ تھی جہاں دیک اینڈ پر بازار لگتا تھا۔ مسلمانوں نے عید کے رش کی وجہ سے اسے گرائے پر ایک دن کے لیے لے لیا تھا۔ ہزاروں نمازیوں کی گنجائش تھی اور پارکنگ میں جیسے گاڑیوں کا جمعہ بازار لگا تھا۔ ایک وسیع پارکنگ میں دور دور تک ہزاروں گاڑیاں نمازیوں نے پارک کر رکھی تھیں۔

اس دن بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ٹورنٹو کو ایک بار پھر سردی اپنے لیپٹے میں لے چکی تھی۔ ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سرمی سے سوال کیا۔ ”ابھی تک بلے کے خوف سے کانپ رہے ہیں؟“

انہوں نے بہت برا مانایا۔ کہنے لگے۔ ”بلانا ہوا، کوئی لاہوری شیر ہو گیا۔“

ان کی بات سیاسی محسوس ہونے لگی تو ہم نے چپ سا دھلی۔ گاڑی کہیں پارک کر کے مفتی کے بہنوئی واپس آئے تو مفتی ہمارے پیچھے ان کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو در در تک صفیں بھی تھیں۔ ہزاروں لوگ بیٹھے مولانا صاحب کے خلبے کون رہے تھے۔ ایک طرف عورتیں اور بچے بیٹھے نظر آرہے تھے اور وہاں سے ایک متواتر شور اٹھ رہا تھا۔ سامنے دیوار پر خانہ کعبہ اور روضہ رسول کی بڑی بڑی تصاویر لگا کر اس ہال کو اسلامی رنگ دیا گیا تھا۔

ایک سائیڈ پر کھانے پینے کے اسٹال لگے تھے۔ سموے، پاپ کارن، چکن رول کے اسٹالوں پر رش تھا۔ سر جوجلیبیاں نظر آئیں تو چمچنے لگے۔ شہباز بمشکل انہیں بازو سے پکڑ کر صفوں کی جانب متنبہ کیا۔

نمازی رواجی شلوار قمیص میں لمبوس تھے۔ نئے کپڑوں نے عید کا حقیقی سماں باندھ دیا تھا۔ عورتوں اور بچوں نے اپنی پھر پور تیاری کی تھی۔ مہندی لگائے پچیاں خوش و خرم دکھ رہی تھیں۔ اونچی پہلوں والی جوتیاں پہنے بمشکل چلتی اندر آ رہی تھیں۔ انہیں بہت دن بعد پاکستانی انداز میں بننے سنورنے کا موقع ملا تھا اس لیے انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ہم چاروں بھی شلوار قمیص میں ان جیسے لگ رہے تھے۔ سامنے سے دو پٹھان سروں پر مگڑی باندھے چلے آ رہے تھے۔ ہر مرد نے کشیدہ کاری والے شوخ رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پورا ہال خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ کوئی جناح کیپ سر پر رکھے چلا آ رہا ہے۔ کچھ نے شیروانی زیب تن کی ہوئی تھی۔ کوئی بچوں کو تھارہا تھا کہ یہ مسلمانوں کی عید نماز ہے۔ وہ بچوں کو عید کے تہوار پر آگاہی دے رہے تھے۔

یہ میری پاکستان سے باہر پہلی عید کی نماز تھی۔ سرجی شہباز کو بکسیریں پڑھانے کی کوشش کرنے لگے اور مفتی کے بہنوئی نے مفتی پر ایک اور نشتر چلایا اور قہقہہ لگا کر بولے۔ ”مفتی کو بکسیروں کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنا بھی سکھا دیں۔“ یہ کہہ کر پھر سے ہنسنے لگے۔ ہم ان قہقہوں پر منوذب رہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا کیونکہ ایک دو بار میں مفتی کو کچھ دیر دیکھ چکا تھا۔

ہمیں مناسب جگہ ملی اور ہم پھیل کر بیٹھ گئے۔ ہر ایک

ارد گرد زیادہ دیکھتا تھا اور امام صاحب کیا فرما رہے ہیں اس جانب کسی کی توجہ نہ تھی۔ یہاں ہر فرقے کا بندہ ایک ساتھ نماز پڑھتا ہے۔

ہم نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو سب برابر ہو گئے۔ نماز پڑھی گئی پھر سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ مجھے بہت سے لوگ گلے ملے اور بہت سوں کو میں جاملہ۔ کوئی کسی کو نہ جانتا تھا پھر بھی سب ایک دوسرے کو عید کی مبارک دے رہے تھے۔ سب کی خوشیاں سانجھی ہو گئی تھیں۔ دو افراد ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ان میں سے ایک مفتی اور دوسرا ان کا بہنوئی تھا۔

لاڈ ڈاؤن ہیکر سے یہ اعلان ہونے لگا کہ دوسری نماز آدھ گھنٹے بعد ہوگی جو لوگ پہلی نماز سے رہ گئے ہیں۔ وہ دوسری میں نماز میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اب تو کئی مقامات پر تین تین عید کی نمازیں ہوتی ہیں۔ دیے جھک دو نمازیں تو ہر مسجد میں ہوتی ہیں۔ اعلان کو نظر انداز کر کے ہم سب باہر آ گئے۔ باہر آتے ہی سرد ہوائے دل کھول کر استقبال کیا۔ ٹورنٹو کی نجد فضا کی نجد عید نے میرے دل و دماغ کو سرور کر دیا تھا۔

وطن سے دور، بچوں سے دور، رشتے داروں سے دور، ایک ایسی عید جو کچھ کے لگا رہی تھی۔ دل کو چمید رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی بقر عید یاد آ رہی تھی۔ ڈیرہ میں جب بڑی عید آتی تھی تو ہم بچوں کو دکنی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عید گاہ سے، بڑوں کی نظر میں بجا کر میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہو لیتا۔ ہم سب ٹولیوں کی شکل میں آس پاس کے کلی محلوں میں خوب گھومتے۔ کہیں گائے ذبح ہو رہی ہوتی تو کہیں دنبہ اور کہیں بکرے یا اونٹ، ہر جگہ ہم سب تالیاں بجا بجا کر چیتے، شور کرتے، قسائیوں کی پھرتی پر اسے داد دیتے اور پھر کسی دوسری گلی کی جانب دوڑ لگا دیتے۔ پھر جب گھر کے کسی بندے کی نظر پڑ جاتی تو ڈانٹ ڈپٹ کے بعد گھر کی راہ دکھا دی جاتی۔ گھر پہنچنے تو کر ما گرم بجنی ہوئی گلی سامنے رکھ دی جاتی۔ اس گلی کا ذائقہ اس وقت بھڑکتے ہوئے موسم میں زبان پر محسوس ہو رہا تھا، منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

دل در در ہا تھا اور میں مسکراتے ہوئے دکھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ٹورنٹو پہنچ کر محسوس ہوا تھا کہ میں بہت بڑا وطن پرست ہوں۔ اپنے ملک اور اپنے شہر سے میری

کے بہنوئی نے کہا۔ ”یہاں بچوں کے لیے حکومت جو ڈالر دیتی ہے وہ سب حرام ہے۔“

”اچھا مگر کیوں؟“ سرجی نے پوچھا۔

”وجہ یہ ہے کہ والدین یہ رقم بچوں پر خرچ نہیں کرتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا کرتے ہیں؟“

”مجھے کیا معلوم لیکن بچوں پر خرچ نہیں کرتے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

میں حیران بیٹھا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو کچھ کھلاتے پلاتے نہیں ہیں۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ بولے۔ ”وہ اپنے پیسوں سے بچوں کو کھلاتے پلاتے ہیں مگر بچوں کے پیسے ان پر خرچ نہیں کرتے۔“

میں نے بردباری سے اپنا سر ہلایا کہ میں ان کی دانائی کا محترف ہوں۔ میری جانب سے داد و تحسین ملنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔ ”اگر آپ کو پیسے ملیں تو بچوں کے نام پر اکاؤنٹ کھولا لیتا اور پیسے اس میں رکھتے جانا جب بچے بڑے ہوں تو ان کی اسٹڈی کے لیے یہ رقم کام آئے گی۔“

ان کی نصیحت کو میں نے سیریس لے لیا تھا۔ جب میرے بچے آئے تو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اب وہ بڑے ہو رہے ہیں تو ان کے اکاؤنٹس میں ان کی پڑھائی کے لیے ایک معقول رقم جمع ہے۔

مفتی کے بہنوئی کی نظروں میں سب سے معتبر میں تھا اس لیے وہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب چلنا چاہیے۔“

ہم واپسی کے لیے کھڑے ہوئے تو سرجی سرگوشی میں بولے۔ ”میں نے اس خبیث بے والے گھر میں اب نہیں جانا، اس موئے ذرا نیور سے کہہ دو کہ ہمیں کسی بس اسٹاپ پر اتار دے۔“

ہم گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے سرجی نے کھسر پھسر لگا رکھی تھی۔ مفتی کے بہنوئی نے بیک ویو مرر سے دیکھا اور پوچھا۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”سرجی کو اپارٹمنٹ جانا ہے۔“

”مگر ابھی تو گھر جا کر تکہ بونی کھائی ہے۔“

میں نے اپنی جانب سے بات گڑھی۔ ”سرجی کہہ رہے ہیں کہ تکہ بونی کھائی ہے یا بے سے میری تکہ بونی کروانی ہے؟“

بہنوئی صاحب نے زوردار قہقہوں کے چم میں کہا۔

لگاؤ میرے لیے بھی حیران کن تھی۔ اپنی اس عادت کا مجھے اندازہ اپنے شہر اور ملک میں رہ کر کبھی نہ ہوا تھا۔ لوگ مجھے خوش قسمت سمجھتے تھے کہ میں کینیڈا میں ہوں اور میرے لیے وہ سب معرفت کے مقام پر تھے کہ وہ اپنے وطن کی مٹی پر قدم رکھتے ہیں۔

مفتی کے بہنوئی ہمیں لے کر کار کی جانب آئے، مفتی ان سے چپ چاپ کر ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ شہباز نے پوچھا۔ ”آہستہ کیوں چل رہے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”سردی بہت ہے۔“

اس جواب سے اس کے بہنوئی کو قلعہ مل گیا اور وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ ”یار مفتی! تمہارے دماغ کا انجن سردی میں شاید جام ہو جاتا ہے، اسی لیے اگلے سیدھے جواب دے رہے ہو۔“

سرجی خوشخوار بلے کی دشت سے باہر نکل آئے تھے چہرے کی شادابی لوٹ آئی تھی۔ وہ چپک کر بولے۔ ”اس لیے تو کہتا ہوں کہ میری طرح گرم ٹوپی پہن لیا کرو۔ اس سے دماغ کی قلفی نہیں بنتی۔“

مفتی نے انہیں گھور کر دیکھا تو سرجی نے چہرہ کھالیا اور تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔

گاڑی میں بیٹھے اور ہیڈ آؤٹ ہوا تو کچھ ہی دیر میں گاڑی دھکنے لگی۔ سرجی کو کمری لگی تو ٹوٹی اتار لی۔ شہباز موقع کی تلاش میں تھا فوراً بولا۔ ”لگتا ہے کہ سرجی کی قلفی پکھل رہی ہے۔“

مفتی اور سرجی کے علاوہ سب نے قہقہہ لگایا۔ سرجی قدرے ناراض ہو کر گاڑی کے شیشے سے سر کا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

آج واقعی ٹورنٹو کو سرد ہواؤں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ بچ بست جھکڑ چل رہے تھے۔ سردی رخصت ہو کر نہ جانے کیوں پلٹ آئی تھی۔ اور چلتی بھی تو اس اداسے کہ جسم کا خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مارچ کے مہینے میں یہ موسم محسوس لگ رہا تھا۔ مفتی کے بہنوئی نے گاڑی ایک کافی شاپ پر روک دی۔ گاڑی رکتے ہی سب کے سب نہایت تیزی سے اترے اور تقریباً دوڑتے ہوئے کیفے میں داخل ہو گئے۔ کافی شاپ ہیٹر کی وجہ سے نعمت محسوس ہوا۔ ہم سب ایک خالی ٹیبل کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پیپر گلاس میں گرم گرم کافی بہت مزہ دے رہی تھی۔ معدے میں کافی اتری تو سب کے چہرے پر برائشٹ نظر آنے لگی۔ سبھی مفتی

”جناب، وہ تو ایک سیدھا سادہ بلا ہے۔ اس سے ڈرنا کیا؟“

سرجی زور زور سے ”ہمیں کھانے لگے کہ یہ بات انہوں نے نہیں کی۔ لیکن جملہ میں نے کہا تھا اس لیے سرجی کی بات پر اسی نے یقین نہ کیا۔“

اولی صاحب نے قہقہہ لگایا ان کے قہقہے تھے تو ماہول میں اسی قدر سکون اتر اور وہ سنجیدہ نظر آنے لگے۔ ہم نے بھی کلمہ کا سانس لیا مگر اچانک وہی قہقہہ دوبارہ اہل ہاں سے۔ سرجی اللہ خیر اللہ خیر کرتے رہ گئے اور شہباز زور پھرے کے ساتھ بولا۔ ”یہ سیپا ندیم بھائی کا پھیلا ہوا ہے۔“

گاڑی میں جملوں کی بارش تب بند ہوئی جب ہم ان کے گھر کی ڈرائیو سے اترے۔

سرجی باہر کھڑے کپکپا رہے تھے۔ یہ بات سمجھ نہ آئی کہ سردی سے کپکپا رہے ہیں یا بے کے خوف سے۔ ان کا گھر جتنا باہر سے خوب صورت تھا اتنا ہی اندر سے بھی تھا۔ دو منزلہ گھر جس کو باہر سے سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیاں باہر بڑک پر کھلتی تھیں۔ سب گھر ایک جیسے تھے۔ باہر مکمل خاموشی مگر سوائے مفتی اور سرجی کی بھرمار کے۔ مفتی سرجی کو اس طرح مہیچ کر اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا جس طرح بقر عید کو قسانی بکرے کو لے جاتا ہے۔ شہباز نے کہا کہ اس کی ٹائلیں باندھ دو۔

بہنوٹی صاحب بڑی تیز سے ہماری جانب آئے۔ سر جی سے بولے۔ ”ہمیں آپ سے زیادہ بے کی فکر ہے کیونکہ وہ رات سے سخت سہا ہوا ہے اور ہم نے اسے محفوظ مقام پر چھپا دیا ہے۔“

سرجی بے یقینی سے دیکھنے لگے کہ اتنے میں بہنوٹی صاحب نے انہیں ایک ہلکا سا دھکا دیا اور دوسرے ہی لمحے سرجی گھر کے اندر تھے۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے بوٹی کا انتظار کرنے لگے کیونکہ قسانی کے پاس سے گوشت ابھی آیا نہیں تھا۔

یہاں قربانی کرنے کا طریقہ بھی نرالا ہے، پاکستان کی طرح نہیں کہ عید سے چند دن قبل بکرے لے کر آجائیں۔ پھر عید کے دن قسانیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ گھر والے مسالے تیار کر کے کھوٹی سے بندھے بکرے کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبانیں پھیرتے رہیں۔ یورپ اور ناتھ امریکا میں یہ تجربہ ہوا کہ یہاں آپ قربانی کا

جانور لے بھی نہیں سکتے۔ آپ فون کر کے قسانی کے پاس جانور کی بکنگ کروا لیتے ہیں وہ آپ سے نام پتہ لے لیتا ہے۔ دوسو ڈالر کے قریب قربانی کے جانور کا نرخ ہوتا ہے۔ اس میں ذبح کرنے سے بونیاں بنانے تک کا معاوضہ شامل ہوتا ہے۔ یہ معاوضہ پچھلے پندرہ سال سے میرے سامنے نہ کم ہوا اور نہ زیادہ۔ فون کے ذریعے ہی آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ گوشت تیار ہے۔ آپ گاڑی لے کر جاتے ہیں اور تین چار بڑے بھاری لفافے اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔ اس میں نہ سرے پائے ہوتے ہیں اور نہ کھال کا دھندا ہوتا ہے۔ عموماً لوگ تین حصے کرتے ہیں۔ پہلا حصہ خود کھاتے ہیں اور باقی دو حصے بھی خود کھاتے ہیں کیونکہ گوشت کو کہاں کھائیں؟

میں اپنے جانور کی قربانی پاکستان میں کرتا ہوں۔ یہاں بھی قربانی کرتا ہوں اور گوشت غریب کالوں میں بانٹ دیتا ہوں اور کچھ مسجد میں رکھوا دیتا ہوں۔ یہاں غریب یا متوسط لوگ بکرے کا گوشت سال میں ایک بار بھی نہیں کھا پاتے۔ بکرے کا گوشت آٹھ ڈالر کا ایک پاؤنڈ ملتا ہے اور پچکن 70 سینٹ کی ایک پاؤنڈ ملتی ہے۔ ہر جگہ قربانی کا اپنا انداز ہے۔

بہنوٹی صاحب قسانی کو کئی بار فون کر چکے تھے مگر گوشت ابھی تیار نہیں ہوا تھا۔ آخر ہمارے اور بہنوٹی صاحب کے بیچ یہ معاہدہ طے پایا کہ ہم تینوں واپس ہو جائیں۔ شام کو جب مفتی اپارٹمنٹ آئے گا تو ہمارا حصہ لیتا آئے گا۔

ہمیں بہنوٹی صاحب نے اپنی کار میں بس اسٹاپ پر اتارا۔ سرجی کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اپنے بے کو یاد کرتے ہوئے چلے گئے اور میں ان دونوں کو پاکستانی بازار جبرالڈ اسٹریٹ لے آیا۔

پچھلی قسطوں میں بیان کر چکا ہوں کہ جبرالڈ اسٹریٹ دیسیوں کا بازار ہے۔ پاکستانی اور انڈین نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ یہ دکانیں دونوں سائیڈ پر ایک لمبی قطار میں بنی ہوئی ہیں مسلمانوں کی عید ہو یا ہندوؤں کی دیوالی، یہ بازار کلچرز ثقافت کا ایک اہم مرکز بن جاتا ہے۔ اب تو ٹورنٹو کے ہر حصے میں بڑے بڑے ہال لے کر عید بازار، رمضان بازار کھولے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے کھانے، کپڑے، مصنوعی جیولری، مہندی اور جوڑیاں بیچی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی کھانوں کے اسٹال لگے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ہر علاقے کا بہترین کھانا یہاں دھڑا دھڑ بک رہا ہوتا ہے۔ ان اسٹالوں

مطبورش ہوتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو عید میلہ دکھانے یہاں لاتے ہیں تاکہ وہ بچے روایات کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھاسکیں۔

جبرالڈ بازار میں ہم اترے تو وہ تیز جھکڑوں کی زد پر تھا۔ عید کا دن تھا اور میلہ کل رات ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب یہاں تیز برفانی ہوائیں بلا روک ٹوک چل رہی تھیں۔ ہمارے علاوہ شاید ہی کوئی اور ان فٹ پاتھوں پر نظر آیا ہو۔ ہم سراسیمہ ہو کر ارد گرد دیکھنے لگے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے سرجی کے محاورے بھی قافی بن گئے تھے۔ وہ بس میں پورا راستہ خاموش رہے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہاں جبرالڈ بازار میں انہیں جلیبیاں بھی یاد نہ رہی تھیں۔ میرے جبرالڈ اسٹریٹ آنے کا مقصد یہ تھا کہ فون کرنے کے لیے کالنگ کارڈ لے لوں۔ ویسے تو کالنگ کارڈ ہمارے علاقے میں بھی ملتے تھے مگر یہاں اسی ڈالر میں دس کارڈ مل جاتے تھے۔ ہمارے علاقے میں دس ڈالر کا ایک کارڈ ملتا تھا۔ میں ڈالر ہمارے لیے بہت بڑی رقم تھی اور اسی رقم کو بچانے کے لیے ہم نے اتنا لمبا راستہ طے کیا تھا۔

میں نے دس کارڈ خریدے تو سرجی نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے دو کارڈ لے لیے۔ شہباز نے اپنی شاپنگ خود کی۔

ہم ایک گروسری کی دکان میں داخل ہوئے اور کالنگ کارڈ کی فرمائش کی۔ دکاندار انہیں تھا۔ اس نے کارڈ کا بنڈل بڑھا دیا۔ سرجی کی نظر کوٹنے میں رکھے ایک تو بے پڑی تو وہ کہتے گئے۔ ”بہت دن ہو گئے میں نے پراٹھا نہیں کھایا۔“

میں متعجب تھا کہ کالنگ کارڈ بے پراٹھے کی جانب ان کی سوچ کا زاویہ کیسے تبدیل ہو گیا۔ بھی شہباز نے ٹوکا۔ ”سرجی سارا سیپا آپ پر ختم ہے۔ یہ بیچ میں پراٹھا کہاں سے آ گیا۔“

انہوں نے تو بے کی جانب اشارہ کیا تو ہمارے دل ہی پھل گئے۔ ہمیں مفتی کا خوف تھا کہ وہ تو بے جیسی چیزوں کو قیونوسی سمجھتا ہے مگر کہاں اتھ سے بنی گرم گرم روٹیاں اور کہاں فرنچ میں پڑے بے ذائقہ کپے پکائے نان۔ میں لے اٹھام کی پروا کیے بغیر وہ تو اٹھا لیا۔ سرجی بولے۔ ”اس لے ماتھ بیٹا ہو تو روٹی پکائے کا مزہ آ جائے۔“

دکاندار نے ایک الماری سے نکال کر بیٹا ہمارے لے کر دیا۔ ہمیں شاپ میں کھڑے کھڑے گرم گرم

روٹیوں کی بھیجی بھیجی خوشبو آئے گی۔ کہیں یہ خوشبو جمن نہ جائے اس خیال سے ہم باہر آ گئے۔ تیز ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے بس اسٹاپ تک پہنچے۔ ہم نے سردی کی وجہ سے دونوں ہاتھوں کو پینٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

ابھی ہم بس اسٹاپ پر آئے ہی تھے کہ بس بھی آگئی اور جلد بازی میں ہم سب بس میں سوار ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کا سفر طے کر کے ریلوے اسٹیشن پر اترے اور وہاں سے ٹرین میں سوار ہو گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم اپارٹمنٹ پہنچے۔ مفتی قربانی کا گوشت رکھے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم حیران تھے کہ وہ اتنی جلدی کیسے پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ بہنوئی صاحب اسے ڈراپ کر گئے ہیں۔ پھر اس نے ہم سے طرح طرح کے سوالات پوچھنا شروع کر دیئے کہ کہاں تھے، کہاں گئے اور کیا کرنے گئے تھے؟

ان سب سوالات کا سرجی نے کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ جیکٹ کے اندر سے تو انکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ پہلے تو وہ حیران ہو کر توے کو دیکھتا رہا اور پھر وہ سیدھا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ کس لیے اٹھا لائے؟“ میں نے کہا۔ ”چند ماہ بعد ٹیلی آری ہے تو سوچا کہ لگے ہاتھوں تو ابھی خرید لوں۔“

اس نے منہ بنا کر کہا کہ آٹے سے کچن خراب ہو جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پکے پکائے نان خریدے جائیں۔“ سرجی بولے۔ ”میں بھی تو یہی سمجھتا رہا مگر انہوں نے کہا کہ میں زندگی کے معاملات میں کسی کی غیر ضروری مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“

یہ سن کر مفتی خاموش ہو رہا۔ مفتی کے سامنے سے سرجی نے وہ تو اٹھا لیا اور اسے کچن میں جا کر رکھ دیا۔ پر سرجی کچن سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شہباز نے منت سماجت کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ندیم بھائی کی فلیٹی تو تین چار ماہ بعد آئے گی۔ کیوں نہ اسی دوران ہم بھی تازہ اور گرم روٹیاں کھالیں۔“

سرجی نے کچن کے اندر سے آواز لگائی۔ ”شہباز کو تو ہر وقت کھانے پینے کی بڑی رعتی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا غصہ کتنا گندا ہوتا ہے۔ غصے میں تو اپنے بہنوئی کو بہنوئی بھی نہیں سمجھتے۔“

میں پیچیدہ چہرہ لیے اندر سے ہنس رہا تھا کہ سرجی کس طرح سے مفتی کو گریڈ رہے ہیں۔

مفتی سرجی کے کلمات سن کر غور و فکر میں مبتلا ہو گیا کہ سرجی نے واقعی تعریف کی ہے یا کوئی چوٹ کر گئے ہیں۔ شہباز بیچ میں بولا۔ ”مگر آتا کہاں سے ملے گا؟“ سرجی بولے۔ ”میں نے خود گھائی اسٹور میں بڑے بڑے تھپے دیکھے ہیں۔“

سرجی کے خاموش ہوتے ہی شہباز یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں ابھی لے آتا ہوں۔“

مفتی اس دوران حیران و پریشان بیٹھا ہمیں دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر پر کس طریقے سے قبضہ کیا جا رہا ہے۔

شہباز بارہر نکل گیا تھا۔ سرجی کچن میں کھڑے پیاز اور لہسن چھیل رہے تھے۔ میں واش روم میں جا گھسا مگر مفتی سوپوں میں غرق اپنے میٹرٹس سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد کچن سے خوشبو آنے لگی جو بھوک کو بڑھا رہی تھی۔ سرجی نے گوشت کو بھوننے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ دس بارہ منٹ میں شہباز آئے گا تھپلا اٹھائے آگیا اور سرجی ہاتھ پر شکٹیں ڈالے بڑی سنجیدگی سے آگ کو گوندھنے لگے۔

مسالوں کی خوشبو کی وجہ سے شہباز بار بار دپٹی میں جھانک رہا تھا اور مفتی ابھی تک سکتے کے عالم میں تھا۔

کچھ دیر بعد اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سرجی نے گھبرا کر مشورہ دیا۔ ”دپٹی چھپا لیتے ہیں، خان ہو گا۔“

میں نے دروازہ کھولا تو وہاں واقعی خان تھا مگر اس کے ہاتھ میں ایک بھری ٹرے تھی۔

اندرواغل ہوتے ہی پہلے کچن کی والا قبضہ لگایا اور پھر بولا۔ ”تم بھوکوں انگلوں کے لیے کبھی اور گوشت بنا کر لایا ہوں۔“ پھر ناک چڑھا کر سونگھنے لگا اور بولا۔ ”کچن میں کیا جل رہا ہے۔“

ہم نے بتایا کہ قربانی کے گوشت کا سالن بن رہا ہے تو ٹرے لے کر خود کچن میں گھس گیا۔ وہاں جب سرجی کو آٹا گوندھتے دیکھا تو وہیں اس پر ہلکی کا دورہ پڑ گیا۔ ہنتے ہنتے کچن کی کھڑکی سے مفتی کو مخاطب کیا۔ ”مفتی! لگتا ہے کل ندیم ہمیں اپارٹمنٹ سے باہر کھڑا کرے گا اور خود مالک بن بیٹھے گا۔“ آٹا دیکھ کر ہی اسے یہ خیال آیا کہ اس کے پیچھے میری ہی کارستانی ہوگی۔

اب ہمارے پاس کھانے کا ذخیرہ بڑھ گیا تھا۔ روٹیاں خان بھی لے آیا تھا کہ اتنے میں دوبارہ دروازے پر

دستک ہوئی۔ شہباز نے پیٹ کھلاتے ہوئے دروازہ کھولا تو ہمارا پٹھان دوست مطیع اللہ تھا۔ پہلے ہمیں باریک سی آواز میں السلام علیکم کی آواز آئی اور پھر وہ شہباز سے بولا۔ ”یہ تم کینیڈا میں کس حالت میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔“

دراصل شہباز نے حسب عادت شرٹ اتار کر صرف قمیص پہنی ہوئی تھی اور بے پناہ زرد اور سرخ چہرے کے ساتھ اپنا بدن کھرچ رہا تھا۔ اتنے میں مطیع اللہ یوگ روم میں داخل ہوا اور شہباز سے بولا۔ ”سوات میں تو تمہاری بھی قربانی جائز بنتی ہے۔“

اس سے پہلے کہ دونوں میں تکرار ہو جاتی میں نے بڑھ کر عید مبارک کہا اور اسے مفتی کے پہلو میں بیٹھا دیا۔

اب جب اتنے لوگ اکٹھے ہوئے تو یوگ روم میں ہنگامہ برپا ہونا ہی تھا۔ مطیع اللہ شہباز کو خان کو رگیدہ کی کوشش کر رہا تھا۔ میں آرام سے ڈور وال سے ٹیک لگائے بیٹھا لطف لینے لگا۔

”اور کینیڈا میں زندگی کیسے گزر رہی ہے۔“ خان نے مطیع اللہ سے پوچھا۔

”گوروں کے ملک میں مسلمانوں کی زندگی خزیروں والی ہی ہوتی ہے۔ وہی گزرا رہا ہوں۔“

”مطیع اللہ بھائی! خزیروں والی مت کہو بلکہ یہ کہو کہ توں والی۔“

”کیا بھرق (فرق) پڑتا ہے دونوں حرام ہیں۔“ پھر وہ لیٹ کر شہباز کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہاں سب خزیروں کی زندگی گدھوں والی بھی ہے۔“

”مگر گدھا حرام تو نہیں ہے۔“ شہباز ہنتے ہوئے بولا۔

”گدھا اپنے آپ کو حلال نہیں کہے گا تو کیا حرام کہے گا۔“ مطیع اللہ بولا۔

اس بات پر تھپتھپے بلند ہونا ضروری تھے شہباز نے آستینیں چڑھائیں، اس سے پہلے کہ گھسان کارن پڑتا کہ سرجی نے سب کے سامنے جلیبیاں اور چائے رکھ دی اور منٹنا کر نصیحت کی۔ ”عید کے دن صرف خزیر، کتے اور گدھے لڑتے ہیں۔“

سرجی کی پھرتیاں دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ میں نے مسکرا کر ٹیک لگایا اور چائے پینے لگا۔

کھانا کھانے کے بعد مطیع اللہ نے انکشاف کیا کہ اس نے دو دن پہلے ہیوسال میں انٹرویو دیا ہے۔ وہ کوئی

کنٹرول میں جاب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سب اسے خفیہ اندرونی مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ میں بھی حیران تھا کہ مطیع اللہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر بات کو انتہائی خفیہ رکھنے کا عادی تھا۔

سب کی مبارک بادیں وصول کرنے کے بعد اس نے مفتی سمیت ہم سب پر یہ بم پھوڑا کہ اگر اس کی بیسوسال میں جاب ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ اسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائے گا۔

یہ سن کر مفتی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس جھلکا اور کارپٹ گھلیا ہو گیا۔ شہباز دادیلا کرنے لگا۔ ”ایک اور سیانہ“

سرجی کو اپنی پڑگئی کہ کہیں ان کی یہاں سے چھٹی نہ ہو جائے۔ میں خود حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ مطیع اللہ کو سب کے سامنے بات کرنے سے پہلے ہم میں سے کئی سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ یہ بات مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ آپ مالک مکان کو صرف اطلاع دے رہے ہوں کہ میں آپ کے گھر میں شفٹ ہو رہا ہوں۔

بوکھلا ہوا مفتی مجھے دیکھ رہا تھا اور میں مطیع اللہ کو۔ بیسوسال ہمارے گھر کے قریب تھا اور جہاں مطیع اللہ رہتا تھا وہاں سے ایک گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ اسے یہاں بہت سہولت تھی کہ فاصلہ صرف پندرہ منٹ کا تھا مگر ہم پہلے ہی ایک کمرے میں تین بندے رہ رہے تھے اور لیونگ روم پر اکیلے مفتی کا قبضہ تھا۔

میں نے مطیع اللہ کے سامنے جگہ کا مسئلہ رکھا تو بولا۔ ”ہم فقیر لوگ ہیں پاؤں میں بھی سو جائیں گے۔“

اپارٹمنٹ کا ماحول ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ خان اپنی خالی ٹرے لے کر کھسک گیا۔ ”مطیع اللہ بولا۔“ ”سوچتا ہوں کہ آج رات یہیں رک جاؤں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ اتاری۔ مفتی کے میٹرز پر لپٹ کر رکھی اور اپنا سر کا کراٹھیں موندھ لیں۔ مفتی اپنی اور اپنے میٹرز کی یہ تو بہن برداشت نہ کرتا ہوا بے بسی سے میری جانب دیکھ رہا تھا بلکہ سرجی اور شہباز بھی میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں سوچوں میں گم مستقبل میں اس اپارٹمنٹ کا نقشہ بدلتا بگڑتا دیکھ رہا تھا۔

مطیع اللہ کا معاملہ ہم نے بیچ میں چھوڑا کہ جب اس کی جاب ہو جائے گی تو دیکھ لیں گے۔ دوسرے دن سے سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ سرجی اپنی سیکورٹی

گارڈ والی جاب سے خاصے مطمئن تھے اور اسی میں لگا رہنا اپنا نصیب سمجھ بیٹھے تھے۔ شہباز نے ایک کمپیکل لیب میں انالسٹ کی Co-op کی جاب شروع کر دی تھی اور اس کا رعب سرجی پر ڈالتا تھا۔ میں نے باقاعدہ بیسوسال میں ٹریننگ کے بعد اپنی جاب شروع کی تھی اور ہفتے میں پانچ دن کام کرنے کے بعد ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر کی کئی شفٹیں کرتا تھا جو دوپہر بارہ سے لے کر رات بارہ بجے تک کی ہوتی تھیں اس سے مجھے کچھ ایکسٹرا ڈالر مل جاتے تھے۔

میرے بچے چند ماہ میں آنے والے تھے۔ مجھے اپارٹمنٹ کرائے پر لینا تھا اور اس کے لیے دو ماہ کا ایڈوانس کرایہ جمع کروانا تھا۔ فرنچیز اور گھر کا سامان لینا تھا۔ بیوی بچوں کے لیے ایئر کنڈ لینے تھے۔ اس لیے میں ایک مصروف شیڈول کا شکار ہو گیا تھا۔ ہفتے میں کوئی ایک دن بھی فارغ نہ ہوتا تھا اور یہ میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں یہ زندگی زیادہ عرصہ نہیں گزار سکتا تھا۔

بیسوسال میں ٹریننگ کے بعد مجھے یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے مجھے سب سے ہائی ٹیک ڈپارٹمنٹ ”کراس ٹکنگ“ کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ اس میں مجھے ماڈرن مشینری کے علاوہ ماڈرن ٹیکنالوجی میں بھی تجربہ حاصل ہو سکتا تھا۔ میں پورے دل و جان سے اپنے کام میں جت گیا۔ جب میری صبح کی بیسوسال میں شفٹ ہوتی تو صبح سات بجے جاتا اور تین بجے واپسی ہوتی۔ شام کی شفٹ دوپہر ایک بجے سے رات آٹھ بجے تک کی ہوتی۔ میرے ساتھ ٹریننگ پر کئی، فردی، ڈیٹا تھیں اور انہیں ان کی تعلیم کی مناسبت سے واشنگ پر لگایا گیا تھا۔

کراس ٹکنگ میں ایک جین تھی۔ عمر بیوی کوئی پندرہتیس کے قریب ہو گی۔ سڈول جسم اور دماغ کی تیزگی۔ اس نے سبز اور گول آنکھوں سے مجھے پہلے ہی دن گھور دیکھا۔ میں نے نظر انداز کر دیا پھر ایک دن اس سے رخ کلائی بھی ہوئی۔ ہمارا پہلا جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ میں اس سے پوچھ بیٹھا تھا کہ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس بات کا اس نے بہت برا مانیا اور کہا کہ مجھے شادی کی ضرورت کیا ہے، میرے کئی بوائے فرینڈز ہیں۔ کئی بوائے فرینڈز کا ذکر اس نے کیوں کیا یہ بات نہ میری سمجھ میں آئی اور نہ مفتی کی۔

میرے ساتھ ڈپارٹمنٹ میں فلپائن کا ایک تیز طرار اور بہت چھوٹے قد کا چھوٹا اور ساتھ ہی ایک سیاہ فام آدمی تھا۔ ان دونوں کو مجھ سے پیر ہو گیا اور وہ دونوں میرے خلاف

سازشیں کرنے لگے۔ شاید میرا کام سیکھنے کا جنوں انہیں پسند نہ آیا تھا۔ ان کے رویے سے میں یہ جان گیا کہ سیاست اور سازشیں صرف پاکستان میں ہی نہیں، مغربی ممالک میں بھی ہوتی ہیں اور ہم سے بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

میرے ساتھ والے ڈپارٹمنٹ میں مفتی کا کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ایک یہودی ”مریکا“ بھی تھا۔ وہ تخرانیہ کا سیاہ فام تھا اور ہر وقت ہم پاکستانیوں اور انڈین کے گروپ کے ساتھ زیادہ خوش رہتا تھا۔ زندگی کے اس ٹریک پر چڑھنے کے بعد اپنی افتاد برقرار رکھنے کے لیے شروع میں مجھے کچھ دشواری پیش آئی مگر پھر ہر ایک کی طرح میں بھی اس راستے کا عادی ہوتا گیا۔

میری مصروفیت بڑھی تو نسرین کے ساتھ ساتھ سرجی کی شکایتیں بھی بڑھنا شروع ہو گئیں۔ سرجی کو لگے یہ تھا کہ میں اس معصوم کا دل دکھا رہا ہوں۔ میں اپنی مصروفیت کا بتاتا تو وہ کہتے کہ جب تین بجے آجاتے ہو تو اس معصوم سے مل لیا کرو۔ یہ بات سرجی نے نسرین کو بھی بتادی تھی اور اسی وجہ سے اس کی ناراضگی میں شدت آگئی تھی۔

ایک دن جب میں بیسوسال سے واپس آیا تو گھڑی تین بجارہی تھی۔ ہاتھ میں کافی وقت تھا۔ سوچا نسرین کو فون کرلوں۔ اپارٹمنٹ سے اسے فون ملایا تو خلاف توقع اس کے بیٹے کی بجائے اس نے خود فون اٹھایا اور میری آواز سن کر چپکے لگی۔ اس کے لہجے کی ٹھٹھکیا ہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ میں نے خوشی کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دینے کی بجائے جلتنگ چاتی ہنسی ہنس دی۔ دوبارہ استفسار کیا کہ تمہارے شگونیوں کیوں پھوٹ رہے ہیں۔ ”یہ بتا دیا تو آنا پڑے گا۔“ اس نے ہنس کر کہا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ ماجرا کیا ہے۔ کہیں اس کا بھائی تو امریکا سے نہیں آگیا مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ وہ تو بستر پر زخمی پڑا تھا۔ نسرین سے ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ میں نے خوش دلی سے پوچھا۔ ”کیا یہ رونقیں میری وجہ سے ہیں؟“

”آج صبح کی سالگرہ ہے۔“
میں ہلکا سا شرمندہ ہوا مگر پھر سنبھل گیا اور پوچھا۔ ”تو مجھے سالگرہ کا کیوں نہیں بتایا؟“

کہنے لگی۔ ”پچھلی بار پارک میں بتایا تو تھا لگتا ہے شاید تم بھولنے لگے ہو۔“

میں خاموش سا ہو کر سوچنے لگا مگر اب کیا کروں تبھی

وہ بولی۔ ”کیا تم آرہے ہو؟“

اب میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے ایک کا پوچھا تو کہنے لگی۔ ”سب موجود ہے بس تم آ جاؤ۔“ میں نے فون رکھ دیا۔

میں ریسیور کو کوڈل پر رکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ گفت کیا لے کر جاؤں کہ اتنے میں سرجی سیوری کی گاڑی وردی میں آکھیں ملتے ہوئے روم میں کھڑے مجھے گھورے جارہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ”کہاں کی تیاری ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کہیں کی نہیں مگر آپ وردی میں کیوں سو رہے تھے؟“

اپنے دیدے مٹکاتے ہوئے بولے۔ ”سب سن لیا ہے، ہمیں اलومت سمجھیں۔ ہم آپ کے بھی بچا ہیں۔“

”ایک تو الو سمجھا نہیں بلکہ بنانا ہوتا ہے اور ہاں آپ ہمارے چچا خدا خواستہ کب سے ہو گئے؟“

فرمانے لگے۔ ”مطلب یہ ہے کہ ہم آپ سے تو کم از کم زیادہ عقل رکھتے ہیں اور الو بنانا ہو یا سمجھنا، آپ اہل زبان کی درستگی کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔“

میں نے سوچا کہ یہ بحث کے موڈ میں ہیں۔ انہیں موقع دینا مناسب نہیں، اس لیے کھک جانا ہی بہتر ہے۔ اپنے خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے میں اندر والے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کا کاک پکڑے آئے۔ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”سرجی! کم از کم میرے لیے چائے مت بنایا کریں۔ ضرورت ہوگی تو خود بنایا کروں گا۔“

”یہ آپ کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے بنائی ہے۔“
میں ایک بار پھر شرمندہ ہو گیا۔ وہ ہنس پڑے اور نگ مجھے تمہا دیا کہ آپ ہی کے لیے ہے۔

میں نے ڈھنگ کے پکڑے پہنے، موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ کل بٹھے کا دن تھا اور مجھے بارہ بجے ہولڈنگ سینٹر جانا تھا۔ جیکٹ میں نے موسم کی مناسبت سے پہنی اور لیو جگ روم میں لوٹ آیا۔ ایک لفافے میں سالگرہ کے گفت پر کچھ ڈالر رکھے، یہ دیکھ کر سرجی بولے۔ ”نسرین باجی کو میرا سلام کہہ دیتا۔“

وہ شرارت کے موڈ میں تھے اور میں نے چہرے پر مکمل طور پر مصنوعی تنجیدگی چڑھالی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔ ”آپ جاتے ہیں، پھر واپس چلے آتے ہیں۔ یہ

آنے جانے سے آپ کا کوئی فائدہ اور نہ اس سے نسرین کا کوئی نقصان۔“

میں نے بھٹا کے گھوم کر دیکھا مگر وہ واش روم میں جا گئے تھے۔ میں ذرا سا پکرایا اور نگلیاں کرتی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا ہوا بس اسٹاپ پر آیا۔ جمعہ کی شام مغرب میں بہت رنگین ہوتی ہے۔ گوا بھی شام ہونے میں بہت وقت تھا مگر ہر ایک کے چہرے پر دیک اینڈ کی خوشی چسپاں تھی۔ جمعہ کو یہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں TGIF اس کا مطلب پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ Thanks god its friday کا مخفف ہے۔

بس اسٹاپ پر مجھے جواں سال لڑکے اور لڑکیوں کے چہروں پر TGIF لکھا ہوا دکھائی دیا۔

بس میں بیٹھا تو اس کی گرمائش یعنی Heating بند تھی۔ پہلی بار میں ٹھنڈی بس میں گرم بیٹھ رہا تھا۔ بس آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ تازہ ہوا کے بھونکنے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ جب بس کہیں رکتی اور اس کا دروازہ مسافروں کے لیے کھلتا تو کئی مسافر آگے پیچھے چڑھ آتے اور کچھ اتر جاتے۔

چالیس منٹ بعد میں نسرین کے اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بس اسٹاپ پر اتر۔ علاقہ بڑا نہ تھا۔ دو رو یا سڑک کی ہر جانب چھوٹے بڑے اسٹور اور چند ایک مال تھے۔ آج پیدل چلنے والے بہت تھے۔ ان کے درمیان میں بھی آتشال ہوا اور کچھ دیر بعد ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا پھر لفٹ سے دوسرے فلور پر پہنچا۔ راہداری سے داہنے ہاتھ پر بنے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔

دروازہ اس کے بیٹے سعد نے کھولا۔ میں پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔ آج سعد اپنی سالگرہ کے دن خوب بنا سلور کھڑا تھا۔ سیاہ چمکدار بال اور ایسی ہی آنکھیں اور ساتھ سرخ و سفید چمکتی ہوئی رنگت، ایسا بچہ دیکھ کر ہر کسی کو ہیار آ جائے۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ دروازے پر ال پوچھنے لگا۔ ”انکل کیا واقعی آپ میری برتھ ڈے پر آئے ہیں؟“

میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے ہاں میں اپنا سر ہلایا۔ میں اس بچے کو دیکھ کر ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ ان کو واہس ایران مل جانا چاہیے۔ ابھی یہ چھوٹا ہے اور اس کی پرورش کے بعد مراعل باقی ہیں۔ نسرین میں ہمت تو مٹی کی کاس کو بال ہاں تکے مگر یہ ہمت بھی دم توڑ سکتی تھی۔ وہ تھک بھی سکتی

تھی۔ میں سعد کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر یہی سوچ رہا تھا کہ نسرین بچن سے بھاگی ہوئی دروازے پر آئی۔ براؤن رنگ کا گھٹنوں سے نیچے آٹا اسکرٹ اور پیچنگ شرٹ میں بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سیاہ بال کھول کر اپنے کندھوں پر جمع کیے ہوئے تھے۔ مسکراتی آنکھوں سے میرا استقبال ہاتھ ہلا کر کیا اور بولی۔ ”میں سمجھ رہی تھی آپ نہیں آئیں گے۔“ یہ کہہ کر مجھے چھوٹے سے لیونگ روم میں لے آئی اور ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

”ہائیں! تم یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں ضرور آؤں گا۔ اسی لیے اتنی ڈر میں آپ ہوئی ہو۔“

وہ ہنس کر بولی۔ ”تیار تو میں بیٹے کے لیے ہوئی ہوں اور لگتا ہے کہ جاب ملنے کے بعد تمہیں اپنے آپ پر بہت زیادہ اعتماد ہو گیا ہے۔“

میں مسکرا دیا اور وہ ”ابھی واپس آئی“ کہہ کر بچن میں چلی گئی۔

میں نے لیونگ روم کا جائزہ لیا تو اسے خاصا صاف و شفاف پایا۔ ایک بڑا آرام دہ صوفہ اور ساتھ میں لیدر کی سنگل سیٹ جس پر میں بیٹھا تھا۔ فرش پر چھوٹا سا ایرانی قالین جس پر کافی ٹیبل رکھی تھی۔ کھڑکیوں پر نفیس سفید کرشن اور ایک کونے میں رکھائی دی اور ساتھ ہی سعد کے بہت سے کھلونے۔ بائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ چار کرسیوں والی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل۔ ٹھیک میرے پیچھے بچن اور دائیں ہاتھ پر ایک واش روم اور ساتھ ہی بیڈ روم کا دروازہ۔ چھوٹا سا کمر خوب صورت اپارٹمنٹ تھا۔

دیوار پر مٹی پینٹنگ کی جانب دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں ملتان یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہا تھا تو ہاسٹل میں میرے کمرے کی دیوار پر یہی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ فراک پہنے ایک جواں سال ایرانی لڑکی کی تصویر جو سر پہنچتوں اور کھلیاتوں میں چھتری اٹھائے بھیڑیں چرا رہی ہے۔ خوب صورتی میں ایک بلند مقام تک پہنچی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک دلچسپ مسکراہٹ۔ اپنے قدرتی ماحول میں وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی تھی۔ میں اپنی اسٹڈی سے جب تھک جاتا تو یہی چہرہ دیکھ کر آنکھیں آسودگی سے موندھ لیتا تھا۔

وہ بھی کیا دن تھے اور کیا سوچیں تھیں۔ دس سال گزرنے کے باوجود میں اس پینٹنگ کو بھول نہ سکا تھا اور آج پھر وہ تصویر نور تو میں نسرین کے اپارٹمنٹ میں

آویزاں مجھے مل گئی تھی۔ میں اس زمانے میں پہنچ گیا جب فریبوں میں گھرا تھا اور سرابوں کو جھیلیں سمجھ بیٹھا تھا۔
سحد میری گود میں کھیل رہا تھا اور میں اس تصویر کو دیکھ کر کہیں اور پہنچ گیا تھا کہ نسرین آگئی۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر پینٹنگ دیکھتے پا کر بولی۔ ”اس چہرے کو جانتے ہو؟“

میں نے بے خیالی میں کہا۔ ”نہیں، اس چہرے کو نہیں بلکہ ان لمحوں کو جانتا ہوں جب اس چہرے کو دیکھا کرتا تھا۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ بولی۔ ”ان لمحوں میں کوئی اور چہرہ اس میں ڈھونڈتے تھے؟“
میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”نہیں، کوئی ایک چہرہ نہیں بلکہ سب شکلیں اس مسکراہٹ کے پیچھے تلاش کرتا تھا۔“

”بڑے رومانٹک تھے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”عمر ہی ایسی تھی۔“ میں ہنس کر بولا۔

”کیا اب عمر زیادہ ہو گئی ہے؟“

”نہیں زندگی میں اور لوگ بھی آگئے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ بات کوئی اور رخ اختیار کرتی کہ سعد میرا بازو دھج کر مجھے اپنے کھلونے دکھانے لگا اور نسرین مجھے بغور دیکھتی ہوئی دوبارہ اندر چلی گئی۔

وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ چائے کب سے پینے لگی ہو؟“

”میں نہیں پیتی بلکہ تمہارے لیے ایک انڈین اسٹور سے اور بھی بہت سی چیزوں کے ساتھ یہ بھی لائی تھی۔“

میں نے سوچا کہ چائے کی پتی تو لے آئی ہے مگر چائے بنانا اس کے بس کا روگ نہیں ہے مگر جب ایک گھونٹ بھرا تو ذائقہ بہت اچھا تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولی۔ ”چائے اور پاکستانی کھانا بنانے کا طریقہ میں نے انٹرنیٹ سے سیکھا ہے۔“

میں حیرت سے بولا۔ ”کیا کھانا بھی بنایا ہے؟“

”جی ہاں یہ سر پرانز ہے۔“

وہ کچن میں کام کر رہی تھی اور میں چائے پینے کے بعد سعد کے ساتھ اس کے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ مجھے اس گھر کا ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مغرب کی نماز کا ٹائم ہوا تو اس نے مجھے جاہ نماز لا کر دے دی۔ میں نے نماز پڑھ کر کمر سیدھی کرنے کے لیے صوفے پر لیٹنے کا ارادہ کیا تو سعد کمرے سے نکلی لے آیا۔ وہ بہت مجھدار اور تیز وار بچہ تھا۔

میں اس گھر میں اجنبیت محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔

میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لینا تو نیند نے دبوچ

لیا۔ جب بیدار ہوا تو نسرین پر نظر پڑی۔ وہ ساتھ والی

چیز پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی اور سعد قالین پر بیٹھا

کھیل رہا تھا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا کہ یہ رشتہ

بھی کیا ہے۔ ہر عورت ممتا کا جذبہ لے کر پیدا ہوتی ہے اور

جب وہ ماں بنتی ہے تو یہ جذبہ پوری قوت سے بیدار ہو جاتا

ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ ایک

ماں کسی اور کو دھوکا دے یا کوئی اس ماں کو دھوکا دے یہ

دونوں جذبے ماں کے رہتے اور شان کے خلاف ہیں۔

جب میں بیدار ہوا تو نسرین نے انیا میگزین سائیڈ

ٹبل پر رکھا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر کہا کہ تم

فریش ہو جاؤ اتنے میں، میں کھانا لگاتی ہوں۔

میں سر ہلاتا ہوا دانش روم کی جانب بڑھ گیا۔ روشن

کمر کیوں سے شام کی سیاہی جھانکنے لگی تھی۔ میں باہر آیا تو

ڈائننگ ٹبل پر نسرین نے کھانا لگا دیا تھا۔ میں کھانے دیکھ کر

ششدر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی جانب سے پاکستان اور

ایرانی کھانوں کا کس بنایا تھا۔ پلاؤ میں گوشت کے علاوہ

سکشش اور کاجو بھی تھے۔ کوفتوں میں لوبیا ڈالا تھا۔ خشک

میوؤں کے ساتھ زعفران بھی شامل تھا۔

ایک دوسری چھوٹی ٹبل پر یک رکھا تھا۔ میں اس ٹی

ٹبل کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں بھی نزدیک آگئے۔

نسرین نے بیٹے کے ہاتھ میں چھری تھمائی، میں نے موم

بتیاں جلا دیں جسے سعد نے چھوٹ مار کر بچایا پھر یک کاٹا۔

اسی دوران ماں بیٹے نے یک کے ٹکڑے میرے منہ میں

ڈال دیے۔ یہ ہنگامہ میرے صوفے پر بیٹھے ہی ختم ہو گیا۔

میرے ایک قدم بڑھانے سے انہیں خوشی مل گئی تھی۔

میں صوفے پر بیٹھا جی سوچ رہا تھا کہ نسرین نے

کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ ہر ڈش ذائقہ دار تھی۔ کھانے

سے فارغ ہوتے ہی میز کو نسرین نے صاف کیا اور سامان

کچن میں لے گئی۔ سعد چلاٹنگ لگا کمری گود میں آ بیٹھا۔

تہہ بنایا گیا تو ساتھ زعفران اور خشک میوہ جات

تھے۔ بلیک ٹی کا تہہ واقعی ایرانی ہی بنا سکتے ہیں۔

تہہ پیتے ہوئے نسرین بولی۔ ”تم نے آکر میرے

بیٹے کو بہت بڑی خوشی دی ہے۔ میں بہت مشکور ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اور تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”میں کیا محسوس کر رہی ہوں یہ تم کو معلوم نہیں ہے۔“

میں خاموش رہا تو بولی۔ ”تم کیا محسوس کر رہے ہو۔“
 ”میں نے کہا وہی جو سعد محسوس کر رہا ہے۔“
 اس پر وہ بر ملا کھٹکلا کر ہنس پڑی۔ وہ ہنسی تو سعد سر
 اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔
 قہوہ ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ”رات زیادہ ہو
 گئی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے کہ بسیں بعد میں ملیں کہ نہ
 ملیں۔“ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نسرین کے چہرے پر ایک
 رنگ آیا اور پھر اتر گیا مگر سعد نے سنا تو میرا دایاں ہاتھ اپنے
 دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچنے لگا اور یہ کہتا جا رہا
 تھا۔ ”انگل آج رات ادھر ہی سو جائیں۔“
 اس کی فرمائش سن کر میں ہولکلا گیا۔ میں نے کہا۔
 ”مجھے کل صبح جا ب پر جانا ہے ورنہ ضرور رکتا۔“
 نسرین خاموش رہی۔ اب حالت یہ تھی کہ میں ایک
 قدم بڑھاتا تو وہ مجھ سے لپٹ جاتا۔ ماں میری چیخت لینے
 جاتی تو اس سے لپٹ جاتا۔ میں عجیب و غریب تجویزیشن میں
 پھنسا کھڑا تھا۔ اب تو باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر
 رہے تھے۔
 میں شرمندگی سے نسرین کی جانب دیکھتا اور نسرین
 سعد کو ڈانٹ رہی تھی۔ اس پر وہ باقاعدہ رونے لگا۔ میں نے
 نسرین سے کہا کہ تم ڈانٹو نہیں میں چندہ بیس منٹ رک جاتا
 ہوں اور جیسے یہ چپ ہوگا تو سمجھا کر چلا جاؤں گا۔ وہ خاموش
 ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی میں دوسرے صوفے پر ٹیک لگا کر جا
 بیٹھا اور سعد میری گود میں آ گیا۔ اپنا سر میرے سینے پر رکھا
 اور ہچکیاں لینے لگا۔ نسرین یہ سب حیرت اور خوشی سے دیکھ
 رہی تھی اور میں صرف سعد کے گالوں پر پھسلنے وہ آنسو دیکھ رہا
 تھا جواب خنک ہو رہے تھے۔
 سعد کی آنکھیں بند تھیں اور ہچکیاں بھی رک چکی تھیں۔
 مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آخری بس بھی مس نہ ہو جائے۔ میں
 ہانے کے لیے اٹھنے لگا تو سوتا ہوا سعد کسمایا اور اپنے ننھے
 بازوؤں سے مجھے جکڑ لیا۔ اب میں نے پریشان اور بے بسی
 سے نسرین کو دیکھا۔
 نسرین نے کہا۔ ”اگر تم نے جانا ہے تو چلے جاؤ۔“
 ”یہ بعد میں جب آنکھ کھلے گی روئے گا۔“
 ”ایک بار ہی تو روئے گا بس سنبھال لوں گی۔“
 میں نے اپنے دونوں بازوؤں سے سعد کو سینے سے
 لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر پیار بھی بہت آ رہا تھا۔ اس کو تو پیدا
 ہونے کے بعد ماں کے علاوہ کسی کا بھی پیار نہ ملا تھا۔ میں

نے ذرا سا پیار کیا تو وہ معصوم نہ جانے کہاں سے کہاں جا
 پہنچا۔
 میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا تو نسرین بولی۔ ”مجھے
 معلوم تھا کہ کل تمہیں بارہ بجے ہولڈنگ سینٹر جانا ہے اور اگر
 رکنا چاہتے ہو تو رک جاؤ۔“ پھر میری جانب دیکھ کر اپنی
 بات آگے بڑھائی۔ ”میں صوفے پر سو جاؤں گی اور تم
 دونوں اندر بیڈ روم میں سو جانا۔“
 میں یہ سن کر اس کی آنکھوں میں تادیر دیکھتا رہا۔ وہاں
 مجھے بے انتہا اعتماد نظر آ رہا تھا۔ میں رات کے دس بجے بسوں
 کے چکر میں دھکے کھانے سے ڈر رہا تھا۔ اس لیے بحالت
 مجبوری میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 سعد میرے سینے پر لیٹا تھا۔ میں اس کے زخمِ ملامت سیاہ
 بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ نسرین سے کہا کہ مجھے ایک
 ٹکیہ دے دے۔
 اس نے ٹکیہ لاکر میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ میں نے
 کبل منگوایا تو وہ بھی لے آئی۔ میں نے سعد کو صوفے کے
 ایک کونے پر سلا یا اور خود نسرین سے دوسرا ٹکیہ لے کر
 دوسرے کونے پر لیٹ گیا۔ اپنے سینے کی شوز بمشکل اتارے
 پھر نسرین سے کہا۔ ”میں اور سعد صوفے پر سوئیں گے اور تم
 کمرے میں سو جانا۔“
 وہ کہتی رہی کہ میں تنگ ہوں گا اس لیے کمرے میں سو
 جاؤں مگر مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے بستر پر سو
 جاؤں۔
 وہ سانسے بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور میری آنکھیں بند
 ہو رہی تھیں۔ آخر اس سے کہنا پڑا۔ ”مجھے سونے دو اور دماغ
 مت کھاؤ۔“
 وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں مجھے
 بھی نیند نے آیا۔
 آنکھ اس وقت کھلی جب اپنے سر پر لمس محسوس کیا۔
 دیکھا تو نسرین نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور
 اسے قدرے ہلا کر مجھے جگا رہی تھی۔ ٹائم دیکھا تو صبح کے
 سات بجے تھے۔ ایسی صبح کی مجھے توقع ہرگز نہ تھی کہ میں
 بیدار ہوں تو نسرین کا کھلتا چہرہ اور مسکراتی آنکھیں مجھ پر جمکی
 ہوں۔ کھڑکیوں کے پردوں سے صبح کی سپیدگی لیوٹنگ روم
 میں آ رہی تھی مجھ پر کبل ڈالا ہوا تھا اور سعد صوفے پر نہیں
 تھا۔ وہ خود ہی بولی۔ ”رات سعد کو میں بیڈ روم میں لے گئی
 تھی۔ تم سردی سے سکتے ہوئے تھے تو کبل ڈال دیا تھا۔“

نمی میری گردن پر محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ آنسو نہیں بے شمار سوالات ہیں جن کے جوابات میں بھی جانتا ہوں اور وہ بھی جانتی ہے۔ میں بار بار دہرائیں سکتا اور وہ بار بار سنیں سکتی تھی نہ میرے کہنے کا فائدہ اور نہ اس کے سننے کا فائدہ تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے کندھے سے اٹھایا، اپنے ہاتھوں کے انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے اور بولا۔ ”اگر میں چاہوں بھی تو یہ ممکن نہیں ہے۔“

وہ میری بات سمجھ گئی۔ ایک دم مجھ سے علیحدہ ہوئی اور میرے جاتے جاتے یہ کہتی رہی۔ ”میرے لیے نہیں تو سہ کے لیے آ جایا کرو۔“

میں نے ہائی بھری اور باہر نکل آیا۔ میں باہر تو نکل آیا تھا مگر میرا وجود شاید کہیں اندر رہ گیا تھا۔ باہر کی تازہ اور خشک ہوا کے دھیرے سے چلتے ہوئے بلکھڑے بھی مجھے اندر کی قبر سے آزاد نہ کر سکے تھے۔ میں ایک ایسے رشتے کی قربت سے آزرده تھا جسے میں کوئی نام بھی نہیں دے سکا تھا۔ اس رشتے کو قبول کرنا نہ میرے لیے ممکن تھا اور نہ معاشرے کے لیے مگر یہ کیا دکھ درد تھا کہ ان سب حقیقتوں کے باوجود میں اسے چھوڑ بھی نہ پایا تھا۔ وہ نہ جانے کون سی ڈور تھی جو میرے اور اس کے درمیان بند تھی مگر جسے میں نہ توڑ سکا تھا اور نہ باندھ سکا تھا۔

میں اپارٹمنٹ پہنچا تو ہولڈنگ سینٹر جانے کے لیے میرے پاس ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

سرکاری ابھی تک سو رہے تھے۔ شہباز اور مفتی لیوگ روم میں بیٹھے ٹی وی پر کوئی پاکستانی پروگرام دکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پہلے دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ بھی سرکاری بیڈ روم سے اٹھ کر باہر گئے خاموشی سے میرے پاس گزرے کوئے میں ڈور وال کے ساتھ اپنی جگہ سنبھالی گھنٹوں کے گرد بازوؤں کا گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور پھر مجھے سلام کیا۔ اب تین تین نگاہیں مجھ پر ٹکی تھیں جو یہ جانتا چاہتا تھیں کہ رات کہاں گزاری ہے۔ سب سے پہلے سرکاری بولے۔ ”رات کہاں تھے؟“

میں خاموشی سے کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر شہباز نے پوچھا۔ ”کیا بحال کی طرف چلے گا“

میں نے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے کندھے پر دباؤ ڈال کر مجھے پڑا رہنے دیا۔ میرے ہاتھیں بازو کو اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میری کہنی صوفے پر تھی اور ہتھیلی کو بند کر کے اپنی ٹھوڑی کے نیچے ٹکا دیا تھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ ”یہ صبح کیا کرنے جا رہی ہے؟“

کہنے لگی۔ ”کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟“

”میں نے کہا کہ بریڈ کے دو سلاکس، آلیٹ اور اس سے پہلے بلکہ ابھی گرم گرم چائے۔“

”میں ابھی چائے لاتی ہوں تم صوفے پر ہی لیٹے رہو۔“

وہ چلی گئی۔ میں نے لیٹے رہنے سے بہتر سمجھا کہ اٹھ بیٹھوں۔ وہ دو کپ بنا لائی۔ ہم نے چائے پی اور میں واش روم میں کھس گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ فرائش ہو کر بال بنا کر باہر نکلا، ناشتا ٹیبل پر تیار تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ٹیلی کب آرہی ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”دو تین ماہ اور لگیں گے۔“ وہ اپارٹمنٹ وغیرہ کی ضروری تفصیلات پوچھتی رہی۔ نو بجنے والے تھے اور مجھے نکلنا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری جینکٹ لاکر مجھے دی۔ سحر کو میں نے ایک نظر کرے میں جا کر دیکھا اور اس کے ماتھے پر بوسا دیا۔ وہ یہ سب دیکھ رہی تھی میں واپس مڑا تو وہ دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے بولی۔ ”تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

میں چونک کر رک گیا۔ ”کون سا فیصلہ؟“

”میں ایران واپس چلی جاؤں یا یہیں رکوں۔“

”وہ بات تو ہم کر چکے ہیں۔“

”میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے لہجے میں ایک التجائی کہ مجھے روک لو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مجھے عجیب سے احساس نے گھیر لیا تھا۔ دل کچھ کہتا، دماغ کچھ اور۔ میں عجیب سی کشش میں گرفتار تھا۔ اس لیے خاموش کھڑا رہا پھر اچانک وہ لپکی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اس کے لیے تیار نہ تھا اور بری طرح گھبرا گیا۔ وہ اپنے بازوؤں کے گھیرے میں مجھے لیے اپنا سر میرے کندھے پر رکھے شاید رو رہی تھی کیونکہ اس کے آنسوؤں کی

بیدی کلین شیو سکھ تھا۔ پہلے میرے ساتھ اس کا رویہ بہت جارحانہ تھا مگر جب میں نے کینیڈا کے قوانین اسے یاد کروائے تو اب دوستی برقرار آیا تھا۔ دوسرا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ میری ایک اور اچھی جاب ہو گئی ہے اور اب میرے لیے سکیورٹی گارڈ کی جاب کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور اگر مجھے زیادہ تنگ کیا گیا تو اپنے ساتھ کسی دوسرے کو بھی بھیج لوں گا۔

سلام دعا کے بعد بیدی نے چھوٹے ہی پوچھا۔
”ٹیکس فائل کیا ہے یا نہیں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے بیک سے ٹیکس فارم نکالا۔ مجھ سے کونف پوچھے۔ اسے یہ بھی بتایا کہ ہم گھر میں چار افراد ہیں۔ ان سب کا اندراج کیا۔ کچھ بیع تفریق کرنے کے بعد بولا کہ تم کو ڈھائی سو ڈالر حکومت واپس کرے گی۔ میں حیران تھا کہ آمدن ایک سو اسی ڈالر اور ریٹرن ڈھائی سو ڈالر۔ پھر سب نے مل کر مجھے سمجھایا کہ اگر آمدن کم ہو اور ٹیکس بڑی ہو تو حکومت آپ کی امداد کرتی ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد ٹیکس سے مجھے ڈھائی سو ڈالر کا چیک مل گیا۔

جب شروع میں یہاں کوئی ایگریٹ آتا ہے اور اپنی جاب کی وجہ سے ٹیکس اپنا سر کرنے سے کتر رہا ہوتا ہے تو یار دوست اس سے ایک سوال ضرور کرتے ہیں کہ بچے کتنے ہیں اور ان کی عمریں کتنی ہیں۔ جس کے بچے زیادہ ہوں تو اس کو چھٹی دی جاتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا کوئی بڑا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی بہت بڑی ڈگری یا تجربہ ہو۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کینیڈا ہر شہری کو بچوں کا الاؤنس دیتی ہے۔ تین بچے ہوں اور ان کی عمریں اٹھارہ سال سے کم ہوں تو سب مل کر مہینے کا ایک ہزار ڈالر تک مل جاتا ہے۔ اوسط درجے کا گھر چلانے کے لیے دو ہزار ڈالر بھی نعمت ہیں جس میں اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی شامل ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر حکومت کتنی توجہ دیتی ہے۔

رات بارہ بجے جاب ختم ہوئی تو باہر نکلے۔ دیکھا تو آسمان بادلوں سے صاف تھا اور ہلکی خشکی لیے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ میں بہار کی خوشبو صاف محسوس ہوتی تھی۔ ٹورنٹو نہ تھا جو پچھلے پانچ ماہ میں ہمیں ملتا رہا تھا۔ میں نے جوش میں آکر سپرنگ جیکٹ کی زپ بھی کھول لی۔ ایسا کیف موسم اس سے پہلے نہ میں نے

میں اپنے گال سہلانے لگا تو شہباز بولا۔ ”یہ جھوٹ مت بولو کہ سرین نے رات روک لیا تھا۔“

میں نے بڑا سادہ جواب دیا اور جھوٹ بولنے کی اہمیت ہی نہ آئی۔ ”جب معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟“
”کہہ کر میں نے ڈور وال کے شیشوں کے پار نیلے آسمان کو دیکھا جہاں آہستہ آہستہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ سر جی ابھی تک شش و پنج میں بیٹھے تھے۔ پھر خاموشی کے پردے چاک کیے۔“
”باہر آب برسے گا نہیں مگر ڈر ہے کہ کہیں آپ پر پانی نہ پھر جائے۔“

میں نے کہا۔ ”میری عزت اتنی کمزور نہیں کہ ہر چھوٹی بات سے خراب ہونے لگے۔“

”میں آپ کی نہیں اس معصوم کی بات کر رہا ہوں۔“
اسی دوران مفتی صرف پلٹیں چھپکائے مجھے دیکھتا ہوا۔ ان سب کو یہ شک تھا کہ میں رات کہیں سرین کی طرف نہ ٹھہر گیا ہوں لیکن وہاں میرے رکنے پر ان کو یقین کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ درمیان میں اٹھے رہیں اور مجھ سے زیادہ سوال و جواب نہ کر سکیں۔ میں کچھ دیر میں تیار ہوا اور ہولڈنگ سینٹر جانے کے لیے نکل گیا۔ ٹیکس فائل کرنے کے دن تھے۔ ہر وہ شخص جس نے

پچھلے سال کچھ بھی کمایا ہے اسے حکومت کو بتانا پڑتا ہے۔ اگر آپ ٹیکس فائل نہیں کرتے تو یہ جرم ہے اور اس سے بڑا جرم ہے کہ جب کوئی اپنی آمدن کم بتائے یا کم بتانے کی کوشش کرے۔ تنخواہ داری کی تنخواہ سے ٹیکس کاٹ کر حکومت کے لزانے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ اصل معاملہ ہوتا ہے برٹس مین کا جس کو اپنی آمدنی اور اخراجات کا حساب دینا پڑتا ہے۔ اخراجات کے اندراج پر وہ اعتبار کر لیتے ہیں اور بہت سی چیزوں کی رسیدیں سنبھال کر رکھتی پڑتی ہیں۔ ٹیکس فائل کرتے وقت کوئی رسید نہیں دینی پڑتی مگر جب آپ کی فائل اگواڑی پر آجائے تو آپ کا عرق نکال دیتے ہیں۔ تنخواہ دار اپنا ٹیکس خود فائل کرتے ہیں۔ ورنہ شاپنگ مال میں اور کل وقتی اکاؤنٹ اپنی دکانوں یا دفتر میں بیٹھ کر ہم سے بیس سے پچاس ڈالر لے کر یہ کام با آسانی کر دیتے ہیں۔ میری آمدن پچھلے سال صرف ایک سو اسی ڈالر تھی۔

جب میں ہولڈنگ سینٹر آیا تو بیدی ہیڈ گارڈ تھا۔ اسلام بٹ بھی اپنے آرٹ کے شہ پاروں کے ساتھ موجود تھا۔ کرل حسب معمول اخبار میں کھویا ہوا تھا۔

دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ گو کہ درخت اپریل میں بھی بے پرگ تھے اور نئے موسموں کی نوید چہار جانب نضاؤں میں تھی۔

ایارٹمنٹ پہنچا تو وہی منظر تھا جو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سب کو سلام کیا اور سب نے گھور کر مجھے جواب دیا۔ مجھے دیکھتے ہی سب شاید خاموش ہو گئے تھے۔ شاید سب کے دلوں میں ایک ہی سوال ابھی تک تھا کہ رات میں کہاں تھا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے آیا تو سرجی نے خاموشی سے میرے لیے کھانا لگا دیا۔ میں نے دوسروں سے پوچھا تو سب نے یک زبان جواب دیا۔ ”ہم کھا چکے ہیں۔“ یہ بول کر سب دوبارہ خاموش ہو گئے۔ میں بھی سوچ سوچ کر کھانا کھا تا رہا۔ اندر سے میں بھی لطف لے رہا تھا۔ کھانے کے دوران کبھی چھت کو دیکھنے لگتا۔ کبھی پہلو بدل کر باہر آسمان کی طرف نظر دوڑاتا پھر پانی پیتا پھر کچھ سوچتا اور کچھ سوچ کر پھر کھانا کھانے لگتا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے برتن کچن میں رکھے اور بیڈ روم میں سونے چلا گیا۔ شہباز چلا کر بولا۔ ”اب کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”کل جاب کے لیے بھی جانا ہے۔ کیا تم لوگوں کی طرح بڈ حرام ہوں۔“ میں مسکراتا ہوا سو گیا اور باہر سے بہتوں کی آہ و زاری مجھے سنائی دیتی رہی تھی۔

میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میرے بیڈ کے ساتھ کمرے کی ڈور والی تھی۔ ڈور وال کا شیشہ دروازے کی طرح اندر سے کھل جاتا تھا۔ سردیوں میں جب بھی کمرے کا درجہ حرارت بڑھتا تو میں ڈور وال کو ایک سائیڈ سے سرکا دیتا تو دروازے میں ایک درز بن جاتی جو باہر کی سردی کو اندر لا کر چند منٹ میں کمرے کو فریزر بنا دیتی تھی۔ سردی کا زور ٹوٹنا شروع ہوا تو میں اکثر ڈور وال کو ہلکا سا کھولے رکھتا تھا۔ ڈور وال کے پرے سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ازلوں سے کھلائی ہوئی ہیں۔ سردیوں میں ان پر برف پڑی رہتی تھی۔ ان دنوں برف سے نجات حاصل کر کے وہ خشک اور جلی ہوئی شہنشاں ہی بن چکی تھیں۔

صبح میں جب بیدار ہوا تو اجالا رات کے اندھیرے سے باہر آنے کی بجائو میں تھا۔ اس وقت باہر جھاڑیوں کے آس پاس میں نے چڑیوں کی چھچھاہٹ سنی، ان کی آواز متواتر چلی آ رہی تھی۔ میں نماز میں سجدے میں گیا تو ان کا

ورد زیادہ بلند ہو گیا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ بہار کالس میں ان ہواؤں سے محسوس کر رہا تھا جو در وال کی درز سے اندر آ رہی تھی اور اس کا ترانہ چڑیوں کی چھچھاہٹ کی صورت اپنی منادی کر رہا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ چڑیاں صرف پاکستان میں ہوتی ہیں آج کے دن پرندوں کی بولی سن کر میرا یقین پختہ ہو گیا کہ اللہ کی قدرت اور نعمتیں دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہیں۔ اکثر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسباب کی بھرمار یہاں ہم سے بہت زیادہ ہے۔ میں نماز پڑھ کر دوبارہ اپنے میٹرز پر کھل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ شیشے کے پار باہر کا منظر جادوئی ہو گیا تھا جہاں کبھی برقانی جھنکر چلتے تھے، وہاں آج دھیرے سے آنکھیلیاں کرتی ہواؤں کا راج تھا جہاں پہلے برف کا سناٹا ہوتا تھا آج پرندوں کی مختلف بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ درخت اپنی جگہ جمجم رہے تھے۔ آسمان کا مالک اپنی حمد و ثناء سن کر اپنی رحمتیں نازل کر رہا تھا۔ ایک سرمئی ماحول نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کوئی روشنی آسمان سے نیچے اترتی اور طلسم اندھیرے کو روشن کرتی گئی۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے باہر سناٹا تھا۔ دن نکلنے کا اندازہ مجھے تب ہوا جب شہباز کی سوتے چہرے کو سورج کی روشنی اور زیادہ دور کرنے لگی اور وہ جب بڑبڑانے کی آڑ میں گالیاں دینے لگا۔

میں باہر نکلا تو مفتی جاگ رہا تھا اور ہلکی آواز میں ٹی وی میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بڑے خوشگوار موڈ میں سلام کیا اور فوراً ہی چائے بنانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں چائے بنا کر کپ میرے حوالے کیا اور بولا۔ ”وہ دونوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اب انہیں بتا ہی دو کہ رات کہاں گزاری تھی۔“

میں نے چائے کا سب لیتے ہوئے کہا۔ ”انہیں اچھا اندازے لگانے دو۔“

کہنے لگا۔ ”چلو مجھے تو بتا دو۔“ میں جان تو گیا تھا کہ یہ چائے مجھے اس لیے پلائی جا رہی ہے کہ کوئی کھٹی میٹھی کہانی اس کو سناؤں لیکن میں اس سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے لوف فرنگ سمجھتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”قسم سے نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا اعتبار تو ہے ناں؟“ سیریس ہو کر بولا۔ ”بہت ہی زیادہ بلکہ اپنے سے لگا

”کھڑے۔“

میں نے جواب میں کہا۔ ”تو بس میرا اعتبار کرو کہ میں کسی غلط جگہ پر نہیں تھا۔“

میں نے بات یہیں ختم کر دی۔

میں چھوٹا تھا تو دیکھا کرتا تھا کہ ہماری اپنی روایات ہوتی تھیں برائی کو لوگ برائی سمجھتے تھے۔ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا دونوں کے درمیان ایک واضح لائن ہوا کرتی تھی۔ اگر کسی رشوت لینے والے اور سیڑ یا کسی افسر کے بچے ہمارے اسکول میں ہوتے تو سارے بچے اور اساتذہ بھی ان بچوں کو دبے دبے الفاظ میں طعنے مارا کرتے تھے کہ ان کا باپ رشوت لیتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا خود کار نظام تھا جو خود احتسابی سے شروع ہوتا ہے۔ محلے کی کوئی لڑکی سب کی سامنے عزت ہوا کرتی تھی۔ اس کی عزت کی خاطر بچے تک کسی سے بھی ٹکرا جاتے تھے۔ دولت سے زیادہ عزت کا پاس ہوتا تھا۔ اپنی بیٹیوں کے رشتے کے لیے ماں باپ شرافت اور عزت کو بھی بہت دان دیتے تھے۔ ان کو یہ بھی گوارا نہ ہوتا تھا کہ ان کی بچیاں در بدر کی ٹھوکرین کھائیں۔ اسی لیے وہ خاندانی ساکھ کا بہت خیال کرتے تھے مگر اب بہت سی برائیوں کی طرح یہ برائی بھی عام ہو گئی ہے کہ معاشرے کی ترجیحات بدل گئی ہیں یا تیزی سے بدل رہی ہیں۔ اس خرابی کی ایک مثال دیتا ہوں۔

میں ہولڈنگ مینٹر گیا تو کل ہی طرح آج بھی بیدی ہلکا گاڑ تھا۔ اسلام بٹ مجھے دکھانے کے لیے اپنے آرٹ کے کمنے لیے میری جانب سوائے نظروں سے دیکھ رہا تھا اور گرامنٹھک ایسا لگتا تھا کہ اس سے کل والا اخبار ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ تمام قیدی اپنی میزوں کے گرد دیے ہی بیٹھے تھے ہمیشہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ شکست، بکلائے، ٹوٹے پھوٹے اور مرجھائے ہوئے۔ ہر ایک اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ تو کینڈا میں رہنے کا پرمٹ مل جائے اور یا پھر یہاں سے اپنے ملک کو ڈی پورٹ کر دیئے جائیں۔

میری نے آنکھ دبا کر مجھ سے کہا۔ ”نیچے بیٹھنا ہے؟“

مطلب یہ تھا کہ نیچے کوئی خوب صورت پری پکڑ لالی گئی ہوگی۔ میری پہلے بھی مجھے ایک اسٹپ ڈانس کے مالے اسی طرح کر چکا تھا۔ میں نے انکار کر دیا تو بولا۔ ”تمہارے پاکستان کی ہے۔“

پاکستانی لڑکی کا سن کر میں چونک گیا۔ میں نے میری سے کہا کہ جب تک میں کہوں نہیں مجھے اوپر مت بلانا۔ اس نے دوبارہ اپنی ایک آنکھ دبا کی جس کا مطلب تھا کہ نو پراہلم۔

میں میز حیاں اتر کر نیچے برآمدے میں آیا۔ دونوں

جانب کمرے تھے۔ مکمل خاموشی تھی۔ نیچے صرف عورتوں کو رکھا جاتا ہے جو غیر قانونی طور پر کینڈا میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی جاتی ہیں۔ نیچے صرف وہی ایک پاکستانی لڑکی تھی باقی سب کمرے خالی پڑے تھے۔ میں دروازے کے ساتھ رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر لاگ شیٹ پڑی تھی اور قیدی کا نام لکھا تھا۔ ”پری جمال۔“

میں نام مکمل ٹھیک نہیں لکھ رہا بس ملتا جلتا نام تھا جیسے مغلیہ دور کی کوئی ملکہ ہو۔ میں کمرے میں بند اس پاکستانی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے اس جنگل میں آ پھنسی ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ کسی نہ کسی کام کے لیے وہ دروازے پر ضرور آئے گی۔ میں بلاوجہ اسے باہر نہیں بلانا چاہتا تھا کیونکہ یہاں بات کا بیٹھکر بننے دیر نہیں لگتی۔ مجھے غرض صرف اتنی تھی کہ اگر میں اس سے اس کی کہانی دریافت کر لوں۔ میں بہت دیر انتظار کر رہا مگر وہ باہر نہ نکلی۔ میں نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور میز پر ٹانگیں لٹائیں اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

میں کتاب میں کھویا ہوا تھا کہ ساتھ والے دروازے کے قریب آہٹ ہوئی۔ میں نے جیسے ہی سر اٹھا کر دیکھا تو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے پتھر کا بنا دیا ہو۔ میں اپنی پلکیں جھپکاتا تک بھول گیا۔ بلا ارادہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میری زبان جیسے ٹنگ ہو گئی تھی۔ ایسا حسین چہرہ اور خدو خال شاید ہی پہلے میں نے کہیں دیکھے ہوں۔ میں حسن تو ہمیشہ قدرت کے نظاروں میں ڈھونڈتا آیا تھا۔ انسانوں میں قدرت کے رنگ میں شاید پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شہد اور دووہ سے دہلی ایک لڑکی جس نے سرخ لپاس زیب تن کیا ہوا تھا۔ حیرت سے مجھے اس لیے دیکھ رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک ایسی خدو خال رکھے والا کھڑا تھا۔ ڈری اور سبھی آنکھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کی آنکھیں، ناک، چہرہ اور جسم

واقعی فرصت میں اسے بنایا گیا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مڑوب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازے سے سلام کیا تو بے ساختہ وہاں سے جواب آگیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستانی ہے اور مسلمان بھی ہے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو کھٹکناقی آواز میں بولی۔ ”مجھے میرا بیک مل سکتا ہے۔ مجھے کپڑے نکالنے ہیں۔“

میں نے بیدی کو فون ملایا اور اس بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ ”شام سے پہلے اسے بیک مل جائے گا۔“

میں نے اسے بتایا تو وہ پہلے مجھے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر جھجک کر بولی۔ ”کیا آپ پاکستان سے ہیں؟“

میں نے ہاں کہا تو گہری سانس لے کر بولی۔ ”اللہ کا شکر ہے۔ کوئی پاکستانی تو ملا۔“ اس کے لہجے میں اب کچھ اطمینان آ رہا تھا۔

وہ شش و پنج میں تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں بھی خاموش کھڑا اسے اسی کیفیت میں گھرا دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود بولے مگر اس نے کچھ نہ کہا اور واپس کمرے میں چلی گئی۔

وہ اندر تو چلی گئی مگر میرا تجسس بڑھا گئی۔ مجھے یہ یقین تو تھا کہ وہ بولے گی ضرور کیونکہ ہر قیدی ہم سیکورٹی گارڈز کو اپنا نمحات دہندہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ ہم بالکل بے بس ہوتے ہیں مگر ان کی نظر میں باہر جانے کا راستہ صرف ہم دکھا سکتے ہیں۔ پھر وہ ہم زبان بھی اور لڑکی ذات بھی اسے سہارے اور لفظی تسلیوں کے علاوہ مدد کی بھی ضرورت تھی۔ مجھے صرف اس کی کہانی سننی تھی۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ واقعی کوئی بد قسمت ہے یا پھر اس سے یا اس کے بڑوں سے کوئی غلطی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اب ایگریگیشن اور عدالت کے ہاتھ میں تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر میں وہ دروازے پر پھر سے ملی اس بار میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے رکی اور پھر بولی۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کہنے لگی۔ ”میں یہاں بالکل بے آسرا ہو گئی ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔“

میں نے وعدہ کیا کہ اگر مجھے اپنی ساری کہانی سچ

بتاؤ تو جو بھی ہو سکا میں ضرور کروں گا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے دروازے کے قریب رکھی اپنی کرسی اسے دے دی کہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔ حالانکہ ہمیں قیدیوں سے زیادہ دہم بات کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر مجھے ڈر نہیں تھا کہ کوئی میری شکایت افسران تک پہنچا دے گا کیونکہ آج اتوار کا دن تھا چھٹی کا دن اس لیے نیچے والی منزل ویران تھی بیدی آج کا انچارج تھا اور اس سے مجھے اب کوئی خوف نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی نیت اور ارادے کو جانتا تھا جس میں کوئی لالچ یا ہوس نہ تھی۔

اس نے اپنی کرسی سنبھالی اور جو بیان کیا وہ مختصر طور پر یہ ہے۔ مگر یہ بھی بتا دوں کہ یہ کہانی اس نے اس ترتیب سے نہیں سنائی تھی، چھ سات گھنٹے میں غلطوں میں سنائی تھی لیکن میں اس رواد کو اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔

پری جمال لاہور کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کا نمبر چوتھا تھا۔ والد کی فیروز پور میں ایک دکان تھی اور وہ گھر کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی استطاعت سے بڑھ کر محنت کرتے تھے۔ پری جمال کے تایا اور ان کے بچے امریکا میں مقیم تھے اور مالی لحاظ سے ان سے بہت مضبوط بھی تھے۔ وہ مالی طور پر مستحکم ہوئے تو انہوں نے پری کے گھر والوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا تھا گویا تائی اور ان کے درمیان ایک لا اعلانیہ سی صورت حال بن گئی تھی۔ یہ جس گھر میں رہتے تھے وہ گھر بھی تایا کے ساتھ مشترک تھا۔ ان لوگوں کے ذہن استعمال تھا اور اس وجہ سے تائی وغیرہ طعنے بھی دیا کرتے تھے۔ یعنی کہ دونوں گھرانے میں رسہ کشی جاری تھی۔ اس

مقابلہ بازی میں پری جمال کے تین بڑے بھائیوں نے یورپ اور امریکا بسنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس کے بھائی پاکستان میں ڈگریاں لے کر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کسی طرح وہ بھی امریکا پہنچ جائیں۔ اس کی ماں مقابلے کے جس اضطراب میں مبتلا تھی اسے اس وقت تک چین نہ آ سکتا تھا جب تک اس کے بیٹے بھی امریکا پہنچ نہ جائیں۔ ان حالات میں گھر کے اندر والد کا زور کمزور پڑتا گیا اور ماں کی خواہشیں زور پکڑتی گئیں۔

(جاری ہے)



تلقین شاہ

افتخار مجاز

شعور ذات کی روح رواں حریم دہر میں حق کی زبان، جہاں زیست کی اک داستاں وہ خود میں معتبر اک جہاں تھا۔ وہ کردار جسے تراشنے والا کس پائے کا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں پھر کوئی ایسا مقبول پروگرام بنا ہی نہیں۔

ڈیڑھ دہائی سے زائد عرصے تک جادو جگانے والی محفل کا ذکر خاص

7 ستمبر 2004ء صوفی دانشور صاحب فکر و فن جناب اشفاق احمد کی رحلت کا دن ہے۔ یوں ہر آنے والے برس 7 ستمبر کا دن ان کی برسی یا یوم وفات منانے کے حوالے سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے لیکن میری دانست میں اشفاق احمد اور ان جیسے لوگوں کے تذکرہ کے لیے محض ایک دن مخصوص کر دینا قرین انصاف نہیں ہے۔
کہتے ہیں استاد امانت علی خان فوت ہوا تو قلمی اداکار اجمل نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ ”بھائی! ایہہ دوسو،

امانت علی مرکیوں کیا اے؟“

پتا ہے جواباً اشفاق احمد نے کیا کہا تھا، انہوں نے کہا تھا۔ ”اجمل صاحب! آرٹس مرتائیں ہے روٹھ جاتا ہے، معاشرہ آرٹس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی ضدیں بھی پوری کرتا ہے لیکن معاشرے کی بھی کچھ مجبوریوں ہوتی ہیں۔ آرٹس معاشرے سے کہتا ہے ”مجھے ایک کوزہ لے دو۔“ مٹی کا کوزہ اور معاشرہ فوراً اسے کوزہ دے دیتا ہے، پھر آرٹس معاشرے سے کہتا ہے کہ مجھے ایک ہاتھی لے دو، اور معاشرہ اپنی تمام جمع پونجی لے کر اسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے۔ پھر آرٹس معاشرے سے کہتا ہے اس ہاتھی کو کوزے میں ڈال دو، معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور آرٹس روٹھ جاتا ہے۔“

میرے دوست دانشور اور کالم نگار عرفان صدیقی نے لکھا۔ ”اشفاق احمد سے تو معاشرے نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ وہ کہتا تو اس سے عشق کرنے والے لوگ ہاتھی کو کوزے میں ڈالنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے ہیں لیکن وہ تو کچھ بولا ہی نہیں، کوئی ضد ہی نہیں کی بلا مجبور دیکھ لیا اور بھر یا میلہ چھوڑ کراتی دور چلا گیا کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔

عرفان صدیقی کی یہ بات دھینا درست ہے مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ ہم انہیں بلا نہیں سکتے مگر سن تو سکتے ہیں بلکہ میری صورت تو یہ ہے کہ ان کے کہے ہوئے الفاظ اور سنائی ہوئی باتیں ہمیشہ میرے دل و دماغ کو مسحور رکھتی ہیں۔ میرے ساتھ تو یوں بھی ہوتا ہے کہ جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی اپنے دلپذیر انداز میں گفتگو کرنے کے بعد داستان سرائے لوٹ گئے ہیں اور میں ان کی سنائی ہوئی باتوں کے سحر میں ہوں۔ ایسی ہی باتوں کی بازگشت اب بھی میری ساعتوں میں محفوظ ہے۔

یہ عہد صدیۂ اخیر کا قصہ ہے۔ اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی کہ کسی قریب میں صدیۂ اخیر اور ڈراما نگار اشفاق احمد کا آتنا سامنا ہو گیا۔ جہاں اشفاق احمد نے صدر صاحب کو ایک لطیفہ سنایا، جس کا لب لباب اور مفہوم یہ تھا کہ اس ملک کو تمام تر نقصان پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے، میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے صحافت کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقامی روزنامے سے بھی وابستہ تھا اور ادارتی صفحہ مرتب کرنے کے علاوہ ہفتہ وار ادبی صفحہ بھی ترتیب دیا کرتا تھا۔ اسی صفحے پر میں نے اشفاق احمد کے صدیۂ اخیر کو لطیفہ سنانے کی خبر اور مذکورہ لطیفہ اشفاق احمد

لطیفے سنار ہے ہیں“ کے ذریعہ عنوان سے شائع کر دیا۔ ان دنوں ابھی اشفاق احمد صاحب سے میری براہ راست ملاقات اس کی تعارف نہ تھا۔ مذکورہ خبر کی اشاعت سے کچھ روز بعد ایک ادبی تقریب میں میرا اشفاق صاحب سے آتنا سامنا ہو گیا۔ تعارف ہوا تو خبر مذکور کا حوالہ بلکہ اس کی سرخی کا ان کے ذہن میں تازہ بھی میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ”آ اشفاق احمد آپ کو لطیفہ نہیں ایک دلچسپ واقعہ سنائے گا۔“ میں ان کا یہ جملہ سن کر جھینپ سا گیا۔ مجھے خدشہ کہ وہ میری مذکورہ بالا حرکت پر مجھ سے شدید ناراضی اظہار کریں گے مگر ان کے لہجے میں ناراضی کی بجائے وضاحت اور اپنے نقطہ نظر کی تشریح کا تاثر نمایاں تھا۔ گئے لگے یہ 1970ء کے انتخابات کا ذکر ہے، میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہی ایک جگہ پر ریڈیونگ اسٹیشن تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ نامعلوم سے معذور ایک شخص چھوٹی ریڑھی (جسے وہ خود ہی زمین کو ہاتھوں سے پیچھے دھکیل کر رہا تھا) پر دوٹ ڈالنے کے لیے آیا، اسے دیکھ کر میرے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا کہ یہ معذور اور اپانچ ہونے کے باوجود کس قدر باشعور ہے اور دوٹ کی اہمیت کو کتنا سمجھتا ہے، میرا جی چاہا کہ میں اسے سراہوں، چنانچہ جونہی وہ دوٹ ڈال کر باہر جانے لگا میں نے راستے میں روک لیا اور اس سے ادھر ادھر کی گفتگو شروع کر دی۔ اس کی تعارف کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے یہ ریڑھی کہاں سے بنوائی یا حاصل کی ہے؟

جواباً اس شخص نے کہا۔ ”جناب اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے، پہلے پہل جب میں نے یہ ریڑھی بنائی تو اسے لکڑی کے پیسے لگائے جیسے پرانے وقتوں میں تیل گاڑیوں میں ہوتے تھے مگر میرا یہ تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ کیونکہ لکڑی کے پیسے جی جگہ اور راستوں پر تو خوب چلتے تھے مگر بیکے فرش، سڑک یا راستے پر زیادہ رواں نہیں ہوتے تھے اور جھنڈ پھنڈ کر چلتے تھے۔ پھر چلتے وقت ان کا شور بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، چنانچہ لکڑی کے پیسوں کو ٹیل قرار دے کر میں نے ان کی جگہ لوہے کے بکے اور پیسے لگائے مگر مسئلہ ابھی بھی حل نہ ہوا۔ یہ پیسے بیکے فرش اور سڑک پر تو خوب چلتے تھے مگر جگہ پر ان کے چلنے میں بہت دشواری آتی تھی۔ یوں لوہے کے پیسے بھی میری ضرورت پوری کرنے میں ناکام ہو گئے۔ اسی پریشانی میں وہ دن لگھڑی میں بیٹھ کر سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ باؤ جی! پڑھا لکھا تو میں ہوں نہیں کہ کسی

ابو جابر بن افلح

ایک مشہور ویت دان۔ وہ اشبیلہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قرون وسطیٰ میں تو اسے کفر فلسفی سے کیا دان جابر بن حیان سے خط ملط کر دیا جاتا تھا۔ اس کا بیٹا یہودی فلسفی ابن میمون کو (وفات 1204ء) ذاتی طور پر جانتا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جابر بن ارج کے بارہویں صدی عیسوی کے نصف کے قریب قریب میں وفات پائی ہوگی۔ جابر نے فلکیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو آج بھی دو مختلف ناموں سے ”کتاب البصیۃ“ اور ”اصلاح الحسابی“ محفوظ ہے۔ اس کتاب میں جابر نے بطلمیوس کے بعض نظریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ خاص طور پر بطلمیوس کے اس دعوے پر نکتہ چینی کی ہے کہ سیارگان اسفل یعنی عطارد اور زہرہ کا کوئی مری اختلاف موجود نہیں۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے فلکی حصے سے پہلے مثلثیات پر بھی ایک باب موجود ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں بھی کیا گیا ہے جو پطرس اپیانوس نے نوربرگ سے 1534ء میں شائع کیا تھا۔

مرسلہ: زید حامد، لاہور

کتاب سے مدد لے لیتا۔ اُن پڑھ آدمی ہوں چنانچہ اپنے دماغ سے سوچا اور اسی سے کام لیا۔ اگلے روز اتارنگی بازار کے پاس نیلے گنبد چلا گیا جہاں سائیکلوں کی دکانیں ہیں۔ ایک دکان سے بچوں کی سائیکلوں کے پیسے خریدے، رڑھی کو لگائے اور آج انہی پر بھاگا پھرتا ہوں۔ نہ کوئی مسئلہ نہ کوئی مسائل اشفاق صاحب کہنے لگے، یہاں تک اپنی کہانی سنانے کے بعد وہ اُن پڑھ معذور شخص بولا۔ ”بابو صاحب اُن پڑھوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ انہیں ہر چیز اور مسئلے کا حل اپنے دماغ سے نکالنا پڑتا ہے اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو آج ابھی تک ادھر ادھر سے یہی پوچھتا پھرتا ہوتا کہ اب میں کیا کروں؟

متذکرہ بالا قصہ بیان کرنے کے بعد اشفاق صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ”بابے مجاز! اس قوم کو جو مسائل درپیش ہیں کبھی ہمارے پڑھے لکھے دانشور ماہرین نے ان سے لمبات کے لیے کیوں سوچا اور اتنا تردد کیا ہے؟ جیسے اس معذور واپس اور اُن پڑھ شخص نے کیا تھا۔

اشفاق صاحب کے یہ زریں خیالات مجھے رفتہ رفتہ ان کے قریب لے آئے اور پھر میں ایک روز واقعتاً اشفاق صاحب کے مریدوں میں شامل ہو گیا اور یہی میرا وہ رنگ پوائنٹ تھا جب مجھے ان کے ایک مختلف آدمی ہونے کا احساس ہونے لگا۔

یہ آٹھ نو سال پہلے کا واقعہ ہے اس روز عید الفطر تھی۔ ”مجھے کوئی کام نہیں میں اشفاق احمد ہوں۔ تلقین شاہ، آپ کو عید ملنے آیا ہوں۔“

اشفاق صاحب کہنے لگے۔ میرا یہ جملہ سن کر تھاندار باقاعدہ ہکا بکا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا تو وہ میرے سینے سے چٹ گیا۔ کہنے لگا میری زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی (بڑا آدمی) بغیر کسی کام کے پولیس والوں کو عید مبارک کہنے اور عید ملنے آیا ہے۔ اشفاق صاحب نے بتایا کہ اس تھاندار نے کہا۔ ”میرے بیوی بچے اور والدین صادق آباد میں ہیں مگر میں یہاں لاہور میں ان کے بغیر بڑے بوجھل دل سے عید کا دن گزار رہا تھا آپ نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو عید مبارک کہہ کر واپسی ہماری عید مبارک بتادی ہے اب ہم بھی سب مل کر عید کا باقی دن خوشی سے منائیں گے۔“

اشفاق احمد کا یہ طرز عمل اور طرز زندگی مجھے ہمیشہ گھماں کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، (آمین)۔ ان کی باتوں کی ہمک ہمیشہ ہمارے مشام جان کو معطر رکھتی ہے مگر اب دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستیاں ہیں۔

اکتوبر 2017ء

جب میں تھاندار کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے حقارت آمیز نظر مجھ پر ڈالنے ہوئے پوچھا۔ ”بابا جی! کدھر آئے ہو، کیا مسئلہ ہے؟“

میں نے بڑے تپاک سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

ماہنامہ سرگزشت



قسط: 9

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوه تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ ذریرہ کے ساتھ مل کر قاتل کو قید کرنے کی کوشش کرتے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی پوچھ میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ بڑا ڈاکو ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بن کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تنہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر اٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو تھوڑی لمبی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی قسیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پندرہ گز لگی ہے۔ قسیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحان کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن ذریرہ کے ساتھ میں فرحان کے گھر گیا کہ ڈائری کے واقعات سننے جس نے رخصت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اکثر کی بہن ٹویس کی گندگی کا ڈسے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری چیزات کو سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ پانزویں پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستار رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف جعفر رینیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سننے ہی میں الجھ گیا۔ گڈ ڈرائیو روٹ کی گاڑیاں اس شروع ہو گئی تھیں۔ سب بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈ ڈرائیو میں خفیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سب کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلدار خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور قسیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دینے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ قسیم کے تھپڑنے مجھے ہلکا ہوا تھا۔ وہ پھنکار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹوک ڈرائیو کی گولڈ لاسی کرادی جس کے ٹوک نے ذریرہ کی کار کوٹ گیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف نے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی انعام کاسن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بیٹنگ میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ یہی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گھٹن حد تک نہیں لکھیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا ہاتھ لٹکا۔ اس کے اڈوں نے مجھے بھی ڈی کر دیا۔ ساتھیوں سے منہ کر میں نے سیٹھ سے انکو الیا کہ عامر کو کہاں رکھا ہے اسے ہاتھ لٹکا لال لایا پھر روزی کے پارٹنر میں پہنچا۔ یہ اس کی کیلی کالیت تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

(اب آگے پڑھیں)

اشارہ کر دیا۔
 باہر مجھے ایک اشارہ انیس سالہ لڑکا بھی کھڑا ملا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رسید بک بھی مجھے نظر آ گئی تھی۔
 ”بی اچھا بھائی! ابھی دیتی ہوں۔“ روزی نے کہا۔
 میں پلٹا۔ میرے عقب میں چند ہی قدموں کے فاصلے پر کالیا ہاتھ میں ٹی ٹی تھا۔ محتاط کھڑا تھا۔
 ”بڑی مہربانی باجی! میں تب تک رسید لکھے دیتا ہوں۔“ باہر سے اس کیل والے لڑکے کی آواز ابھری۔
 روزی پیسے لینے کمرے کی طرف جانے لگی تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور اپنی جب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے تمھار دیا۔
 ”بھائی! رسید بنائی؟“ روزی نے میری ہدایت کے مطابق چند سیکنڈوں بعد اس کیل والے لڑکے سے پوچھا۔

”کون؟“ روزی نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔
 ”کیل والا فیس؟“ باہر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔
 ”بھائی! قلیٹ کے مالکان کہیں گئے ہوئے ہیں، آپ پھر کبھی آجانا۔“ روزی نے جواب میں کہا۔ اس دوران میری نظر میں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس پر نصب ”میچک آئی“ دیکھ کر میں نے روزی کو ”مکالمہ“ جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے دروازے کے پاس آیا اور میچک آئی سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔
 ”باجی! کوئی بڑی رقم تو ہے نہیں، صرف پانچ سو روپے ہی دیتے ہیں، آپ ہی دے دیجیے۔ میں آپ کو رسید کاٹ دیتا ہوں، ورنہ مجھے دوبارہ پکڑ لگنا پڑے گا۔“ باہر سے آواز ابھری۔ میں تب تک میچک آئی سے باہر دیکھ چکا تھا اور قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے میں نے روزی کو آنکھ کا

”جی ہاں جی! رسید لے لیں۔“ لڑکے نے کہا اور روزی نے دروازہ ذرا سا کھول کر پیسے آگے بڑھائے۔ میں اور کالیا ایک طرف گھوم گئے تھے۔ لڑکے نے رسید بڑھائی اور روزی لے پیسے۔

ٹھیک اسی وقت میں نے لڑکے کے حلق سے ایک عجیب سی آواز دنی دنی کی آواز ابھرتے سنی اور جب تک میں سمجھ بھٹتا، روزی بھی بڑی طرح چیختی تھی، کیونکہ اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور وہ کیبل والا لڑکا روزی کے ساتھ بری طرح ٹکرایا تھا۔ دونوں ہی اندر گرے تھے۔ شاید باہر سے کسی نے لڑکے کی پشت پر لٹا رسید کر ڈالی تھی۔

”ہے لے!“ مجھے کالیا کی متحیرانہ آواز سنائی دی تھی۔ میں خود ایک لمحہ کو بھلا گیا تھا۔ تب ہی میں نے انہی دونوں، موٹی ناک والے، کریمہ صورت اور اس کے ساتھی کو پتو ملیں تھے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

”خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا ورنہ گولیوں سے سب کو بھون دیا جائے گا۔“ اسی کریمہ صورت والے شخص نے اپنا پستول تانے ہی غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور میرا پورا وجود جیسے ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں میری سوچ سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے جبکہ کیبل والا لڑکا واقعی نہیں لپٹے آیا تھا اور ان دونوں حملہ آوروں نے خاموشی سے اسے ”چارے“ کے طور پر آزمایا تھا۔

روزی کے حلق سے خوف زدہ سی چیخ خارج ہوئی تھی ہلکے کیبل والا لڑکا بھی پریشان اور حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب مجھے اپنے ٹھٹھے ہوئے وجود میں ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا۔ کالیا اس پورے ”منظر نامے“ سے پہلے ہی جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے عین وقت پر پھرتی اور چالاک کا مظاہر کیا تھا، شاید یہی وہ وقت تھا جب کیبل والا لڑکے کے حلق سے ابھرتی آواز اس پلے تھی سنی اور پل کے پل خطرہ بھانپنے ہی اس نے گھات لگالی تھی۔

”ذرا بھی کسی نے آواز نکالی تو اسے گولی چاٹ جائے گی۔“

ہم دم بہ خود سے کھڑے تھے۔

”تمہارا دوسرا ساتھی کدھر ہے؟“ کریمہ صورت آدمی نے میری جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ماہم ہی اس نے لاؤنچ سے آگے کمرہ میں ایک نظر بھی اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

”مم..... میرا تو کوئی اور ساتھی نہیں تھا؟ مم..... میں تو اپنی دوست سے ملنے آیا تھا۔“ میں نے چالاکी چلنا چاہی تو اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر کمرہ دی مسکراہٹ ابھری۔ وہ شاید سب کچھ اچھی طرح جان اور پہچان رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ پستول ہاتھ میں لیے نہایت محتاط انداز میں اندر کی طرف کمرہ کی تلاشی لینے کے لیے لپکا۔

”مم..... مجھے تو جانے دو..... میں تو..... میں تو.....“

کیبل والا لڑکا کھٹکھٹایا۔

”جپ!“ کریمہ صورت نے اسے جھڑکا اور اس کی پیشانی سے پستول کی نال لگا دی تو وہ دیں خاموش اور گھٹ کر رہ گیا۔ اس وقت تو وہ ضرور خود کو بری طرح کوس ہی رہا ہوگا کہ کاش! آج کے دن کیبل کی فیس پر لعنت ہی بھیج دیتا اور دوسرا چکر بچانے کے چکر میں ایک لمبے چکر میں پھنس کر رہ گیا۔

میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ کریمہ صورت کا ایک ساتھی کالیا کی تلاش میں اندر جا چکا تھا اور مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ اندر کیا ہونے والا تھا۔ لہذا میں نے اس موٹی ناک والے کریمہ صورت کو ہاتھ میں لگا کر ضروری سمجھتے ہوئے اس سے کہا۔

”کون ہو تم؟ اگر چوری کی نیت سے آئے ہو تو یہاں ایسا کچھ خاص مال نہیں ملے گا تم لوگوں کو۔“

”پانا منہ بند رکھو!“ وہ اندر کی طرف سے نظریں بٹا کر میری طرف گھور کر زبردست ہنسنے میں پولا۔

مجھے اندازہ تو ہو رہا تھا کہ یہ دونوں یقینی طور پر سیٹھ ستار کے پیچھے ہوئے ہی کر گئے ہوں گے جو ہمارے ہی تعاقب میں یہاں تک غالباً روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ ہم دونوں کو یہ گولیوں کا نشانہ بنا کر فو چکر بھی ہو سکتے تھے۔ یہی دھڑکا میرے دل کو متحش کر رہا تھا۔

”اوئے..... رائے! کدھر مر گیا؟“

”رائے“ کی آواز تو نہ آئی البتہ ایک پلیٹ سی فربیس بی (frisbee) کی طرح ایک کمرے سے اڑتی ہوئی آئی اور بڑے زور سے اس کریمہ صورت شخص کی موٹی سی ناک پر لگی۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر بند دروازے سے پشت کے بل جا گیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور یہ سمجھتے ہی کہ یہ کارستانی کسی کی ہو سکتی تھی، میں نے پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص پر جا پڑا۔ میں نے اپنی ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کے گھٹنے کی ضرب اس کے پیٹ پر

رسید کر ڈالی تھی۔ وہ ابھی ناک کی ضرب سے ہی سنبھل نہ پایا تھا کہ میرے گھٹنے والی چوٹ نے اسے درد سے دوہرا کر دیا۔ وہ رکوع کے بل جھکا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دیوبچ کر اسے پیچھے دھکیلا تو وہ سیدھا کھکی کے قدموں کے قریب جا کر۔ یہ کالیا تھا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور سینے پر ہاتھ باندھے اطمینان سے کھڑا سکر رہا تھا۔

اس نے اپنے ایک ہیر کا بوٹ کر یہہ صورت کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا۔

”اپنے اس کانے سینٹھ ستار کو جا کر بتا دینا، جس کے تم لوگ زر خرید کتے ہو کہ اب تیرے اور تیری بدمعاشیوں کے دن گئے جا چکے ہیں۔“ کالیا نے گویا خم ٹھوک کر کہا۔ ”اس طرح کی حرکتیں کرتا رہے گا تو بہت جلد دوسری آنکھ بھی گنوا بیٹھے گا کیونکہ ہم دشمنوں کو ہلاک نہیں انہیں اپنا جیج کر دینے میں زیادہ لطف محسوس کرتے ہیں۔“

اسی وقت رنگ ٹون کی آواز ابھری۔ میرا دھیان اپنے سیل کی طرف گیا تھا کہ کالیا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جگری! اس کی جیب سے سیل نکال کر کال مجھے دے۔“

رنگ اسی سیل کی تھی، جسے کالیا نے فوراً تاڑ لیا تھا۔ میں اس کی تلاشی لینے کے لیے جھکا تو کر یہہ صورت بے چینی سے کسمانے لگا مگر کالیا نے اپنے بوٹ کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھائے رکھا۔ میں نے پھرتی سے اس کی جیب سے موبائل نکال لیا اور ایک نگاہ یوں ہی اس کی اسکرین پر ڈالی تو اس پر ”سینٹھ صاحب“ لکھا ڈپلے ہو رہا تھا۔ میں نے وہ کالیا کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر اسے آنکھ ماری۔ کالیا نے وہ لے کر ایک نظر اس کی اسکرین پر ڈالی اور مجھے بھی جوابی آنکھ مار کر موبائل کان سے لگا لیا۔

”ہیلو سینٹھ صاحب! آپ کی آنکھ کا کیا حال ہے؟“

”لگ..... کون ہو تم؟“ دوسری جانب سے سینٹھ ستار کی چوکتی ہوئی آواز ابھری۔ کالیا نے موبائل کا وائیڈ اسپیکر آن کر دیا تھا شاید.....

”ابے لے..... سینٹھ! ہمیں نہیں پہچانا..... ٹھیک، تو سن لے کان کھول کر تیرے پیچھے ہوئے دونوں کتے اس وقت ہمارے سامنے خاک چاٹ رہے ہیں۔ بول اسے پولیس کے حوالے کر دیں یا پھر خود ہی دھڑن تختہ کر دیں؟ کیا کہتا ہے؟“

دوسری جانب ایک اکی ساٹا چھا گیا، جس کا دورانیہ چند سیکنڈ تو رہا ہوگا۔ پھر اس کی سانپ جیسی پھنکاری آواز ابھری۔

”تم دونوں شیطان بہت جلد اپنے عبرت ناک انہماک پہنچنے والے ہو اور یاد رکھنا، تم نے میری ایک آنکھ ضائع کی مائیں..... میں تم دونوں کو ننگڑا اور اپنا جیج بنا دوں گا۔“ اس ساتھ ہی..... دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”انسپکٹر کامران کا نمبر ملا جگری!“ کالیا نے سیل فون اپنی جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا تو کیبل والا لڑکا غلغلہ زدہ لہجے میں کالیا سے بولا۔

”مم..... مجھے تو جانے دو..... میرا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”ابے چپ تو!“ کالیا نے اسے جھڑکا۔ روزی کا سنبھل گئی تھی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کالیا سے پوچھا۔

”اس کا دوسرا ساتھی کدھر ہے؟“

”اندر ہے، میں نے اسے اٹھا غفلت کر ڈالا ہے۔“ کال نے جواب دیا پھر قریب کھڑی روزی سے بولا۔

”تم اندر جا کر اس پر نگاہ رکھو، تھوڑا ابھی بلے جلے تو بتانا۔ ویسے دو ایک گھنٹے کہیں بھی نہیں گئے۔ وہ اتنی جلدی اب نہیں ہوش میں آنے والا۔“

”دل..... لیکن، پلیز پولیس کو فون مت کرنا۔ پولیس یہاں آئے گی تو میری سبیلی پریشان ہو جائے گی اور پتا نہیں پولیس کے چکر میں نہ وہ پڑ جائے۔“ روزی نے ہانپا منت کی۔ میں نے پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سیڑ کر کال کی طرف دیکھا تو وہ روزی کو کسبھاتے ہوئے بولا۔

”اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟ آج نے کوئی جرم تو نہیں کیا، دو در اندازوں کو پولیس کے حوالے کر دیا، کہانی ختم..... لیکن اس طرح آپ کو.....“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے کالیا!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے روزی کی تائید میں کہا۔ ”یہ خود یہاں ایک گھنٹہ کے ساتھ رہ رہی ہے اور بعد میں اپنی اس سبیلی کو یہ جواب ہوگی کہ یہاں ہوا کیا تھا اور وہ سبیلی اس سے ہمارے بارے میں پوچھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور یہاں کیسے اور کیوں آئے تھے؟ یوں اس کے اپنی سبیلی سے تعلقات خراب ہونے کا امکانات ہوں گے۔“

کالیا میری بات پر ہنسا پھر اسی انداز میں بولا۔ ”میرے نزدیک یہ بھی کوئی اہم باتیں نہیں ہیں جگری“

پھر وہ ذرا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے... روزی بولا۔ ”روزی صاحبہ! جہاں تک میں سوچ رہا ہوں، وہیں تک“

ہمیں سب انسپکٹر نعیم شاہ کی آمد کا انتظار تھا۔ انسپکٹر کامران نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے اسٹنٹ کو جلد ہی چند پولیس اہلکاروں کے ساتھ یہاں روانہ کرنے کی ہدایات دے دیا ہے۔ ہمیں ٹیلی ہوگئی تھی۔

”مجھے اب یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی۔“ چند عانیوں کی خاموشی کے بعد روزی نے کہا۔ اب اس کے لہجے اور آواز میں کسی ڈیر یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ البتہ ایک ذمہ دارانہ سی پریشانی ضرور موجود تھی۔

”اب تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔

کالیا خاموش تھا۔ روزی جواباً ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”دوبی سوچ رہی ہوں۔ کہاں جاؤں اب؟“

اس کی بات نے مجھے بھی کچھ پریشان سا کر دیا تھا۔

”اس فلیٹ میں تمہاری سہیلی کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟“ میرا مطلب ہے کوئی فیملی، ماں باپ، شوہر وغیرہ؟“ مجھے مشکور دیکھ کر کالیا نے پوچھا۔

”زینہ لاہور کی رہنے والی ہے۔ یہاں کراچی یونیورسٹی میں کوئی کورس کر رہی ہے۔ ایک کلاس فیلو بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔“ روزی بتاتے لگی۔ ”دونوں مل کے اس فلیٹ کا کرایہ دیتی تھیں۔ پھر کسی وجہ سے اس کی کلاس فیلو نے یہ فلیٹ چھوڑ دیا اور ہوسٹل میں رہنے لگی۔ ایسے میں، میں نے زینہ کے ساتھ شیئر کر لیا تھا۔“

”زینہ لاہور میں رہتی ہے اور تم کراچی میں۔ دونوں کی دوستی کیسے ہوگئی؟“ کالیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ میری بچپن کی سہیلی ہے اور پہلے یہ لوگ کراچی میں ہی رہتے تھے۔ پھر یہاں کے حالات خراب ہوئے تو یہ لوگ لاہور چلائے، ہمیں بھی پھرنے کا دکھ ہوا تھا مگر ہم نے رابطہ اور بچپن کی دوستی کو قائم رکھنے کا عہد تو کر رکھا تھا۔“ روزی نے بتایا۔

”تب پھر تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، تم ادھر ہی رہو۔“ کالیا نے بالآخر اسے اپنا مشورہ دے ڈالا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن اس تازہ ناخوشگوار واقعے کے بعد مجھے ڈر ہے وہ گھبرا نہ جائے کیونکہ وہ یہاں کراچی میں صرف اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے عارضی طور پر آئی ہوئی ہے، کوئی ریسرچ کا کام ہے، پھر واپس چلی جائے گی۔“

اپنا بھی دماغ استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ جب اس میں سر دے ہی دیا ہے تو مسلوں سے کیوں ڈرنا۔ پہلی بات تو یہ کہ تم۔۔۔ اس واقعے کے بعد یہاں زیادہ دیر اب رہ لی نہیں سکتیں۔ دشمن تمہاری کمین گاہ سے واقف ہو چکے ہیں۔ انہیں اگر چھوڑ دیں گے تو بھی وہی بات ہوگی۔ پولیس کے حوالے تو ان دونوں کو یوں بھی کرنا ہی ہوگا تاکہ سیٹھ نار کے گرد قانونی گھبراہٹک ہوتا رہے۔ جانتا تو ہوں میں یہ لڑوی حقیقت کہ وہ انہیں رہا کر والے کا لیٹن ایک بات سیٹھ نار کے خلاف قانونی طور پر تو ریکارڈ میں آئی جائے گی تاں ہمیں مستقبل میں فائدہ پہنچا سکتی ہے۔“

کالیا کی اس صراحت پر میں نے بلا دیر انسپکٹر کامران سے رابطہ کر لیا۔ اس روز ٹرک والے واقعات کے بعد سے ہی انسپکٹر کامران سے اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ سر دست میں نے اسے مختصر حالات کے بارے میں بتا دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”آ رہا ہے وہ؟“ کالیا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ”وہ کسی اور اپریشن میں مصروف ہے، وہ سب انسپکٹر نعیم شاہ کو پولیس نفری کے ساتھ بھیج رہا ہے، میں نے اسے یہاں کا ایڈریس سمجھا دیا۔“

اس کے بعد روزی نے ہمیں رسی تلاش کر کے دی جس میں ہم نے کبیرہ صورت شخص کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور لپٹے ہوئے اسی کمرے میں لے آئے جس پر کالیا نے اس کے دوسرے ساتھی کو بھی رتن بستہ حالت میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی پہلی سے خون کی لکیریں بے پیرہ کر جم گئی تھیں اور وہ ہوش میں آکا تھا۔ پھر اپنے ساتھی کو بھی اسی حال میں دیکھ کر وہ پریشان بالظر آئے لگا۔

کیل والے لڑکے نے ایک بار پھر ہم سے التجا کی کہ ہانے دیا جائے مگر کالیا نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے دھمکی دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اگر دوبارہ لاؤا اسے بھی باندھ کر ایک طرف کونے میں ڈال دیا جائے گا۔ ہم سب دوسرے کمرے میں آ گئے۔ کیل والے لڑکے کو ہم نے اسی کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر حکم دیا تھا جہاں ان دونوں دھماکوں کو رکھا گیا تھا، اس کا دروازہ باہر سے بند کرنے کے بعد ہم قیام دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

دونوں حملہ آوروں کی جامہ تلاشی لینے کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔

”تمہیں اسے پوری بات بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ کالیا نے کہا۔ ”اس ناخوشگوار واقعے کو عام سی ڈکیتی کی واردات کا کہہ دینا اور بس! اس میں بھلا تمہارا کیا قصور؟“

”ہاں! یہی سوچا ہے میں نے کہ اسے اصل حقیقت بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ وہ بھی کالیا کے مشورے پر صادر کرتے ہوئے گوگوسے لہجے میں بولی۔

”ابھی زریہ کہاں گئی ہوئی ہے اور کب تک یہاں آجائے گی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت روزی سے پوچھا۔ ”کیونکہ حملہ آوروں کے ساتھ ہم دو اجنبیوں کو بھی وہ یہاں دیکھ کر اسے دل میں کسی لیے چکر کا شہر تو ضرور ابھرے گا۔“

”میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے ہی ایک تو یہ معاملہ منٹ جائے اور تم دونوں بھی اسے یہاں موجود نہ ملو تو میں اسے سنجال لوں گی۔“

”میں نے پوچھا تھا کہ اس کے کب تک لوٹنے کے امکانات ہیں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”میرا خیال ہے ابھی تو اس کے آنے میں چند گھنٹے ہیں۔“ روزی نے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ انسپکٹر نعیم شاہ ابھی تک نہیں پہنچا؟“ کالیا نے اپنی رسوا واپس پر نظر ڈالتے ہوئے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”آتا ہوگا، ابھی میرا خیال ہے یہ مشکل نصف گھنٹہ ہی گزر رہا ہے۔“ میں نے کہا تو کالیا طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”آدمے کھٹنے میں تو ایسی وارداتوں میں آدمے درجن لوگ مرکبپ جائیں۔ ہماری پولیس چائے پانی پینے کے بعد ہی آرام سے آتی ہے۔“

”یہی بات نہیں یار!“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”انہیں تسلی ہوگی کہ وارداتیوں کو ہم نے اپنی گرفت میں تو لے لی رکھا ہے۔“

”ہاں ضرور اگرچہ یہ پولیس کے کرنے کا کام تھا۔“ کالیا کی تکی جوں کی توں تھی۔

”ہم شہریوں کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں میرے جگری یار! پولیس کے پاس بھی تو کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہوتا۔“ میں ہنسنا۔ روزی بھی ہماری باتوں سے غلطوظ ہو کر مسکرا رہی تھی۔ اسی انداز میں بولی۔

”گلتا ہے تم دونوں خاصے پرانے اور گہرے دوست ہو۔“

اچانک ہی ایک کھٹکے پر ہم چوکنے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ کہتے ہوئے روزی اٹھنے لگی تو کالیا نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور ایک دم اس کے پستول نکال لیا اور تیر کی طرح کمرے سے نکلا۔

یہ کمرہ کچھ ایسے رخ پر تھا کہ اس کے کھلے دروازے سے صرف لاؤنچ ہی نظر آتا تھا۔ بیرونی دروازہ نہیں۔ کالیا کے پیچھے میں بھی پھرتی کے ساتھ لپکا تھا۔ لاؤنچ میں قدم رکھتے ہی میں نے سب سے پہلے فلیٹ کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے بند پا کر میں نے ساتھ والے کمرے پر لاٹھا ڈالی۔

دروازہ کھلا پڑا تھا۔ بھینا کالیا اندر گیا ہوگا۔ میں نے بھی اسی جانب قدم بڑھا کر اندر ابھی کمرے کے دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اندر سے دوڑتا آتا ہوا کالیا مجھ سے ٹکرایا۔

”ابے لے..... وہ بھاگ گئے..... جگری!“ وہ مجھ سے ٹکرا کر فوراً سنبھل کر بولا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ مجھے ایک شاک سا لگا۔ پہلے تو کالیا کی بات پر یقین ہی نہ آیا۔ آتا بھی کیسے؟ سارے دروازے بند تھے، حملہ آور بھی بندھے ہوئے تھے تو پھر وہ نکلے کیسے؟ اپنے ”مشکل“ سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے میں مذکورہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اسی کمرے کا ایک دروازہ باہر مختصر سی بالکونی میں کھلتا تھا اور جس رسیوں سے دونوں حملہ آوروں کو باندھا گیا تھا اسی رسی کو انہوں نے بروٹس کار لاتے ہوئے بالکونی سے نیچے چھلانگیں لگائی تھیں، ذہن میں ابھرنے والے ایک اور لامحالہ سوال کا جواب مجھے ازخود سوچنا پڑا جو اتنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

میں غلطی ہماری ہی تھی۔ ہم نے کیبل والے لڑکے کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے اور دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ اسے بھی انہی خطرناک حملہ آوروں کے ساتھ ہی کمرے میں جھپوڑ دیا تھا۔ دونوں حملہ آوروں نے بھینا اس لڑکے کو پٹیاں پڑھائی ہوں گی کہ پولیس کے چکر میں ان کے ساتھ وہ بھی چھٹس جائے گا، مفت کی ”قلم“ گلے پڑنے سے بہتر ہے کہ وہ سب یہاں سے فرار ہو جائیں اور لڑکے نے ان کے گلے بند کھول ڈالے ہوں گے۔ اس کے بعد دونوں اسی رسی کو استعمال کر کے بالکونی سے نیچے کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ سب پل کے پل سوچنے کے بعد میں نے بھی ماہ

۱۱۱ دی تھی لیکن باہر گیت پر پہنچتے ہی میں نے کالیا کو ہاتھ لگا ہوئے واپس آتے دیکھا۔

”چوٹا نکالیا کم بختوں نے۔“ وہ ہنپتے ہوئے بولا۔
”اس کیبل والے لڑکے نے یہ کام خراب کیا ہے۔“
میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”بھئی تو ہم نے جھڑ مارا تھا جگری؟“ وہ بولا۔ ”اب پتا لیں وہ اس لڑکے کو کبھی قربانی کا بکرا بنا کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں یا پھر.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا، کیونکہ اسی وقت ہمیں سائرن کی آواز سنائی دی۔
”دھت تیری کے اب یہ کیا کرنے آئے ہیں؟“ کالیا لے جھلا کر بولا۔

”یہ اسی وقت ہی آتے ہیں، جب مجرم اپنا کام کر کے پھر ہو جاتے ہیں۔ چلو ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں لے کہا۔

ہم گیت کی طرف بڑھے اور لوگ بھی جمع ہونے لگ گئے۔ پولیس کی لمبی سی موہاں گاڑی تھی، جس کے ڈرائیور لیبن سے ایک چھریے جسم کا دروازہ قامت شخص نکلا تھا۔ باقی پولیس اہلکار بھی کدڑے مار کے نیچے آئے تھے۔ میں نے اس چھریے جسم والے شخص سے ہاتھ ملایا اور پھر اہلکاران کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا تعارف کالیا سے ہی ”شیراز“ کی حیثیت سے کروایا اور پھر وہیں کھڑے لڑے اسے ساری بات بتادی۔ وہ اپنے ہونٹ سمجھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد ضروری کارروائی نمٹائی، بیان لیا اور چلا گیا۔

میں اور کالیا بھی اوپر آگئے۔ روزی پریشان اور متوحش نظر آرہی تھی۔
”سب کچھ غارت چلا گیا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں ہی ہلنا چاہیے۔“ کالیا بولا۔

”روزی کا کیا کریں؟ کیا یہ ادھر ہی رہے گی؟“ میں لے کالیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم انپکٹر کمران کو فون کر کے پہلے تازہ صورت لال سے آگاہ کرو!“ اس نے کہا۔ ”اور یہ بھی کہہ دینا کہ وہاں سے تو روزی کی حفاظت کے لیے دوسرا دھلکار پولیس والوں کو بھی یہاں مستقل طور پر تعینات کرنے کا بندوبست کرنا۔“

مشہور شاعر مرزا بقی بیگ مائل کا اصل وطن دہلی تھا لیکن ملازمت کی وجہ سے جے پور میں جا بسے تھے۔ دہلی تشریف لاتے تو دہلی کے ممتاز لوگوں سے ملاقات فرماتے۔ ایک روز حکیم اجمل خاں کے ہاں بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب نے فرمائش کی۔ ”حضرت کچھ سنائیے۔“ مائل صاحب نے غزل شروع کی، مطلع تھا:
اس شوخ کا جو نام نہ آتا زبان پر
مسجد میں لوگ آ ہی تو جاتے اذان پر
مائل صاحب حکیم صاحب سے قریباً اٹھارہ برس بڑے تھے، حکیم صاحب نے بزرگی کا لالچ نہیں کیا اور اس مطلع کی داد نہیں دی۔ مائل صاحب نے دوسرا مطلع پڑھا:

حیرت ہو کیوں نہ آدم خاکی کی شان پر
ایک مشت خاک چھانک دوں جہان پر
اس مطلع کی حکیم صاحب نے دل کھول کر داد دی اور پھر جتنے شعر پڑھے۔ ایک ایک شعر پر حکیم صاحب کی زبان سے سبحان اللہ اور صل علی نکلا۔ حکیم صاحب خود بلند پایہ شاعر تھے اور نہایت سخن سنج تھے۔ غزل ختم ہوئی تو مائل صاحب نے پوچھا۔ ”پہلا مطلع آپ نے کیوں ناپسند کیا۔“ حکیم صاحب نے کہا: ”تعلیق شعر میں شوخ کا لفظ مجھے ٹھنکاتا ہے۔ شوخ اور شریر ہم معنی ہیں۔ مائل صاحب نے فوراً شوخ کی جگہ پاک کر دیا:

اس کا جو نام پاک بھی آتا زبان پر
مسجد میں لوگ آ ہی تو جاتے اذان پر
حکیم صاحب نے پاس ادب کا مظاہرہ جمع عام کو دکھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ اس وقت وہاں حکیم صاحب اور مائل صاحب کے سوا تیسرا فقط اللہ تھا۔
مرسلہ: نعیم شاہ۔ شیخوپورہ

ہم اندر کمرے میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے سیل فون پر انپکٹر کمران سے رابطہ کرنا چاہا مگر وہ شاید مصروف

ہونے کی وجہ سے اٹینڈ نہیں کر پارہا تھا۔

”تم دونوں میری فکر نہ کرو۔“ روزی ہمیں الجھن آمیز نظر میں پا کر بولی۔ ”اتنی جلدی دشمن دوسرا وار کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ تب تک تم اسپیکر کا مرامن سے رابطہ کر کے اسے سب بتا دینا۔“

میں نے اور کالیا نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور پھر وہاں سے رخصت ہوئے۔

کالیا بانیگ چلا رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں محو تھا۔ مجھے بیک وقت کئی کام نمٹنا تھے۔ عاصمہ کی واپسی کی سلی ہوئی تھی میرا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ دشمنوں کے خلاف کافی کچھ کرنے کا موقع ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا اور میں نے عزیز خان کے خلاف بھی قانونی کارروائی نمٹانے ہوئے اے ایس پی خادم حسین سے رابطہ کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ ٹوبہ کا ذکر اس سے کرنے کے بعد میں اس سے بچنے کی راہ تلاش نہیں دینا چاہتا تھا۔

”کدھر چلنا ہے جگہ؟“ کالیا نے مین روڈ پر آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

”اے ایس پی خادم حسین کے ہاں!“ میں نے کہا اور وہ چونک کر بولا۔

”ابے لے..... جگہ! ہمیں عاصمہ بہن کے سلسلے میں انہیں اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔“

”ابھی چل کر لے لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ پولیس افسر ہے جگہ! کوئی عام آدمی نہیں۔ اسے کیا بتاؤ گے کہ ہم نے ذاتی طور پر یہ کارروائی کر کے عاصمہ بہن کو اغوا کاروں سے چھڑا لیا ہے؟“

”مگر وہ تمہارے استاد بھابھا سے اس کے دوستانہ تعلقات ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر ایک فوری خیال کے تحت اس سے بولا۔ ”ایک کام کر کالیا!“

”ابے لے..... دس کام بول۔“

”پہلے تیرے اڈے پر چلتے ہیں، استاد بھابھا سے ملے ہیں۔ دیکھیں وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔“

”ایک دم برابر بولا۔“ کالیا موڈ میں تھا۔ ایسے وقت میں فلمی ڈائلاگ مارتا تھا۔

ہم اڈے پر پہنچے۔ استاد بھابھا سے اے ایس پی خادم حسین سے ایک نئے مسئلے کے سلسلے میں بات کرنے کا کہا تو اس نے بھی پہلا سوال ہم سے یہی پوچھا۔

”وہ چھوٹے ہی تم دونوں سے پہلا سوال مٹو یہ

(عاصمہ) کے بارے میں ہی پوچھتے گا۔“

”استاد! یہی مشورہ تو ہم آپ سے کرنے آئے ہیں، کیا کیا جائے پھر؟ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہم نے خود ہی.....“ کالیا نے استاد بھابھا سے یہ کہتے ہوئے خود ہی دانستہ معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو استاد بھابھا ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”وہ برا تو مانے گا لیکن..... تم اس سے جا کر پہلے بات کر کے دیکھو۔“

”آپ کے اس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تعلقات تو اچھے ہی ہیں لیکن بہر حال وہ اپنی ٹانگ اونچی ہی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پولیس افسر جو ہوا۔“

”اسے چھوڑو استاد پھر!“ کالیا نے کہا۔ ”لیکن معاف کرنا استاد! میں سمجھتا ہوں کہ اس کے زیادہ اچھے تعلقات ضمیر شاہ سے ہیں اور ضمیر شاہ کو میں نہیں پسند کرتا نہ ہی وہ مجھے.....“

کالیا نے آخر میں صاف گوئی سے کہا تو میں نے وزیدہ سی نظروں سے استاد بھابھا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کالیا کی بات کا برا ماننے بغیر مسکرا کر بولا۔

”جانتا ہوں میں تم دونوں کے دلوں میں پلنے والی سرو جنگ کے بارے میں۔ گردہ میں تم دونوں کی کہاں بنتی تھی؟“

”وہ خدا تھا۔“ کالیا نے کہا۔

”وہ تمہاری وجہ سے گردہ سے نکلا تھا۔“ استاد بھابھا نے صاف لہجے میں کالیا سے کہا۔

”اور استاد! تم ہمیشہ اسی کی طرف داری کیا کرتے تھے۔“ کالیا بھی آج اپنے اندر کا غبار نکالنے پر تلا تھا۔

”اس لیے کہ ہمیشہ تم ہی غلطی پر ہوتے تھے۔“

”اس کے مشوروں نے کب ہمیں فائدہ پہنچایا تھا استاد! آخر کار معاملہ سلجھانے کے لیے آپ مجھے ہی بھیجتے تھے۔“

”کیا بات ہے کالیا! آج بہت تنہا ہو رہے ہو؟“ استاد بھابھا سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے موضوع دوسری جانب موڑنے کی کوشش چاہی۔

میں اندر ہی اندر بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے بہت سے کام ترنت نمٹنا تھے اور یہ دونوں آپس کی بحث میں الجھ گئے تھے۔ تب ہی میں نے ہولے سے کھنکھار کر مداخلت کی اور کہا۔

”میرا خیال ہے ہم کچھ اور سوچ لیتے ہیں، ہمیں ضمیر

میں نے اپنا سرائیباں میں ہلاتے ہوئے اس کی بات برصا دکیا اور ابھی ہم روانہ ہوتا ہی چاہتے تھے کہ میرا سیل ٹنگنٹا۔ یہ انسپکٹر کامران کی کال تھی۔

”جناب! السلام علیکم! میں نے فوراً ادب سے سلام کیا۔ اس نوجوان پولیس افسر کا میں احترام کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک ایماندار اور دلیر افسر تھا۔ میرا سلام اس کی فرض شناسی کو تھا۔

”تم اور تمہارا ساتھی شیراز اس وقت آسکتے ہو؟ میں آفس میں ہوں۔“ اس نے کہا۔

”جناب! ہم آپ ہی کی طرف آرہے تھے۔“ میں نے چھوٹے ہی کہا۔

”بس! پھر بلا دیر چلے آؤ۔ باقی باتیں ملاقات پر۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”اے لے..... جگری! اسے کہتے ہیں بیٹھے بٹھائے کام ہوتا۔“ کالیا خوش ہو کر بولا۔

ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ لمبر پہنچ کر ہم نے انسپکٹر کامران سے ملاقات کی وہ ہمارا ہی بے چینی سے منظر تھا۔ ”میں اسی قاتب نامی شخص کو گرفتار کرنے نکلا تھا۔“ اس نے بتایا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”مگر اس کے لیے مجھے ایف سی ایم سے خصوصی وارنٹ درکار تھے، میں اسی تک دو میں تھا اور موسمیات والی واردات تک بروقت نہ پہنچ سکا۔“

یہ قسم شاہ۔ وہ ایک لمحے توقف کے بعد ہم دونوں کے بشروں میں نظر ڈال کے مستفسر ہوا۔

”وہ دونوں حملہ آور بھگے کس طرح؟“ میں نے کامران کو ساری کھانا ڈالی، جسے سن کر وہ پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سیکڑ کر رہ گیا۔ میں نے فوراً کہا۔

”تو پھر آپ نے قاتب نامی اس آدمی کو گرفتار کر لیا؟“ ”ہاں!“ اس نے کہا اور پھر تیل بجا کر کسی کو بلایا اور اسے قاتب کو لانے کا کہا۔

اس کے ذرائعی دیر بعد دو اہلکار قاتب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔

”یہ تھا وہ شخص؟“ انسپکٹر کامران نے ہم سے پوچھا۔ میں نے گھوم کر اس شخص کی طرف دیکھا جس سے میں نے ڈاکٹر کی حیثیت اور گاہک بن کر بلیڈمون کے دفتر میں ملاقات کی تھی، فوراً اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

شاہ اور اے ایس پی خادم حسین کا چہرہ ہی گلوڑ کر دینا چاہیے۔ ”اجازت دو استاد! پھر ملتے ہیں۔“ کالیا میری بے چینی بھانپ کر اٹھ کھڑا ہوا تو شاید استاد بھابھا کو بھی ہماری پریشانی کا احساس ہو گیا۔ دوستانہ حکم سے بولا۔

”بیٹھ جاؤ آرام سے تم دونوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کالیا نے مجھے آنکھ ماری تھی۔

”جیو! بھابھا بول رہا ہوں۔ ضمیر! ایک کام کرو یا! میں نے جس کام کے لیے کالیا اور اس کے دوست نعمان کو تمہاری طرف بھیجا تھا..... اسی سلسلے میں اے ایس پی صاحب سے دوبارہ ملنا تھا۔ آج ہو سکتی ہے ان سے ملاقات؟“

میں نے کن آنکھوں سے کالیا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بیزار سا نظر آ رہا تھا۔

”کیا کہا؟ نہیں ہو سکتی، کیوں؟ کہاں ہیں وہ؟ اچھا! چلو کوئی بات نہیں اور تو سب ٹھیک ہے نا؟ آؤ یا! ابھی اڑے پر، بڑے دن ہوئے ملاقات کو..... چلو..... ٹھیک ہے۔“

استاد بھابھا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر ایک اور نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”ہاں، شکور! بارہ ایک کام تھا تم سے..... کوئی پولیس افسر ہے جان پہچان کا..... ایماندار اور ذمہ دار قسم کا..... بابا..... صبح کہا یا! ایماندار ہو گا تو بھلا ہم جیسوں سے رابطے میں رہے گا، یہ بھی تم نے خوب کہی..... ڈی ایس پی ریحان؟ ارے..... اسے تو شاید میں جانتا ہوں کہیں یہ وہی تو نہیں۔“

استاد بھابھا اپنی بات کرتا رہا اور کالیا نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

”اپنا استاد بھابھا! اب پہلے جیسا چکے والا نہیں رہا ہے۔“ کالیا نے اپنی بانیگ سنہالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”کہاں تو پہلے خود ہی سارے کام کیا کرتا تھا۔ بڑے دھڑلے سے جس سے جا بے ملتے پہنچ جاتا تھا مگر اب صرف فون پر ہی کام چلانے کی کوشش کرتا ہے۔“

”اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ مجھے اس کے استاد بھابھا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”اب ایک ہی ہمارا دوست ہے وہی انسپکٹر کامران! اسی سے ہی مل کر کچھ مدد لیتے ہیں۔“ کالیا نے جواب دیا۔ ”تیری تو اس کے ساتھ اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

”جی ہاں، جناب! میرا خیال ہے اب رحیم بخش کو بلا کر اس کی شناخت کروادیں تو یہ معاملہ ادھر ہی منٹ جائے اور کارروائی آگے بڑھ سکے۔“ میں ایک دم جوش میں آ گیا۔

”ثاقب حیران و پریشان نظروں سے بھی میری طرف بولا۔ ”انسپکٹر کا مران کی طرف کئے جا رہا تھا آخر احتجاجاً بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ اور میں تو ان دونوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ انسپکٹر کا مران نے میز سے سیاہ رنگ کا رول اٹھا کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم شاید اس آدمی کو تو ضرور ہی پہچان لو گے جسے ابھی تمہارے سامنے پیش کیا جانے والا ہے۔“ بڑے ڈرامائی انداز میں یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کا مران نے ایک الٹا رنگ کا مخصوص اشارہ کیا۔ میں اور کالیا بھی چند ثانیوں کے لیے حیران ہوئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں چوکنے اور میں تو بے اختیار اس نوجوان انسپکٹر کا مران کی چابکدستی اور زیرک دماغی کا دلی طرح معترف ہو گیا تھا۔ کیونکہ ثاقب کے سامنے جن دو افراد کو پیش کیا گیا تھا وہ احسان جمالی گڈز کا منشی نواز اور ملوک کا سالار رحیم بخش تھے۔ تب ہی میں نے انسپکٹر کا مران سمیت ثاقب کے چہرے کو تیز اور بھانپتی ہوئی نظروں سے گھورا۔ ان دونوں مذکورہ اشخاص کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزرے تھے اور ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ بھی ست کر رہ گیا تھا۔

”ان دونوں کو تو تم اچھی طرح پہچان رہے ہونا!“ انسپکٹر کا مران نے اس کی طرف گھور کر پوچھا۔

”آں..... سن..... نہیں تو.....“ ثاقب بوکھلا کر بولا۔ ”تمہارا انکار بتا رہا ہے کہ تم انہیں جانتے ہو۔“ انسپکٹر کا مران اس کی طرف تیزی نظروں سے گھورتے ہوئے طنزیہ بولا۔ ”مگر..... یہ دونوں تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ منشی نواز اور رحیم بخش کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا تم اسے جانتے ہو؟“

”جی جناب! اچھی طرح جانتا ہوں میں۔“ رحیم بخش نے فوراً جواب دیا البتہ منشی نواز خاموش رہا۔ میں اس کی خاموشی کی وجہ جانتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے بھی اب انکار کی کوئی گنجائش انسپکٹر کا مران نے نہیں چھوڑی ہوگی۔ لہذا وہ اسی کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

”اور..... منشی نواز! تم کیوں خاموش ہو؟“

”جی جی..... جناب! میں بھی اسے جانتا ہوں۔“

”کمال ہے ثاقب صاحب! تم ان دونوں کو نہیں جانتے اور یہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔“ انسپکٹر کا مران دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ ”یاد رکھو ثاقب! دو گواہان کے سامنے تم جھوٹ نہیں بول سکتے۔ یہ معاملہ کسی عام آدمی کے ایکسٹنٹ کا بھی نہیں ہے۔ ہائی کورٹ کی ایک وکیلہ ہے وہ۔ عدالت میں تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے یہ دو گواہ کافی ہوں گے اور پھر تم نہیں بچ سکو گے۔ جھوٹ بولنے کا جرم الگ تمہارے گلے پڑے گا۔“

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مسلسل تذبذب پریشانی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر کا مران نے رحیم گل اور منشی نواز کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر سیاہ رول کو اپنی بائیں ہاتھ کی پتیلی پر مارتا ہوا اپنی کرسی پر جا کے براجمان ہو گیا۔ پھر ثاقب کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم اب بچ نہیں سکتے۔ سینٹ ستار کتا ہی بڑا دولت مند اور اثر و رسوخ والا آدمی ہو، وہ بھی تمہیں اس مقدمے سے نہیں بچا سکتا۔ تکی تختہ دیتا ہے وہ تمہیں؟“

”پچاس ہزار۔“ اس نے بہ مشکل جواب دیا۔

”پچاس ہزار کی تنخواہ کے لیے تم ایک جھوٹ بول کر خود کو لاکھوں کے جرمانے کی سزا میں بھی پھنسانے والے ہو اور جو جسمانی سزا تمہیں ہوگی، وہ الگ بھگتنا پڑے گی تمہیں۔ اب بھی تم نہیں مانتے تو میں تمہارا چالان تیار کر نے لگا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں صرف استعمال کیا گیا ہے اور قربانی کا بکرا بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ تم ایک پروفیشنل آدمی ہو اور تمہارا ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

انسپکٹر کا مران نے آخر میں اس پر ایک نفسیاتی داؤ آرمایا تھا۔ اس کی عقلی نظروں نے شاید بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ثاقب فوراً بول پڑا۔

”جج..... جناب! انسپکٹر صاحب! میں واقعی ایک شریف آدمی ہوں، بل..... لیکن میں اپنے پاس کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ آپ مجھے ایک سمجھدار اور بھلے ماس آدمی دیکھتے ہیں۔ میرا قصور صرف اسی قدر ہے کہ میں نے پاس کے حکم پر عمل کیا اور یاسر نامی ایک شخص کو احسان جمالی گڈز میں نوکری پر رکھوایا۔ وہاں اس نے کیا کرنا تھا، اس کا مجھے بالکل بھی علم نہ تھا۔ یہ تو بعد میں اخبارات میں اس ایکسٹنٹ کی خبر پڑی تو میں ملوث تھا تھا اور پاس سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں

لے مجھے یہ سب بھول جانے کا حکم دیا۔ تب سے میں خود بھی کلک گیا تھا کہ ایسے خطرناک آدمی تو کبھی چھوڑ دوں گا۔
”پاس سے مطلب بیوسومون بلڈرز کا سیٹھ ستار ہی ہے
یاں؟“

”بالکل جناب! وہی ہے۔“ ثاقب نے گردن کو اٹھاتے میں جھنجھکی دی۔
”سب بیان تم عدالت میں دو گے۔“
”مجھے کوئی اعتراض تو نہیں جناب! لیکن ڈر ہے کہ
اس میرے خلاف ہو جائے گا اور مجھے نقصان پہنچانے کی
کوشش کرے گا۔“

”تمہارے بیان اور اس اہم کیس کے بعد وہ قانون
کے کٹھنے میں آجائے گا۔ پھر وہ نہیں بچے گا۔ باقی اس سے تحفظ
کی میں نہیں ضمانت دیتا ہوں۔ تم اگر میری ہدایات پر عمل کرو
تو خطرے سے بچ رہو گے۔“

”مجھے منظور ہے جناب!“ وہ جھٹ سے بولا۔ اس کے
بعد انسپکٹر کامران نے یاسر کے متعلق پوچھا، جس پر اس نے
لاٹلی کا اٹھار کرتے ہوئے یہی بتایا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا،
وہ بھینا سیٹھ ستار کا ہی آدمی تھا۔ اس کی تلاش جاری تھی۔ تاہم
انسپکٹر نے ثاقب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس نے کیا کرنا تھا۔
وہ اسے چھوڑ رہا تھا، اس شرط کے ساتھ وہ اپنے آفس جا کر یہی
بتائے کہ اسے غلط فہمی میں پولیس لے گئی تھی اور بعد میں اسے
چھوڑ دیا گیا تھا۔

”اب یہ ہمارے لیے ایک خبری حیثیت رکھے گا۔“
ثاقب کے جاتے ہی انسپکٹر کامران ہم سے مسکرا کر بولا۔ ”اور
اسی کے ذریعے سے ہم یاسر کو بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ
بھینا سیٹھ ستار کے رابطے میں اب بھی ہوگا اور یہ یعنی ثاقب،
سیٹھ ستار کی بغل میں رہتے ہوئے اس کی لٹکا ڈھانے گا۔“

انسپکٹر کامران کی پلاننگ پر میں مطمئن تھا مگر جانے کیا
بات تھی کہ مجھے کالیا کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم وہ
خاموش ہی تھا۔ میں نے انسپکٹر کامران سے عزیر خاں کے سلسلے
میں بات چھیڑ دی۔ اس کے لیے اس نے مجھ سے یہی کہا کہ
جہاں منتقلہ ٹوبہ کا کیس داخل ہے بہتر ہوگا کہ اسی تھانے کے
اچارج سے رابطہ کیا جائے۔

”ختمہ کریمی کی حدود کے تھانہ انچارج سے اگر آپ کی
کوئی دعا سلام ہو جاتی تو کام ہمارا آسان ہو جاتا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ وہاں میرا کوئی جان پہچان کا آدمی
نہیں۔“ انسپکٹر کامران بولا۔ ”لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو؟

کیس مضبوط ہے، تم نے عزیر خاں کے خلاف موثر ”ہوم
ورک“ کر رکھا ہے تو کیا پریشانی ہے؟“

”پریشانی یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ عزیر خاں بھی کسی معمولی
آدمی کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ کے ایک گھٹھ کے بڑے جاگیردار کا
لاڈلہ چشم و چراغ ہے۔“ اس بار کالیا نے کامران سے کہا۔

”بات سمجھ رہا ہوں میں تمہاری۔“ کامران بولا۔
”تھانہ انچارج یا پولیس افسر کوئی بھی ہو لیکن ساری بات کا
انحصار فریادی کی طرف سے کیے گئے وکیل کا ہوتا ہے۔ آپ
ایسے سے وکیل کا بندوبست کر لیں۔ یہی صورت ہے۔“

”ہم.....“ میں نے پرسوج انداز میں اسے ہونٹ
سکڑ لیے۔ اس کے بعد میں نے کالیا کی طرف دیکھا۔ ”پتلی؟“
”ہم دونوں انسپکٹر کامران سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے
اور تھانے کے احاطے میں کھڑی اپنی بایک کے قریب آ گئے۔
”کیا بات ہے کالیا! تم ثاقب والے معاملے میں کچھ
غیر مطمئن سے نظر آ رہے تھے، کوئی خاص وجہ؟“

اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ہونٹوں میں
داب کے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔ پھر ایک کش لیتے ہوئے
بولا۔

”پتا نہیں کیا بات ہے جگر! میرا دل اس ثاقب
پر اعتماد کو مائل نہیں ہو رہا۔“
”وہ تو مجھ سمیت انسپکٹر کامران کو بھی اس پر ابھی کامل
بھروسہ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات نہیں۔“ وہ فوراً ہی دوسرا کش لیتے ہوئے
بولا۔ ”میرا نہیں خیال کہ وہ وہی کچھ عدالت میں گئے گا جس
کے بارے میں انسپکٹر کامران نے اسے کہا ہے اور جو جج بھی
ہے۔“

”ابھی تو اسے عدالت میں پیش کرنے کا کوئی ارادہ
نہیں ہے انسپکٹر کا!“

”یاسر کے سراغ ملنے میں اگر ناکامی ہوتی ہے
تو کامران عدالت میں چالان پیش کر دے گا اور ثاقب کو بھی۔
تب ہی پتا چلے گا اس کی نیت کے بارے میں۔“

”چلو چھوڑو ابھی پھر اس بات کو۔ مجھے گھر پہنچنا ہے۔“
میں نے کہا۔ کالیا نے جلدی جلدی سگریٹ کے مزید دو تین
گھرے گھرے کش لیے اور پھر اس کا ادھ جلا ٹوٹا انگلیوں میں
دبا کر پھینکا اور بایک پر سوار ہو گیا۔

”ہم گھر پہنچے۔“ عاصمہ خیریت سے تھی۔ اس نے بتایا کہ
اسلم موکا اس کی خیریت پوچھتا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کہا تھا

کہ میں جب گھر آ جاؤں تو قاضی صاحب کی بیٹھک پر آ جاؤں جبکہ نسیم کا ابھی تک کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں تھا۔ عاصمہ کو بھی میں نے اس کے لیے پریشان دیکھا۔

”بھائی جان! نسیم! آخر کہاں چلے گئے ہیں؟ نہ گھر آتے ہیں نہ ہی اپنی خیریت کی اطلاع دے رہے ہیں؟ آپ ہی ان کے سیل نمبر پر رابطہ کر کے دیکھ لیں۔“

میں نے مغموم سے لہجے میں کہا۔ ”بھنا! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا ہوگا؟ پگلی! میں اسے ہر روز دن میں کئی بار فون کر چکا ہوں، وہ کال ہی ریسیو نہیں کرتا، آخر کار میں نے اسے ایس ایم ایس کے ذریعے تمہارے خیریت سے گھر آ جانے کی بھی اطلاع کر ڈالی تھی۔ مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ یہ پیغام پڑھ کر ضرور فون ریسیو کر لے گا مگر افسوس پتا نہیں وہ بے وقوف کیا کچھ بیٹھا ہے مجھے۔“

”پھر بھی بھائی جان! آخر کچھ تو پتا چلے ان کے بارے میں۔ کچھ تو کریں؟“ عاصمہ گہری ٹھگر سے بولی۔

”مجھے خبر تیار ڈ..... میرا اس کے لیے ان فون نمبر ہوگا، وہ اٹھالے گا تو میں تمہیں سیل دے دوں گا، اس طرح کم از کم اس کی خیریت کے بارے میں تو پتا چل جائے گا۔“ کالیا نے مجھ سے کہا اور مجھے اس کی یہ تجویز معقول لگی۔ میں نے... اسے نسیم کا نمبر دیا جسے وہ اپنے سیل فون سے ملانے لگا۔ اس کے بعد سیل اس نے اپنے کانوں سے لگا لیا۔

”ہیلو! کون؟“ کالیا نے کہا۔ شاید نسیم نے کال اینڈ کر لی تھی۔ میری اور عاصمہ کی دھڑکتی نظریں کالیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ارے بھائی! تم نسیم ہی بات کر رہے ہو ناں؟ نعمان احمد کے چھوٹے بھائی؟ میں اس کا دوست کا.....“ کالیا اچانک یہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ یک لخت متغیر سا ہو گیا۔ پھر شاید دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے سیل فون اپنے کان سے ہٹا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت الجھن کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

”کک..... کیا ہوا یا رکالیا؟ خیریت تو ہے؟ یہ تیرا چہرہ..... ایک دم فکر مند سا کیوں ہو گیا؟ کیا کہا نسیم نے؟“ میں نے پریشان کن بے چینی سے پوچھا تو وہ بولا۔

”اے بے..... جگری! وہ کوئی اور تھا۔“ وہ گوگو سے لہجے میں بولا۔

”آخر کون تھا وہ شیریں بھائی؟ اور کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ عاصمہ نے بھی متوش سے لہجے میں اس کے چہرے کی طرف

دیکھ کر پوچھا۔ وہ کالیا کو ”شیریں بھائی“ ہی کہتی تھی۔

”کوئی اجنبی تھا مگر..... وہ نسیم کو جانتا تھا۔“ کالیا نے کہا۔ ”کہہ رہا تھا کہ نسیم کو اب بھول جاؤ۔“

”کیا؟“ بیک وقت عاصمہ اور میرے منہ سے ایک فحش ہونٹنی کی صورت میں یہ برآمد ہوا تھا۔

”کک..... کیا مطلب ہے اس بات کا؟ آخر بھائی کے سیل پر کون بات کر رہا تھا؟“

عاصمہ تشویش زدہ ہو گئی خود میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ”جسہیں یقین ہے کالیا وہ کوئی اور شخص تھا؟ م..... میرا مطلب ہے بولنے والا نسیم نہیں تھا؟“

”نہیں، نسیم۔ تو وہ بالکل ہی نہیں تھا اور نہ ہی ہمارا شناسا۔“ کالیا نے جواب دیا۔ ”وہ کوئی اور ہی آدمی تھا جس کی آواز اور لہجے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ ایسے قماش کا آدمی نہیں تھا۔“

”م..... میں نہ کہتی تھی بھائی جان کہ نسیم بھی کسی مصیبت کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ پلزز، بھائی جان! انہیں ڈھونڈیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ عاصمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نئی تشویش ناک صورت حال پر سب سے پہلے میں نے سنبھالا لیا، اس کے بعد عاصمہ بہن کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرا اور جب اس سے تسلی بھرے الفاظ کہنے چاہے تو خود میری آواز میں لڑکھراہٹ گئی۔

”بھنا! حوصلہ رکھو، میں اور کالیا یہ ناں! نسیم بھائی کو ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔“

میں اس سے زیادہ عاصمہ سے کچھ نہیں کہہ سکا اور فوراً ہی کالیا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کالیا! وہ کہہ کیا رہا تھا نسیم کے بارے میں؟“

”راہیلے پر اسی نے ہی پوچھا تھا، کون۔ میں نے نسیم کا نام لیا تو وہ بولا کہ اسے اب بھول جاؤ۔ میں خود یہ سن کر چند لمحوں کے لیے سوچا رہ گیا تھا۔ جب دوبارہ کہنا چاہا تو اس نے دوسری جانب سے رابطہ ہی منقطع کر دیا۔“

”تم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی خطرناک شخص معلوم ہوتا تھا۔“

”ہاں! اس کی آواز میں ایک خطرناک غراہٹ اور لہجے میں سفاکانہ قطعیت تھی۔“ کالیا نے جواب دیا۔

میں نے کچھ سوچ کر فوراً اپنے سیل فون سے نسیم کے نمبر پر رابطہ کیا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ میرا نمبر اس نمبر کے لیے

”بلاک“ کر دیا گیا تھا۔ یہ بات میں نے کالیا کو بتائی اور اس کا سیٹ لے کر میں نے دوبارہ نسیم کا نمبر ملایا تو یہی رسپانس ملا، یعنی، رابطہ ممکن نہیں۔

”تمہارا نمبر بھی بلاک کر دیا گیا ہے۔“

”اوہو!“ کالیا کے منہ سے نکلا۔ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”یار، کالیا! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ، میں انسان ہوں۔ کالیا! مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اتنی پریشانیوں کو سہے سکوں، یار! مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا زورس بریک ڈاؤن ہی نہ ہو جائے۔ اس قدر نے ہمارا ہی گھر کیوں دیکھ لیا ہے یار! اور یہ ساری پریشانیوں مل کلاس طبقے کے لوگوں کے ہی حصے میں کیوں آتی ہیں۔ باپ کو بے گناہ پھانسی چڑھنے کا غم میرے دل کا ناسور بن گیا ہے۔ باپ کا وہ چہرہ، وہ الفاظ ابھی تک میری سماعتوں میں گونجتے ہیں، جب انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ مجھے ان کے خاندان کی پیشانی سے ایک ”قاتل“ کا وارغ دھونے ہے۔ وہ خاندان جن کی انہوں نے ہمیشہ حق و حلال کی کمانی سے پرورش کی تھی۔ وہ کنبہ جسے انہوں نے اپنی نجابت داری اور خون سے سینا تھا۔ کالیا! میں تو ابھی تک اپنے اس اہم مقصد سے بھی خود کو دکھوں دور سمجھے ہوئے ہوں کہ یہ سب ستار اور مہراں خان جیسے ناسور فطرت ”ڈون“ میرا راستہ روکے کھڑے ہو گئے اور وہ ”پردہ نشیں“ ناسور جو میرا اصل ٹارگٹ تھا، ہنوز در پردہ رہتے ہوئے میرے لیے طرح طرح کی مشکلات کھڑی کیے ہوئے تھا۔

میں کس کس سے نمٹوں یار! میں ایک شریف آدمی ہوں، جتنی مجھ میں سکت اور جس قدر میری اوقات ہے میں وہ کرنے کی کوشش میں جتا ہوا ہوں کہ اب یہ نسیم بھائی کا نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یار کالیا! میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔ تقدیر نے یہ ایک کے بعد ایک پریشانیاں میرے ہی حصے میں کیوں ڈال دی ہیں۔“

میں توطلی ہونے لگا تھا، مایوسی کی انتہا کو چھوتا میرا دل و دماغ اپنی ڈگر چھوڑ رہا تھا۔ میں اندر سے گھٹ رہا تھا اور اندر میرے باغیانہ اور سرکشی جیسے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک غبار تھا میرے اندر جو آپوں آپ اٹھنے اور اگلنے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کن آنکھوں سے محسوس کیا تھا جب عاصمہ مجھ سے کچھ کہنے والی تھی تو قریب کھڑے کالیا نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”میرے دشمن کس قدر طاقت والے ہیں اور میں کیا ہوں ان کے مقابلے میں؟ محض ایک پھونک جسے یہ لوگ جب چاہتے ہیں، اپنی دولت اور اثر و رسوخ سے اڑا ڈالتے ہیں۔ یار کالیا! ہمارے سانح میں ایک شریف اور غریب آدمی اتنا ناقدر اکیوں ہے؟ تو نے ٹھیک راستہ چنا کالیا! جب تک تو ایک غریب اور شریف آدمی رہا، سماجی ناسور نما دشمن تجھے لٹاڑتے رہے، پھر تو نے مجبور ہو کر جیسے ہی شرافت کا لباس اتار پھینکا اور اپنے دشمنوں کو دسی زبان میں جواب دیا تو وہ سب کے سب ایک ایک کر کے قصر فنا میں گرتے چلے گئے۔ ہاں کالیا! میرے یار! میرے بھائی! میں بھی شرافت کا لبادہ اتار پھینکوں گا۔ اپنے دشمنوں کو انہی کے انداز میں، انہی کی بولی میں پھونک کی طرح اڑا دوں گا۔ تجھے یاد ہے ناں کالیا! ایک دن تو نے مجھے بھی یہی درس دیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا کیونکہ میری سرشت میں ایک شریف باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ رگوں میں تو میرے بھی ایک شریف خاندان کا ہی لہو دوڑ رہا ہے، اسی لیے تو تو نے مجھے شرافت کا لبادہ اتارنے نہیں دیا تھا اور مجھ سے ایک فقیرا لاشال جملہ کہا تھا۔ یاد ہے ناں کیا کہا تھا کالیا تو نے.....“

”نہیں جگری! میں تجھے ایک اور ”کالیا“ ہرگز بننے نہیں دوں گا۔“

”مگر یار! اب میں کالیا بن کے رہوں گا۔“

”بس میرے جگری! اب چپ ہو جا، جتنا غبار اپنے دل کا تو نے نکالنا تھا نکال لیا۔“

ایک دم کالیا نے کہا۔ اسی لمحے مجھے عاصم کی سسکی سنائی دی تھی۔ کالیا آگے بڑھ کر میرے قریب ہی بستر پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے مجھے اپنے گلے لگا لیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نام کی کوئی شے نہیں اتری تھی مگر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

”تجھے کالیا بننے کی ضرورت نہیں ہے جگری! میں ہوں ناں تیرا بار کالیا، بس، ایک ہی کالیا کافی ہے، پھر کیوں تو فکر کرتا ہے جگری!“ کالیا تم ٹھوکنے والے جوش تلے لہجے میں بولا۔

”معاشرے کے ان ناسوروں سے نمٹنے کے لیے ایک کالیا، ایک نعمان عرف نوی۔ ایک بد معاش ایک شریف کافی ہوگا۔“

وہ میرا دل رکھنے اور شاید ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے مسکرا کر بولا اور بے اختیار میں بھی ہولے سے مسکرا دیا۔ وہ آگے بولا۔ ”خود کو کیوں کمزور سمجھنے لگا ہے جگری؟

تو کزور کہاں ہے جگری! اگر ایسا ہوتا تو خود سوچ ذرا، اتنے بڑے تیس مارخاں جیسے افانی چیخس کی نیندیں حرام ہوتیں؟“ پھر عاصمہ بھی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی پھٹکی ہوئی تھیں بولی۔ ”بھائی جان! آپ بہت بہادر اور باہمت ہیں۔ مجھے ہمیشہ آپ پر فخر رہے گا۔ آپ کی شرافت، ثابت قدمی، آپ کا اور شاندار انداز زندگی اور چٹانوں جیسا حوصلہ۔ ایسے بھائی کی بہن ہونے پر بھلا کس بہن کو فخر نہ ہوگا۔ اباجی نے بھی تو کبھی... حالات کے سامنے سہر ڈالی تھی بھائی جان! انہوں نے سارا بار اپنے کانڈھوں پر اٹھا رکھا تھا مگر اب تک نہ کی تھی لیکن بھائی جان! یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ آج ان سے کئی گنا زیادہ نامساعد حالات سے دوچار ہیں۔ ایک کے بعد ایک مصیبت اور ایک نئی پریشانی منہ چھاڑے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ میری پریشانی ختم ہوئی تھی کہ اب نسیم بھائی بھی!“ کہتے ہوئے عاصمہ کا لہجہ رندہ گیا۔ عاصمہ کو آرزوہ خاطر ہوتے دیکھ کر میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، جانتا تھا کہ میرے سوا اس کا دنیا میں اور کون ہے۔ میں ہی اگر ڈھٹے لگتا تو اس کا کیا بنتا۔ جب ہی میں نے اپنا درد دیا تو ہونے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا عاصمہ! میں شاید واقعی ایسے بے در بے پڑنے والے دگرگوں حالات کے شکنجے میں خود کو جکڑے دیکھ کر خواہ مخواہ ہی اپنا دل چھوٹا کر بیٹھا تھا مگر تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہونا۔ قنوطیت اور مایوسی کا یہ دورہ عارضی ہوتا ہے میرے لیے اور پھر جب کالیا جیسا جگری یا راکا ساتھ ہے تو کس مائی کے دل کی جرات ہے وہ ہمارے طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔“

”ابے لے..... جگری! تو نے تو ہماری بہنا کو بھی دھکی کر دیا۔“ کالیا فوراً بولا۔ پھر وہ بھی عاصمہ کے سر پر ازراہ شفقت اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ سچ ہے کہ اپنا ہونی بھی تو ایک عام انسان ہی ہے۔ مایوسی کا غلبہ تو میرے جیسے پرآن پڑتا ہے، پر اپنا ہونی ایسے حالات سے نمٹنا بھی اچھی طرح جانتا ہے اور بہن عاصمہ تم بھی یہ مت سمجھنا کہ تمہارے صرف دو ہی بھائی ہیں، یہ شیراز بھی تمہارا بھائی ہے۔ چلو اب یہ آنسو پونچھو اور ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ جب تک ہم نسیم بھائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔“

کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”کالیا! یہ حرکت کم از کم اس کانے سیٹھ ستار کی نہیں ہو سکتی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

میری بات پر وہ ٹھوڑا چونک کر مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابے لے..... جگری! تو نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ خود میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔ مگر.....“ کہتے ہوئے اس نے شاید دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

”مگر کیا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”حاجی مہران خان کو تو تم نہیں بھول رہے ہو؟“ اس نے کسی خیال سے میری جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”اس کا خیال بھی میں اسی لیے رد کروں گا کہ ابھی میرا اس سے براہ راست کوئی خاص ٹاکرا نہیں ہوا ہے۔“ میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”ٹاکرا اس کے خاں کار پر دواڑوں سے ہو چکا ہے۔“ کالیا بولا۔ ”دشمن اس کے کانڈھے پر بھی تو بندوق رکھ کر چلا سکتے ہیں۔ لاڈلہ سائیں بھی تو ہے۔“

”میرا پھر بھی نہیں خیال کہ حاجی مہران کی یہ حرکت ہو سکتی ہے جبکہ لاڈلہ سائیں کی تو ابھی بات ہی چھوڑو۔“ میں نے کچھ غور کرنے والے لہجے میں کہا تو کالیا بدک کر بولا۔

”ابے لے..... جگری! فی زمانہ اس سرزمین میں ہمارے یہ دو ہی تو اہم دشمن ہیں۔“

”حیرت ہے میرے بارہ کالیا! تو اس پردہ نشین دشمن کو کیوں فراموش کر بیٹھا ہے، جس کے ساتھ میری اصل جنگ ہے۔“ میری سرداوی پردہ نشین دشمن سے تھی جس نے میرے بد نصیب باپ کے خلاف سازش تیار کی تھی۔

”اوہ، سمجھا!“ وہ ایک دم بولا۔ ”پر جگری!“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور چپ ہو گیا۔ شاید اس تیسرے دشمن کو وہ جھٹلانے کی کوشش نہیں کر پا رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں مزید آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول پڑا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر وہ ہم سے کسی قسم کی معاملہ داری طے کرنے کے لیے رابطہ کیوں نہیں کر رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اب کرے۔“ میں نے کہا۔

اسی اثناء میں عاصمہ چائے بنا لائی، ہم چائے پینے لگے۔

میں نے چائے ختم کی ہی تھی کہ میرے موبائل کی مبینج ٹون ابجری۔

نے عاصمہ سے کہا کہ میں ابھی حاجی صاحب سے مل کر آتا ہوں۔“

کالیا چاچا تھا۔ میں گھر سے نکلا اور حاجی صاحب کی بیٹھک پر پہنچا۔ وہ وہیں موجود تھے دو ایک اور لوگ بھی تھے۔ صاحب سلامت کے بعد حاجی صاحب نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”بھئی پر خوردار! یہ اپنے سنے میاں والے معاملے کا کیا بناؤ؟ وہ تو بے چارہ چپ ہو کے بیٹھ گیا ہے مگر اس غریب کو انصاف تو دلانا ہی ہوگا ناں۔ آخر کار مجرم کو قرار واقعی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے جناب!“ میں ان کی تائید میں بولا۔ ”میں اسی سلسلے میں مصروف تھا وہ میرا خیال ہے میں نے مجرم تلاش کر لیا ہے، اب بس اس کے خلاف قانونی کارروائی کی دیر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں ساری بات بتادی۔

وہ ایک دم جوش میں آگئے۔ انہوں نے اسی وقت اسلم مموکا کو خورشید خاں المعروف سنے میاں کو بلوانے کے لیے اس کے گھر کی طرف روانہ کر دیا اور پھر مجھ سے بولے۔ ”نعمان میاں! ہم ابھی متعلقہ تھانے جا کر عزیر خاں کے خلاف ایف آئی آر تو کنوا دیں گے مگر میرا خیال ہے اس کے خلاف ہمارے پاس بھی شہدہ کرنے کا کوئی ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔“ میں نے انہیں عزیر خاں کی تصویر اور چند ایسے ثبوت پیش کر دیئے جس سے متعلقہ ڈیوے اور اس کے بیچ یونیورسٹی فیلوز جیسے تعلقات ظاہر ہوتے تھے۔

”اس کے علاوہ سنے میاں کا بیٹا اختر بھی ٹوبہ کی زبانی عزیر خاں کا نام سن چکا تھا۔ میں بھی عزیر خاں کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔“

تھوڑی دیر میں سنے میاں اپنے بیٹے اختر کے ساتھ وہاں حیران و پریشان سا آن وارد ہوئے۔ جب انہیں بتا دیا کہ متوقع مجرم کا کھوج لگا لیا گیا ہے اور اب بس پولیس کو مطلع کرنے کی دیر ہے تو سنے میاں فوراً مستفسر ہوا۔ ”آخر پتا تو چلے وہاں عالم ہے کون اور کس کی اولاد ہے؟“

میں نے جب انہیں بتایا کہ وہ ملیر گٹھ کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے جن کا آبائی شہر ٹھٹھہ ہے تو وہ کچھ کم مسم سا ہو گئے۔

”کیا ہوا سنے میاں؟ تم چپ کیوں ہو گئے؟“ حاجی صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا تو سنے میاں ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے جوان اکلوتے بیٹے اختر کی

”کہاں ہو؟ کیسے ہو؟“ فوزیہ کی طرف سے متوجہ آیا تھا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ حالات کی کشمکش کے باعث میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اسے جواب سینٹر کر دیا اور یہی بتا دیا کہ میں ان چند دنوں میں کیا کیسے اور کہاں مصروف رہا۔ نیز میں نے اسے عاصمہ کی بازیابی کے بارے میں بھی مختصر بتا دیا۔

”بات ہو سکتی ہے؟“ اس نے پھر پیغام کیا۔ ”ابھی نہیں۔ بعد میں خود ایس ایم ایس کے ذریعے پوچھ کے تمہیں کال کر لوں گا۔“ میں نے لکھ کر ”کس“ کے ٹیکسٹ کے ساتھ سینٹر کر دیا۔ جواب میں مجھے بھی ”اوکے“ کے ساتھ ایسا ہی متوجہ آیا۔

اسی وقت کالیا کے سیل فون پر ایک کال آئی۔ ”ہیلو!“ اس نے سیل کان سے لگا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں! وہ گھر آگئی ہے۔“ اس نے شاید دوسری طرف کی بات سن کر جواب دیا تھا۔

”میں نے استاد بھابھا کو بتانا ہی ضروری سمجھا تھا۔ چلو، ایک ہی بات ہے انہوں نے تمہیں بتا دیا ناں..... کیا؟ بس! اپنے طور پر معاملہ سینٹر ہو گیا تھا۔ ہاں! استاد بھابھانے ہی مسئلہ حل کر دیا تھا۔ چلو..... پھر تم خود ہی استاد سے بات کر کے اپنے سوال کا جواب حاصل کر لو۔ خدا حافظ!“ یہ کہتے ہوئے اس نے براہ راست بنا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”کون تھا؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ضمیر شاہ!“ وہ جوابا بولا۔ ”اپنا رعب جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمیں اسے بتانا چاہیے تھا۔ اس طرح اسے ایس پی خادم حسین نے بھی براہ منایا ہے۔“

”ہمند..... براہ منایا ہے، خود تو وہ کچھ کر نہ سکے تھے، اب کھسیانی ملی کی طرح کھسیا تو بچ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”چھوڑو یا رہے! تا! اب کیا پروگرام ہے؟“ کالیا نے سر جھٹک کر کہا۔

”عزیر خاں کی گرفتاری کے سلسلے میں حاجی کریم بخش سے ملنا چاہوں گا میں۔“

”ٹھیک ہے جگر!“ کہتے ہوئے کالیا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اپنا خیال رکھنا، میں اب چلتا ہوں۔ کوئی بات ہو تو مجھے فون کر لیتا۔“

میں نے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب اس کی بائیک کی اشارت ہونے کی آواز ابھری تو میں

طرف ڈالنے کے بعد بولے۔ ”حاجی صاحب! میں ایک غریب آدمی ہوں اور ایک جوان اکلوتے بیٹے کا باپ بھی۔ عزیز خاں نامی اس شخص کو میں نہیں جانتا جس نے میری معصوم بیٹی پر یہ گھناؤنا ظلم کیا مگر کیا ایسا ممکن ہوگا کہ ایک جاگیردار کے بیٹے کو قانون کی طرف سے کوئی سزا بھی ملے؟“

اس کی بات پر وہاں موجود ہم سب چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

”یہ..... کیا کہہ رہے ہو، منے میاں؟ ہوش میں تو ہو ناں تم!“ حاجی صاحب نے اس سے کہا۔ ”ارے بھئی! قانون تو قانون ہے، سب کے لیے برابر، جرم خواہ کسی نے بھی کیا ہو اور چاہے وہ کتنے ہی بڑے باپ کی اولاد ہو، اسے سزا تو ملنی ہی چاہیے۔“

”معاف کرنا حاجی صاحب! آپ پرانے خیالات کے آدمی ہیں، شاید زمانے کے چلن اور ہمارے سماج کے ان ناسوروں سے واقف نہیں ہیں جو اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی نہ صرف آزادانہ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنی طاقت اور زور کے بل بوتے پر جج اور قاضی کی آواز کو بھی دبانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جاگیردار بھی نہیں چاہے گا کہ اس کے بیٹے کو سزا ہو، یادہ بھائی کے تختے پر چڑھے۔“

”ارے بھئی یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ حاجی صاحب ایک دم بولے۔ ”حق کی آواز کا گلا تو تم خود ہی گھونٹ رہے ہو۔ میاں! کیا تمہیں اللہ پر مبرہوسا نہیں ہے؟ صرف اسی ذات پاک سے ڈروئے میاں! جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔ چلو اٹھو، اسی وقت ہمارے ساتھ تھانے چلو، اے نعمان میاں نے کتنی محنت اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اصل مجرم کا سراغ لگایا ہے، باقی ہم سب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

منے میاں مشکلوں سے راضی ہوا تھا۔ بیٹا بھی ساتھ تھا۔ میں نے اپنی کار نکالی اور ہم متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایس ایچ او تیور ملک وہاں موجود تھا اور وہی بد نصیب ٹوپیہ کے اغوا اور بعد قتل کی تفتیش کر رہا تھا۔ ہم نے تھانے پہنچ کر اسے ساری بات بتائی اور عزیز خاں کے خلاف ایف آئی آر کٹانے کا کہا تو وہ بولا۔

”جناب! ایف آئی آر تو کاٹی جا چکی ہے۔“

”کیا؟“ اس کی بات پر میں چونکا۔

”کس کے خلاف کاٹی گئی اور کب؟“

”آپ ہی لوگوں نے کٹوائی تھی، نامعلوم افراد کے خلاف!“ ایس ایچ او تیور ملک بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! لیکن اس وقت ہمیں کب پتا تھا کہ اصل مجرم کون ہے؟“ حاجی صاحب نے جواب دیا۔

”تو اب کیسے پتا چل گیا آپ لوگوں کو، اصل مجرم کا؟“

تیور ملک نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ میں نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! کمال ہے، جو کام آپ کو انجام دینا تھا وہ ہم نے کیا ہے، پھر بھی آپ!“

”آپ نے کیسے یہ کام انجام دیا؟ آپ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہو؟“ انسپکٹر نے میری جانب گھور کر پوچھا۔ مجھے اس کا انداز مخاطب برا لگا مگر مضبوط سے کام لیتے ہوئے میں نے قدرے سکون سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں شواہد کی بات کر رہا ہوں جو کسی کے ہاتھ بھی لگ سکتے ہیں اور وہ پولیس سے ہی رابطہ کرتا ہے، جیسا کہ ہم سب آپ کو یہاں نظر آرہے ہیں، آپ شاید بھول رہے ہیں، ذرا ٹوبہ مرڈر کیس کی ایف آئی آر کی کاپی نکال کر ملاحظہ فرمائیں، مقتولہ کے بھائی نے اپنے بیان میں کسی عزیز خاں کے بارے میں ذکر کیا تھا جو ٹوبہ کا کلاس فیلو تھا اور وہ اس سے باتیں بھی کرتی رہی تھی اور ہم اسی عزیز خاں کے شواہد لے کر آئے ہیں۔“

میرا خیال تھا انسپکٹر لا جواب ہو کر بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جائے گا مگر اس کے برعکس وہ اسی طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”میں دیکھ لیتا ہوں اور آپ ذرا وہ شواہد بھی بتا دیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ریکارڈ روم کے ایک ٹرک کو بولویا اور ساتھ ہی ہینڈ عمر کو بھی حکم دیا کہ اس روز کی ایف آئی آر اور بیانات کی فائل لے آئے۔

تھوڑی دیر میں دونوں حاضر کر دی گئیں۔ شواہد کا تذکرہ میں نے کر دیا اور جب انسپکٹر تیور کو یہ پتا چلا کہ عزیز خاں ہمارے ہاں کام کرتا ہے تو وہ بولا۔ ”لگتا ہے آپ کے عزیز خاں سے کچھ کاروباری اُن بن ہو گئی ہے۔“

میں اس کی معنی خیز بات کا مطلب سمجھ گیا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا، سمجھ میں تو آ رہا تھا کہ یہ حاجی مہراں خان جیسے جاگیردار کا راتب خوار بننے کی تیاری پکڑے ہوئے تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ اپنی ”ٹوڑ“ کے علاوہ اور بھی کچھ بنانے کے چکر میں ہے۔ حاجی مہراں خان سے کم از کم ٹیلی فونک کال کے ذریعے تو رابطہ کر کے اسے اس ساری صورت حال سے آگاہی دینے کی کوشش کرے گا، اگر ایسا

تھا تو اس کا واضح مطلب ہوتا کہ میرا اگلا اور براہ راست ٹکراؤ حاجی مہران خان کے ساتھ ممکن ہوتا۔ لہذا پھر میں نے بھی اسی کے اعزاز و لہجے میں جواب دیا۔ ”میری تو کاروباری ان بن نہیں ہے البتہ آپ ضرور ایک بڑے آدمی کے ساتھ اپنی راہ و رسم بڑھانے کی کوشش میں ہیں۔“

وہ بھی زیرک تھا، میری ذومعنی بات میں چھپے کاٹ دار طنز کو فوراً سمجھ گیا اور اس بار ڈرا کر سخت لہجے میں بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ تم شہر کے کسی بھی بڑے اور شریف عزت دار آدمی پر تہمت لگا کر اس کے خلاف، مجھ سے ایف آئی آر کرواتے رہو گے۔ تم لوگ جواب میں اپنا کام بخوبی کرنا جانتا ہوں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی انسپٹر صاحب!“ اس بار سننے میں اس کو غصہ آ گیا۔ ”میری بیٹی اغوا ہوئی، آپ لوگ اسے بازیاب کرانے میں بری طرح ناکام رہے، پھر اس معصوم کو بیدروی سے قتل کر دیا گیا اور اب جب اس کے قاتل کے خلاف شواہد ہاتھ لگے ہیں تو آپ ایک جاگیردار کا نام سن کر اس کے بیٹے کے خلاف ایف آئی آر نہیں کاٹ رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ پہلے سے درج شدہ ایف آئی آر کو بھی نامعلوم ملزموں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں جبکہ ہم عریز خان کا نام درج کروا چکے تھے۔“

انسپکٹر تیمور بولا۔ ”تم لوگوں نے شواہد پولیس کو دے دیئے ہیں، لہذا میں پہلے خود اس کے بارے میں تفتیش کروں گا اس کے بعد ہی کوئی کارروائی کروں گا۔“

”میرے خیال میں ہمیں چلنا چاہیے حاجی صاحب!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر حاجی کریم بخش سے کہا۔

”ہمیں پولیس کمشنر سے خود ہی ملنا پڑے گا اور اسی وقت ملنا پڑنے گا، بصورت دیگر ہم پریس کلب جا کر بھوک ہڑتال پر بیٹھ جائیں گے۔ میڈیا والے خود ہی ہمارا سچ اور پولیس کی بددیانتی کو عوام کے سامنے لے آئیں گے۔“

ہم سب تھانے سے واپس لوٹنے لگے۔

”اس طرح معاملہ سلجھنے کی بجائے اور الجھ جائے گا۔ سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھانا، ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کو دوبارہ میرے پاس ہی آنا پڑے۔“ بد طبیعت انسپکٹر تیمور نے آخری اور روایتی حربہ استعمال کرنا چاہا جبکہ میرا اپنا یہ خیال تھا کہ اب ہمارا پولیس کمشنر سے ملے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے لیے ہم پہلے محلے میں آئے۔ کچھ اور لوگوں کو اکٹھا کیا اور جلوس کی صورت میں پولیس انتظامیہ کے آفس پہنچے اور اس کے احاطے میں کھڑے ہو کر متعلقہ تھانے کے خلاف

نعرے بازی شروع کر دی۔ جلد ہی ہماری شنوائی ہو گئی اور صرف چار افراد کو کمشنر نے اپنے آفس روم میں بلایا۔ میں، حاجی صاحب، سنے میاں اور اختر آفس میں داخل ہوئے۔ وہاں ہم نے جوہری انصاری صاحب کو ساری حقیقت اور کیس سے متعلق شروع سے آخر تک بات بتادی۔ انہوں نے بڑے غور سے ہماری بات سنی اور ڈٹے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی وقت متعلقہ تھانے کے انچارج تیمور ملک کو فون کھڑکا کر سختی سے ہدایت جاری کر دی کہ عریز خان کے خلاف فوراً ایکشن لیا جائے۔

ہم کمشنر صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے لوٹ گئے۔

میں گھر آ گیا۔ عاصمہ میرا یہی انتظار کر رہی تھی۔ وہ سہیل کی وجہ سے ابھی تک پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بہنا! گلہ نہ کرو اور دعا کرو، ہنس بھائی کے لیے تم ڈرا احتما ہو کر کھر پر رہنا اور کسی کے دستک دینے پر بالکل بھی دروازہ مت کھولنا۔ میں ذرا، ہنس کے آفس جا کر اس کے دفتری ساتھیوں سے مل کر کچھ پتا لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”بھائی جان! میرا خیال ہے آپ پولیس کو مطلع کر ہی دیں۔“ عاصمہ نے مشورہ دیا تو میری نظروں کے سامنے انسپکٹر تیمور ملک کا چہرہ گھومنے لگا۔

”بہنا! تمہیں پتا ہے ناں ہماری پولیس کیا کرتی ہے۔ بس! تم اپنے بھائی جان پر بھروسہ رکھو اور اس کی کامیابی کی دعا کردہ میں چلتا ہوں۔“

میں اپنی مہران کار میں سوار ہو کے ہنس کے دفتر جا پہنچا جو شروع فیصل پر ہی واقع تھا۔ وہاں میں نے، ہنس کے سب سے قریبی ساتھی سے بات کی اور اسے ہنس کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد اس نے مجھے وہیں مزید ساتھیوں سے ملوایا اور سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہنس نے ان میں سے کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ ہنس جب مجھ سے ناراض ہو کے گھر چھوڑ گیا تھا تو بھینا اغوا ہونے سے پہلے اپنے کسی قریبی دوست وغیرہ سے ضرور ملا ہوگا اور اسی سے مجھے کچھ نہ کچھ پتا چل جاتا کہ وہاں سے وہ کدھر گیا؟

میں نے لاری اڈے پر جانے کا قصد کیا مگر پھر کچھ سوچ کر ایڈووکیٹ زہیرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نئی صورت حال سے میرا دل و دماغ بو جھل ہو رہا

تھا۔ مجھے اس بات کا تو امکان کم ہی لگ رہا تھا کہ ہمیں کے اغوا میں سیٹھ ستار گروپ کا ہاتھ ہو سکتا تھا جبکہ رفعت خان مرڈر کیس سے متعلق میری ہم جوئی نے جس پردہ نشیں ”بگ باس“ کو ظاہر ہونے پر (ٹیلی فونک رابطے کی حد تک) مجبور کر دیا تھا، درحقیقت میرا اصل اور تارگنڈ مجرم یہی تھا، مجھے ہمیں کے اغوا یا کشدگی میں اسی کا ہاتھ لگتا تھا۔

میں زنیہ کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر گلاب کے اس پھول کی طرح حل اٹھی تھی جسے سورج کی تازہ کرنوں کے ساتھ آب شیریں مل جاتا ہے تو وہ ایک دم حل اٹتا ہے۔ حالانکہ میں اسے فوزیہ سے متعلق دوستانہ اور بے تکلفانہ ماحول میں اپنی پرستل انچ منٹ کی حقیقت بھی بتا چکا تھا۔ باوجود اس کے وہ مجھے اب بھی دیکھ کر ہمیشہ کی طرح سکر ادیتی تھی۔

”لگتا ہے بڑی بھاگ دوڑ کر کے آرہے ہو۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے نرم لبوں کو دل نشیں انداز میں ایک دل فریب سی مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا تھا۔ جواب میں، میں بھی اپنا سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ وہ آج بیڈ پر نہیں تھی۔ صوفے پر بیٹھی کسی فائل کا مطالعہ کر رہی تھی جواب اس کے پاس رکھی تپائی پر نظر آ رہی تھی۔

”ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے سامنے والے ایک صوفے میں جھٹس گیا۔ ”ویسے تمہیں آج بیڈ کی بجائے یہاں بیٹھ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ جس کا مطلب ہے تم تنزی کی ساتھ رو بہ صحت ہو۔“

اسی وقت خالدہ بھی وہاں آ گئیں۔
”سلام خالدہ!“ میں نے فوراً انہیں سلام کیا۔
”جیتے رہو بیٹے!“ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مجھ سے دعا کیے۔

”توی بیٹے! تمہارے لیے کچھ ٹھنڈا لاتی ہوں۔“
”خالدہ! بس، ٹھنڈا پانی ہی لایئے گا۔“ میں نے کہا۔
”اس کے بعد اچھی سی چائے پیوں گا۔“
”ضرور بیٹا! ابھی لاؤ!“ خالدہ بخوبی شفیق محبت سے بولیں اور چلی گئیں۔

میں نے ایک گہری مگر تھکی تھکی سی ہمارگی خارج کرتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔
پتا نہیں کیا بات تھی۔ مجھے یہاں زنیہ کے پاس آ کر ایک عجیب سا ہلکا پھلکا پن اور سکون سا ملتا تھا۔ میں جس کی توجیہ پریش کرنے سے قاصر ہی رہا تھا کیونکہ میں نے بارہا اس کے بارے میں سوچنے کی بھی کوشش کی تھی اور تب ہی مجھے دو اہم

لغظوں کے معنی سمجھ میں آ سکے تھے۔ ایک دوستی اور دوسرا تعلق۔

میری دوستی کی بیخ زنیہ کے ساتھ خاصی مضبوط تھی، اس میں سب ہی کچھ تھا۔ بے تکلفی، برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی سہیل اور اس دوستانہ سنگت میں بیٹھنے کا ایک الگ سا یک گونہ احساس، قلبی سکون جو صحت و حوصلہ کی ذہنی دیواروں کے لیے مضبوط ستون کی طرح لگتا تھا جبکہ تعلق ایک اندریں جذبہ خاطر کی صورت میرا فوزیہ سے کب کا استوار ہو چکا تھا۔ جس کے لوازم کچھ اور تھے۔ وہ بس محبت تھی۔ کسی کو پالیئہ کی، اپنا بنا لینے کی چاہت۔

”کیا کچھ خاص ہوا ہے آج؟“ معاذ زنیہ کی نرم آواز ابھری اور میں اپنے مختصر سے خیالات کے بھنور سے ابھرا۔
”ہاں!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”لیکن پہلے مجھے تم سے پیچ پیچاؤ کہ تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟“ وہ بولی تو میں چونک گیا۔ وہ شاید اتنی سی دیر میں میرا چہرہ پڑھتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا پہلا سوال خود ہی اچک لیا تھا اور جلدی سے دوسرا پوچھ لیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور صاف دلی سے بولا۔
”زنیہ! پتا نہیں کیا بات ہے، جب میرا دماغ بوجھ اور دل بوجھل پن محسوس کرنے لگتا ہے تو اسے اتارنے کے لیے مجھے تمہارے ہاں کے سوا اور کوئی جگہ سوچیں لگتی ہی نہیں، میں یہاں آ کر تم سے اپنی پریشانیوں اور دیگر معاملات شیئر کر کے ایک گونہ سکون سا محسوس کرنے لگتا ہوں اور تب ہی میرا دل و دماغ ایک دم ہلکا سا ہونے لگتا ہے۔ میرا تمہارا تعلق ایک مڑکل اور مکمل کا تو رہا ہی ہے لیکن جب سے یہ تعلق از خود ہی دوستی میں بدل گیا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہاری سنگت میں کوئی ایسی بات تو ہے، جس کے حصار میں خود کو بہت مطمئن اور آسودہ سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ بس! یہی میں سوچ رہا تھا۔“

یہ کہہ کر میں اس کی کھلی کھلی رحمت، صورت پر اپنی نظریں جمائے رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے میری بات بڑے غیر معمولی دھیان اور توجہ سے سنی تھی اور جسے سننے کے بعد اس کی سیاہ آنکھوں میں کچھ اپنے پن کے گلابی رنگ تاروں کی طرح جھلکے تھے، اس کے شفیق رنگ گالوں کی پھٹکی پھٹکی سی فوس قزاق جیسے یک دم ہی چمکی تھی۔ اس کے نرم لبوں کی گدازیت میں جیسے کوئی ملاحت آمیز جذبہ اپنی تمام تر حلاوتوں سے ایکا ایکی ہی دہکا تھا اور تب ہی وہ جیسے ایک چور

سے جذبے تلے بولی۔

”یہی تو دوست کی اصل حقیقت ہے نوی کہ وہ اپنی سچائی لفظوں کے اظہار سے نہیں، احساسات سے باور کرائی ہے۔ ایسا احساس جس کا جزوہ عمل کے تابع ہوتا ہے۔ میں تمہارے احساسات اور تمہارے اندر کو سمجھتی رہی ہوں۔ اس وقت سے جب تم اپنے باپ کا کس لڑنے کے لیے ایڈوکیٹ راجا راجم صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے۔ میں تمہیں محسوس کرتی تھی، تمہارے جوش کو اور اس جذبے کو جس نے تمہیں ثابت قدم اور حوصلہ مند رکھا ہوا تھا۔ تم نے اپنے بے گناہ باپ کو بچانے کے چھندے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر انفسوس کہ تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب ہی میں نے بھی اپنے دل میں ایک عہد کر لیا تھا نوی کہ اگر تم نے ہمت نہ ہاری اور بعد میں بھی تم اسی عزم و حوصلے سے اصل مجرم کو سزا دلوانے کے لیے ثابت قدم اور کوشاں رہے تو میں بھی تمہاری مدد کو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ کیونکہ یہ سیاہ کاڈن میں نے صرف فیس ہی گھری کرنے کے لیے نہیں پہن رکھا ہے، بلکہ حق کو باطل پر سرخورد کرنے اور باطل کو ذلت کے کھاٹ اتارنے کے لیے پہن رکھا ہے، جنہیں یہاں اسی لیے سکون ملتا ہے کہ اس سلسلے میں میرے اور تمہارے جذبات میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ وہ میری بات کی تشریح پر اتنی صراحت کرنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ بات بدل گئی اور میرے دل کو بھی لگی تھی۔

”یہی حالہ بخورانی و شکلی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ اس پر پانی اور چائے کے برتنوں کی ہلکی کھٹک گونج رہی تھی۔ کچھ پلیٹوں میں بسکٹ اور ایک پیس بھی رکھے تھے۔ میں نے پانی پیا اور چائے کا کپ سنبھال لیا۔ حالہ بخو زادہ پر بعد چلی گئیں۔

میں نے اس دوران زنیہ کو دیگر مختصر تفصیلات کے بعد اول فیسمہ کی ناراضگی اور بعد اس کی گمشدگی اور انخوا کے بارے میں گوش گزار کر دیا۔ چائے پیتے ہوئے زنیہ پورے دھیان سے گوش برآواز رہی تھی۔

کمرے میں چند ٹاپے کے لیے برسوسج خاموشی کا راج رہا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑے متشکر سے لہجے میں بولی۔ ”تمہارے بھائی کی گمشدگی میں کوئی عیب نہیں کہ اسی پردہ فین کا ہاتھ ہو جو ہمیں رفعت خان مرڈر کیس میں مطلوب ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ وہ تمہاری اس ہم جوئی سے بخوبی واقف ہے کہ تم آہستہ آہستہ بھی اس بمیا تک جرم سے پردہ اٹھانے والے ہو۔ ورنہ وہ بھی خود کس طرح ظاہر نہ کرتا۔“

”لیکن ایک بات پر میری الجھن ختم نہیں ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے بھی تو پھر اسے مجھ سے دوبارہ ٹیلی فونک رابطہ کرنے میں کیا قباحت تھی؟ وہ میری اس مہم جوئی کو بانے کے لیے تپ کا یہ پتا کیوں نہیں کھیل رہا؟ تاکہ کچھ پتا تو چل سکے کہ.....“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور اپنی پیشانی کو ایک ہاتھ سے مسلتے ہوئے سخت تشویش زدہ لہجے میں دوبارہ بولا۔

”م..... مجھے تو ڈر ہے کہیں خدا نخواستہ وہ فیسمہ کو کوئی جانی نقصان نہ پہنچا دے۔“

”ابھی ایسا وہ نہیں کر سکتا۔“ زنیہ پر غور سے لہجے میں بولی۔ ”تم نے بتایا تھا کہ اس نے تمہارے سیل نمبر پر بات کی تھی؟“

”ہاں!“

”وہ نمبر تم نے فریض کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟“

”کی تھی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔“ میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”ہمم، ایسے لوگ ہر طرح سے محتاط رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا راستہ یا کیونہیں مل رہا ہے کہ میں فیسمہ کی تلاش کے سلسلے میں کوئی موثر قدم اٹھا سکوں۔“ میں نے پریشانی سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ میں اس کے دفتری ساتھیوں سے بھی مل چکا ہوں مگر ان سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا اور پھر میں یہاں آ گیا تاکہ تم سے کچھ مشورہ کر سکوں۔“

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ دیکھا تو چاچا انور شاہ کی کال تھی۔

”ایک منٹ!“ میں نے موبائل کان سے لگا کر زنیہ سے کہا پھر ”ہیلو“ کہا۔

دوسری جانب سے چاچا انور شاہ کی گھبرائی ہوئی سی آواز ابھری۔ ”نوی بیٹے! وہ..... وہ پولیس آئی تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے، عزیر خان کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔“

”اس کے بانی دودوست کہاں ہیں؟ شاہنواز اور بشیر خان؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”اس وقت عزیر خان کے ساتھ صرف شاہنواز موجود تھا۔“ چاچا انور شاہ نے بتایا۔ اسی وقت مجھے باتوں کے دوران ہلکی ہلکی بپ کی آواز بھی سنائی دینے لگی جس کا مطلب تھا کہ کوئی اور کال بھی آ رہی تھی۔ میں نے چاچا انور شاہ کو کال

ہولڈ کروائی اور آنے والی دوسری کال اینڈ کی تو دوسری جانب سے غصیلی آواز ابھری۔

”مسٹر نعمان! تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا ہے؟ نہیں جانتے تم کہ عزیر خان کس کا بیٹا ہے؟“

یہ شاہنواز خان تھا۔ میں نے بھی جواب میں اسی ناگواری سے کہا۔ ”وہ جس کی کا بیٹا ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے لیکن جو جرم اس نے کیا ہے اس کی سزا کا وہ حق دار ضرور ہے۔“

”سزا..... پا.....“ شاہنواز نے میری بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کس چڑیا کا نام ہے مسٹر نعمان! مگر ایسا نہ ہو کہ یہ الزام تمہارے لیے سزا بن جائے۔“ اس کی ڈھٹائی، غرور اور تمسخر اڑانے کے انداز اور جہد ید نے میرا دماغ الٹ دیا۔

”تم جیسے لوگ جب تک پہاڑ تلے نہیں آتے ہو، ایسی گیدڑ بھبکیاں دینا تم لوگوں کا ہی وتیرہ بن جاتی ہیں، مسٹر شاہ نواز! اب میں تم جیسے کرملو کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی پراپرٹی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے فوراً سے چیئر اپنا پوریا ستر سیٹنے کی کوشش کرو، ایسا نہ ہو کہ مجھے عزیر خان کی طرح تمہاری مٹی پلید کرنا پڑ جائے۔“

میں نے بھی اس کا کھنڈ توڑنے کے لیے اسی کے لہجے میں جواب دیا تو وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم چوری چھپے نہیں آئے ہیں تمہارے اڈے میں۔ باقاعدہ تمہارے ساتھ ایک معاہدے کے تحت آئے ہیں جس کے باعث ہم نے یہاں اپنا کرڈوں کا سرمایہ لگا رکھا ہے اور تمہیں کرائے اور کمیشن کی مدد میں پیسہ مل رہا ہے۔“

”میں تم کو پھینکتا ہوں اب اس معاہدے پر اور تم لوگوں پر بھی۔“ کوشش ضبط کے باوجود میرا اندر لاوے کی مثل کھولنے لگا تھا۔

”منہ سنبھال کر بات کرو مسٹر نعمان!“ وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”خوب سمجھ رہا ہوں میں تمہاری اس چالاک کی کو، جب تم نے دیکھا کہ ہمارا کام منافع بخش جا رہا ہے تو تم اب کرایہ اور کمیشن کے چکر میں پڑے رہنے کی بجائے، خود ہی اس سارے کام پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہو۔ اس کے لیے تم نے ہمارے سابق عزیر خان پر جھوٹا الزام لگوا کے اسے گرفتار بھی کروا دیا مگر ہم تمہاری اس سازش کو نامہ بنادیں گے۔ لہذا اب کورٹ کے قہر وہی مجھ سے بات کرنا۔“ یہ کہتے ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی ہٹ دھرمی اور قبضے کی نیت جان کر مجھے طیش کے احساس تلے ایک نامعلوم سی بے بسی کا احساس بھی ہوا مگر ساتھ ہی یہ سوچ کر کہ وہ میرے کرائے دار تھے تاکہ میں ان کا؟ یہ اس زمین کے مالک نہیں تھے کہ اپنا قبضہ جمانے کا اختیار رکھتے۔ میں غصے سے بھنایا ہوا اسی وقت لاری اڈے پہنچا۔ مالک میں تھا اور ان کی کیا جرأت تھی کہ میری ہی زمین پر مجھ سے اس طرح کی ڈھٹائی کرتے۔

”دوسو!“ میں نے اپنے کمرے میں آتے ہی اپنے چڑا کی کو آواز دی۔

”کدھر مر گیا ہے بڑے تو؟“ اس کی آواز نہ پا کر میں غصے سے چنچا۔

”حاضر سائیں حاضر سائیں.....“ جلد ہی وہ نمودار ہو کر منڈ پانہ بولا۔

”اسی وقت اڈے کے تمام آدمیوں کو احاطے میں اکٹھا ہونے کی اطلاع دے، اس کام میں ذرا بھی دیر ہوئی تو میں تیری اسی وقت کھڑے کھڑے پھٹی کر دوں گا۔“

دوسو بے چارہ یہ سنتے ہی الٹے پیروں پلٹ گیا۔ ذرا ہی دیر میں بہت سے لوگ میرے کمرے کے باہر وسیع احاطے میں اکٹھے ہو چکے تھے۔

”اسی وقت مہران گڈز کا آفس سیل کر دو اور جو بھی وہاں موجود ملے اسے بے دخل کر ڈالو۔“ میں نے چلا کر حکم صادر کر دیا۔ لوگوں کو میرے اس فیصلے پر حیرانی تو ہوئی مگر انکار یا تسال کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ حکم سنتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

مہران ٹرانسپورٹ گڈز کی عمارت اڈے کی جنوبی سمت میں واقع تھی۔ یہ ہمارا بیک وقت اسٹور اور گودام ہوا کرتا تھا۔ معاہدے کے بعد یہی عمارت خالی کر کے ہم نے عزیر خان کے حوالے کی تھی تو ان تینوں دوستوں یعنی عزیر خان، شاہنواز اور بشیر خان نے انہیں پرار طریقے سے سیٹ کر لیا تھا۔ اب میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہاں ان تینوں (بلکہ دونوں) میں سے کون کون وہاں موجود تھا۔ نہ ہی مجھے اس کی پروا تھی۔ میں ابھی احاطے میں کھڑا تھا۔ لوگ اس عمارت کی طرف بڑھ چکے تھے۔ جا جا انور شاہ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ کر گر پری پر بیٹھ گیا۔ میں اس وقت سخت اعصاب زدگی کا شکار تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ گولی چلنے کی آواز ابھری۔

”ٹھائیں..... ٹھائیں.....“ تلے اوپر دو فائر کرنے کی

کے دوسرے ہاتھ میں سیل فون بھی نظر آنے لگا تھا جو اس نے اپنے کان سے لگا رکھا تھا اور شاید کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

دوسو کمرے کے باہر دروازے کے اسٹول پر سہا ہوا سا بیٹھا تھا۔

مجھے ایک لمحہ کے لیے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ کہیں میں نے طیش میں آ کر کوئی غلط قدم قبل از وقت تو نہیں اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ عموماً غصے اور جوش کی حالت میں اٹھائے گئے اقدام پر انسان کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوا کرتی تھی۔ البتہ اس کا فائدہ ضرور مخالف کے حصے میں چلا جاتا تھا۔ بہر طور اب جو کچھ بھی ہو چکا تھا یا میں کر چکا تھا اس سے پیچھے ہٹنے والا میں بھی نہ تھا۔

مجھے پولیس کا انتظار تھا کہ اچانک میرے سیل فون کی بیل مستثنائی میں نے دیکھا یہ کال عطا محمد کی تھی۔ میں نے بڑسوچ انداز میں اپنی ہمنویں سیکرٹس اور سیل فون کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔

”اے پی یہ کیا مسئلہ ہوا ہے نعمان؟“ دوسری جانب سے عطا محمد کی سنجیدہ اور برہانہ سی آواز ابھری۔ مجھے حیرت تھی کہ انہیں کس نے اس واقعے کی اطلاع کر دی؟

میں نے انہیں پہلے حزمہ خان کے سنگین جرم کے ارتکاب اور اس کی گرفتاری کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر شاہنواز کے فائر کرنے کے بارے میں مطلع کیا تو وہ بولے ”مجھے ابھی ابھی ان کے ایک ساتھی شاہنواز نے کال کر کے یہ بتایا ہے کہ تم ان لوگوں کو اڈے سے بیدل کر رہے ہو؟“

”جی ہاں جناب!“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ دونوں عزیر خان کے ساتھی ہیں اور کرمٹل بھی۔“

”شاہنواز بتا رہا تھا کہ ان کے ساتھی عزیر خان کو بھی تم نے ہی ایک سازش کے تحت گرفتار کروایا ہے؟“

”جی ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ عطا محمد مجھ سے بظاہر عام اور سیدھے سادے انداز میں جان کاری حاصل کر رہا تھا۔ ان کے لہجے میں کئی تنبیہ یا درحقیقی کا فخر محسوس نہیں ہوتا تھا۔

”کیا جرم کیا تھا اس نے؟“

میں نے انہیں ٹہنیہ کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ میرے ہی محلے سے تعلق رکھتی تھی۔ پولیس کو اس کے خلاف

آواز ابھری اور میں گولی کی طرح اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گیا، اس بات کی بھی پرواہ کیے بغیر کہ اڈے کے اندر ہی لارنگ ہوئی تھی۔

باہر نکل کر میری جلتی سکتی نظریں اسی مذکورہ عمارت کی طرف جم گئیں۔ وہاں میرے ملازمین کا ہجوم اکٹھا نظر آ رہا تھا۔ مجمع کافی کی طرح پھٹنے لگا تھا اور عمارت کے باہر میں نے شاہنواز خان اور بشیر خان کو دیکھا۔ وہ سخت جارحانہ موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ شاہنواز خان کے ایک ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ اپنی پر اپنی کی حدود میں اسے اس طرح کی اسلحہ بدست ہد معاشی کرتے دیکھ کر میں بھی آ پے سے باہر ہو گیا اور کسی بھی خطرے یا بلوے کی پرواہ کیے بغیر میں تقریباً دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ مجھے قریب دیکھ کر ملازمین ایک طرف کو ہو گئے۔

”اس مجرمانہ اور غیر قانونی حرکت کا مطلب سمجھتے ہو تم شاہنواز؟“ میں نے غصے سے حلق چاڑ کر اسے لٹکارا۔

”مجرمانہ حرکت میں نے نہیں تمہارے ان آدمیوں نے کی ہے۔“ شاہنواز میری طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔ ”ہم نے یہاں کوئی سستا سٹھلا یا پتھر ہونٹ نہیں کھول رکھا ہے سٹر نعمان! کروڑوں کی سرمایہ کاری کی ہے ہم نے۔ لہذا ہم سے کسی نے بھی یہاں ذرا سی بھی بد معاشی کی تو انہیں اسی زہان میں جواب دیا جائے گا۔“

اس کا ساتھی بشیر خان بھی میری طرف گھورتے ہوئے لمبے سے بولا۔ ”تم بھولو کہ ہمارے پاس بھی غنڈے ہیں۔“

مارے ایک اشارے پر وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”بھواس بند کرو اپنی۔“ میں طیش ناک انداز میں بولا۔

”تم لوگ خود ایک قاتل اور خونی شخص کے ساتھی ہو،“

فہ پولیس گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔ اب لگتا ہے شاید تم اس کی باری ہے۔“

”تم لوگ یہاں سے بالکل نہیں ہٹنا۔ کوئی مافی کالال تم

گولی نہیں چلائے گا۔“ میں نے آخر میں اپنے آدمیوں سے

گھمانہ کھرا دیا وہیں کھڑے کھڑے دن فائبر پولیس کو کال کر

ال۔ یہ پولیس چوکی قریب ہی واقع تھی۔ کال کرنے کے بعد

میں ہی طرح تھماتا ہوا اپنے کمرے میں آ کر بے چینی سے

لٹک لگا اور ساتھ ہی گاہے بگاہے میں کھڑکی سے احاطے کے

اہاں عمارت کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا جس کے سامنے مجمع

لی صورت میں میرے آدمی موجود تھے جبکہ شاہنواز اور

بشیر خان بھی اب تک اسی طرح دروازے پر تنے کھڑے

تھے۔ شاہنواز کے ہاتھ میں ہنوز پستول دبا ہوا تھا لیکن اب اس

فحش شواہد بھی میں نے ہی تلاش کر دیئے تھے۔“

”ہمم.....“ دوسری جانب سے عطا محمد نے پُرسوج سی ہرکاری لی۔ پھر بولا۔ ”لیکن میرا خیال ہے، تم ابھی عزیر خان پر قانونی جرم ثابت ہونے سے پہلے ان کے دو ساتھیوں کو اڈے سے بغل نہیں کر سکتے۔ زبردستی اور جوش میں اٹھایا ہوا قدم ہمارے خلاف بھی جاسکتا ہے۔ یہ لوگ کورٹ سے اٹے آرڈر حاصل کر لیں گے تو پھر ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ پھر نہ ہمیں کرایہ ملے گا نہ کمیشن، سب کورٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ کمال ہے نعمان! تم تو بہت سوچ سمجھ کر اور نہایت بردباری سے اس قسم کے مسائل اور معاملات حل کیا کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اتنی جلد بازی کیوں کرنے لگے ہو؟“

میں ان کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آگے بولے۔

”اپنے آدمیوں کو واپس بلا کر کام پر لگا دو اور شاہنواز وغیرہ کو اپنا کام کرنے دو۔ مالک مکان کے زعم میں اگر تم کرائے دار کے ساتھ زبردستی کرو گے تو اس کے حقوق قانونی طور پر برقرار مل جاسکتے ہیں۔ اسی لیے میرے پہلے عزیر خان پر کوئی فراوانی جرم یا فرد جرم ثابت ہونے کا انتظار کرو، ابھی اس معاملے کو چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں ہونٹ بیچنے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں نے مجبوراً وہی کیا جس کا ہدایت نامہ مشورہ مجھے عطا صاحب نے دیا تھا۔

میں نے آدمیوں کو واپس بلا لیا اور انہیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جانے کی ہدایت کر دی۔ میرا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ عطا محمد کی یہ بات میرے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی اور وہ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے کہ میں اب پہلے کی طرح ہوش کی بجائے جوش سے کام لینے لگا تھا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ کیا واقعی ایسا تھا؟ یا پھر یہ سب دھیرے دھیرے اثر پذیر ہونے والے واقعات سے اس کا تعلق تھا کہ کہیں ہوش سے اور کہیں جوش سے بھی کام لیتا پڑتا ہے۔ کیا مجھے دونوں ہی روش کو متوازن خطوط پر استوار رکھتے ہوئے یہی راہ اختیار کرنا پڑے گی؟

”ہاں!“ میرے دل نے ہی نہیں دماغ نے بھی یہی کہا تھا۔

میں نے تازہ صورت حال پر تھوڑا غور کیا اور فوراً رسد بھائی کو فون کھڑا کیا۔

”جی جناب!“ دوسری جانب سے اس کی سپاٹ سی

آواز ابھری۔ میں نے پہلے اس سے کسی غی بات کا کھوج کئے گا پوچھا جس کا مجھے بھی اندازہ تو تھا کہ ایسا ابھی کچھ نہیں تھا کیونکہ اگر ہوتا تو مجھے اسے فون نہیں کرنا پڑتا۔

”تم کو ایک کام دے رہا ہوں۔“ چند ثانیے بعد میں نے اس سے کہا۔

”جی جناب؟“ اس نے استفسار یہ کیا۔

”کسی بہانے سے یا بیٹیس میں مجھ سے پہلے لاری اڈے پر ملے آؤ۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کیونکہ میں تمہیں جو اہم کام سوچنے والا ہوں اس کا تمہارے لیے پہلے تھوڑا سا مشاہدہ ہونا ضروری ہے۔“

”میں ابھی کچھ جاتا ہوں۔“ اس نے فوراً کہا اور میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے دو تین آدمیوں سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ پولیس کی کوئی بھی گاڑی اندر داخل ہو انہیں سب سے پہلے میرے کمرے میں لایا جائے۔ لہذا وہ ادھر ہی آ گئے۔ ان کے ہمراہ ایک ہیڈ کانسٹیبل آیا تھا، باقی اہلکار پانچ چھ کی تعداد میں تھے۔ میں نے ان کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور پھر ان سے یہی کہا کہ لاریوں سے اترنے والے کچھ مسافروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا، وہ خود ہی منٹ گیا تھا اور وہ پولیس کی دھمکی پر چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی لوگ کولڈ ڈرنکس اور ایک سکٹ وغیرہ کھا کر چلے گئے۔ میں نے حلق سے ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کر کے اپنا سر کرسی کی پشت گاہ سے نکا دیا۔

کچھ سوچ کر میں نے سائیں واڈ کو فون کیا۔ اس نے میری کال ریسپونڈ کرتے ہی ہیڈل کہا تو میں نے پہلے مختصر الفاظ میں اس کی خیر خبریت پوچھی اس کے بعد بولا۔ ”سائیں واڈا ایک کام کر سکتے ہو؟“

”حکم کرو میرے یار!“ اس نے کہا۔

”بتا سکتے ہو کہ اس وقت حاجی مہران خان کہاں ہوگا؟“

”بتا سکتا ہوں۔ چند منٹ دے سکتے ہو؟“

”آدھا گھنٹا کافی ہوگا؟“

”بہت ہے۔“

”گڈ!“ میں خنجر ہوں تمہاری کال کا۔“ میں نے کہا اور

رابطہ منقطع کر دیا۔

میں منٹ بعد ہی اس کا فون آ گیا۔ ”وہ اپنی آبائی زمینوں پر ٹھہر گیا ہوا ہے۔“

”کیا انہیں بھی آپ اپنے ساتھ لائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہوسکتا ہے لیکن آپ کے ہاں آنے سے پہلے میں ان سے پوچھ لوں گا۔“

”نکد! وہ ساتھ آجائیں تو اچھا ہے گا۔“
 ”اوکے!“ کہنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔
 میں نے اپنی رست واپس میں وقت دیکھا اس کے بعد چند ضروری کام نٹائے اور زئیرہ کو فون کر کے فرحانہ کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی اس سے چلنے کو بھی پوچھ لیا۔
 ”ارے بھئی میں تو تیار بیٹھی ہوں آجاؤ، ساتھ ہی نکل چلتے ہیں۔“
 ”مگر..... تمہاری طبیعت؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسے ضروری موقع پر میرا تمہارے ساتھ جانا غیر اہم نہیں ہوگا۔“
 اسی وقت دوسرا اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ چہرے پر سفید واڑی مٹی اور مونچھوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ عام سی شلوار قمیض میں ملفوف تھا۔ کمر بھی قدرے خمیدہ تھی۔

”کیا بات ہے؟ کون ہے یہ؟“ میں نے ایک نظر اس بوڑھے پر ڈالنے کے بعد دوسرے پوچھا۔
 ”سائیں! یہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، کہہ رہا تھا برات کے لیے دو عدد دلا ریاں بک کروانی ہیں۔“
 ”اس سے تم نے کہا نہیں کہ انور شاہ سے بات کر لے۔“ میں نے دوسری طرف گھورا۔
 ”کہا تھا سائیں! مگر یہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتا تھا۔“ دوسرے فوراً جواب دیا۔

”سائیں! آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں کہ میں کون ہوں؟“ اسی وقت میرے کانوں میں سمد بھائی کی آواز گونجی اور میں چونک پڑا۔ تب میں نے آنکھیں کھلیں کہ اس بوڑھے کو دیکھا اور ایک جھماکا سا میرے اندر ہوا۔
 ”تم جاؤ!“ میں نے فوراً ہی دوسرے کو کہا اور وہ حیران و پریشان سا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ارے یا رب! بتا تو دیا کرو پہلے سے کہ تم کس گیٹ اپ میں آ رہے ہو؟ بیٹھو!“ میں مسکرا کر بولا اور ساتھ ہی اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔ وہ کرسی سنبھالا ہوا بیٹھا اور بولا۔
 ”میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن آئندہ آپ

”کب تک لوٹے گا؟“
 ”کچھ نہیں بتا۔“
 ”اور کوئی خاص خبر؟“
 ”کوئی نہیں۔“

”شکریہ دوست!“ کہتے ہوئے میں رابطہ منقطع کرنے ہی والا تھا کہ اس نے پوچھا۔
 ”دش..... دشمنی؟“
 ”ابھی تو نہیں کیا اور تم جانتے ہو کہ اس بے چاری کے لیے ابھی یہ کام بے حد مشکل ہوگا اس لیے جب کوئی خاص بات ہوگی تب ہی وہ جان کا رسک لے کر بھی مجھے بتائے گی۔“
 ”ٹھیک ہے۔ میرے آنے کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔“
 سائیں دادا آخر میں بولا۔

”ابھی نہیں، ضرورت پڑی تو بتا دوں گا۔ تم بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی بات نوٹ کرو تو مجھے فوراً مطلع کرنا، چاہے رات کے تین بجے کا ہی وقت کیوں نہ ہو۔“

اس کے اثباتی جواب کے بعد میں نے سیل فون میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد تین افراد کو میں نے اسی وقت شاہنواز خان کی رہائی پر لگا دیا۔ ویسے تو میں ان پر کڑی نگاہ پہلے سے ہی رکھے ہوئے تھا مگر اب اپنی انتہاء کو پہنچ رہا تھا اسی لیے میں نے اس سلسلے میں مزید اپنی تنگ دو تیز کر دی تھی۔

اس وقت سائیں دادا کو فون کر کے مہراں خان کے بارے میں دریافت کرنے کا میرا مقصد یہی تھا کہ اسے اب تک اپنے بیٹے کی گرفتاری کا علم ہوا تھا یا نہیں جبکہ وہ ٹھٹھہ گیا ہوا تھا۔

ابھی میں نے اس معاملے کو ادھر ہی رکھا اور فرحانہ کو فون کر کے اس کے ساتھ میٹنگ رکھی۔

”آپ آج شام کو آجائیں۔ پاپا ابھی جلد ہی گھر آنے کا مجھے کہہ گئے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”ابھی بات ہے۔ میں آج شام پانچ بجے تک آ جاؤں گا۔“

”اچھا یہ بتائیں نعمان صاحب! زئیرہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ اس نے پورے خلوص سے اس کی خبریت پوچھی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے وہ اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔“ میں نے اہاب دیا۔

کو بتا دیا کروں گا جناب!“

”اوکے!“ میں نے کہا اور پھر میز کی سطح پر رکھی ہوئی چاہیوں کا گچھا اٹھایا، ایک چابی منتخب کر کے میز کی درمیان والی دراز کھولی۔ اس کے اندر سے ایک لفافہ نکالا اور میز پر اسے الٹ دیا۔ اندر سے تین عدد پوسٹ کارڈ ساز کی تصاویر نکل کر میز پر گریں۔ یہ تصویریں رانا بشیر کی تھیں، جو میں نے اپنے ”اسپائی کیم“ سے رانا بشیر کے ساتھ ہونے والی مختلف ملاقاتوں کے دوران کھینچی تھیں۔ ایک تصویر میں وہ اپنی لاڈلی بیٹی فرحانہ کے ساتھ بھی موجود تھا۔

”یو!و!“ میں نے تینوں تصاویر اس کی جانب بڑھا لیں اور کچھ سوچ کر پہلے یو بی اس سے پوچھ لیا۔ ”اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے تم نے؟“

وہ تینوں تصاویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھتا رہا، اس کے بعد ایک ایک تصویر کو چہرے کے قریب کر کے دیکھنے لگا۔ میری نظریں اس کے شرے پر جمی رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ باقی دو تصویریں اس نے میز پر رکھ دیں اور ایک تصویر کو آٹھیں سیکڑ کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ تصویر تھی جس میں رانا بشیر اکیلا نہیں بلکہ اپنی بیٹی فرحانہ کے ساتھ تھا۔ اس تصویر کو اسے غور سے دیکھتا پا کر میں بھی ایک لمحہ کو اندر سے کھٹکا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اس تصویر میں کسی کو پہچان رہا تھا حالانکہ میں نے تو یو بی اسے تصویریں تھمتے ہوئے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اسے پہچان رہا ہے یا نہیں تاکہ میں آگے اس سے بات کر سکوں۔

”میں اس لڑکی کو پہچان رہا ہوں۔“

معافی اس نے دھا کا کیا اور وہ تصویر میری طرف بڑھا کر بولا۔ اس کا انکشاف میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔

”تت..... تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو؟ واقعی؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں کہا۔

”جی ہاں جناب!“ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جناب! آپ کیوں اس قدر حیران ہو رہے ہیں؟ یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں۔“

”لیکن میرے لیے ہے سدا بھائی!“ میں نے فوراً کہا۔ ”اس لیے کہ میں نے ہمیں یہ تصاویر پہچاننے کے لیے نہیں دی تھی اصل مقصد میرا یہ تھا کہ اس میں جو پختہ العمر شخص نظر آ رہا ہے، میں نے اس کی تم سے رکھی کروانی تھی، تو لگے ہاتھوں میں نے ایسے ہی روادری میں کہہ ڈالا تھا کہ تم نہیں پہچانتے تو نہیں؟“

وہ مسکرایا۔

”میرے لیے یہ واقعی ایک حیرت ناک انکشاف ہوگا اگر تم مجھے ذرا تفصیل کے ساتھ اس لڑکی (فرحانہ) کے بارے میں بتاؤ گے، مگر پھر وہ سب سے پہلے مجھے اس کا نام بتاؤ۔“

”فرزری..... فریو یاد آیا..... فرحانہ!“

”اوبائی گاڈ!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا اور سدا بھائی اس بار تو جیسے مجھے ہولنوں کی طرح دیکھتا چلا گیا تھا۔

”جناب! آپ ان تصویروں کے متعلق مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے؟“ مجھے حیرت میں ڈوبا دیکھ کر شاید اسے بیزاری سی ہونے لگی تھی اور اسی لیے اس نے فوراً مقصد کی بات کر دی۔

میں نے کہا۔ ”مفہوم پہلے مجھے فرحانہ کے متعلق بتاؤ تم اسے کیسے جانتے ہو اور اسے کہاں اور کس کے ساتھ دیکھا ہے؟“

”کوئی زیادہ طویل عرصہ نہیں ہوا۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”بہی کوئی تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ آئی تھی۔ میں اس وقت وہیں تھا۔“

”کس سلسلے میں آئی تھی؟“

”یہ مجھے نہیں پتا۔“

”تم نے ایک بار ہی اسے وہاں دیکھا تھا یا.....“ میں نے استفسار یہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

”دو تین بار دیکھا تھا اور ہر بار اس کے ہمراہ وہی نوجوان تھا۔“

”اس نوجوان کا ناک نقشہ بتا سکتے ہو؟“

سدا نے اس نوجوان کا جو طلیہ بتایا تھا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اصل بات چھیڑ دی۔

”سنو!“ کہتے ہوئے میں نے میز پر سے صرف وہی دو تصویریں اٹھائیں جس میں صرف رانا بشیر موجود تھا۔ وہ اسے ایک بار پھر دکھاتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص کی رکھی کروانی ہے۔ گھر سے دفتر اور اس کے بعد یہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ کون زیادہ قریب رہتا ہے۔“

میں نے اسے دونوں پتے از پر کروا دیے اور آخر میں بولا۔ ”یہ لڑکی فرحانہ اس کی بیٹی ہے۔ ممکن ہو سکے تو اس کی بھی گھرائی کر کے مجھے مطلع کر دینا۔“

”ٹھیک ہے جناب! اور کچھ؟“ سدا بھائی بولا۔ میں کچھ دیر تک پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے بیٹھا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آخری بات جس فوجوان کو تم نے فرحانہ کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اب دوبارہ تمہیں دکھائی دے تو مجھے مطلع ضرور کرنا۔“

”ٹھیک ہے جناب!“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اپنے جیبی پرس سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر اسے تھا دیئے۔ ”یہ تمہارا پوسٹ ہے مگر کام جتنی جلدی ہو سکے اتنا ہی اچھا ہوگا۔“

”میں پوری کوشش کروں گا جناب!“ وہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا اور چلا گیا۔

لگ بھگ شام ساڑھے پانچ بجے میں اور زہیرہ، رانا بشیر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ دونوں باپ بیٹی لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے اور زہیرہ نے بھی ایک ایک کپ لیا اس کے بعد ہم چاروں اٹھ کر اندر نشست گاہ میں آ گئے۔

اس بار میں اور زہیرہ یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ وہ دونوں مذکورہ ڈائریاں لے کر ہی جائیں گے اور وہ تصویر بھی جس میں رانا بشیر کے سابقہ پارٹنر نیر الدین اور اس کی بیوی، بیٹے تھے۔ ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہی میں نے رانا بشیر کے چہرے پر نظر پڑا۔ جہاں سے وہ پوچھا میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا مگر اس وقت آپ کو دفتر کی ایک اہم میٹنگ میں جانے کی جلدی تھی اور وہ رہ گیا تھا۔ میں نے یاد دلایا۔

”سوری! میں شاید بھول رہا ہوں۔ تم دوبارہ دہرا سکتے ہو وہ سوال؟“ اس نے کہا۔

اس کے چہرے سے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب ان سارے معاملات سے بیزار سا ہونے لگا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی۔ وہ شاید یہی سمجھتے ہوئے تھا کہ میں اتنا وہ اہم سوال بھول چکا ہوں گا مگر میں نے بھی گویا چھوٹی سی اسی سوال سے ابتدا کی۔

”شیوہ!“ میں نے ہولے سے کہا اور پوچھا۔

”آپ کے وہ سابقہ پارٹنر نیر الدین اور ان کی فیملی، بقول آپ کے جرمی شفٹ ہو چکے ہیں اور میرا سوال آپ سے یہ تھا کہ کیا وہ آپ کی اہلیہ کے متقول ہونے سے پہلے جرمی شفٹ ہو چکے تھے یا بعد میں؟“

کمرے میں ایک ایسا میکی پرسوج خاموشی طاری ہوئی تھی۔

رانا بشیر کا چہرہ سوچنا ہوا سا بن گیا تھا اور ہم تینوں کی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اسی دوران میں نے جب کن آنکھوں سے فرحانہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے عجیب سی الجھن کے آثار رز جتے محسوس ہوئے۔

”اس کا جواب مجھے سوچ کے دینا پڑے گا۔“ بالآخر رانا بشیر نے کہا۔ ”کیونکہ مجھے ٹھیک طرح اندازہ نہیں اس بات کا، دفتر جا کر ہی مجھے کچھ ریکارڈ کھنگالنا پڑے گا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ پہلے یہ دیکھنا چاہیں گے کہ آپ کے اور نیر الدین کے درمیان کاروباری شراکت داری کب اور کون سی تاریخ کو منقطع ہوئی تھی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اپنی طرف سے ایک گہرا لگائی۔

”بالکل یہی بات ہے۔“

”لیکن..... اس تاریخ سے یہ بات کس طرح ثابت ہوگی کہ وہ پاکستان سے کب اور کون سی تاریخ کو ہجرت پذیر ہوئے؟“

”پہلے ایک بات معلوم ہو جانے دو، بعد میں وہ بھی میں معلوم کر لوں گا۔“ رانا بشیر نے جواب دیا۔

”کس طرح معلوم کریں گے آپ؟ کیا ان کی روانگی کا کوئی ڈیٹا آپ کے پاس موجود ہے یا ان کے کسی عزیز رشتے دار سے دریافت کرنے کی کوشش کریں گے؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے ایک بار پھر یہ سوال کرنے کے بعد فرحانہ کے چہرے پر دزدیدہ سی نظر ڈالی تھی اور اب وہاں مجھے الجھن کے ساتھ ایک عجیب سی حیرت کے آثار بھی اٹتے محسوس ہونے لگے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے اندر کی کیفیات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن..... میری بھانپتی ہوئی نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ دونوں باپ بیٹی کے درمیان دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔

”ارے مجھی تم بھی ایک وقت کئی سوال پوچھ لیتے ہو شاید یہ ایڈووکیٹ زہیرہ کی محبت کا اثر ہے۔“ رانا بشیر نے ہنسی کے ساتھ گول مول سی بات کر گیا۔

”ظاہر ہے جب تک پہلے سوال کا جواب تسلی بخش نہیں ہوگا تو اس سے مربوط و متصل سوالات خود بہ خود ہی پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔“ میں نے بھی اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑا اکسمایا اور اسی وقت فرحانہ نے جو اپنے باپ کے بالکل قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی، تھوڑا جھک کر سرگرمی میں باپ کے کان میں کچھ کہا تھا جس پر رانا بشیر نے نفی میں سر ہلایا تھا مگر منہ سے بولا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے ان دونوں باپ

بیٹی کی یہ ”ادا“ ناپسند محسوس ہوئی۔

”ایٹیکسکو ز می!“ اسی وقت ایڈووکیٹ زبیرہ نے ہونے سے ہٹکھار کر کہا۔ ”آپ دونوں اگر واضح روش اختیار کر لیں تو معاملہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے حل کی جانب بڑھ سکتا ہے۔“ زبیرہ کی اس ذوقی بات کا مطلب فرحانہ کو نہ سمجھ سکی، البتہ رانا بشیر جڑ بھڑک کر کھسپائی ہنسی تلے بولا۔

”ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

تب ہی فرحانہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور وہ صاف کوئی سے بولی۔ ”اس فیملی نے مرحلہ وار جرمی جبریت کی تھی۔“

میں اور زبیرہ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتے رہے اور ساتھ ہی میری دزدیدہ نظروں نے رانا بشیر کے چہرے سے کچھ برہمی کے تاثرات اٹھتے محسوس کیے تھے۔ جیسے انہیں بیٹی کا بولنا ناگوار گزرا ہو۔ ”سب سے پہلے میزالدین جرمی گئے تھے اور اس کے بعد۔“

”ارے فری بیٹا! میں نے تو ایک اندازے کے تحت تمہیں بتایا تھا۔ اصل اور حقیقی تاریخ اور اس خاندان کی ہجرت وغیرہ کے سلسلے میں تو ریکارڈ دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔“ رانا بشیر نے بیٹی کی بات کاٹ کر کہا اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”اندازوں اور مفروضوں کے بجائے میں مناسب سمجھوں گا کہ پہلے دفتر جا کر اس سلسلے میں ریکارڈ چیک کر لوں۔“

”بہت اچھی بات کہی آپ نے.....“ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ فوراً اس موضوع کو سر دست ادھر ہی دفن کرنے کا فیصلہ کیا اور فرحانہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ برائے کرم ہمیں وہ دونوں ڈائریاں دے دیں۔ میں ذرا غور سے خود بھی پڑھنا چاہتا ہوں، شاید کوئی کلیو ہاتھ لگ جائے۔“ میری بات پر فرحانہ نے جھجکتے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے سر دلچے میں بولا۔

”مسٹر نعمان! وہ ڈائریاں آپ کے سامنے آپ کو اور ایڈووکیٹ زبیرہ کو پڑھادی گئی ہیں۔ اب اس میں بھلا پڑھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ یوں بھی وہ میری وائف کا پرسنل اسٹف ہے۔ وہ میں کسی غیر کو دینا پسند نہیں کرتا۔“

اس کی بات سن کر میرے سینے میں طیش کا ایک بگولا سا اٹھا تھا۔ اس کی شخصیت ابتدا ہی سے میرے لیے مشکوک رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ دن بدن اور زیادہ مشکب و شبہ میں پڑتی

جاری تھی۔ شروع میں بس اس نے اتنا ہی تعاون کیا تھا مگر جیسے جیسے میری مستقل مزاجی اور ثابت قدمی اور ایک عزم کی چٹکی کا رانا بشیر کو ادراک ہونے لگا تو وہ بیزار نظر آنے لگا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ میں وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی اس ”مچھلیک“ قصے سے بیزار ہو کر چپکا بیٹھ رہوں گا تو معاملہ از خود ہی ختم ہو جائے گا، یہی وجہ تھی اس کی اس روز ہمارے گھر آمد اور شرمندگی کا اظہار بھی منافقت سے کم نہ تھا، کیونکہ دونوں ڈائریاں اس کی بیٹی کے ہاتھ لگ چکی تھیں اور وہ انہیں غائب نہ کر سکا تھا تو یوں اپنی شرمساری ظاہر کرنے چلا آیا تھا، مقصد صرف اپنی بیٹی کی نظروں میں خود کو ”بے گناہ“ ثابت کرنا ہی تھا۔

میں نے پھر بھی اپنے مزاج کے مطابق ضبط سے کام لیتے ہوئے مگر اندر کا ابال لفظوں میں پروتے ہوئے رانا بشیر سے کہا۔ ”میرے نزدیک خواتین کے پرسنل اسٹف میں زیرِ جامے ہوتے ہیں، میں تو آپ سے نہیں مانگ رہا ہوں!“

”واٹ نان سنس.....“ رانا بشیر کو میرے کاٹ دار اور ذوقی طعنے پہلے لگا کر رکھ دیا۔

”یہ کیا بیہودگی ہے؟ میں اپنی مرحومہ بیوی کے لیے ایسا گندہ مذاق بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”مقتولہ بیوی!“ میں نے اسے مزید زچ کرنے کے لیے ہتھیج کی اور آگے بولا۔ ”کمال ہے رانا صاحب! آپ اپنی مقتولہ بیوی کے بارے میں بقول آپ کے یہ گندہ مذاق پسند نہیں کرتے جو بہر حال کسی قسم کی گندگی میں نہیں شمار ہوتا ہے لیکن آپ کو اصل قاتل کے سراغ لگانے کی کوئی فکر نہیں ہے؟ آپ ڈائری کی بات کر رہے ہیں جبکہ پولیس تو دورانِ تحقیق کسی بھی مقتولہ کی چھوڑی ہوئی ایک ذرا سی سطر تک کو بھی اہمیت دینے کو نظر انداز نہیں کرتی کہ اس نے کیا لکھا ہے، یہ تو دو عدد دستم ڈائریاں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ اس میں کوئی ایسا مواد سرے سے شامل ہی نہیں جو کسی اور کو پڑھانے سے بیہودگی میں شمار ہوتا ہو۔ ہاں البتہ اس میں وہی مواد موجود ہے جو تحقیق کے دوران پولیس کو پوری مدد فراہم کر سکتا ہے۔“

میری بات پر رانا بشیر کا چہرہ غصہ اور طیش میں مزید سرخ ہو گیا مگر اس کے غصے میں مجھے ایک طرح کی جھلاہٹ اور بے بسی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ چلا کر بولا۔ ”مسٹر نعمان! میں بھاڑ میں جھونکا ہوں ان دونوں ڈائریوں کو اور اس سارے معاملے کو بھی آپ کو اتنی جلد بازی ہو رہی ہے تو خود ہی جا کر اپنے باپ کے اصل قاتل کو تلاش کر لیں۔“

میں خود بھی اس کی بات پر اندر سے بری طرح بھر گیا۔
فرحانہ بھی اس بد مزاج صورت حال پر پریشان اور متحوش سی ہوئی
تھی۔ اسی وقت ایڈووکیٹ ذنیرہ رانا بشیر سے مخاطب ہو کر بولی۔
”رانا صاحب! آپ کو اس طرح چلا کر بولنا زیب نہیں دیتا۔ آپ
ماشاء اللہ سے ایک پیچورڈ پرنٹائی کے مالک ہیں۔ پھر یہ ایک گنیمت
معاملہ ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ آپ کے لیے کسی ایسے غصے کا
سبب بننا ہو۔ خیر، آپ بتادیں کہ پھر آپ کیا چاہتے ہیں اور کس
انداز میں اس معاملے کو آگے لے جایا جائے؟“

میرا خیال تھا کہ ذنیرہ نے بڑی چالاکی سے یا تو
رانا بشیر کے اندر کا چور ظاہر کرنے کے لیے گیند کو دانستہ اس کے
کورٹ میں پھینکی تھی یا پھر وہ درست اس بد مزگی کو ختم کر کے
بعد میں کوئی اور مربوط لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی۔ میں نے
بھی یہی کچھ سوچتے ہوئے اپنے اندر کے ابال کو رفتہ رفتہ
مصلحت کوئی کی تھپکیاں دیتے ہوئے ”کول“ کرنا چاہا تھا۔
”اس کے بارے میں اب پھر بھی بات ہوگی، اس
وقت میں اب مزید اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا، میرا
موضوع خراب ہو گیا ہے لیکن اگر آئندہ بھی ایسا ہوا۔ یعنی مسٹر
نعمان نے جلد بازی یا کسی قسم کی بیہوشی کا مظاہرہ کیا تو میں
ٹھیک آکر اس پورے معاملے کو ہی پٹیلز پر فون کر دوں گا۔“ یہ
کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے جواب میں
پھر کچھ کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے ساتھ بیٹھی ذنیرہ
نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔

”آپ پلیز! اس وقت تشریف لے جائیں۔ بابا غصے
میں آگئے ہیں، میں انہیں بعد میں خود ہی سمجھا دوں گی۔“
فرحانہ نے فوراً ہی معذرت خواہانہ انداز میں ہماری طرف
دیکھتے ہوئے کہا تو میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سدو
بھائی کی دی ہوئی معلومات کے مطابق اس سے چند سوال
پوچھ لوں لیکن یہ سوچ کر ابھی قبل ازل وقت ہوگا، پہلے دیکھا
جائے کہ سدو بھائی نئی رپورٹ کیا دیتا ہے۔ تاہم میں اور ذنیرہ
اپنی جگہ سے رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرحانہ
ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں ہم سے بولی۔

”بابا کے رویے کی میں ایک بار پھر آپ سے معافی
چاہتی ہوں، وہ درحقیقت آج کل واقعی بہت پریشان ہیں۔
شاید کوئی کاروباری معاملہ ہے۔“

”پریشانی کی وجہ صرف کاروباری ہی نہیں اور بھی ہو سکتی
ہے۔“ میں نے معنی خیر لہجے میں قدرے سختی سے کہا۔ ”لیکن
آپ انہیں سمجھا دیجیے گا کہ اگر انہوں نے اسی طرح اپنا عدم

تعاون کا رویہ برقرار رکھا تو مجھے مجبوراً کسی ذمے دار پولیس
افسر سے رجوع کرنا پڑے گا۔“ فرحانہ کو فکرمند سا پا کر میں نے
اس کی طرف مڑ کر تشبیہ والے انداز میں کہا۔ ”وہ دونوں
ڈائریاں سنہالے رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر کھو گئیں
تو آپ جانتی ہیں کہ میرا سب سے پہلا شبہ کس پر جائے گا اور
پھر میرے پاس آخری آپشن پولیس سے مدد لینے کے سوا اور
کچھ نہیں ہوگا۔“

رانا بشیر کی رہائش گاہ سے واپسی میں ذنیرہ اور میں کار
میں روانہ ہوئے تو راستے ہی میں، میں نے اس کے ساتھ
سدو بھائی کی معلومات شیئر کر ڈیٹا میں اور یہ بھی بتایا کہ میں نے
اسے رانا بشیر کی مستقل نگہبانی پر مامور کر دیا۔
”یہ تم نے بہت اچھا کیا ہوئی!“ ذنیرہ فوراً بولی۔

کار میں ہی ڈرائیور رہا تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ
پر براجمان تھی۔ ہم تھوڑی دیر اسی مسئلے کے متعلق گفتگو کرتے
رہے۔ اسی دوران میرے سیل فون پر ایک ایس ایم ایس
موصول ہونے کی بے ابجری۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔
ذنیرہ کی رہائش گاہ نیٹانڈن کی طرف تھی جس کی حدود
میں ہم داخل ہو چکے تھے۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد میں نے
ذنیرہ کو اس کے مکان کے دروازے پر اتارا اور جب وہ مجھے
الوداع کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے دروازے سے
اندر داخل ہو گئی تو میں نے کار ریورس کی اور اسٹیئرنگ گھما
کر جیسے ہی ایک موڑ کاٹا تو اچانک ہی میری نگاہ ایک پلو کیب
پر پڑی اور اسے عام سی نیکی سمجھ کر مجھے اس پر کوئی شبہ نہ ہوسکا
اور میں نے دائیں جانب ایک اور موڑ کاٹا، کیونکہ یہ راستہ
تھوڑی دور جا کر مین روڈ سے متصل ہوتا تھا۔ پھر بھی غیر ارادی
طور پر میری دوسری بار نگاہ پلو کیب پر پڑی جو ایک خالی پلاٹ
کے پاس ہی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس میں ڈرائیور موجود
تھا۔ میں نے مذکورہ موڑ کاٹا تو پتا نہیں کیوں آخری بار میں نے
وڈ اسکرین پر لگے بیک ویو لمپر پر نظر ڈالی تو چونکا۔ نیکی میں
ڈرائیور کے ساتھ مجھے ایک اور آدمی کی بھی جھلک دکھائی دی۔
مجھے حیرت تو ہوئی تھی کہ اتنی سی دیر میں اگر کوئی شخص نیکی کی
طرف دوڑتا اور سوار ہوتا تو مجھے پہلے ہی نظر آجاتا تو کیا دوسرے
شخص نے خود کو دانستہ نیچے جھکا رکھا تھا اور پھر میری کار کو مڑتے
دیکھ کر وہ سیدھا ہوکے پیٹھ گیا تھا۔

میری چمچی جس نے خطرے کا الارم بجایا۔ ذنیرہ کے
حادثے والے روز سے تو میں اس کے لیے زیادہ ہی متحاط ہو گیا
تھا اور وہ جب بھی میرے ساتھ ہوتی میں بہت متحاط ہو کر اور گرد

وچش پر نگاہ ڈالے ہوئے ہی رکھتا تھا۔ بلو کیب سے میں اس لیے شاید دھوکا کھا گیا تھا کہ اسے میں محض عام یٹیکسی سمجھا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میری بیک دو یو پر نگاہ پڑ گئی اور اس میں پہلے سے ہی موجود دوسرے شخص کو مشکوک انداز میں ابھرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا۔

میں نے یک دم بیک پر اپنا پاؤں رکھ دیا لیکن کار کو بیک اس طرح لگائے کہ اس کے ٹائر ’مسکڈ‘ نہ کریں تاکہ ان کی چرچاہٹ سے وہ مشکوک شخص چونکا نہ ہو جائے۔

کار ایک طرف روکنے کے بعد میں نیچے اترا آیا۔ شام اپنی زلفیں سیٹھ رہی تھی اور رات کی تیاری میں اس پر شب کا آچل سرسارنے لگا تھا۔ تاہم رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی کہ شب گزیدگی ماحول پر اثر پڑ رہی ہوئے لگتی۔ لوگ باگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، میں بھی انہی میں شامل ہو گیا اور کسی بھی قسم کی جلالت کا مظاہرہ کیے بغیر مشرگشت کے انداز میں واپسی کی طرف مڑنے کے بجائے ایک ذیلی گلی میں داخل ہو گیا جو مکانات اور بنگلوں کا عقبی حصہ تھا۔

یہ تنگ گلی تھی اور یہاں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر رکھے نظر آرہے تھے۔ یہ گلی اسی راہ پر ختم ہوتی تھی جدھر وائیں ہاتھ پر سامنے کے رخ پر زہیرہ کا مکان تھا۔ یہاں اکثر آنے جانے کے باعث یہاں کی میں ایک ایک گلی اور راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

میں جلد ہی گلی کے اختتام پر پہنچ گیا اور تھوڑا سا سر ابھار کر دیکھا۔ پہلی ٹیکسی اپنی جگہ جوں کی توں کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ابھی تک وہی شخص بیٹھا تھا جسے میں ... ڈرائیور کی حیثیت سے دیکھ چکا تھا جبکہ دوسرا مشکوک آدمی ٹیکسی سے اتر چکا تھا اور وہ زہیرہ ہی کی رہائش گاہ کے باہر عین دروازے پر کھڑا تھا۔

وہ دروازے کے اس قدر قریب کھڑا تھا جیسے اس کا ارادہ ہو، دروازہ کھلے اور وہ غراب سے اندر داخل ہو جائے۔ بلکھت میرے پورے وجود میں ہنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میری نظریں یہ غور اسی آدمی پر پڑ گئی ہوئی تھیں۔ وہ درمیانے قد بت کا مگر صحت مند شخص تھا۔ اس نے دھاری دار نی شرت پہن رکھی تھی۔ پتلون بھی اس کی لافظ ٹائپ تھی، یعنی خاصی کھلی ڈلی۔ ایک ہاتھ اس کا پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے شاید کال بتل، بجادی تھی اور دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

”یہ کوئی عام ملاقاتی بھی ہو سکتا تھا؟“ ذہن میں ابھرنے والے اپنے اس لغو خیال کو میں نے تیسرے جھک

دیا۔ کیونکہ اس کے مشکوک انداز پر میں پہلے ہی کھٹک چکا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے عقب میں جاتا تو ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور نما اس کا ساتھی اسے خبردار کر سکتا تھا۔

”کیا کرنا چاہیے مجھے؟“ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

اسی وقت شاید اندر سے کسی نے کچھ پوچھا تھا اور وہ شخص منتظر انداز میں اپنا قدرے جھکا ہوا سر اب اٹھا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ میں یہی دعا کر رہا تھا کہ خالہ نجو اس آدمی کی شناخت پوچھے بغیر دروازہ نہ کھولے اور زہیرہ کو مطلع کر دے تو مجھے بھی یہاں سے تیل فون پر زہیرہ کو اس متوقع خطرے سے آگاہ کرنے کا موقع مل سکے مگر اگلے ہی لمحوں میں نے دیکھا کہ دروازہ ڈرا سکتا تھا اور کسی نے دیکھا، یہی وہ وقت تھا جب وہ مشکوک آدمی ہل کے ہل اپنے گرد و پیش میں ایک نگاہ ڈالتے ہی جارحانہ انداز میں اندر گھستا چلا گیا تھا۔ میرا دل جیسے تیزی کے ساتھ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ نشیوں پر جیسے حشرات العرض رینگنے لگے۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ٹیکسی ڈرائیور کی نظروں کے سامنے آ کر دروازے کا رخ کروں۔ یہی میں نے کیا اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف دوڑا۔

اس راستے میں لوگوں کی آمد و رفت کم کی ہی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ڈرائیور اپنی سیٹ پر یوں ایک دم اچھلا تھا جیسے اسے بچھونے ڈنک مارا ہو۔

میں اسے نظر انداز کرتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک ایسی میری ٹھٹھی ہوئی ساعتوں نے ٹیکسی کے انجن کی غراہٹ سنی۔ اس کا انجن شاید پہلے ہی سے جاگتا ہوا رکھا گیا تھا اور ڈرائیور نے ریس دی تھی کیوں؟ اس کا ادراک بھی مجھے فوراً ہی ہوا تھا کیونکہ اسی لمحہ میں نے دیکھا ٹیکسی کسی طوفانی گبولے کی طرح حرکت میں آئی تھی اور گولی کی طرح میری جانب بڑھی۔ ایک لمحہ کو تو میرے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کروں؟ لیکن جیسے ہی ٹیکسی اندھا دھند دوڑتی ہوئی میرے سر پہ پہنچی میں اپنی جگہ سے پوری قوت کے ساتھ اچھلا۔

ٹیکسی ایک خیر کار تھی جس کا بونٹ آگے سے قدرے سولہوی اور نیچے ہوتا ہے، ورنہ میری چھلانگ اتنی زیادہ اونچی نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم میں فوری طور پر اس کی طوفانی نگر سے بچ تو گیا تھا اور بونٹ پر میرے پاؤں پڑے تھے۔ خود کو بچانے کے لیے میری اس حرکت کا شمار غیر ارادی بھی ہو سکتا تھا۔

کار کے بونٹ پر پاؤں پڑے مگر میرے جسم کا توازن

قائم نہ رکھ سکے اور یہی ٹیکسی رکی تھی، نتیجے میں یہ ہوا کہ میں بوٹ پر آتے ہی اس کی وڈ اسکرین سے ٹکرایا اور میرے ڈھتے ہوئے وجود کو ایک جھٹکا لگا، شکر تھا کہ میں سائڈ میں سڑک پر گر کر اور کار تلے پھنسنے سے محفوظ رہا تھا، کچھ خراشیں ضرور آئی تھیں مگر بڑی چوٹ اور بڑے حادثے سے تو کافی حد تک بچ گیا تھا۔

میرے پاس یوں بھی اسلحے نام کی کوئی شے کبھی نہیں رہی تھی۔ کار آگے نکل چکی مگر تھوڑی دور جا کے اس کے ٹائروں کی چرچراہٹ ابھری تھی۔ میں گرنے کے بعد سنبھلا۔ نظریں میری ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ رک کر اسی تیزی کے ساتھ پھر رپورس ہوئی جب تک میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کچھ بحال ہوگئی تھی۔ میں نے گھر کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا مگر وہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ مشکوک شخص اندر جانے اب تک کیا کل کھلا چکا تھا مجھے اس کا صرف ہولناک اندازہ ہی ہو سکتا تھا جبکہ باہر موجود اس کے ٹیکسی ڈرائیور ساتھی نے مجھے کوئی ایسا موقع دیے بغیر اپنے ساتھ ”مصرف“ کر دیا تھا۔ دروازے پر ہاتھ مارنے کا ایک مقصد میرا یہ بھی تھا کہ اندر درانا وار گھنے والا وہ شخص بھی بدک جائے کہ کوئی باہر تھا۔

دشمن..... عام کار کی بجائے ٹیکسی کو بروئے کار لائے تھے تاکہ کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو اور ہوا بھی ایسا ہی تھا، ابتدا میں، زنیہ کی رہائش گاہ کے قریب کھڑی ایک ٹیکسی کو دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی سواری وغیرہ اٹھانا ہوئی اور میں دھوکا بھی کھا گیا تھا، یہ تو غیر ارادی طور پر میری بیک وڈ پورنگاہ بڑھ گئی تھی اور میں نے ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص کو اچانک ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ میری کار آگے نکل چکی تھی۔

بہر طور، ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھی کی راہ ہموار کرنے میں بڑی تندہی کے ساتھ کوشاں نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی رپورس کی اور ایک بار پھر مجھے ٹکرا مانے کی کوشش چاہی۔ یہ اس کی دم توڑی آخری حرکت کبھی جاسکتی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ دیر عام پبلک پلیس میں یہ نیم فلی ایکشن افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ ”اے..... اے..... کون ہوں..... خبردار!“ میں دانستہ حلق کے بل زور سے چلا یا۔ رپورس ہوتی ٹیکسی کا یہ وار بھی خالی کیا تو وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ ہو چلا تھا۔ یعنی ٹیکسی ڈرائیور کا فرار کیونکہ یہ وار بھی خالی جاتے ہی کار رک کر آگے بڑھی ایک موڈ کاٹ کر غائب ہوگئی۔ زنیہ کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر کے میں غیظ میں دوڑتا ہوا آیا اور پوری قوت سے

اپنے کانڈھے کی ٹکر دروازے کو رسید کر دی۔ میں کچھ زیادہ بھاری بھر کم ڈیل ڈول کا مالک نہ تھا مگر اتنا گیا گزرا بھی نہ تھا جسم ذرا چھریا مگر دروازہ قامت تو تھا لیکن دروازہ ہلا تھا کھلا نہیں۔ مقصد میرا بھی یہی تھا کہ اندر داخل ہونے والا وہ مشکوک آدمی پریشانی کے ساتھ ہولکھلا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے سیل فون کے ذریعے رابطہ کر کے خطرے سے آگاہ کر دیا ہو۔

اسی وقت میں نے برابر والے مکان کا دروازہ کھلنے دیکھا۔ ایک پختہ العمر شخص برآمد ہوا تھا۔ وہ شاید اس سارے کھڑ بڑا ہٹ سن کر ہی باہر نکلا تھا۔

”ارے بھی کیا ہو رہا ہے یہاں؟ یہ شور کیسا ہے؟“ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شک کے سائے لرزاں تھے۔

”جناب! یہ میری ایک عزیزہ ایڈووکیٹ زنیہ کا گھر ہے۔ اندر ایک چور کو گھستے دیکھا ہے میں نے آپ پلیز مجھے اپنے گھر سے ان کی چھت پر جانے دیں، ان کی زندگی بخت خطرے.....“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ پختہ العمر شخص نے تھوڑی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹنے پاؤں دوبارہ اپنے گھر کے دروازے سے اندر گھسنے کی کوشش چاہی تھی اور میں سمجھ چکا تھا کہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح کسی پرانے پھنڈے میں ٹانگ اڑانا پسند کرنا نہیں جانتا تھا لیکن میرے سر پر اس وقت زنیہ کو خطرے سے بچانے کی ذمہ داری تھی۔

چنانچہ جیسے ہی میں نے اس آدمی کو اندر فرار ہونے دیکھا تو اس کی جانب لپکا۔ وہ بے چارہ مزید خوف زدہ ہو گیا، تب تک میں کسی بھی قسم کے نتائج کی پرواہ کیے بغیر اسے اپنے ہی گھر کے اندر دھکیلتا ہوا لے گیا اور میری متلاشی نظروں نے فوراً چھت کی جانب جاتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا اور اسی طرف کوشش دوڑا۔

اس کی چھت سے زنیہ کے مکان کی چھت ملی ہوئی تھی اور دونوں گھروں کی دیواروں کے بیچ خلا اتنا زیادہ کشادہ نہ تھا کہ میں ان کی منڈیروں کو چھلانگ لگا کر پار نہ کر سکتا۔

زنیہ کے مکان کی چھت پر پاؤں ٹکاتے ہی میرے پورے وجود میں جیسے بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ میں نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

ٹھیک اسی وقت نیچے اندر کہیں گولی چلنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی نسوانی چیخ ابھری، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ (جاری ہے)



(منشی عزیز مئے لندن کا جواب)

عباس علی سید..... لاہور

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

ریحان علی..... اسلام آباد

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
نہ غم میں آپ ہی کیسے دل کو مرے بہلائے کون

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

آفتاب احمد نصیر اشرفی..... کراچی

یہ طلوع روزِ طلال ہے سو گھنٹہ بھی کس سے کریں گے ہم
کوئی دل رہا کوئی دل شکن کوئی دل فگار کہاں رہا

(اختر علی لاہور کا جواب)

ڈاکٹر عبدالغنی بکلیل..... ملتان

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

نامہ تحریم..... کراچی

کچھ اس ادا سے میرے ساتھ بے وفائی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

شبیر شاہ..... کشمور

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

(مہوش صدیقی بھمبر کشمیر کا جواب)

عبدالجبار رومی..... لاہور

وہ انسان فقط تنہی لگتے ہو
جو بچی سوچ کا حال ہے

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

عشنا عباس..... جہلم

اندھیری راتوں میں امید کے جلا کے چراغ
یقین کی روشنی آنکھوں میں وہ سجاتے ہیں

نیلوفر شاہین..... اسلام آباد

اب آپ ملقت ہیں تو دنیا ہے نمکسار
غم کیا ملا کہ آپ ملے اک جہاں ملا

نزابت افشار..... فتح جنگ

اک ذرا سی بات پہ دامن چھڑا لیا ہم سے
تمام عمر کی وابستگی کو بھول گئے

نزهت پروین..... کراچی

یہ ستارہ جو گرا ٹوٹ کے اونچائی سے
تکسی ڈرتے کی ہنسی اس نے اڑائی ہو گی

(اوریس مسیح کراچی کا جواب)

عبدالحکیم شہر..... کراچی

یہی چاند تھا اس کو گواہ خبرا کر
ذرا سا یاد کرو تم نے کیا کہا تھا مجھے

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

احمد یار خان..... پشاور

نہ جب کوئی تمہارے پاس ہو گا
بہت پچھتاؤ گے میری کمی سے

(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

نواز شعلی..... لاہور

ہم تجھے منزل سمجھ کر آئے تھے
تو ہزاروں راستے میں بٹ گیا

انوار حسین..... سرگودھا

ہزار شاہد رعنا ملے مگر ہم کو
اسی ستارہ جبین کی عبادتیں کرنی

انوشہ نوید..... گجرات

ہے بڑھاپے کے لیے تو سرد سا اک سلسلہ
اور جوانی کے لیے ہے آگ برساتی گھٹا

اقراہ بانو ناگوری..... کراچی

ہم وفا کر کے رکھتے ہیں امید وفاؤں کی
دستی میں یہ سوداگری بھی جرم ہے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نگار فاروقی..... راوہ لپنڈی
یاد آتی ہیں وہ شامیں جب رسم و راہ کسی سے تھی
ہم بے چین سے ہونے لگتے جوں جوں یہ دن ڈھلتا تھا
عارفہ جہانگیر..... پاک پتن
یہ تسلیاں مجھے بعد میں رلائیں گی
مجھ کو آسرا نہ دو آج میں اداس ہوں
رفیق احمد ناز..... ڈیرہ غازی خان
یہ کھلا کھلا سا چہرہ یہ حسین مسکراہٹ
تیری خم یہ خم زلفیں میری زیت کا سہارا
(نامہ تحریم کراچی کا جواب)

انیس ملکائی..... حیدر آباد
حیات و موت کی آئینہ دار ہے آتش
بہی جلی ہوئی سگریٹ بھی ہوئی سگریٹ
نرگس فاروق..... کوٹ دادن
حسین اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالہ امرو کہاں اور بھی ہیں
(انیس پراچہ کراچی کا جواب)

عبدالستار..... ساہیوال
رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مدعا
قاتلوں کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے
(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

مرحوم سعید احمد چاند کا آخری شعر
ایک لمحے کو گوارہ نہیں فرقت جن کو
کتنی جلدی انسان انہیں بھلا دیتا ہے
(اظہر علی کراچی کا جواب)

فلک صغندیم..... حیدر آباد
رنج و غم درد و الم پاس تنہا حسرت
اک تری یاد کے ہونے سے یہ کیا کیا دل میں
(سعید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

ابوبکر قریشی..... لاہور
آکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکا نہیں
موج حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

عنایت حسین قزلباش..... ملتان
آجا آجا ذرا صورت تو دکھا جا اپنی
نعل امید کے سب پات ہیں جھرنے والے
نور عین کوثر..... دینہ جہلم
اتر کے عرش سے چلتے ہی جارہے ہیں مدام
کہ دوسری کوئی حالت نہیں بجائے سحر
نوازش احمد..... کوٹ ادو

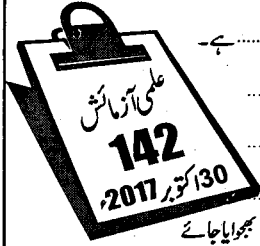
آہٹ آہٹ دستک دستک لمحہ لمحہ ہلچل ہلچل
چلن چلن شعلہ شعلہ نظریں نظریں شبنم شبنم
(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

نوشین طلعت..... فیصل آباد
وہ کیسا شخص ہے اس کی نگاہیں بات کرتی ہیں
میں اپنے ہونٹ بھی کھولوں مجھے قدرت نہیں ملتی
احمد جاوید..... ڈیرہ غازی خان
وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص
اسد عباس..... شیخوپورہ

اس یاد کے تپے شعلوں سے پھر دل کی تڑپ کو بھلائیں
اس یاد کے ظالم خنجر سے زخموں کی کہانی دہرائیں
سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا
وہ کون سی شے ہے جو بھلائی نہیں جاتی
اک حیرا تصور ہے بھلایا نہیں جاتا
(حکفۃ یاسمین کراچی کا جواب)

اختر شاہ عارف..... جہلم
اڑتے اڑتے آس کا پتھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودا کی
نیاز ملکائی..... سکمر
کیل پر ٹوپی کے بدلے ٹائیاں تنگ جائیں گی
باپ کے کمرے میں جب بیٹے کا نمبر آئے گا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ
سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سسٹمز □ پاکیزہ □ مرکز شہرت □ بجوایا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کو پین کے ہمراہ اپنے جزیات مودعہ 30 اکتوبر 2017ء تک علمی آزمائش 142 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ مرکز شہرت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کوہی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 II ایڈیشن ڈسٹری بیوٹنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم! محترمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **(103)**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش - 142

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منبر و انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، مسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک مہی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1928ء کو ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وطن لوٹ آئے اور کھاریاں کھجرات میں رہائش اختیار کی۔ 1948ء میں پاک فوج میں شامل ہوئے اور 1950ء میں پنجاب رجمنٹ میں کیشیڈ پائے۔

علمی آزمائش 140 کا جواب

مرزا ادیب کا نام تو مرزا دلاور تھا لیکن قلمی نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پیدائش لاہور کی ہے۔ 4 اپریل 1914ء میں پیدا ہوئے اور 31 جولائی 1999ء کو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

انعام یافتگان

1- زمکس قائم خانی، کراچی 2- نصیر اختر، ساہیوال 3- امتیاز شیخ، چنیوٹ

4- احسن علی، لاہور 5- زاہد خان، پشاور حیات آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نسرتین عزیز، پروین نیگم، عبدالکیم ثمر، رضیہ مسعود، خادم حسین، مقدس جہاں، شمیم احمد، سائرہ بلقیس، نواب احمد، امتیاز علی سید، رحمان جعفری، شاہد علی شاہد، فاطمہ امتیاز، میمونہ صدیقی، علی اصغر، آصف احمد، رضا علی عابدی، انعم توقیر، کمال حسن، نوشابہ ادریس، مگزار جہاں، نسیم اختر، حسن علی، نعمان حسن، عمران الحق، افسر خان، تنویر شیرانی، شاہدینہ، مہتاب خان، بلکھوم عثمانی، نوخیز خان، عظیم اختر، جنید احمد، ملک ممتاز، شاہد علی، عاطف حسن، ظہیر صدیقی، انیلا عثمان، رشید شیاں، زرین فاطمہ، قدرت خان، نسیم نیازی، شہباز اکرم، مظہر حیدر آباد سے ایضہ صدف، ماہ رخ، بلال اختر، مابین علی، حریم ظفر، ملائکہ ادریس، اشفاق حسن، شائین علی، داؤد پراچہ، لبتی علی، اختر رانا، جاوید اختر، اطہر علی، توقیق بیچہ، سعدیہ نور امین، ارم، شاہدینہ، تنویر عباس، ظفر

لودھی، عمر علی، عارف عباس، عالم علی، کمال مظفر، ظفر صدیقی، مدر حسین، عین الحق - اسلام آباد سے فرمان حسن، خالد عثمانی، ماہ جبین فاطمہ، عزیز الحق، محمد ذیشان، نشاط بانو، نعیم اختر، نیلوفر شاہین، غضنفر عباس مرزا، انوار یوسف زئی - راولپنڈی سے طہیر نوید، ڈاکٹر سخاوت علی خان، طارق ظفر، مسعود اظہر، افتخار حسن خان، حضور خان، تقی عباس تقی، توصیف حسین، محسن انور، کاظم زیدی، عتیق الرحمن، ذکی سید، علی قادری، نوید حسن، سکیم اختر، نوید احسن، بگریز خان، نوشاد صدیقی، محمد یاسین - واہ کینٹ سے محمد فیض، یاسین احمد، امیر احمد، عتیق احمد، نشاط فاطمہ - ملتان سے سرفراز محمد مغل، ڈاکٹر ادیب عبدالغنی کھیل، محمد انور الحسن، محسن اختر، نیاز گلستانی، وقار احسن، عنایت اللہ خان، محمد یحییٰ محسن، فرحین گل، عباس علی سید، نواز علی نواز، کائنات اختر، عباس بہکری، نعمت گل، سید شاہ علی، رزی، مظہر عباس، امتیاز کھوسو، انوار مجتبیٰ، مصطفیٰ ہمدانی، قیصر حسین زیدی، امیر ندیم، ممتاز گل، بحر ش، اکبر علی زیدی، نواز گل، فرحین فاطمہ، انیس علی سید، عزیز الدین، کلب امیر کاظمی، نبیہا رضوی، رحمن گل، خان بابا، بشیر فاروقی، مولانا بخش چانڈیو - لاہور سے حنیف ادیب، مسرت اسلم، ڈوگر اسلم، فہیم الدین، یاسین بانو، مصباح شاہ، گل نوخیز، رضا عباس، اقبال خان، امیر بٹ، عبدالخالق، سید محمد رضا کاظمی، ممنون احسن، کاظم حسین، فہد فاطمی، مصباح الرحمٰن، نوید اختر، علی نواز کارلی، آل بختن نقوی، نواز کبیر، فرحت فاطمہ، صابر علی خان، تاسیر احسن - بہاولپور سے مہناز اکرم ملک - ایاز امام کلیم، عظیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، بارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، نیل خان، زاہد علی، طہ حسن، الیاس اختر بٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر - پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اجکزی، نادر خان، امیر حسن، مساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوروی، بخش، ماہد سلطانہ، انور حسن خان، اتم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، دارود خان - ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام - میرپور سے اے کے کاظم علی بھٹو - قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید - خان پہلہ سے عنایت علی، یاسین فراز - سید محمد عرفان جعفری، کلفیہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید - سرگودھا سے اکبر خان، مصطفیٰ کاشمیری، اکبر خان، ممتاز مصطفیٰ، اشرف علی، نعیم احسن، ہار علی، نظام احسن، فہد علی سید، حسن شاہ، تاثیر احسن سید، عظمیٰ اکمل نوانہ، علی ربیسی - شجاع آباد سے حسن علی زیدی، بابر ندیم - خانیوال سے سید اشام اشرف، ندیم اللہ اجکزی، فہیم قیصر، احمد انصاری، ہمیدہ سلطان، ناصر علی، زریاب خان، نہت شاہ، محمد احتشام، نایاب علی، بابر خان، امیر حسن انصاری، رؤف صدیقی، سرفراز حسن، فصیح الدین، انیس ارشد، ماہ نور انصاری، نعیم حسن - کوہاٹ سے فدا حسین طوروی، نعمت علی شاہ، نظیر نیازی - شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ، عرفان قاسمی، ہدایت شاہ، احمد لغاری، عباس فدا حسین - سکسہ سے نجم الدین، ثاقب، رائیل رحیم، اقبال انصاری - گدو بیراج، کشور سے شبیر شاہ - پورے والا سے رانا محمد شاہ - بکسر سے محمد عارف قریشی - ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز - میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین، مظفر گڑھ سے ڈاکٹر نادیہ اظہر - گھوٹی سے مقبول احمد خان شچر - ملک وال سے سیف اللہ - پاک پتن سے علی محمد - زہیب احمد، نسیم مظفر، محمد رحمان، خادم حسین، ناصر محمد، محمد محمد برہان علی، سید عزیز الدین، ندیم افضل، ارشد حسین، ناصر حسین ناصر، محمود زہیب کمال، انیس بھٹانی، کاشف اختر، آغا قزلباش، نوشین کاظمی، عباس خان، مظفر علی خان، آغا ظہیر، مرزا امداد حسین، قاسم جان، زونیبہ خان، فرحت فاطمہ، عاقل حسین، کلیم اللہ حسن زئی، عطا محمد، زہیب خان، کاشان قریشی، نعمان قریشی، فرحت ندیم، یاسین جوگیو، شاہد اسلام، شاہین ربانی، مرزا اختر بیگ، محمد سلیم، نادر نیازی، غیاث احمد، احمد علی، قیام احمد، فیضان اختر، ارشد علی - حیدر آباد سے نعیم حسین، ثناء اللہ، اقبال جاوید، توقیر حسن زیدی، نوشین فاطمہ، حیات فاطمہ، رخسانہ حیات، نرگس علی سید، مریم کاشف - خانیوال سے سید حسان اسلم شہیدی - سکسہ سے محمد اسلام بھٹو، عماد حسن، عباس علی، منور سلیم، ناصرہ جاہ، شفقت خاقان ٹالپر، حبیب الرحمن، کریم خان - شکار پور ذیشان اکبر، درخشاں اقبال - آصفہ ہوتی، کلفیہ تحریم - میرپور خاص سے محمد فرقان، ضیا احمد، ناصر حسین، افتخار حسین، نوشین ملک - بکسر سے خوش بخت، نیاز ملتان، فدا محمد، صاحب شاہ، نگار قریشی - ڈی آئی خان سے قمر احسن، ناز سلطان، محمد وحید خان، نواز علی - ڈی جی خان سے عبدالرحمن، اشفاق احمد، آفتاب علی نیازی - ملتان سے آصف علی قریشی، انیس امام، تبسم فرقان، اذان قریشی، سندس احمد، عرفانہ امام، ناصر اسلم، نصیر حسن، جمیل خان، انیس اقبال، نظیر حسین گیلانی، سندس احمد، صباحت عابدی، رانا کلیم، نسیم ضیائی، جاوید احسن، مہتاب مرزا،

ممالک غیر سے اشتیاق قر، العین (بواے ای) - زرغون خان، صاحب جان، اسلم قریشی (دینی) - فہیم احمد (نورٹو)، زیارت فاطمہ (جڑی)، سکیم احمد (ماچسٹر)، علی ناز (بید نورڈ)، کاشف اقبال کاشف (نوکیو، جاپان)۔

رہائی

محترم مدیر
السلام علیکم

یہ سچ بیانی غور سے پڑھیں کیونکہ زیب کی یہ داستان ہماری بے حسنی کو عیاں کر رہی ہے۔ گو کہ قیام پاکستان کو 70 سال ہو چکے ہیں پھر بھی زخم کلی طور پر مدمل نہیں ہو پائے ہیں۔ نہ جانے کتنی زیب آج بھی مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں میں سسکتی زندگی گزار رہی ہیں۔

زویا اعجاز
(لاہور)

دکھاتے تو وہ اذیت سے سر جھیک دیتی۔ یہ آنکھ بچولی اسے مزید بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ شام ڈھلنے لگی تھی مگر وہ وہیں ساکت بیٹھی تلاوت کرتی رہی۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد تو اس عمل میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔

فلک ریتا رہی پھلنے لگی تو ہجوم واپس لوٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں حمل خاموشی چھا گئی۔ اس سنائے میں اس کی نمناک دھیمی آواز کے سوا کہیں کوئی آہٹ نہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد اسے اپنے سامنے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”محترم خاتون! انتظامیہ اس وقت کسی کو یہاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کل آجائیے گا۔“ ایک شفقت بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کل کس نے دیکھا ہے؟“ وہ اپنے ہونٹ کپلتے ہوئے بولی۔

”جی! آپ نے بجا فرمایا۔ زندگی میں اگلے پل کی کوئی ضمانت نہیں۔“ مزار کے عمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھ مجھے علم ہے میں اتنی خوش قسمت نہیں کہ موت مجھے اپنی آغوش میں لے لیکن آپ کے اصول و ضوابط سر آنکھوں پر۔“ اس نے قرآن پاک طاق میں رکھا اور ایک جانب دھرا اپنا مخصوص کڑا پہن لیا۔

عماد کی حیران نظریں اس کڑے سے پھسلتی دایں شے پر موجود خیر کے ایک گہرے نشان کو دیکھ کر ساکت ہو گئیں۔ وہ اس عورت کی شخصیت کے یہ تضادات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی اچھن کو الفاظ کا پیراہن عطا کرتا وہ خاموشی سے محن عبور کر کے مزار سے باہر چلی گئی۔

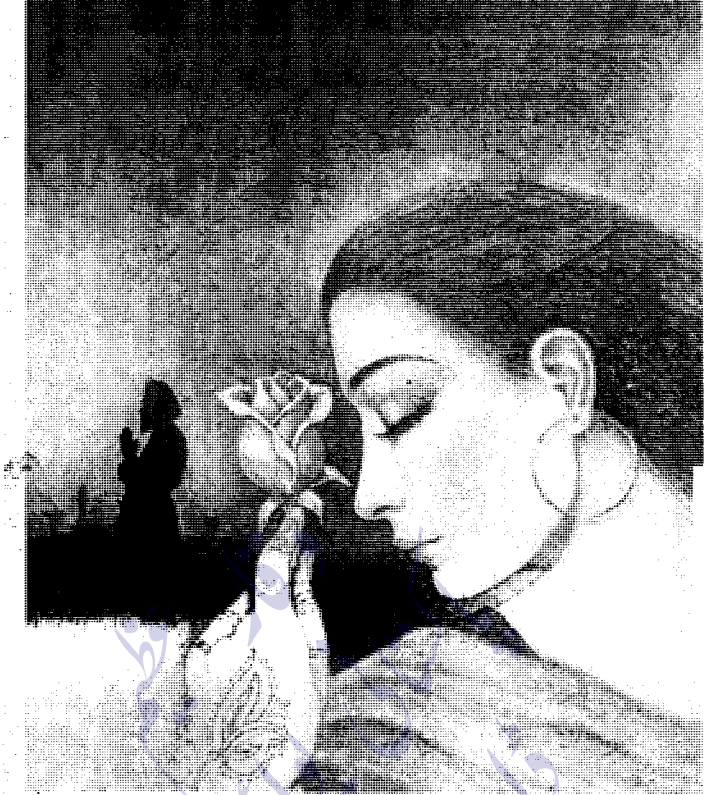
لڑکھڑاتے قدموں سے اپنا وجود سنبالتے ہوئے وہ

مزار میں آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ گلابی پھولدار شلوار قمیص میں ملبوس ایک عورت پڑمردگی سے چلتی ہوئی مرکزی دروازے تک پہنچی اور ویران نظروں سے زائرین کی نقل و حرکت دیکھنے لگی۔ محن میں موجود پڑمردگی اسے اپنی مانند تھا اور اس پر وہ محسوس ہو رہے تھے۔ اپنے دل میں اٹھتی وحشت پر قابو پاتے ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی محن کے مغربی کونے میں نصب تل کے پاس پہنچی اور وہاں موجود چوکی پر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں کی خاموشی میں بیت گئے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دائیں ہاتھ میں موجود مخصوص کڑا اتار کے ایک جانب رکھا اور لرزاتے وجود سے وضو کرنے لگی۔ اس پاس چند خواتین اس کڑے اور وضو کے عجیب و غریب ملاپ پر بہت حیران تھیں لیکن وہ ان کی اس کیفیت سے دانستہ بے نیازی ظاہر کرتی سر جھکائے محن کے شمالی جانب کمرے میں چلی گئی۔

اس کمرے میں صاف ستھری دریاں اور چٹانیاں موجود تھیں۔ وہ قدموں کی لرزش پر قابو پاتے ایک چٹانی پر کھڑی ہوئی اور بیکسر کہتے ہوئے نماز کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے۔ اس کا وجود اشکوں اور ہچکچوں کی زد میں تھا۔ نماز عصر کے مختصر ارکان کی ادائیگی بھی نصف گھنٹا پر محیط ہو گئی۔ نماز مکمل ہوئی تو وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان بھیرتی ہوئی اٹھی اور ایک جانب طاق میں رکھے قرآن پاک کو تمام کر دوسری سے تلاوت کرنے لگی۔ آنکھوں کی نمی بار بار الفاظ پر دھندلاہٹ طاری کر رہی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے کچھ چہرے اپنی جھلک



گلاس یکدم اس کی طرف اچھال دیا جو پھٹا ہوا اس کی پیشانی پر زخم چھوڑ گیا۔ لبو کے چند قطرے اس کے چہرے پر بہہ نکلے۔ وہ خاموشی سے زخم کو دبائے اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی جہاں ایک مدقوق روشنی والا بلب روشن تھا۔ فضاء میں شدید صحن اور گرمی تھی لیکن اس کوٹھڑی میں پکھلنا دار تھا۔ اس نے نکلنے سے بنی ایک چھائی اٹھائی اور اسے جھلاتی اپنا پسینا خشک کرنے لگی۔ ویران نظریں سامنے دیوار پر آویزاں ایک سالخوردہ کیلنڈر پر پڑیں اور لبوں سے بے اختیار ایک سسکی برآمد ہوئی۔

13 اگست کے جلی حروف آنسوؤں کی نمی سے دھندلانے لگے۔

”الہی! میری اس سزا میں کی فرما دے..... میرے صبر کا دامن اب تار تار ہونے لگا ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆.....☆

اسکول کی مختصر سی عمارت میں معمول کی سرگرمیاں

پیدل ہی ایک جانب بڑھ گئی۔ پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ایک کشادہ گلی کے اختتام پر واقع گھر میں داخل ہوئی تو حسب توقع ایک کرخت اور سماعت میں چھپتی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ”رو آئی ہو اپنے رشتہ داروں کو؟“

”ہاں! رو آئی ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر بے نیازی کے تاثرات طاری کر لیے تھے۔

”ہر وقت نحوست پھیلانے رکھتی ہو۔ تمہارا یہی رد و حرکت اس گھر کے مردوں کی روزی روٹی اور سکھ چین حرام بنانے لگا ہے۔“ اس کی ہم عمر بھاری بھر کم جناسمت اور تنفر زدہ تاثرات والی اس عورت نے ایک بار پھر چوکا لگایا۔

”میرا اس گھر سے اور ان مردوں سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے میری نحوست اثر نہیں کرے گی۔ ہاں! البتہ تمہارا شوہر اور بیٹے کہیں تمہاری نحوست کے اثر میں تو نہیں آئے گئے؟“ اس نے بھرپور جوانی وار کیا۔

بھاری بھر کم عورت نے اپنے ہاتھ میں موجود پیتل کا

جاری تھیں۔

”فرق تو ازل سے موجود ہے گلاب اور ہمیشہ رہے گا۔۔۔۔۔ یہ سارا کھیل سامان نہیں ہے کچھ اور ہی ہے۔“ مہرونے پریشان نظروں سے اپنے سامنے قطار میں کھڑی لڑکیوں کو موبن واس گاندھی کی تصویر کے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھ کر کہا۔

”بہت بے وقوف ہو تم لوگ!“ اس نے سر جھکا کر اپنی باری آنے پر آگے بڑھ گئی۔

اگلے چند لمحوں میں اس میدان میں صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ زیب اور مہرونے اس پریڈ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ عمر رسیدہ استانی کی آنکھوں سے شرارے پلکنے لگے۔ اس نے اپنی بید کی چمڑی منگوئی اور ان دونوں کو پیاز و دار ضرب لگائی۔ اذیت اور درد سے ان کے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں لیکن انکار کی صورت اقرار میں تبدیل نہ ہو سکا۔ اس ہٹ دھرمی کی سزا میں انہیں میدان کے اس کونے میں کھڑا کر دیا گیا جہاں کسی بھی درخت کا سایہ نہ تھا۔

چلپاتی دھوپ میں اپنے ہاتھ سر کی پشت پر باندھے زیب کے دل میں اطمینان و سکون کی لہریں ہلکے لہکے لے رہی تھیں۔ اسے دھوپ کی پیش کش کی بھی نخستان سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر سرشار مسکراہٹ لیے وہ بالکل بے خبر تھی کہ بہت جلد یہ دھوپ اور پیش اس کی زندگی پر محیط ہو جائے گی۔

☆.....☆

سہ پہر کے وقت اس وسیع و عریض گھر کے دالان میں ہمیشہ بہت رونق ہوا کرتی تھی۔

زیب اور مہروانی والدہ نور بیگم کے ہمراہ سینے پر ونے کا کام سیکھا کرتی تھیں لیکن اس روز دن بھر کڑی دھوپ میں کھڑے رہنے کے باعث زیب کو سخت بخار نے آلیا۔ مہرو کی طبیعت بھی بہت پڑمردہ تھی۔ کچھ دیر بعد گلاب اپنے ہاتھ میں ایک کتاب تھا ان کے پاس چلی آئی۔ اسے حسب معمول ریاضی کے چند سوال سمجھنے کے لیے مدد درکار تھی۔

”میرا سر بہت چکرا رہا ہے گلاب! آج میں تمہیں ریاضی کا کام نہیں کروا سکتی۔ تم میرا دانی سے پوچھ لو۔“ اس کی آواز بخاری شدت سے بوجھل تھی۔

”غلطی تمہاری اپنی ہے زیب! خواخواہ اتنی سزا بھگتی۔۔۔۔۔ مان لی ہوئی ان کی بات۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے ہم صرف ایک ہی ہستی کے آگے سر جھکاتے ہیں اور توحید کا یہ عمل ہمیں جو خودداری و

چودہ سالہ زیب التسا اپنی دو سال بڑی بہن مہر اور بچپن کی کھلی گلاب کے ہمراہ میدان میں موجود تھی۔ انتظامیہ کی جانب سے آج مختلف جماعتوں کو میدان میں طلب کیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی طلبی پر وہ کبھی خاصے حیران تھے لیکن اساتذہ کا ادب انہیں کسی بھی استفسار سے روکے ہوئے تھا۔ مہر النساء عمر میں ان سے بڑی ہونے کے باوجود اسی جماعت کی طالبہ تھی۔ زیب کے برعکس اسے پڑھائی لکھائی کا کبھی بھی شوق نہیں تھا۔ وہ محض والدین کے دباؤ کی وجہ سے مارے باندھے اسکول آیا کرتی تھی۔ پڑھائی میں عدم دلچسپی سالانہ نتیجہ پر بھی اثر انداز ہوا کرتی۔

یہ دہائیوں بھی اس وقت اپنی طلبی پر تجسس تھیں۔ اگلے ہی لمحہ یہ تجسس غم و غصہ میں ڈھل گیا۔ ان کے سامنے شفاف سرسختی و جدوجہد والے ایک شخص کی تصویر رکھ دی گئی۔ ہلکی سوتی ساڑی پہنے ایک عمر رسیدہ استانی کی آواز ان کی سماعت کے لیے مزید امتحان ثابت ہوئی۔

”باپو کی مہانتا سے کون واقف نہیں بھلا؟ ہماری آزادی کے لیے باپو نے فرنگیوں سے ٹکری ہے۔ وہ جلد ہی ہندوستان سے انہیں واپس بھیج دیں گے۔ ہم سب پر باپو کا بہت اظہار ہے۔ اس اظہار کے بدلہ بھی بچے ان کے سامنے سر جھکاؤ۔ ہم ان کی جتنی بھی پوجا کریں کم ہے۔“

زیب اور مہروانیہ الفاظ اور مطالبہ سن کر دھلی چکی تھیں۔ ”ہرگز نہیں! میں ایسا بالکل بھی نہیں کروں گی۔“ زیب التسا کی دھیمی آواز میں چٹانوں کی تختی تھی۔

”میں بھی اس تصویر کے سامنے نہیں جھک سکتی۔۔۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔“ مہرونے کہا۔

”ارے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ باپو ہیں وہ ہمارے۔۔۔۔۔ ہم ان کے سامان کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔“ گلاب کو رنے منہ بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ باپ وہی ہوتا ہے جو ہماری پیدائش کا سبب بنے۔ اور دوسری بات یہ کہ ایک مسلمان کا سر صرف اللہ کے آگے جھکتا ہے میرا سر کٹ تو سکتا ہے لیکن اس تصویر کے سامنے ہرگز نہیں جھکے گا۔“ زیب نے دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

”ایک تو تم ہر بات میں اللہ بھگوان کا فرق اور دھرم کی باتیں بہت لے آتی ہو۔ مجھے تو اس سامان میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا۔“

دکھائی دینے والی 'آزادی' اب زیادہ دور دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کی صورت میں لاہور اور پنجاب کی مسلم آبادی پر مشتمل پاکستان میں یقینی شمولیت نے سابقہ رنج و غم ختم کر دیے تھے۔ اب انتظار تھا تو اس وقت کا جب غلامی کی زنجیریں پاش پاش ہو جاتیں۔

قرآن بتاتے تھے کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔

☆.....☆

مہر النساء نے اپنی پڑھائی مزید جاری رکھنے سے محذرت کر لی تھی۔ اس کے برعکس زیب کو پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ وہ فطری طور پر ہی بہت صاف گو اور صریح طبیعت کی مالک تھی۔ سچائی اور بے باکی اس کا خاصہ تھیں۔

نئے اسکول میں داخلہ کے بعد گلاب کوڑ سے دوستی محدود تو ہوئی لیکن ختم نہ ہو سکی۔ وہ اب بھی دوپہر ڈھلے اس سے ریاضی اور انگریزی سمجھنے آ جایا کرتی۔ مہروان دنوں اپنے جینز کے لیے غلاف اور چادریں کاڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس کی شادی پشاور میں رحیم خان، کے چچا زاد کے بیٹے وحید سے طے تھی اور اب رخصتی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

مہرو کی شادی کے بعد زیب کو فطری طور پر تنہائی اور اداسی محسوس ہونے لگی لیکن اس نے پڑھائی میں مزید سنجیدگی اختیار کر لی۔ اس کے میٹرک کے امتحان نزدیک تھے۔ شب و روز کی محنت سے وہ ایک بار پھر سخت بخار میں مبتلا ہو گئی۔ نور بیگم کو اس کی بیماری ہمیشہ ہی بوکھلا دیا کرتی تھی۔ پندرہ روز شدید علالت کے بعد وہ صحت یاب ہوئی تو وہ اسے ہمراہ لیے علی گڑھ کی مزار پر روانہ ہوئیں۔

مزار کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اس کے نا تو اس وجود کو سکون و فرحت کی لہروں نے ڈھانپ لیا۔ طمانیت اور کیف و سرور نے ذہن پر طاری ہو چھل کیفیت پل بھر میں دور کر دی اور وہ ایک ستون سے کمر نکالے تلاوت قرآن میں مصروف ہو گئی۔ اس تاریکی مزار میں آمد زیب النساء کے پلے ہمیشہ ایک یادگار تجربہ ہوا کرتی تھی۔ رحیم خان کی ذالی لائبریری میں موجود کشف المجتب 'سمیت ان گنت کتابیں موجود تھیں اور زیب وقتاً فوقتاً ان کتب کے مطالعہ سے اپنے درخشاں ماضی میں سفر کرتی رہتی تھی۔

یہ سفر اسے مختلف راہوں پر بھٹکا تا اس دور میں لے جاتا تھا جب برصغیر کے اس خطہ میں مسلم جاہ و جلال اپنے

سکون عطا کرتا ہے اس کی لذت تم کبھی جان ہی نہیں سکتیں۔" زیب نے سرشاری سے کہا۔ "اب جاؤ اور مہرو آپنی سے سیکھ لو سوال۔ وہ اپنے کمرے میں کئی ہیں ابھی۔"

"نہیں! مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔ تمہیں تو رہنے دو۔ میں خود ہی کچھ پائے کروں گی۔" وہ غصہ سے پیر پختی چلی گئی۔

زیب آنکھیں موندے لپٹی رہی۔ اسی پل اسے اپنی دائیں سمت کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"کیا بات ہے بیارانی؟" گلاب کو بہت آزرہ نظر آ رہی تھیں۔ "ایک شیخ آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

"وہ بس یونہی بلا وجہ ہم سے بحث کر رہی تھی بابا جان!" زیب نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور منڈب ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟ نصیب دشمنان طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟" رحیم خان کو اپنی لاڈلی بیٹی کی حالت دیکھ کر تشویش نہ گھیر لیا۔

زیب نے بلا کم و کاست انہیں سارا قصہ سنا دیا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ مجھے آپ کے اس جذبہ اور عمل پر بے حد فخر ہے۔" رحیم کی آواز شدت جذبات سے لرنے لگی۔

"لیکن اگر یہی معمول رہا تو پڑھائی کا یہ سلسلہ کیونکر چل سکے گا؟" نور بیگم نے کہا۔

"اس کا بھی حل نکل آئے گا۔۔۔۔۔ ہم تو پہلے بھی بچیوں کے اس اسکول میں پڑھائی کے حق میں تھے۔ لیکن آپ ہی بعد میں کہہ رہی تھیں ادارہ ہے اور بچیوں کو زیادہ دور نہیں بھیجنا۔" رحیم خان نے نرمی سے کہا۔ "اب وقت آچکا ہے کہ غیر معمولی فیصلوں میں تاخیر نہ کی جائے۔ ہم کل ہی کسی دوسرے اسکول میں داخلہ کروا دیں گے اور آمدورفت کی ذمہ داری وین محمد کو چاں کے سپرد کر دیں گے۔"

زیب کی نظروں میں اپنے والد کے لیے بہت والہانہ محبت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں رحیم خان ہی کی پیروی کیا کرتی۔ وہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے اور کپڑے کے بیوپاری تھے۔ اطاعت گزار ہوی فرامیاد برائیوں نے زندگی مکمل کر دی تھی۔ اولاد زینہ سے محمدی کے دکھ سے قطع نظر بیٹیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کی جارہی تھی۔ وہ لاہور کے علاقہ قلعہ چھمن سنگھ میں پشتوں سے آباد تھے۔ اپنے آباؤ اجداد سے غلامی کی تلخ سچائیاں سننے بالآخر ان کی زندگی ایسے سوڑ پر ان پہنچی تھی جہاں بظاہر ناممکن

عروج پر تھا۔ اس پہ مستزاد اسی علاقہ میں شاہی قلعہ بادشاہی مسجد جیسی عمارات کی موجودگی اسے مزید بے خود کرنے لگتیں۔ وہ کئی بار رحیم کے ساتھ وہاں جا چکی تھی اور ہر بار اس کی ایک ازلی خواہش پوری شدت سے لوٹ آتی۔

”کیا وہ وقت پھر سے لوٹ کر نہیں آ سکتا بابا جان؟“ وہ خوابناک لہجہ میں دریافت کرتی۔

”کیسا وقت؟“ رحیم کا اشتیاق بھی بڑھ جاتا۔

”مسلم قوم کے عروج اور بلند بخشتی کا وقت۔“

”ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ کشیدہ میراث کا حصول کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔“

”میرادل چاہتا ہے میں کسی طرح اس وقت میں واپس لوٹ جاؤں جب ان روشوں پر بادشاہوں کی شاہی سواری گزرتی ہوگی۔ ان درپچوں میں فخر اداے اور شہزادیاں جلوہ افروز ہوتے ہوں گے۔ شاہی سواری کی دھمک سے

درو دیوار لرزتے ہوں گے۔ بزرگان دین کے کلام کی نرمی سے سخت دل بھی بدلتے ہوں گے۔۔۔۔۔ میں وہ شاہانہ وقت اپنی نظروں کے سامنے مجسم دیکھنا چاہتی ہوں۔“

رحیم خان کو اس کی خواہش پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی۔

”گذرا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا زیو! بحیثیت قوم ہم اس وقت بہت نازک موڑ سے گزر رہے ہیں اگر یہ سفر کامیاب رہا تو شاید عروج ایک بار پھر مقدر بن جائے۔“

ستون کے ساتھ دوڑا تو بیٹھی زیب النساء کے ذہن میں یہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ فضاء میں بہت تپش تھی۔ جون کا آخری عشرہ رواں تھا۔ اس نے تلاوت مکمل کرتے ہی اپنے چہرے پر موجود چادر ڈرا سی سر کا ڈی۔ اس

مزار کا تقدس اور خاموشی اسے بے حد بھائی تھی۔ نور بیگم اندرونی جانب نوافل کی ادا انگلی میں مصروف تھیں۔ اس نے

ٹھیلے آسان پر ایک نگاہ دوڑائی اور ایک بار پھر اپنے مخصوص مشغلہ میں گمن ہو گئی۔ مزار کے درو دیوار پر ماضی کے نقوش تلاش کرتی وہ بھاری قدموں کی دھمک سے بری طرح چوکی۔

اس کے سامنے ایک دراز قد بھاری بھر کم جسامت اور متورم آنکھوں والا ایک شخص موجود تھا۔ مخصوص پگڑی میں

بندھے سر کے بے ترتیب بال اور جھاڑ جھکاؤ ڈھمی اس کی شخصیت کا تاثر مزید ہولناک بنا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں

ایک بوتل بھی موجود تھی جس میں بدبودار ساحل جھلک دکھا رہا تھا۔ مزار کے صاف ستھرے فرش پر اس کے جوتوں کے

نشانات دیکھ کر زیب کی بے باکی اور غصہ شدت سے عود آیا۔

اسے دین محمد کوچان کے ساتھ اسکول آتے جاتے بھی سکھ برادری کے بہت سے لوگ نظر آیا کرتے تھے۔ زیب بچپن ہی سے ان افراد کے مابین رہتی آئی تھی۔ قلعہ چھمن سنگھ میں بھی اسی برادری کی بہتات تھی۔ ماضی قریب میں رحیم خان اور دیگر اکاؤنٹ مسلم خاندانوں سے سکھ برادری کے تعلقات بہت دوستانہ اور برادرانہ تھے لیکن پچھلے کچھ عرصہ میں

ان کے انداز و اطوار میں واضح تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ لبوں سے مسکراہٹ تو گویا ناپید ہو چکی تھی۔ بیچنے ہوئے ہونٹ سرد مہر آنکھیں اور روکھا لہجہ ہمہ وقت تناؤ کی کیفیت پیدا کیے رکھتا۔

زیب کے مقابل کھڑے اس نوجوان سکھ کے چہرے پر بھی وہی درشت تاثرات طاری تھے۔

”اپنے جوتے باہر باندھنا پر اتار کر آئیے۔ مزار میں یوں جوتوں سمیت آمد بہت غیر مناسب حرکت ہے۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

”مجھے سکھانے یا پڑھانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ ہم اپنے من کے بادشاہ ہیں جو جی میں آئے گا وہی کریں گے۔“

”اکر کوئی مسلمان جوتوں سمیت آپ کے گوردوارے میں چلا جائے تو یقیناً آپ کو بھی اچھا نہیں لگے گا اور آپ بھی اسے اس نامناسب فعل سے روکنے کی کوشش کریں گے۔“

”کوشش۔۔۔۔۔ میں کوشش نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ میں اپنی کرپان سے اس مسئلے کی ٹانگیں توڑ دوں گا تا کہ وہ آئندہ کہیں بھی آنے جانے کے قابل ہی نہ رہے۔“ اس نے زہریلا قہقہہ لگایا۔

”ہم بھی اپنے مقدس مقامات کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں اور یہ تصور مت کیجیے کہ ہمارے بازوؤں میں دم نہیں۔ آپ لوگ یہاں چند روز کے مہمان ہیں اس لیے مہمانوں کی طرح تہذیب سے رہیں۔“ زیب نے دوبارہ جواب دیا۔

”مہمان وہمان نہیں تھے ہم یہاں۔۔۔۔۔ ہماری دھرتی تھی۔ صدیوں سے رہتے آئے ہیں، ہمارے گھر بار ہیں یہاں۔ تم لوگوں کی ہٹ دھرمی اور کم عقلی نے اس گھر کا بؤارہ کر دیا ہے۔۔۔۔۔ ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی اور مہمان بنا دیے گئے ہیں بؤارے کا فیصلہ اور یہ مہمان نوازی تم لوگوں کو

بہت مہنگی پڑے گی۔ اس بن باس کی پوری قیمت وصولیے تم لوگوں سے۔“ اس نے نفرت سے باتیں جانب چہرہ موڑ کر فرش پر ٹھکا۔

اکتوبر 2017ء

”یہ تو وقت ہی بتائے گا سردار جی کہ ہمارا یہ فیصلہ کس حد تک درست تھا اور آپ کی یہ بد تہذیبی کسی قدر غیر اخلاقی حرکت ہے۔“ زب کے جذبات بری طرح نمودار ہوئے تھے۔

”بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر دیاسلائی نہیں جلاتے نادان چھوکر ی! لیکن یہ گنتی تو تم سمیت بھی منسلک کر چکے ہیں اب اس غلطی کا بھگتن بھی بھگتو گے بہت جلد بھگتو گے۔“ وہ اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا آگے بڑھ گیا۔

زب اپنا غصہ ضبط کرتی چلی اور زائرین کے وضو کے لیے ایک جانب موجود پانی سے ٹھوک دھونے لگی۔

☆.....☆

رمضان کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔

مسلم برادری حسب سابق انتہائی عقیدت سے اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مگن کی۔ رحیم خان کے گھر میں بھی معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں لیکن اس بار فضاؤں میں موجود اہو نیوں کے اندیشے ہر ذی نفس کو مضطرب کیے ہوئے تھے۔ رحیم کی پیشانی بھی ہمہ وقت شکن آلود اور آنکھیں گہری سوچ میں کھولی رہتیں۔

”اس قدر بے چینی کی کیا وجہ ہے؟ پروردگار پر بھروسہ کیجیے۔“ نور بیگم نے ان کی پریشانی دیکھتے ہوئے کہا۔

”توکل اور قناعت پروردگار کی پسندیدہ صفات ہیں لیکن خطرات کی موجودگی میں اپنی حفاظت سے بے نیاز ہو جانا تو کل نہیں کم عقلی ہوتی ہے۔“

”کیسے خطرات؟ ہم اس شہر میں اس گھر میں سالہا سال سے رہائش پذیر ہیں۔ ہمسائیوں سے تعلقات مثالی ہیں۔ انگریز حکومت کے اعلان کردہ منصوبے کے مطابق ہم پاکستان ہی کا حصہ ہیں تو پھر یہ اندیشہ کیوں؟ اور آس پاس کے سبھی غیر مسلم گھرانے جانتے ہیں کہ اگر وہ یہاں سے ہٹا دیے جائیں تو ہم انہیں محفوظ رہتے فراہم کریں گے۔“

”آج سے صدیوں پہلے عرب کے صحرا میں جب اسلامی ریاست کی صدا بلند ہوئی تھی تو سب سے پہلے انہی لوگوں نے مخالفت کی تھی جو ازل سے ان کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ تبدیلی مذہب، تبدیلی ریاست ان کے لیے ناقابل قبول تھی۔ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ سالہا سال سے اکٹھے رہنے والے افراد ہی نے تلوار اٹھالی۔ ہم اس انقلاب کے داعی افراد کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں لمحائی غفلت کی سزا عمر بھر

بھگتنی پڑتی ہے۔“ رحیم خان نے پیشانی مسلی۔
”آپ خواخوہ و ہم میں جھلا ہیں۔“ نور بیگم نے کہا۔
”ہماری دکان پر سارا دن بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں۔ ان کی پریشائیاں مسائل اور جذبات دیکھ کر دل کٹنے لگتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس وقت خون کی ہولی پھیلی جا رہی ہے۔ یہاں بھی کئی علاقوں میں ہندو اور سکھ قتل و غارت برپا کر رہے ہیں۔“

”لیکن ہمارے ہمسائے بہت اچھے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہمیں ایسی کسی بھی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“
”میں ان کی اچھائی پر کوئی سوال نہیں اٹھا رہا۔ وہ یقیناً بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوتے آئے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بشر میں شر نہیں پایا ہوا ہے اور آگ ڈھیر سوخ ملنے ہی یہ شر اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر سبھی اقدار اخلاقیات اور مجرم دلچاظ مجسم ہو جاتے ہیں۔ میں نے گھر کے مرکزی دروازہ پر خصوصی پہریدار متعین کر دیے ہیں تاہم اندرونی معاملات پر نظر رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔“ رحیم خان نے دو لوگ انداز میں کہا تو نور بیگم ان کا حراج بھانپ کر خاموش ہو گئیں۔

☆.....☆

اگلے دو مہینے خاموشی سے بیت گئے۔
علاقہ کے غیر مسلم کین بوجھل دل اور مجرد جذبات لیے اپنے گھر بار خالی کرنے لگے۔ محلہ میں ایک سوگ اور تناؤ کی کیفیت چھا گئی تھی۔ رخصتی سے قبل کئی خواتین ایک دوسرے کے گھر الوداعی ملاقات کے لیے جاتیں اور پھر رقت آمیز باتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ خط و کتابت کے ذریعے روابط قائم رکھنے کے وعدے و وعید لیے جاتے اور اپنی اولاد کے شادی بیاہ میں مدعو کرنے کی یقین دہانی کے بعد محلہ مکانی کا کریناک مرحلہ شروع ہو جاتا۔ زب کی کئی ایک سہیلیاں بھی امر تر چلی گئی تھیں۔ رگنی کویتا اور ادھاسے اس کے تعلقات بچپن ہی سے بہت مثالی تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ اس طویل رفاقت کا یہ موڑ اس کی حساس طبیعت کے لیے بہت کریناک تھا۔

رمضان کے تیسرے عشرے کا آغاز ہو گیا۔
رحیم خان کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ محلہ حالات کے پیش نظر اس نے کافی عرصہ سے دکان کے لیے مال نہیں خریدا تھا لیکن اب خریداری ناگزیر ہو چکی تھی۔ بہرہ کے سرال میں تہوار پہنچانے کا مرحلہ بھی درپیش

تھا۔ چارونا چاراس نے رنج سفر باندھ لیا۔ پشاور سے ریشی تھان خریدنے کے بعد مہرو سے ملاقات بھی منٹ جانی۔ وقت رخصت نور بیگم کو ضروری ہدایات دینے کے بعد روانہ ہو گیا۔

گھریلو نظام اپنے معمول کے مطابق چلتا رہا۔ رحیم خان کی روانگی کو تین روز بیت چکے تھے۔ اگست کی اس پڑھیں دوپہر میں گلابو کی اچانک آمد زیب کے لیے بہت خوشگوار تھی۔

”تم کدھر سے رستہ بھول گئیں؟ تم نے تو مجھے بھلا ہی دیا ہے۔“ زیب نے محبت سے شکوہ کیا۔

”بھلا یا تو تم نے بے زبوا! اسکول تبدیل ہوتے ہی تمہاری مصروفیات بھی بڑھ گئیں اور پرانی سکھیوں کے لیے سے ہی نہ رہا تمہارے پاس۔“ گلابو کے انداز میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔

”کیا بات ہے اتنی اداس کیوں ہو؟“

”میں اداس نہیں نراش ہوں۔“

”لیکن کیوں گلابو؟ ہماری محبت میں کہیں کوئی کی رہ گئی کیا؟“ نور بیگم نے بھی شفقت سے دریافت کیا۔

”ہم چند روز بعد لدھیانہ چلے جائیں گے چاہی! پھر کون جانے کب ملاقات ہو سکے؟ میں نے اپنی سبھی سکھیوں کو آج اپنے گھر اکٹھا کیا ہے۔ کچھ سے ساتھ۔۔۔ بتائیں گے۔ یہی یادیں اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاؤں گی۔“ اس کے لہجہ نے ان دونوں کو بھی ساکت کر دیا۔

”ابا کیوں سوچتی ہو بنگلی؟ رب نے چاہا تو ہم بونہی میل ملاپ رکھیں گے۔“ نور نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کون جانے چاہی؟ جندگی کا کیا بھروسہ ہے؟ آپ زیو کو میرے ساتھ بیچ دیں۔ بڑا اُپکار ہوگا۔“

”مائیں اپنی بیٹیوں پر اُپکار نہیں کرتیں گلابو! میرے لیے تم زیب النساء جیسی ہی تو ہو۔“

”یہ آپ کا بڑا اپن ہے ورنہ اس سے لوگوں کی سوچ میں اتنا پر پورتن آچکا ہے کہ دل چاہتا ہے آتما جتھیا کر لوں۔“ وہ بچی سے بولی۔

نور بیگم اور زیو کا دل اس کی حالت دیکھ کر کٹنے لگا۔ وہ بھلے ہی بڑا رے کے اس عمل میں اپنے گھریار سے محروم نہیں ہوتی تھیں لیکن اگر ایک بل کے لیے وہ ان کی جگہ اپنی ذات کو تصور کرتیں تو دل کی دھڑکنیں تھیں گئی تھیں۔ اپنی جڑوں سے دوری آسان تو ہرگز نہیں ہوا کرتی۔ زیب اپنی والدہ کی رضا

مندى سے اسی وقت گلابو کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ اس کا گھر گلیوں کے فاصلہ پر تھا۔

زیب کے علاوہ وہاں محلہ اور اسکول کی اور بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ سورج کی تپش اور گرمی حد سے سواکھی لیکن باتوں اور قصوں میں وقت بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہ سکا۔ متوقع جدائی اور آبائی علاقوں سے کوچ نے سبھی کے دل گداز کر دیئے تھے۔ سر چڑھنے کے بعد لا جوتی نیتو اور ریکھا اپنے گھروں کو لوٹ گئیں لیکن زیب کے اصرار کے باوجود گلاب کو رنے سے روک لیا۔

سورج مغرب افق پر چمکنے لگا۔ افطاری میں اب چند ہی منٹ باقی تھے۔ زیب اس صورت حال پر قدرے فکر مند بنے ہوئے تھی۔

”میں نے روزہ افطار کرنا ہے گلابو! اسی جان منظر ہوں گی۔“

”باتوں باتوں میں سے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ تم ایک گلاس دودھ پی لو ورنہ گھر پہنچنے سے قبل ہی اذان نہ ہو جائے۔ انکار مت کرنا۔۔۔ تمہاری افطاری سے مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ تپتی انداز میں بولی۔

”جیسے تیری خوشی! دودھ لے آؤ فوراً۔۔۔“ زیب نے خوشدلی سے کہا۔

گلاب کو رغبت میں رسوئی کی طرف بڑھی اور چند ہی لمحوں میں پیٹیل کا ایک جہاز ساز گلاس دودھ سے لبالب بھرا لائی۔ زیب نے مسکراتے ہوئے گلاس تھا اور ہونٹوں سے لگا کر تین سانسوں میں دودھ ختم کر دیا۔ گلابو سے بغلیہ ہوتی وہ واہسی کے لیے روانہ ہو گئی لیکن کمر عبور کرنے سے قبل ہی اسے ایک زوردار چکر آیا اور زمین و آسمان اس کی نظروں میں گھونٹنے لگے۔ پلکوں پر شدید بو جھڑھ آ رہا تھا۔

ہوش کے آخری لمحات میں اس کی نظر شمالی جانب دیوار پر ایک کینڈر پر جمی تھی جہاں جلی حروف میں ایک تاریخ لکھی تھی۔

13 اگست 1947ء

حروف میں دھندلا ہٹ پیدا ہونے لگی اور اگلے ہی لمحہ زیب النساء اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆.....☆

آنسوؤں اور سکھیوں نے اس کو کھڑکی کی فضاء مزید جو جھل بنادی۔

جس بے چینی اور اندرونی ٹھٹھن اس قدر شدید تھی کہ

فرق نہ آیا تھا۔ بلدیو کے اعصاب پر تھکاوٹ طاری ہو چکی تھی لیکن اس کا چٹائی عزم اب بھی برقرار تھا۔ وہ ایک بے بس نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے سر جھٹکتا کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔

☆.....☆

نور بیگم کی پریشانی حد سے سواتھی۔

نماز تراویح کا وقت ہو چکا تھا لیکن زیب ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ وہ افطاری کے وقت بھی ایک ملازم کو گلابو کے گھر روانہ کرنا چاہتی تھیں لیکن پھر اس کے آنسو اور سکیاں یاد آئیں تو اپنا ارادہ مؤخر کر دیا۔

”میں اپنی بے بے کے ساتھ زیبو کو خود چھوڑنے آؤں گی چاہیے کہ تم پریشان مت ہونا۔“ اس نے روائی کے وقت یقین دہانی کروائی تھی۔

اندھیرے نے ہر سو اپنے پنکھ پھیلا لیے تو جانے کیوں ان کا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے ایک قابل بھروسہ ملازم کو فوری طور پر گلابو کے گھر روانہ کیا لیکن اس کی آمد اور خبر نے ان کے وجود کی بنیادیں ہلا دیں۔

گلاب کور کا خاندان آج شام ہی اپنے مکمل ساز و سامان کے ساتھ لاہور سے روانہ ہو گیا تھا۔ نور بیگم کے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔ پریشانی کے عالم میں انہوں نے اپنا برقع تھاما اور ایک ادیب عمر ملازمہ کے ہمراہ گلابو کے گھر چل دیں لیکن وہاں سناٹا طاری تھا۔ وحشت و اضطراب میں وہ محلہ کی بھی لڑکیوں کے گھر استفسار کرنے گئیں لیکن ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا۔ ”ہم شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آئے تھے۔ گلاب کور نے آج شام کی ٹرین سے امرتسر روانہ ہو جانا تھا۔“

”لیکن اس نے تو دو روز بعد لدھیانہ جانے کا بتایا تھا۔“ نور نے پریشان لہجے میں کہا۔

گلاب کور نے محلہ کے ہر گھر میں مختلف بیان دیا تھا۔ امرتسر جانے والی ہزار لدھیانہ کا نام لیتی خدا جانے وہ کہاں گئی تھی اور زیب النساء کو بھی جانے زمین نکل گئی تھی کہ آسان کھا گیا تھا۔

”اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہوگی تمہاری بیٹی! تمہوڑا اتجار کر لو..... آہی جائے گی۔“ کویتا کی ماں کے الفاظ انہیں نیزے کی انی کی مانند گھائل کر گئے۔

”میری بیٹی ایسی نہیں ہے سروسوئی اتہ تو ہمیں جانتی ہو اسے۔ وہ ضرور کسی حادثہ کا شکار ہوئی ہے۔“ ان کی آنکھیں پھلک اٹھیں۔

اسے سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا۔ محن میں چند مخصوص آوازوں کی گونج سے اندازہ ہوا تھا کہ مرد حضرات کام کاج سے لوٹ آئے ہیں۔ وہ کرب سے آنکھیں موندے بھاری لمبوں کی کوٹھڑی میں آمد اور جسمانی تشدد کی ایک نئی لہر کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئی۔

وقت تیزی سے بیتا چلا گیا لیکن خلاف معمول کسی نے وہاں قدم نہ دھرے۔ سالہا سال سے جاری اس معمول میں رکاوٹ نے اسے اچھٹے میں جٹا کر دیا۔ مسلسل گریہ زاری اور آہی دباؤ نے اس کی طبیعت بوجھل کر دی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر مغربی جانب ایک تپائی پر موجود پتیل کی ٹیلی ٹیلی پلٹ تھامی اور اس میں موجود دباؤی چاول حلق سے نیچے اتار لیے۔ اپنا پیوند زدہ نکیر اٹھا لے وہ جھلنگا چار پائی کی جانب بڑھی ہی تھی کہ دروازے پر ایک آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ بلدیو پنکھ کی آنکھیں کثرت سے نوشی سے متورم تھیں اور چہرے پر وحشت کا ایک سمندر دکھائی دیتا تھا۔

”تم آج پھر مزار پہ گئی تھیں۔“ اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

”ہاں گئی تھی اور آئندہ بھی جاتی رہوں گی۔“ وہ بے خوفی سے بولی۔

”زی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔“

”کسی کے روکنے سے ہوائیں کبھی نہیں رکتیں بلدیو نکھ۔“

”لگتا ہے تمہیں ایک بار پھر زنجیروں میں قید کرنا پڑے گا۔“ وہ خراپا۔

”اگر مزید کوئی حسرت باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر لو۔“

”مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور مت کرو..... تمہاری عمر اور بڑھاپے کا لحاظ کر کے زنجیریں کھولی ہیں۔ میری پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو۔“ وہ خلاف توقع الجھ کر کہنے لگا۔

”بلدیو نکھ کی آگ برساتی زبان سے پریشانی کا لفظ سن کر گمان ہوتا ہے کہ تمہارے آقاؤں نے اپنے غلاموں کی پشت پناہی چھوڑ دی ہے۔“ وہ ہر خند ہوئی۔

بلدیو پیش کے عالم میں اس کی جانب بڑھا لیکن پھر اپنے قدم روک لیے۔ مخفی وجود اور کمزور جسمت کی حامل یہ عورت گزشتہ بیستیس سال سے مسلسل اس کے عتاب کا نشانہ بن رہی تھی لیکن اس کی ہٹ دھرمی اور بے خوفی میں رتی بھر

”بھئی ہم کیا جانیں کون کیسا ہے؟ ہم تو کیول اتنا جانتے ہیں کہ جوانی بڑی دیوانی ہوتی ہے۔“ پُرسوئی نے نخوت سے جواب دیا تو نور بیگم ساکت رہ گئیں۔ شر میں سامنے شری جھٹک کا یہ تجربہ ان کے لیے بے حد بھیاںک تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھر لوٹ آئیں۔ جوان بیٹی کے اس غیبی نے ان کے دل کی رگیں بری طرح مل ڈالی تھیں۔ علاقہ میں زیب کی گمشدگی زبان زد عام تھی۔ اس بدنامی اور اپنی کوتاہی کے احساس جرم سے شوہر سے نظریں ملانے کی بھی تاب نہ تھی۔ دوسری رات وہ اپنے دل میں ابھی بیسیں دیوانی سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اگلے روز رحیم خان کی واپسی پر آفات ناگہانی ان کی منتظر تھیں۔

الہیہ کی فوری تدفین کے بعد رحیم نے ایک نئے سرے سے زیب کی تلاش کا آغاز کیا لیکن بے سود۔ اگلے کئی ماہ تک وہ مختلف شہروں کی خاک چھانتے رہے لیکن ناکامی ان پر سایہ لگن ہو چکی تھی۔ انہیں اپنے وجود کی پروا بھی نہ دن بہ دن زوال پذیر صحت کی۔ زیب النساء کا تصور اور اس کی تلاش کا جنون دل و دماغ پر حاوی تھا۔ اور پھر ایک روز موہالی کے گمنام قصبہ میں گلیوں کی خاک چھانتے رحیم خان کے دل نے بھی دھڑکنوں کا ساتھ بھانے سے انکار کر دیا۔

وقت آخر بھی ان کے چڑی زدہ ہونٹوں پر زیب النساء ہی کی پکارت تھی۔

☆.....☆

زیب کی پلکوں پر شدید بوجھ تھا۔ اعصاب کی مکمل ٹوٹ سے وہ اپنی آنکھیں کھولنا چاہتی تھی لیکن نقاہت کے باعث ہانپ کر رہ جاتی۔ بازو پر جا بجا سونے جیسے کے نشان تھے۔ شاید اسے لگا تا رابکشن لگتے رہے تھے شاید اسی وجہ سے وہ زمان و مکان کی تصور سے مبرا ہو چکی تھی۔ اسے اپنا وجود خلاء میں محفل محسوس ہوتا۔ کبھی بھی بے ہوشی اور نیم مدہوشی کی کیفیت میں اپنے جسم پر ایک کریمہ اور متعفن یوجہ بھی محسوس ہونے لگتا لیکن وہ بے کسی سے چل کر رہ جاتی تھی۔ اسی مدہوشی میں اسے دو مضبوط ہاتھ چا دل اور روٹی کھلا دیتے۔ وہ اپنا سرخ کر اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرتا چاہتی تھی لیکن توٹی پر طاری کمزوری اور زنجیر میں جکڑے ہاتھ پاؤں اسے مزید بے بس کر دیتے۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن آواز کسی سیٹی کی مانند حلق میں دب کر رہ جاتی۔ ذہن پر چھائی رہنے والی دھند جسمانی نقاہت اور

لاشعور میں خلش کی طرح کسی قیمتی متاع سے محرومی کا احساس اسے ہر پل میں ہزار بار دفع موت سے ہٹکاتا کرتا۔ اپنوں کے گم گشتہ چہرے اس کی آنکھوں میں مزید جلن پیدا کر لے لگتے۔

اس سوئی جاگی کیفیت میں جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ قدموں تلے شئی فرش اور آس پاس چھائے اندھیرے کے سوا اگر کوئی تیسرا عنصر اسے محسوس ہوا تھا تو وہ موسم میں خلج تھی۔ جس زندہ اور تپش لٹاتی فضاء میں ٹھنڈک کا احساس اس کے ناتواں وجود میں پھر بری دوڑا دیتا۔ اس روز جب اس کے دماغ سے خوابیدگی کا اثر کم ہوا تو پہلی بار وہ اپنے گرد ملبی روشنی دیکھ کر حیران ہوا۔ جیسا بھول گئی۔ اس کے معدے میں تیز، نویکی شے کی چپکن کا احساس ادھ موا کرنے لگا۔ ذہن پر زور دینے سے اسے یاد آیا کہ دردن سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اپنے ہاتھ ٹھنڈے فرش پر جاتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اس کو شرفی کا جائزہ لینے لگی۔

سادہ اینٹوں سے بنی دیواریں خشکی کا شکار تھیں۔ کمرے کی مغربی جانب ایک مختصر سلاخ دار کھڑکی سے ڈوبے سورج کی روشنی چنن کر اندر آ رہی تھی۔ مشرقی سمت ایک مشفل چوبی دروازہ تھا جس کی چلی جانب ایک درز موجود تھی۔ فضاء میں خشکی کا تاثر آج مزید گہرا تھا۔ ذہن میں ادم بچاتے سوالوں نے اسے بے حال کر دیا۔

”ایسا کوئی بھی کمرہ گلابو کے گھر میں نہیں تھا اور اگر یہ گلابو کا گھر نہیں تو پھر میں کہاں موجود ہوں؟“ اس نے خود کلامی کی۔

اسی پل دروازے کی درز سے کسی نے ایک اخبار میں لپی روٹی اور پالک کا سالن اندر دھکیل دیا۔ اناج دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اپنے ہاتھوں کے بل ٹھٹھٹے ہوئے اس نے بدقت تمام کھانا کھانا کھانا اور دیوانہ وار اسے دانتوں سے کترنے لگی۔ معدے کی تپش کم ہو گئی تو دماغ میں سوچ اور ارادوں کو بھی تقویت ملنے لگی۔ وہ اخباری تراشہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ خبروں کا متن نا مانوس تھا اور اخبار کا نام بھی پچکتا ہٹ کے باعث ناقابل فہم تھا لیکن اگلے ہی لمحہ چند الفاظ نے اس کی بصارت بچھرا دی۔ اخبار کے نام تلے واضح انگریزی حروف میں لکھا تھا

دہلی، نومبر 1947ء

زیب النساء کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اضطراب اور خوف کی لہریں پورے جسم میں سرایت کر

بازوؤں میں تو بہت ہلکتی ہے ناں..... انہیں آواز دینا کہ
”جہیں یہاں سے نکال لیں۔“ بلدیو نے آگے بڑھ کر اس
کے بال نوچ لیے۔

”خدا کے قہر کو دعوت مت دو بلدیو! یہ بھوار وقت کی
ضرورت تھا۔ تمہیں کسی نے وہاں سے نکلنے کے لیے تو نہیں کہا
ہوگا۔ تم اپنے گھر میں محفوظ تھے۔ ہمارے مذہب میں غیر مسلم
عوام کے لیے بھی یکساں حقوق متعین ہیں۔“

”ہمیں مسلمانوں کی بھیک اور ہمدردی کی جبروت
نہیں اس لیے وہاں رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ ہندو برادری سے بڑھ کر ہمارا کوئی جتن نہیں۔ اور آنے
والا وقت بتانے کا کہ اس بھوارے کے ذمہ داروں کے بعد
تمہارے دلش کی جڑیں بھی ہم کھوکھلی کر دیں گے۔ جدیگی
میں ایک بار تجھے وہاں جبرور لے کر جاؤں گا۔ یہ بلدیو سنگھ کا
وچن ہے۔“ وہ اس کے بالوں کو جھٹکے دیتا اپنے نفس کی تسکین
میں مگن ہو گیا۔

وہ رات زیب النساء کے لیے بہت بھاری تھی۔ بلدیو
کے انکشافات کی روشنی میں اسے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی
خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ لاشعور میں جھپتی غلغلہ جسم وجود اختیار
کر چکی تھی۔ اس کی زندگی ایک ہیما تک طوفان کی زد میں
آگئی تھی۔

اس کی منت ساجت! آجیں! سسکیاں اور آنسو رانگاں
جاہت ہوئے۔ بلدیو ہر دوسرے تیسرے روز اپنے ہمراہ کسی
نفس پرست کو لے آتا۔ نووارد اس کے مذہب اور جس منظر
سے پہلے ہی آگاہ ہوتے تھے اس لیے بھوارے کی ہزیمت کا
بدلہ بھر پورا انداز میں اس کے دجود سے چکا یا جاتا۔

اس قید خانہ میں شب ماہ و سال کا تصور ایک بار پھر شرم
ہو گیا۔ شب و روز کی نشاندہی اس کو غمخیزی کی انگلی کی کھڑکی
سے مشروط ہو کر رہ گئی۔ زیب کے ہاتھ اور پاؤں ایک بھاری
زنجیر میں اس طرح جکڑے رہتے تھے کہ کھانے کے سوا وہ
انہیں کسی بھی صورت جنش نہ دے پاتی۔ دن میں ایک مرتبہ
بلدیو اسے اپنی گمرانی میں کوٹھڑی کی بیرونی جانب واقع بیت
الخلعہ میں لے جاتا اور پھر سے جکڑ دیتا۔
زندگی کسی درویش کی بددعا بن گئی تھی۔

☆.....☆

جبر اور جسمانی استحصال کی اس جگہ میں پستے جانے
کتنے موسم بیت گئے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ منقطع تھا۔ زیب
کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اپنی زندگی کا

رہی تھیں۔ اس کا دماغ مفلوج ہونے لگا تھا۔ کھڑکی سے
آنے والی روشنی نے بھی اپنے پرمیٹ لیے تھے۔ تاریکی
میں اندیشوں کے بھوت اس کے ارد گرد بے شکم رقص کرنے
لگے۔ اسی پل ساعت میں دروازہ پر ایک آہٹ محسوس ہوئی۔
لاٹین برادر ایک بھاری بھر کم شخص نہایت اطمینان سے اندر
داخل ہوا اور ایک جانب رکھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔
”کیسی ہوزیب النساء؟ ہماری مہمان نوازی میں کوئی
کمی تو محسوس نہیں ہوئی؟“

”کک..... کون ہو تم؟ ہم..... میں یہاں کک.....
کیسے؟“ اس کی آنکھوں کی پیش نے زیب کو ہکا دیا۔
”کمال ہے..... مجھے نہیں پہچانتے؟ بلدیو سنگھ نام
ہے میرا..... وہی بلدیو سنگھ جسے تم اپنے بازوؤں کے دم کی
چٹاؤنی دے رہی تھیں۔“

زیب کو ذہن پر زرا زور ڈالتے ہی مزار میں ہونے
والی ملاقات اور یہ شخص یاد آ گیا۔
”میں تو گلابو کے گھر میں تھی۔ پھر یہاں کیسے؟“ اس
کے آنسو جھلک اٹھے۔

”گلابو کے گھر سے تمہیں بے ہوشی کی حالت میں ایک
بستر میں باندھ کر کرپین کے ذریعہ اسی رات ہم یہاں لے
آئے تھے۔ اور کیول تم ہی نہیں تمہارے پاکستان کی بہت سی
پاک صاف نارایاں ہم اپنے مخصوص طریقہ سے بھوارے
کے وقت دہلی، ممبئی، لکھنؤ اور کلکتہ کے بالا خانوں میں پہنچا
چکے ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”لیکن کیوں..... کیا بگاڑا تھا، ہم لوگوں نے تمہارا؟“
”ہمیں اپنے گھروں سے نکالنے کا پاپ کیا ہے تیرے
بڑوں نے..... کیول فرنگیوں کو وہاں سے نکال دیتے تو کیا
حرج تھا؟ لیکن انہیں تو اپنے لیے علیحدہ ملک لینے کا جنون
تھا۔ جس دلش کو انہوں نے گچھ اور ناپاک سمجھے ہوئے بھوارہ
کیا! آج اسی دلش میں ان کی لڑکیاں جسم فروشی کا دھندا
کر رہی ہیں اور مرتے دم تک کرتی رہیں گی۔ تیرے شریر
سے میں اپنے اچانک پورا بدلہ وصول چکا ہوں اور اب تو بھی
مرتے دم تک اسی کوٹھڑی میں اپنے پرکھوں کی گتھی کا تادان ادا
کرے گی۔“ اس کے زہر لیے الفاظ نے زیب کو ششدر کر
دیا۔

”رحم کرو مجھ پر بلدیو سنگھ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔“
وہ بے اختیار بلکنے لگی۔
”چہ چہ..... یہ آنسو کیوں؟ تمہاری قوم کے

کرب کی موجودگی بھانپ گئی۔
 ”واہگرو نے ابھی ہمیں سناں نہیں دی۔“ گلابو کے
 چہرے پر دکھ کی جھلک واضح تھی۔

”فکر نہ کرو۔ اللہ پاک بلند یوسنگھ کو اولاد ضرور دے
 گا۔ میں نے بہت دعائیں کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میری
 یہ دعائیں رد نہیں ہوں گی۔“

”تمہیں فکر کرنے کی کیا جرورت ہے؟ اور یہی
 دعائیں تم اپنی قوم کے لیے کیا کرو کہ واہگرو انہیں عقل
 دے۔ تمہاری قوم سے بڑھ کر جذباتی اور بے وقوف میں نے
 کبھی کہیں نہیں دیکھا۔ یاد نہیں جاچی نور نے میرے دو
 آنسوؤں کو دیکھ کر اپنی بیٹی کو ہمارے گھر بھیج دیا تھا اور پلٹ کر
 شام تک خبر بھی نہ لی۔“ گلاب کور پھٹکارا۔

”ہم بے وقوف نہیں تھے گلابو! انسان دوست تھے۔
 ہمسائیوں کے حقوق کا خیال تھا، میں۔“ زیب اپنی والدہ کے
 ذکر پر آبدیدہ ہو گئی۔

”تم لوگوں کی بالک ہٹ نے ہمیں در بدر کر دیا۔ اس
 کی سزا تو بھگتی ہوگی۔“
 ”ٹھیک ہے، ہم نے سزا بھگت لی۔ لیکن اگر ایسی ہی
 سزا تم لوگوں پر مسلط ہو گئی تو کیا کرو گے؟“

”ہم بے وقوف ہیں نہ جذباتی..... ہمیں اپنے
 دوستوں پر دھواں ہے۔“ وہ زہریلے انداز میں کہتی لوٹ
 گئی۔

زیب النساء کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے۔
 والدین اور بڑی بہن کا تصور اس کی آنکھوں میں آتشیں
 آنسو پیدا کرنے لگا۔ صبح کا ذب تک وہ مثل مانی بے آب
 تر پتی رہی۔ فجر کا وقت ہوا تو اس نے معمول کے مطابق تیغ
 کیا اور اشاروں سے نماز ادا کرنے لگی۔ بچتے آنسوؤں میں
 دعا مانگتے کے بعد اس کے دل میں سکون کی لہریں موجزن...
 ہوئیں تو نیند نے کسی مہربان دیوی کی طرح اسے اپنی آغوش
 میں لے لیا۔

☆.....☆

گلابو اور بلند یوسنگھ کی تلخ آوازیں اس کی سماعت ذہنی
 کر رہی تھیں۔

”میرا گھر مسجد یا مزار نہیں ہے بلند یو! وہ یہاں نماز
 پڑھتی ہے اور تم نے کبھی روکا ہی نہیں۔“ گلاب نے چٹا کر
 کہا۔

”جاہل عورت! میں یہاں رہتا ہی کب تھا جو مجھے

خاتہ کر لے لیکن صیاد بہت شاطر تھا۔ اس نے قفس میں کوئی
 بھی ایسا روزن نہیں چھوڑا تھا جس کی مدد لیے وہ اپنے وجود کو
 اس ان جابی غلامت سے بچا سکتی۔ بلند یوسنگھ اس کی جسم
 فروشی سے خوب پیسے کماتا تھا۔ زیب النساء کی جسمانی اور
 ذہنی حالت محض دوش ہونے لگی تھی۔

کچھ عرصہ بعد بلند یو نے اس کوٹھڑی اور بیرونی سمت
 تعمیر کردہ بدل کر دیا اور ایک عورت کے ہمراہ اسی گھر میں
 مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اس روز اپنی کوٹھڑی میں ایک
 ست الوجود حلقہ زدہ آنکھوں اور چہرے پر تشدد و حقارت کے
 تاثرات لیے اس عورت کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی۔

”کیا حال ہے زیب النساء؟ ہماری خاطر داری میں
 کوئی کی تو نہیں؟“ اس کالب دلچہ زیب کو کچھ مانوس محسوس
 ہوا۔

”پچھانا نہیں مجھے؟“ وہ اس کے چہرے پر الجھن دیکھ
 کر محفوظ ہوئی۔

زیب نے نفی میں سر ہلادیا۔
 ”کمال ہے۔ تمہاری ذہانت کے ڈٹکے تو پورے
 اسکول میں بچتے تھے اور تم اپنے بچپن کی سکسی کو بھول گئی۔ میں
 گلاب کور ہوں۔“

زیب کے دل دو باغ میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ وہ
 اسے جھنجھوڑتے ہوئے اپنا قصور دریافت کرنا چاہتی تھی لیکن
 اپنے ضبط کی توہین بھی اسے گوارا نہ تھی۔ وہ دلی طور پر اپنی
 ذات سے وابستہ ہر معاملہ پر وردگار کی عدالت میں پیش کر
 چکی تھی۔

”کیسی ہو گلابو؟ اتنی افسردہ کیوں ہو؟“ زیب نے
 مسکراتے ہوئے کہا۔

”رسی جل گئی لیکن بل نہ گیا۔ مجھے افسردہ ہونے کی کیا
 جرورت ہے؟ واہگرو کی کرباسے میں اور بلند یوشادی کے بعد
 بہت خوش ہیں۔“ اس نے تکبر سے جواب دیا۔

”ماشاء اللہ! پروردگار تمہاری خوشیاں سلامت
 رکھے۔ کتنے سال ہو گئے اس شادی کو؟“

”دس سال ہو چکے ہیں۔ بلند یوسنگھ آج بھی مجھے اتنی
 ہی محبت کرتا ہے۔“

”دس سال اتنا عرصہ بیت گیا مجھے اس قفس
 میں؟“ اس نے زیر لب کہا۔

”تمہارے بچے کتنے ہیں گلابو؟ تمہیں بچے بہت پسند
 ہوا کرتے تھے ناں؟“ زیب اس کے رویے میں کسی گہرے

اندازہ ہو پاتا۔ اب بھی تمہاری ہی ضد پر یہاں منتقل ہوا ہوں۔“ بلد یونے بھی دودھ جواب دیا۔

”میں خوب سمجھتی ہوں تیری بے ایمانیاں! تو نے جان بوجھ کر اسے کسی کوٹھے پر نہیں بھیجا۔ اپنے گاؤں کے ساتھ خود بھی اس کے شریر سے ٹھیلے ہو۔ میں تمہیں سزا نہیں دے پائی تو تم اس سے ناجائز اولاد پیدا کر لو گے۔“

”تو چرا چائی ہے گا۔ یوں..... میں ایسے جموٹے بن رہی ہوں۔ اپنی اولاد کبھی پیدا نہیں کروں گا۔ تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس چھو کر نے مزار میں میرا ایمان کیا تھا اور اس کی سزا میں یہ ساری جنت کی بیہیں رہے گی۔ باقی آج ایک اور جگہ بھی جان لے۔ میں حکیم جج سنگھ کی دی ہوئی دوائیاں اسے کھلا چکا ہوں۔ یہ بھی بھی اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ بجز زمین بن چکی ہے اور کیول ہماری ہندو سکھ برادری کی رکھیل بن کر رہے گی۔“

”تو نے میرا بھی خوش کر دیا بلد یو! تیری ذہانت کا بھی جواب نہیں دیے۔“ گلاب کے لہجے میں خوشی کی ٹھٹھکی تھی۔ ”لیکن اس کی نماز کا سلسلہ بھی ختم کر دو کی طرح۔“

”وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ میں آج ہی داہرو کی مورتیاں اور تصویریں اس کی کوٹھڑی میں لگا دوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں کیسے نماز پڑھ پائے گی یہ۔“ وہ بیوی کو پکارتے ہوئے بولا۔

اور پھر زیب النساء کے لیے ایک نئی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کوٹھڑی میں ہر طرف تصویروں کی موجودگی نے نماز کی ادائیگی محال کر دی۔ یہ اذیت سابقہ بھی نکالیف سے سوا تھی۔ اس کی تڑپ اور کرب ناقابل بیان تھا۔ جسمانی استحصال کا کر یہ عمل بھی تو اسے جاری تھا۔ دن رات یونہی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے اور بھی ایک روز گلاب کو کور کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر ملی۔ ان دونوں میاں بیوی کے قدم زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔ بلد یونے اسے گھر یلو کام کاج سے منع کر دیا۔

”تیرے پاؤں بستر سے نیچے نہ اتریں۔ کام کاج کرنے کی بھی کوئی جرورت نہیں۔“

”تو گھر کون سنبھالے گا؟“ وہ شوہر کی اس محبت پر نہال تھی۔

”میں کسی نوکرانی کا بندوبست کر دوں گا۔ تو چھتا نہ کر۔“

”نوکرانی رکھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ وہ تو پہلے

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے سائنس پر کماحقہ توجہ دی۔ بقول رابرٹ برکفالت سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، کھیتیش کے نئے طریقے، پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔ جن سے یونانی بے تجربہ تھے۔ یورپ میں اس روح اور اسباب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے طبی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق مختصر یہ کہ انہوں نے روشنی، نظر، کسوف، خسوف، باد و باران، حیوانیات، نباتات، خواص اشیاء وغیرہ پر لاقعدا کتب لکھیں۔ گندھک اور شورے کا تیزاب بنایا۔ الکحل سے کام لیا۔ جراثیم کے قوانین پر روشنی ڈالی۔ مباحات معاون اور مہربان وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔ نیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے جڑا ہوا علم پیدا کیے۔ جبریل بن حیثیو، یوحنا بن ماسویہ، الکندی رازی، ابن سینا، ابو القاسم، ابن زہر، ابن خلیفہ اور ابن رشد جیسے میکروں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ڈیپہر لکھتا ہے کہ پنجاب کا ٹیکہ اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات میں مسلمانوں نے پیش قیامت اضافے کے یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد، حافظہ، ابن طفیل، امام غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جا تا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، الخوارزمی، ابوالوفا، ابن النہم اور موہبی بن شاہر جیسے علما کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا، مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔ علم ہیئت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اطراف سطحی، جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا تھا۔ علم تاریخ چمکی بار مسلمانوں ہی نے سج اور سائنسی بنیادوں پر مدون کیا۔ واقدی ابن سعد ہذری، ابن اثیر، طبری، ابن خلکان، ابن جریر، ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے میکروں مورخین نے وہ کام کیے جو آج بھی سنہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، موسیقی، حدیث، فقہ، علم الکلام اور ایسے میکروں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔ قرون وسطی کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض ادین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب است و کشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، رابری

اذیت پسندی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ زیب کا بیرونی دنیا سے کوئی بھی رابطہ تھا نہ تعلق۔ گھر میں ہونے والی گفتگو سے اسے تہواروں کی آمد اور دنیاوی پہلچ کا اندازہ ہوتا تھا۔

بلد یوسگھ کی ذاتی، معاشرتی اور قومی زندگی میں ہونے والی کوئی بھی شے یا منفی تبدیلی کا براہ راست نشانہ زیب کا وجود بننا۔ خوشی، غمی کے مواقع پر بھی وہ اپنی افسردگی اور خوشی کا تادان اسی کے جسم و جاں سے وصول کیا کرتے۔ بھارت کی پاکستان پر ناکام حملہ کی ہزیمت اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ زیب کے استخوانی وجود نے کئی روز دن رات ان گنت ہندو اور سکھ مردوں کی درندگی، جھیلی اور نیتھناؤ اس قدر بیمار ہو گئی کہ بالآخر بلد یوکوڈ اکثر کو گھرا کر دکھانا پڑا۔

اس بیماری کے دوران زیب نے دل کی گہرائیوں سے اپنے لیے موت کے لیے شمارو عا میں کیس لیکن زندگی اسے ابھی رہائی دینے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ ایک ماہ کے علاج اور ادویات کے استعمال سے وہ ایک بار پھر اسی دائرہ میں مقید ہو گئی۔

زیب النساء نے موت کی اس بے رخی پر ایک مکمل خاموشی اختیار کر کے اپنا وجود حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ بلد یو اور اس کے احباب کی آسودہ روانگی کے بعد اس کی آنکھوں سے اشکوں کی ایک جھڑی لگ جاتی اور وہ گہری سانس لیے آسمان کی جانب دیکھ کر پھر سے سر جھکا لیتی۔ اسے اب کسی بھی معجزہ کا انتظار نہ تھا۔

☆.....☆

سردی گرمی بہار، خزاں پت جھڑ تبدیل ہوتے رہے لیکن زیب کی زندگی پر ہنوز ایک ہی موسم طاری تھا۔ جبر و استبداد کا موسم۔

اس کی حالت اُس فصل کی سی تھی جسے اجاڑنے کے لیے جنگی درندوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی لیکن وہ خاموش اور ساکت رہنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اذیت کے اس سفر میں ایک کریناک لمحہ اس وقت آیا جب ایک بچہ بستہ شب میں شراب کے نشے میں دھت بلد یو اس کی ٹوٹری میں گھس آیا۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔ ایسی خوشی تو میں نے تب بھی محسوس نہ کی تھی جب تجھے ایک ٹرائی کی طرح جیت کر یہاں لے آیا تھا۔“ وہ سرشاری سے بولا۔

”لگتا ہے آج پھر کسی ماں کی گودا جاڑ آئے ہو۔“ وہ تلخ ہوئی۔

سے ہی گھر میں موجود ہے۔“ گلا پوتھر سے بولی۔ ”اس کے لیے نئی زنجیر بنوادنا کہ گھر بھر میں محسوس پھر کر کام کرنے میں بھی کوئی اڑوچن نہ آئے۔“

اس روز کے بعد رحیم خان اور نور بیگم کی نازوں پٹی بچی بلد یوسگھ اور گلاب کور کی ذاتی خادمہ بھی بن گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد سورج کی روشنی اپنے وجود پر محسوس کر کے اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر آئے۔ اسے پروردگار کی ذات سے انصاف کی کامل اُمید تھی۔ وہ بھاری زنجیر کھینچتے ہوئے دن بھر گلاب کو گمرانی میں گھر کے کام نمٹاتی اور رات کو بلد یوسگھ کی وحشت و حیوانیت برداشت کیا کرتی۔ پہلے بیٹے کی پیدائش نے ان کے کروفز اور فرعونیت میں مزید اضافہ کر دیا۔ بچے کے نام کرن کی تقریب زیب کے لیے ناقابل فراموش تھی۔ اس روز پانی کی طرح شراب کے بے تحاشا جام لٹھ خانے کے بعد بلد یو اس کے رشتہ دار اور احباب نے اسے نوچنے کھسوتنے کی انتہا کر دی۔ بے بسی اور اذیت سے وہ اس رات بلد یوکے پاؤں پڑ گئی۔

”مجھ پر رحم کرو۔ میری یہ سزا ختم کر دو۔ اب تو تمہیں اولاد کی محبت اور تڑپ کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں بھی کسی کی اولاد ہوں بلد یوسگھ! مجھ سے یہ اذیت مزید برداشت نہیں ہوئی۔ رحم کرو خدا کے لیے۔“

”اب کیوں روئی ہے مورکھ! ہماری یہ خدمت تو تجھے مرتے دم تک کرنی ہوگی۔“ بلد یو اس کی حالت اور آنسو دیکھ کر قہقہے لگنے لگا اور زیب نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

☆.....☆

اگلے پانچ سال میں گلاب کور نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی کو جنم دیا۔

ان بچوں کے کام کاج کی تمام تر ذمہ داری بھی زیب ہی بھرا رہی تھی۔ چار صحت مند بچوں کی پیدائش نے ان دونوں کی زندگی میں بے حد خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ تنگ و تنگوت اپنے اصل سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ ان چاروں بچوں کی پرورش خالص رنگ و رنگ ڈھنگ اور مخصوص افکار کے تحت کی جا رہی تھی۔

زیب النساء کی زندگی اسی دائرہ میں مقید تھی۔ جنسی استحصال نے اس کے وجود میں ناتوانی پیدا کر دی تھی۔ اسے گمان تھا کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد گلاب اور بلد یوکا دل پہلے جائے گا لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بے رحمی اور

”آج ملے والی اذیت سے بڑھ کر اور بھلا کیا ہوگا میرے لیے؟“

لیکن ہر بار اس کا یہ گمان غلط ثابت ہوتا۔ رحم خان کی اس لاڈوں پٹی اولاد کے لیے سب سے قیامت خیز کھڑی اس وقت آئی جب بلدیو کا سولہ سالہ بیٹا ہمیش سنگھ ایک رات شراب کے نشے میں دھت اس کی کونٹری میں در آیا اور اپنے باپ کی اس مفتوحہ زانی کو اپنی درندگی کے ٹوکیے بچوں سے ادا میز دیا۔

پھر یہ ایک معمول بن گیا۔ ہمیش کے ہم عمر دوستوں کی آمد کا ایک لاقصدی سلسلہ شروع ہوا تو آنے والے سالوں میں رام سنگھ اور اجیت سنگھ نے بھی اپنے علاوہ نوجوانی کے خمار میں جیٹلا دوستوں کو اس کونٹری کا مستقل راہی بنا دیا۔ یہ کم عمر خالص نوجوان بھی نفرت و دھشت میں اپنے بڑوں سے کم نہیں تھے۔ اس صورت حال کے بعد زیب ندیان میں جیٹلا ہو گئی۔

”اللہ کے تہرے ڈرو بلدیو سنگھ! مجھ پر اب تو رحم کرو۔“ وہ ہلک اٹھتی۔

”بس چند سال اور ہماری خدمت کر لے پھر تجھے ریٹائرمنٹ دے دوں گا۔۔۔۔۔ اور تجھے ایک ہار تیرے دلش کی یا ترا کروانے کا وجہ بھی پورا کرنا ہے مجھے۔“ وہ ہنس کر کہتا۔

”اپنی اولاد کے لیے اس حرام کمائی سے کیوں جہنم کا ایندھن اکٹھا کر رہے ہو؟ انہیں ابھی سے ایسی حرام کاری میں مبتلا کر کے اپنی نئی نسل کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہو۔“ اس کی تلخ گفتگو نے حسب سابق بلدیو کی برداشت کا بیانا نہ لبریز کر دیا اور اس نے اپنے معمول کے مطابق زیب کوروی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

وقت کے تھال میں لمحوں کے سکے اپنی مخصوص کھٹکھٹ سے قفس کرتے رہے۔ بلدیو سنگھ گلاب کور اور زیب النساء بڑھاپے کی ولہیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اسی کی دہائی اپنے جلوس بہت سے تغیرات لیے طلوع ہو گئی۔

بلدیو کے بیٹوں بڑھاپی لکھائی میں مکمل کورے تھے۔ وہ خالصہ تھقیوں سے وابستگی کے بعد مار دھاڑ اور لاقانونیت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ گلاب کور کے لیے بیٹوں کی یہ دہشت اور غنڈہ گردی باعث فخر تھی۔ ہاں! البتہ ان کی بیٹی اپنے بھائیوں کے برعکس تھی۔ انیس سالہ مدھوڈا انز بننا چاہتی تھی۔ تعلیم اس کا جنون تھی اور اخلاقیات اس کا زیور۔ وہ بلدیو کے خاندان سے منفرد تھی۔

بیٹی کے میڈیکل کالج میں داخلہ کی خوشی اس سے

”ایک نہیں ہزاروں ماؤں کی گود اجڑی ہے آج تیرے دلش میں۔“ اس نے تہہ لگایا۔

”ابھی خیر! کیا ہوا ہے وہاں؟“ زیب دل لگئی۔

”تیرے طاقتور بازوؤں والے سپاہیوں نے ہماری سینا کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔۔۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ بے یقین تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں تجھے۔۔۔۔۔ ہم اس دلش کو کھوکھلا کر دیں گے۔ آج بیوہ کرنے والوں کے دلش کا ہم نے بیوہ کر ڈالا۔ تمہارا پاکستان دو کھڑے ہو چکا ہے۔ اس کامیابی کا جشن ہم سب تیرے ساتھ منائیں گے۔“ اس کے ارادے جان کر زیب کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔

اپنی قوم اور مذہب کا یہ دکھ زیب کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اسے زندگی میں آزادی کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ برسوں سے آنکھوں میں سجے خواب کی تعمیر جس وقت ممکن ہوئی تھی اسے یرغمال بنا کر قید کر لیا گیا۔ اپنے وطن اور اپنے ہم مذہب افراد پر پڑنے والی اس افتاد نے اس کے رگ و پے میں حشر برپا کر دیا تھا لیکن اس قفس سے رہائی کی کوئی بھی صورت نظر ہی نہیں آتی تھی۔

جنون کے عالم میں وہ اپنا سر دیواروں سے ٹخ کر رہ جاتی۔ بچتے بھوے چہرہ رنگین ہو جاتا لیکن موت پھر بھی مہربان نہیں ہوتی تھی۔

☆.....☆

بلدیو سنگھ نے گھر میں ایک بار پھر تعمیراتی کام کا آغاز کر دیا۔

زیب کی جسمانی نقدی ہوس کے بازار میں اپنی قدر و قیمت اب کھونے لگی تھی۔ اس نقدی سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے بلدیو نے بھارت کی مٹی آبادی سے اس کے دام کھرے شروع کر دیے تھے۔ ”کچلے، مٹلے اور جنسی آسودگی کے لیے ترساں افراد اس کا خیر میں بہت خوش و خرم رہتے۔ نشے کے عادی افراد کی آمد کے باعث وہ اپنی بیٹی اور بیوی کی موجودگی پر کچھ تحفظات میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنے اہلخانہ کے لیے گھر میں ایک اور منزل تعمیر کروا کے انہیں وہاں منتقل کر دیا۔ مٹی منزل کی کونٹری میں شیطانیات کا قفس اب بلا خوف و ہرجمک ہونے لگا۔

ہرگز نادان زیب کے لیے ایک نیاز و خرم اور تکلیف لیے طلوع ہوتا اور ہر رات کے اختتام پر وہ ایک ہی بات سوچتی؛

سنجیلے نہیں سنسبل رہی تھی۔ وہ اپنی سبھی اولاد میں مدھوی سے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ کالج آمدورفت کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس خوشی و سرشاری میں زیب کی قید میں آسانیاں پیدا کر دی گئیں۔ اس کی کوکھری میں ایک برقی بلب لگانے کے بعد دیوار پر کیلنڈر آویزاں ہوا تو اس کے ساتھ ہی گلاب کور کے دل میں برسوں سے موجود ایک خلش عود آئی۔

”اس کے ہاتھ میں ایک کڑا بنوا کے پہنا دے بلدیو!“

”اس کی کیا جرات ہے گلابو؟ اس کی اصل شناخت ہی برقرار رہنی چاہیے۔“

”ضرورت ہے..... بالکل ضرورت ہے..... تو چاہے تو اس کی زنجیریں کھول دے۔ اس عمر میں یہ بھاگ کر جائے گی بھی کہاں؟ لیکن اسے خالصہ کڑا پہنا دے۔ ان دونوں بہنوں کو اپنے دھارک سان کا بہت مان ہوتا تھا۔ مجھے کہتی تھیں کہ ہمارا سر کسی کے بھی آگے نہیں جھک سکتا۔ اسے کڑا پہنے دیلوں گی تو دل کو بہت سکون ملے گا۔“

بلدیو نے اس کی بات تسلیم کر لی۔ زیب کی زنجیروں کے قفل کھلے تو وہ اپنے جسم پر موجود ان بیڑیوں کے نشان دیکھ کر کتنی ہی دیر بے آواز آنسوؤں سے رو رہی۔

دھیرے دھیرے وہ گھر کے باہر چہل قدمی کے لیے بھی نکل جاتی۔ اپنے ارد گرد خوش باش چمکتے چہروں کو دیران نظروں سے دیکھتی تو اپنے پیاروں کے کم گشتہ وجود بہن کے کواڑوں پر زور و شور سے دستک دینے لگتے۔ اسی دوران اسے مرکزی سڑک پر واقع ایک حزار نے اپنے حشریں گرفتار کر لیا۔ وہ موقع ملے ہی اس حزار میں پہنچ جاتی اور اپنا کڑا اتار کر عبادت کی لذت میں مگن ہو جاتی۔

وقت گزرتا رہا۔ بلدیو سیکھ کے تشدد کے باوجود وہ اپنا یہ نیا معمول ترک نہ کر سکی۔ اس کی قید سنسبلیں پڑاؤ و گور کچکی تھی۔ ماہ ستمبر کا آغاز ہوتے ہی بلدیو کی کچھ پراسرار سرگرمیوں پر گلاب کو ہنٹک گئی۔

”یہ کن جھیلیوں میں پڑا ہے تو آج کل؟ ہمیش بتا رہا تھا پاسپورٹ دفتر کے بہت پکڑ لگ رہے ہیں۔“

”ہاں! میں اپنا اور زیو کا پاسپورٹ بخوار ہا ہوں۔ پاکستان کی یا تارا کو روانی ہے اسے۔“ بلدیو نے اطمینان سے کہا۔

”میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ کبھی کبھی بہت دل چاہتا

ہے کہ اپنی جنم بھومی، قلعہ کے مینار، بڈھا دریا ایک بار پھر دیکھوں۔“ اس کی آنکھوں میں بے چینی اور لہجہ میں کک عیاں تھی۔

”تجھے پھر کبھی لے جاؤں گا۔ ابھی تیرا یہاں رہنا جروری ہے۔ مدھو کے پرے شروع ہونے والے ہیں اور دہلی کے حالات بھی آجکل اچھے نہیں۔ میں واپسی کے بعد یہاں سے سب کچھ سمیٹ کر امرتسریت ہونے کا سوچ رہا ہوں۔“

”رہنے دے باپو! ہم اپنا گھر بار کیوں چھوڑیں بھلا؟“ اجیت سنگھ نے تیوریاں چڑھائیں۔

”تو نہیں سمجھ گا اجیت! میری نظریں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ ننی پر دھان مٹری نے خالصہ برادری کے خلاف بہت سے آدمیش دے رکھے ہیں۔ خالصتان تحریک کے جرم میں ہر خالصہ کو دیش دروہی سمجھا جا رہا ہے۔“ اس نے پیشانی مسلی۔ ”گھر کے اندرونی معاملے تیرے سپرد ہیں گلابو! اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ اس مسئلے کی طرف کیوں یہی ایک قرض باقی رہ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو بے فکر ہو جا۔ ہم یہاں اتنے سالوں سے رہ رہے ہیں۔ سب اپنے ہی تو ہیں۔ ڈر کا ہے کا بھلا؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

دو روز بعد بلدیو زیب النساء کو لکشی کور کے جعلی پاسپورٹ کی مدد سے پاکستان لے آیا۔ زیب کے لیے اس تصوراتی وطن میں آمد ایک انوکھا تجربہ بھی۔ لاہور آمد اس کے لیے بہت دردناک مرحلہ تھی۔ ۳۷ سال قبل وہ اسی دھرتی میں آزاد پنجپھی کی طرح والدین کے شفیق سائے میں رہتی تھی۔ یہاں ہر ایک چپہ اس کے وجود اور شناخت کا گواہ تھا لیکن آج ارد گرد نظر آتے لوگوں کے ساتھ ساتھ فضا میں ”عجرب“ بیل بوئے راہیں بھی اسے اجنبیوں ہی کی طرح تک رہی تھیں۔

اسی شام بلدیو اسے قلعہ چھن سنگھ کے اسی محلہ میں لے گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کا خوبصورت ترین دور گزارا تھا۔ علاقہ کے لوگوں نے بہت خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ نمبردار کی بیٹھک میں انہیں بادام ملا دو دھپیش کیا گیا۔

”خیر سے آنا ہوا سردار جی!“ نمبردار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی جناب! ہوا رے کے وقت ہم دونوں ہمیں اسی محلہ میں رہتے تھے۔ تقدیر کی کھمن گھری ہمیں اپنے ساتھ

اڑائے ہندوستان لے گئی لیکن جنم بھومی کی کشش کبھی بھی ختم نہ ہو سکی۔ اپنے باضی کو ایک بار محسوس کرنے کے لیے چلے آئے ہیں۔ ”وہ اپنے چہرے پر ممکن تاثرات سجائے بولا۔
”ست بسم اللہ پترا! جم جم آدیاہاں۔ میں تو خود یہاں پرکھوں کے وقت سے رہ رہا ہوں۔ اس علاقہ میں دو سٹیکس میرے سامنے بل بڑھ کر جوان ہوئی ہیں۔ بٹوارے کے وقت میری عمر بھی یہی کوئی تیس سال ہو گئی۔“ اس کے انکشاف پر زیب چونک گئی۔

”میراج سنگھ سے آپ واقف ہی ہوں گے بھئیائ۔“ بلد بونے دانستہ استفسار کیا۔
”بالکل واقف ہوں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی شاید۔“
حشمت علی ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔
”جی ہاں! گلاب کور..... اور میراج سنگھ میرے سگے چچا تھے۔“

”بہت خوب! بہت خوب! ان سے ہماری بہت اچھی یاد اللہ تھی۔ اس نسبت سے آپ سے قلبی تعلق بنتا ہے ہمارا۔“
”رحیم خان اور نور بیگم سے بھی آشنا ہوں گے آپ؟“
زیب نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں آپ اس رحیم خان کی بابت تو نہیں پوچھ رہیں جو کپڑے کے بیوپاری تھے اور ان کی دو بیٹیاں تھیں۔“ حشمت نے ایک بار پھر ذہن کریدا۔
”جی ہاں! بالکل وہی۔“ زیب کی دھڑکن منتشر ہو گئی۔

”آہ بڑا بد قسمت گھرانا تھا وہ بھی۔ دولت کی ریل پیل تھی ان کے یہاں۔ لیکن چھوٹی بیٹی کی گمشدگی نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔“ وہ آزرہ دہوا۔
”کسک..... کیا ہوا انہیں؟“

”شدید یہی تھا کہ ان کی بیٹی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ رہ پویش ہو گئی تھی۔ اسی صدمہ نے پہلے نور بیگم کی جان لی۔ رحیم خان بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور بیٹی کی تلاش میں ہندوستان تک جا بیٹھے لیکن وہ کسندہ ہوئی تو انہیں مل بھی جانی..... وہ بھئیائ کسی آشنا کے ساتھ اپنی مرضی سے فرار ہو گئی تھی۔ رحیم کے ساتھ ان کا ایک ملازم بھی گیا تھا۔ اسی نے واپس آ کر بتایا کہ موہالی میں ان کی وفات کے بعد وہیں تدفین کر دی گئی تھی۔“ حشمت کے انکشافات نے زیب کے وجود کو یکھت پارہ بارہ کر دیا۔
”اور ان کا گھر دکان وغیرہ؟“

”بڑی بیٹی کے شوہر نے سب کچھ فروخت کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہیں بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔“
زیب النساء کا وجود سناٹوں کی زد میں تھا۔ بلد یونگھ کی استہزائیہ مسکراہٹ بھی اس سے ارجھل نہ تھی۔ حشمت علی انہیں اپنے ہمراہ لیے علاقے کے کبھی پرانے گھرانوں سے متعارف گردانا رہا اور ایک پُر خلوص شاندار ضیافت اڑانے کے بعد بلد یواس کے ساتھ لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر و تفریح میں مگن ہو گیا۔

رحیم خان کے ساتھ بچپن میں وہ بارہا ان بھی جگہوں پر آچکی تھی لیکن آج یہ جانے پہچانے مقام بھی اسے کشمی کور کی گردان کر اجنبی لگا ہوں سے تک رہے تھے۔ قلعہ کے درو دیوار بادشاہی مسجد کے عظیم الشان مینار راوی کا بہتا پانی، علی جھویری کے مزار کی رونقیں اور چوہدری کے چاروں مینار اس کے دل میں کرب بڑھانے لگے۔ وہ لمحات اس کے لیے بہت بھاری تھے۔ اس رات ہوٹل کے کمرے میں وہ ایک بار پھر بلد یوکے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی۔

”مجھے واپس لے چلو بلد یو! میں ساری زندگی تمہاری دی ہوئی ذاتیں سہتی آئی ہوں لیکن اس درد کا کوئی درماں نہیں ہے۔ مجھے اسی نفس میں واپس لے چلو۔“

”اتنی جلدی بھی کیا۔ ہے زیب النساء؟ ابھی تو تمہاری قوم کے اور بھی بہت سے روپ دکھانے ہیں تمہیں۔“ وہ اپنے مخصوص زہر لیے لہجہ میں بولا۔

”مجھے کچھ نہیں دیکھنا اب اور کچھ نہیں دیکھنا۔“ وہ اہنا سر دائیں بائیں جھکنے لگی۔

☆.....☆

اگلی صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔
اخبار اور ریڈیو میں بھارتی پردھان منتری کی اپنے سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں ہلاکت کی خبر نے بلد یونگھ کا چہرہ فٹ کر دیا۔

”بہت غلط ہوا ہے یہ..... سامان وغیرہ سمیت لوڑیو! میں نکلوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ داہگر و میرے بیوی بچوں کی حفاظت کرنا۔“ وہ جگت میں کہتا روانہ ہو گیا۔
نکلوں کا انتظام ہوتے ہی وہ دہلی لوٹ گئے جہاں ایک قیامت بلد یوکے منتظر تھی۔

مدھو درود سے لاپتا تھی۔ گلاب کور سے اپنی ایک سیکیلی نہا کی ساگرہ میں شرکت کی اجازت لیے وہ سہ پہر کے وقت گھر سے روانہ ہوئی تو رام سنگھ اسے خود اپنی معیت میں نہا کے گھر

چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ اپنی کچھ مصروفیت کے سبب اس کے دیئے گئے وقت سے ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچا تو مدھو وہاں موجود نہ تھی۔ یہاں بھی اس کی روگائی کی بابت کچھ نہیں جانتی تھی۔

”میں کچھ مہمانوں میں مصروف بھی رام! مجھے علم نہیں ہوا کہ وہ کب اور کس کے ساتھ روانہ ہوئی۔“ اس کے دو ٹوک جواب نے اسے بوکھلا دیا۔

گلاب کور کے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ دیوانہ وار آس پاس کے بھی علاقوں اور کالج تک جا پہنچی لیکن مدھو کو جانے زمین نکل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ وہ سینہ کو پی کرتی بیٹی کو یاد کرتے ہوئے بین ڈالتی لیکن بے سود۔ ہمیشہ رام اور اجیت نے بھی اس دوران اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلاتیں مگر ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

بلد یونٹکھ یہ صورت حال جان کر اپنے ذہن پر قابو نہ رکھ سکا اور مغفلات بلکا ہوا گلابو پر ہل پڑا۔
”تجھے کہہ کر گیا تھا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ بیٹی کی حفاظت تیرے ذمہ لگائی تھی میں نے۔ تو ہی ذمہ دار ہے اس حادثہ کی..... میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اسے ٹھوکر دینے کی زور دینے لگے ہوئے چلا یا۔

”میرا کوئی دوش نہیں..... یہاں خود میرے پاس آگیا لینے آئی تھی..... میں کیسے انکار کر دیتی..... وہ مدھو کے بچپن کی سمجھی ہے..... اس کے ماتا پتا سے بھی میل جول ہے ہمارا۔“ وہ کراہتے ہوئے بولی لیکن بلد یونٹکھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

”فکر نہ کر گلابو! مدھو مل جائے گی..... ضرور مل جائے گی۔“ زب نے سپاٹ لہجہ میں کہا اور اپنی کوفڑی میں چلی گئی۔

بلد یونٹکھ نے بیٹی کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ دہلی کے سیاسی حالات اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ خالصہ برادری سیاسی اور معاشرتی عتاب کی زد میں تھی۔ ہندو اپنی پردھان منتری کی موت پر خون آشام درندے بن چکے تھے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ٹشموں کا قتل عام جاری تھا۔ ان کے گھر کا درباری مراکز نذر آتش کیے جانے لگے۔ ان کی آمد کے اگلے ہی روز پولیس اچانک وارد ہوئی۔

”اجیت سنگھ اور ہمیشہ سنگھ کہاں ہیں؟“ ایک افسر نے درستی سے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں۔“ بلد یونے جواب دیا۔
”تو پھر کے علم ہے سردار جی؟ خاموشی سے انہیں تھانہ میں حاضر کر دو روز تیرے پورے گھر کو بھسم کر دوں گا۔“

”انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تو خود ان کی تلاش میں ہیں۔“ بلد یونے کبھی کسی بل نکل چکے تھے۔

”ہمیں کچی خبر ملی ہے کہ پردھان منتری کے باڈی گارڈ کا تھارے تینوں بیٹوں کے ساتھ گھبراہٹ تھا۔ وہ اب قانون کی گرفت سے بھی نہیں بچ سکتے۔ آج نہیں تو کل! میں انہیں ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔“ ریش نامی اس افسر کا لہجہ بہت خوشنور تھا۔ بلد یون اور گلابو کے جسم میں پھیری دوڑ گئی۔

”میری بیٹی کا کچھ پتا چلا صاحب؟ ہم نے دو روز پہلے رپورٹ درج کروائی تھی۔“ گلاب کور نے روتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگی ہوگی شریعتی جی! چتا نہ کر دو جا روز میں جب اس عاشق کا گول بھر جائے گا تو لوٹ آئے گی ورنہ کسی کو ٹھٹھے پر پہنچ جائے گی۔ ایسی لڑکیوں کا بچپن انجام ہوتا ہے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔

ریش اپنے دو سپاہی وہیں تعینات کر کے روانہ ہو گیا۔ رات ہوتے ہی بلد یون کا ایک دیرینہ دوست موہن سنگھ ایک بڑی خبر لیے اس سے ملنے چلا آیا۔

”مجھے رام سنگھ نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ بلو۔ مدھو مل گئی ہے۔“ اس کا لہجہ گھمبیر تھا۔

”کہاں ہے میری بیٹی؟ اور رام خود کیوں نہیں آیا؟“ وہ بیٹائی سے بولا۔

”چربیا گیا ہے کیا؟ باہر پولیس ان کے سواگت کے لیے کھڑی ہے۔ وہ تینوں کیسے آسکتے ہیں بھلا؟ اور مدھو کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر نہیں ہے میرے پاس۔“ موہن نے اس کا کندھا تپتپایا۔ ”وہ یہاں کے بھائیوں کے چنگل میں تھی۔ ہمیشہ رام اور اجیت کا تعلق خالصتان کے کچھ حمایتیوں سے تھا۔ وہ بہت سے لوگوں کی نظر میں کھلتے تھے۔ اسی لیے یہاں کے بھائیوں نے مدھو کو اغواء کے بعد قید کر لیا اور پھر“ وہ اپنے ہاتھ بے چینی سے مسلنے لگا۔

”پھر کیا موہن؟“ بلد یون کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”وہ اپنے کئی دوستوں کے ساتھ اس کی عزت سے کھلوڑا کرتے رہے..... وہ کوئل لڑکی یہ درندگی سہہ نہیں پائی اور موت کو گلے لگا لیا۔ یہاں کے بھائی اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے دوران ہی رام کی نظر میں آئے تھے۔“ موہن کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک تھی۔

بلد یونٹکھ کا وجود ساکت اور بصارت بھرا گئی۔ اسے

اپنی ساعت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ موہن تعزیت کرتا روانہ ہو گیا لیکن اس کے وجود میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ گلاب کو بھی دیوانہ وار اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کا ماتم اور تڑپ پتھروں کا کلیجہ بھی شق کر رہا تھا۔ زیب دھیرے دھیرے چلتی کرے کی دہلیز پر آئی اور نرم آواز میں بولی۔
 ”میں کہتی تھی ناں بلدیو! اپنی اولاد کے لیے آگ اکٹھی نہ کرو۔ لیکن تم نہ مانے۔ شکر کرو گلابو کہ وہ مر گئی۔ شکر کرو تہاری بیٹی پر موت مہربان ہو گئی۔ مجھے اس کی خوش قسمتی سے جلد ہونے لگی ہے۔ اگر وہ زندہ رہتی تو ہر روز ایک نئی موت مرتی۔۔۔۔۔ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہی کہ رب کے اس انصاف پر خوشی محسوس کروں یا ایک اور عورت کی تذلیل کا ماتم۔“ وہ بے ربط انداز میں کہتی چلی گئی۔ بلدیو اور گلاب کو یہ حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔
 وہ پوچھ لے لے اپنا وجود کھینچتی اس قفس سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

مزار کے درو دیوار پر شام کا سرمئی پنچھی سایہ قلعن تھا۔ زائرین میں لنگر تقسیم کرنے کے بعد اس نے صفائی ستھرائی کا آغاز کر دیا۔ ملکی حالات کے پیش نظر شام ڈھلتے ہی لوگ اپنے گھروں میں مجبوس ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ فرش کی دھلائی کے بعد اس نے وضو کیا اور نماز عشاء کی ادائیگی میں مشغول ہو گئی۔ نماز مکمل ہونے کے بعد وہ کتنی ہی دیر وہیں بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ یہ آنسو اس کے بہت وفادار ساتھی تھے۔ کسی لمحہ بھی اسے تہا چھوڑتے ہی نہ تھے۔ دفعتاً اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے گہری سانس لیتے جائے نماز لیٹی اور ایک ستون کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے اپنے مستقبل کے متعلق زیب؟“ مجاور کی شفیق آواز اس کی ساعت میں پڑی۔

زیب النساء اپنے قفس سے رہائی کے بعد یہاں آگئی تھی۔ بارعب شخصیت نرم خوار اور دھیمے مزاج کے مالک اسد اللہ اسے پہلے بھی کئی بار یہاں آتے جاتے دیکھ چکے تھے۔ اس کی ظاہری شخصیت کا تضاد ان کے لیے بہت حیران کن تھا۔ زیب نے انہیں اپنی داستان حیات بنانے کے بعد مزار کے کام کاج سنبھالنے کی درخواست کی تھی جسے انہوں نے وقتی طور پر تو تسلیم کر لیا لیکن اس کے محفوظ مستقبل کے لیے وہ بہت فکر مند رہے۔

”میرے دل و دماغ پر اب بھی ایک دھند چھائی

ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ میں بچی کچی زندگی یہیں بسر کر لوں؟“

”اس میں بھی بہت سی مشکلات ہیں۔ آپ اپنے وطن واپس لوٹ جائیے۔“ انہوں نے خالصانہ تجویز دی۔

”وطن..... میرا تو کوئی بھی وطن نہیں۔ میری یہاں منتقلی کے وقت میں برٹش راج کے زیر تسلط ہندوستان کی شہری تھی۔ لیکن پھر میری کوئی شناخت ہی نہ رہی۔ میں ملک و قوم کے معاملہ میں یتیم ہوں۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔“

”آپ بلدیو سنگھ کے ساتھ اپنے شہر سے واپس کیوں آگئیں؟ ذرا سی ہمت آپ کو حاصل شناخت لٹا دیتی۔“

”میں بہت خوفزدہ تھی..... وہ لوگ میرے ہم مذہب ہم قوم تھے لیکن کوئی بھی مجھے پہچان ہی نہ سکا۔ میں ان کے انداز سے خوفزدہ تھی۔ وہ اپنے گھروں میں بھارتی فلمیں دیکھتے، بھارتی گانے بجاتے ہیں۔ ان کی لڑکیاں اور لڑکے بھارتی اداکاروں کی نقالی کرتے ہیں۔ وہ بلدیو سنگھ کو اپنا بیٹا بھائی کہہ کر گلے لگاتے رہے۔ ان کی شاندار زندگیوں کے پیچھے مجھ جیسی جانے کتنی حرام نصیب عورتوں کی آہیں اور سکیاں ہیں لیکن ایک بار بھی میرے وجود کا کرب نہ پہچان سکے۔ میری ذات سے منسوب خرافات سن کر میں نے سوچا کہ میں انہیں بھی اپنی پارسانی کا یقین نہیں دلا سکوں گی۔ وہ لوگ بھی میری ہی طرح ایک قیدی تھے۔ جھوٹے مجرم، نفس اور شان و شوکت کے قیدی۔ وہاں مستقل رہائش کے بعد میں ایک اور اذیت میں مبتلا ہو جاتی۔ مجھے ماضی تلاشنے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا اور وہاں ایسی تلاش میرے بچے بچے وجود کو مزید ریزہ ریزہ کر دیتی..... میں اپنے قفس میں لوٹ آئی اور اب بھی شب و روز میری ایک ہی دعا ہے کہ میری اس لاعلم قوم کو عقل و شعور اور بصیرت عطا ہو ورنہ انہیں علم ہی نہیں کہ قوموں کی کوتاہیاں ان کی بے قصور بیٹیوں کو ایسے زندان میں قید کر دیتی ہیں جہاں سے رہائی ممکن ہی نہیں ہوتی۔“ زیب نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے طاق میں رکھا قرآن پاک تھاما اور تلاوت کا آغاز کر دیا۔

مجاور اپنے کمرے میں بیٹھا بند یو کے چپے پر پاکستان سے آئے مہر النساء کے خط کا جواب لکھ رہا تھا۔ پندرہ صفحے میں اس پر گزرے واقعات لکھنے کے بعد اس نے لکھا۔ ”قید میں اسے موت نہ آئی مگر جب قفس سے آزادی ملی تو وہ ابدی نیند سو گئی۔“

کی جاناں میں



شیریں خاتمہ حرزنت

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

سرگزشت کافی عرصہ سے زیر مطالعہ ہے۔ پہلی بار میں نے اس کے لیے کچھ بھیجا ہے۔ یہ میرے لیے ایک ناقابل فراموش واقعہ اس لیے ہے کہ اس واقعہ کو کہانی کے انداز میں لکھا ہے۔ امید ہے کہ پسند آئے گا۔

اشعر جمال

(کراچی)

اس نے اپنے ہونٹوں پر سرخی بھائی اور چمک کر بولی۔
”میری جان صرف پانچ منٹ دے دو، میں ابھی آتی ہوں۔“

میں اس کی طرف دکھ سے دیکھتا رہ گیا۔

خدا نے کیا حسن دیا تھا اسے۔ پتلے ہونٹ، بہترین قامت، چمیرا جسم، نازک نقش و نگار۔ سب کچھ مکمل تھا لیکن میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پانچ منٹ بعد وہ کمرے میں آ گیا تھا۔

اس نے ایک پھولدار فراک پہن لی تھی۔ اسی کمرے کی

شلوار تھی۔ اس کے خوب صورت بال کھلے ہوئے تھے۔
 ”کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”بہت خوب صورت۔“ میں نے کہا۔
 ”یار! پوری دنیا میں ایک تم ہی ہو جو مجھے اچھی طرح
 جانتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ یہاں تو..... خیر چھوڑو۔ یہ
 بتاؤ آج کہاں چلیں، میرا دل تو پڑا کھانے کو جا رہا ہے۔“
 ”لیکن میں تمہارے اس طیلے میں تمہیں اپنے ساتھ
 نہیں لے جاؤں گا۔“

”ارے ظالم۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہی
 تو میرا اصل ہے۔ خیر تم کو اچھا نہیں لگتا تو میں پیچھ کر کے آتی
 ہوں۔“

وہ پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا (چلی گئی)
 میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کو اچھی
 پینٹنگ جمع کرنے کا شوق تھا اور خود بھی کئی کامیاب ریپلر کا بنا
 چکا تھا۔ میری اس سے دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن
 نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بہت قریب ہو گیا تھا۔
 وہ دن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں انٹرویو
 کے لیے اسٹار وارز میں گیا تھا۔ وہ دواؤں کے سب سے
 بڑے آپورٹر تھے۔ میں اخبار میں ویکسی دیکھ کر گیا تھا۔
 کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے مجھ سے پوچھا۔ ”جیال صاحب! کیا
 آپ نے مسٹر روشن سے ملاقات کا وقت لیا ہے؟“
 ”نہیں جناب۔ میں نے کسی سے وقت نہیں لیا۔
 ویسے یہ روشن صاحب کون ہیں؟“

”یہ اس فرم کے منیجر ہیں۔“ ریپنٹنٹ نے بتایا۔
 ”ان کی عادت ہے کہ بغیر اپائنٹمنٹ کے کسی سے نہیں
 ملتے۔“

”بھائی میں بہت دور سے آیا ہوں اور اخبار میں
 اشتہار دیکھ کر آیا ہوں۔“

”شاید آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس میں لکھا ہے کہ
 بغیر فون کیے انٹرویو کے لیے نہیں آئیں۔“

”ہاں یہ غلطی ہو گئی۔ میں نے دیکھا تھا..... میں نے
 اعتراف کیا۔“ لیکن پلیز کسی طرح ان سے بات کراویں۔
 میں بہت دور سے آیا ہوں۔“

اس کو شاید مجھ پر رحم آگیا۔ اس نے انٹرکام پر کچھ
 بات کی اور دوسری طرف سے اجازت ملنے پر ایک کمرے کی
 طرف اشارہ کر دیا۔ ”وہ سامنے والا کمرہ روشن صاحب کا
 ہے۔ سیدھے چلے جائیں۔“
 میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کمرے تک چلا گیا۔

دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک نرم سی آواز
 آئی۔ ”کم ان۔“

میں کمرے میں داخل ہوا تو سامنے میز کے پیچھے کرسی
 پر جو بیٹھا تھا، وہ نرم و نازک سا چہرہ مجھے پہلی نظر میں بہت اچھا
 لگا تھا۔ مرو ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص قسم کی کشش
 تھی۔

میں اس کی شاندار میز سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”تشریف رکھیں۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف
 اشارہ کیا۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”نام کیا
 ہے آپ کا؟“

”جی میرا نام اشعر ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”آپ کے
 پاس میری فائل رکھی ہوگی۔“

”جی ہاں، آپ کی فائل ہے میرے پاس۔“ اس نے
 میز پر سے میری فائل اٹھالی۔ اس میں تھیں سی دی دیکھنے
 لگا۔ ”اوہ مائی گاڈ۔“ وہ ایک خاص ادا سے بولا۔ ”آپ تو
 بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔“

”جی سر۔ اس کے باوجود آج تک ڈھنگ کی جاب
 نہیں ملی ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں ابل جائے گی۔“ اس نے کہا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ فون
 کی کھنٹی بول اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر گفتگو شروع کر دی۔
 اس دوران میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں ایک خاص قسم
 کی نسوانیت تھی۔ ایسی نسوانیت جس میں مردانہ پن بھی شامل
 ہو۔ یا ایسا زانہ پن جس میں کسی حد تک مردانہ پن کا شہہ ہو۔
 وہ لچک لچک کرتی نظر آ رہی تھی۔ ایسا ایسی وقت ہوتا ہے جب
 انسان دونوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔

بعد میں میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ وہ فون پر
 باتیں کرتا رہا اور میں اس کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ وہ ایک کمال
 کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے کمرے کو بھی خوب صورت پینٹنگ
 سے سجا رکھا تھا جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک باذوق
 انسان ہے۔

فون پر باتیں ختم کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔
 ”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کمرے میں لگی تصویروں کو بہت
 غور سے دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں سر، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ تصویریں ریپلر کا
 ہیں۔ اس کے باوجود جس نے بھی بنائی ہیں، بہت اچھی بنائی

”ہاں بالکل اکیلا۔ کیونکہ میرا کوئی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟ کوئی تو ہوگا؟“

”نہیں کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ کوئی نہیں۔ صرف میں ہوں اور میری چھوٹی بہن جو میرا سب کچھ ہیں۔“

”وہ چھوٹی بھی ساتھ نہیں رہتیں؟“

وہ ہنس پڑا۔ ”کیا بات ہے۔ کیا میرا اثر دہلیے آئے ہو؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔ روشن بات یہ ہے کہ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کیا جانا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ تمہارا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“

”اگر جانا ہی چاہتے ہو تو اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ نہیں، پہلے وہ ڈش کھا لو جو میں نے تیار کی ہے۔ اس کے بعد اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ اس نے کہا۔

وہ چکن سے کباب اور چائے لے کر آگیا۔ وہ خاص ڈش شامی کباب ہی تھے اور واقعی بہت لذیذ تھے۔ اتنے شاندار شامی کباب میں نے پہلے کبھی نہیں کھائے ہوں گے۔ اس سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا۔ ”اب تم آرام سے بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اندر والے کمرے میں چلا گیا۔ اس دوران میں اس کی بنائی پینٹنگز دیکھتا رہا۔ اس نے کمال کر دیا تھا۔ میں بھی چونکہ اس فن سے کسی حد تک واقف ہوں اسی لیے مجھے باریکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک لڑکی باہر آئی۔ میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے قریب آئی اور اس نے اچانک میرے گلے میں اپنی ہاتھیں ڈال دیں۔ میں بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنس پڑی۔ خدا کی پناہ یہ تو وہی تھاروش۔

”یہی تو میرا اصل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم میرے بارے میں جانا چاہتے تھے نا۔ تو جان لو کہ میری اصلیت کیا ہے۔ میں کون ہوں۔“

”روشن اتم..... تم لڑکی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں میں لڑکی بھی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ رپلیکا ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ اور جنکل بھی تو ہو سکتی ہیں۔“

”نوسر ایہ اصلی ہو نہیں سکتیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھی پینٹنگ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں مشہور لوگوں کے کاموں سے واقف ہوں۔“

”چلیں مان لیا کہ یہ رپلیکا ہیں۔“ اس نے کہا۔

”آپ یہ بتائیں یہ ہیں کیسی؟“

”بہت زبردست۔“ میں نے تعریف کی۔ ”جس نے

بھی بنائی ہیں، حق ادا کر دیا ہے۔“

”مسٹر اشرف! یہ سب میری پینٹنگز ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”بہت زبردست.....“ میں نے تعریف کی۔ ”کمال کر دیا ہے آپ نے.....“

تو یہ کئی میری اس سے دوستی کی ابتدا۔ حالانکہ میں نے اس کے دفتر میں صرف ایک ہفتے جاب کی تھی۔ کیونکہ مجھے ایک اور جگہ جاب مل گئی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا۔ ہماری روزانہ ہی باتیں ہوا کرتیں۔ وہ زیادہ تر میرے بارے میں سوالات کیا کرتا جبکہ مجھے اس کے بارے میں بہت کم جاننے کا موقع ملتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم آج میرے فلیٹ آ جاؤ۔ میں نے ایک خاص ڈش بنائی ہے۔“

”مجھے تو تمہارا فلیٹ نہیں معلوم۔“

اس نے اپنا ایڈریس سمجھا دیا۔

میں اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اس کا فلیٹ ایک شاندار پینٹنگ کی طرح تھا۔ بہت خوب صورتی سے سجا ہوا۔ فرنیچر بھی قیمتی تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہر چیز میں ایک خاص قسم کا ذوق نمایاں ہو رہا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز تھیں جو یقیناً اسی کی بنائی ہوئی ہوں گی۔

جب تک میں اس کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا وہ میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

”کیوں، کیسا لگا میرا ڈرائنگ روم؟“

”بہت خوب صورت۔“ میں نے تعریف کی۔

”یہ پینٹنگز بھی میری بنائی ہوئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ہاں مجھے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا پھر

پوچھا۔ ”کیا تم اس فلیٹ میں اکیلے رہتے ہو؟“

”تو پھر؟“

”تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کون ہو سکتی ہوں؟“ اس بار اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ ”اشعر! میں خدا کی وہ مخلوق ہوں جس کو پیدا کرنے کے بعد ایک نام دیا گیا ہے۔ میں دونوں کے درمیان ہوں۔ یہ تم جو سڑکوں اور گلیوں میں ہم جیسوں کو ہونٹوں پر لپ اسنگ لگائے اور دھول بجاتے، ہجیک مانگتے دیکھا کرتے ہو۔ میں ان ہی میں سے ایک ہوں۔ وہی میری برادری ہے۔ وہی میرا خاندان ہے۔ وہی میرے رشتے دار ہیں۔“

میں حیرت اور دکھ سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کس بلا کا دکھ تھا اس کی باتوں میں۔ کیا کرب تھا۔ ”روشن! یہ تم نے جو تعلیم حاصل کی ہے اور اتنے اچھے عہدے پر ہو۔ یہ سب کیسے ہوا؟“

”یہ سب میری پھوپھی کی وجہ سے ہو سکا ہے۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آج اس مقام پر ہوں۔“ ”روشن! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے ماں باپ کون ہیں؟“

”ہاں جانتا ہوں لیکن وہ اب میرے کوئی نہیں ہیں۔“ اس نے بابت سے کہا۔

”روشن! میں تو چکرا کر رہ گیا ہوں لیکن میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت مجھے کچھ گڑبڑ کا خیال آیا تھا۔ تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو نیچرل نہیں لگ رہی تھی۔ خاص طور پر تمہارے باتیں کرنے کا انداز۔ یہ سب مجھے کچھ سمجھا رہا تھا لیکن میں کھل کر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔“

”ہاں مجھے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید تمہیں مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات بتاؤ، کیا تمہارے دفتر والے اس بات کو جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں سب جانتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میرا عہدہ اور میری صلاحیتیں ایسی ہیں کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ میں نے اپنے کام سے ثابت کر دیا ہے کہ ہزار مردوں پر بھاری ہوں۔ اس فرم کے ڈائریکٹر میرا خیال رکھتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔“

”روشن! تم تو ایک باکمال آدمی ثابت ہوئے ہو، ورنہ عام طور پر، معاف کرنا میرا مطلب ہے کہ عام طور پر.....“ ”ہم جیسے لوگ گلیوں اور سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔“ اس نے میرا جملہ مکمل کر دیا۔

”ہاں، میں یہی کہنا چاہتا تھا۔“

”میں نے اپنی پھوپھی کے بارے میں جو بتایا ہے، یہ سب انہی کی مہربانی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہاں، تم سے ایک کام ہے۔“

”مفروضہ بتاؤ، مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہوگی۔“ ”دیکھو، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری پھوپھی میرے ساتھ رہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ ہمیشہ انکار کر دیتی ہیں۔ کیا تم میرے لیے انہیں اس بات پر راضی کر سکتے ہو؟“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک خوش قسمت عورت ہیں جنہیں تم جیسا بھتیجا ملا ہے۔“ ”تو پھر کل دفتر آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”ہم کل وہیں سے چلیں گے۔“

میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ مگر سوچیں پچھانیں چھوڑ رہی تھیں۔ حیرت انگیز صورت حال تھی۔ کیا خوب صورت فوجی جوان تھا (تھی) کسی زندگی گزارا ہوگی اس نے۔ اعلیٰ تعلیم کیسے حاصل کی ہوگی۔ اتنے اچھے عہدے پر کس طرح پہنچا ہوگا۔ ابھی اس کی زندگی کے بہت سے صفحات میری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ بہر حال اس کی پھوپھی سے بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

میں دوسری شام اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اس وقت کسی میٹنگ میں مصروف تھا۔ میں اس کے کمرے میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ اب سب مجھے پہچاننے لگے تھے کہ میں روشن صاحب کا دوست ہوں۔ چیرا سی نے جائے لا کر رکھ دی تھی۔ میں نے ابھی چائے ختم ہی کی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ آج بھی میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس پر سرخ ٹائی جو اس کے گورے رنگ پر بہت فوجی رہی تھی۔

”ہائے، ہائے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو، نظر نہیں لگا دینا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نظر تو لگ ہی چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چلو، میں نے اپنا کام غماز دیا ہے۔“ اس نے کہا۔

میں اس کے ساتھ اس کے دفتر سے نکل کر کار پارکنگ کی طرف آ گیا۔ اس کے پاس گاڑی بھی بہت شاندار تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کیا کرتا تھا۔ اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی اصل شخصیت کیا ہے۔

”یار! جب سے تم ملے ہو۔ میری زندگی میں تبدیلی آگئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کون سی تبدیلی؟“

”کیا بتاؤں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں جو کچھ بھی ہوں، اس پر مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے کیونکہ اس کی مرضی۔ وہ جس حال میں رکھے۔ تبدیلی یہ آئی ہے کہ میں اب زندگی میں دوپہی لینے لگا ہوں۔ ورنہ ایک روٹین لائف تھی۔ دفتر، فلیٹ، پینٹنگز۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں بھی انسان ہی ہوں۔ کوئی اور نہیں ہوں۔“

اس کی ڈرائیونگ بھی بہت اچھی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہم بہت دور نکل آئے تھے اور مضافات کی طرف جارہے تھے۔

”کیا تمہاری پھولی دور رہتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں بھائی دور ہی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آجائیں۔ مجھے ہفتے میں دو تین بار ان کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ان کی عمر بھی اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ دیکھ بھال تو کرنی پڑتی ہے۔ تا۔“

اب چھوٹے چھوٹے خستہ حال مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے چھوٹے گوارٹر نما مکانات بنے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ کچے مکانات تھے۔ ایک چھوٹی سی گلی تھی۔ اس میں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے گاڑی گلی کے باہر روک دی۔

”یار یہاں سے پیدل چلنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”بس تھوڑا سا فاصلہ ہے۔“
”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں گاڑی سے باہر آگئے اور اس وقت کچھ لوگ تالیاں بجاتے ہوئے گاڑی کے پاس آگئے۔

وہ سب تیسری دنیا کے تھے۔ یعنی خسرے۔ تالیاں بجاتے اور شور مچاتے ہوئے انہوں نے روشن کو گھیر لیا تھا۔ روشن بھی ان سے بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا شاید یہ بستی ہی ان لوگوں کی تھی۔

میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کہاں روشن اور کہاں یہ لوگ۔ روشن نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ گھجڑوں کی وہ ٹیم بھی ہمارے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ ایسا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ راستے میں بھی ایسے لوگ ملتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ روشن کو سب جانتے تھے۔

”کیوں بھائی حیران ہو رہے ہو؟“ روشن نے پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہی میری برادری ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہی میرا خاندان ہے۔ اب چلو، سامنے ہی پھولی کا گھر ہے۔“

میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اس کی پھولی اس محلے میں کیا کر رہی ہے لیکن خاموش رہا۔ جو کچھ بھی تھا، سامنے آنے ہی والا تھا۔ ہم ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ یہ مکان بھی دوسرے مکانات کی طرح تھا۔ اس وقت اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”آ جاؤ۔“ روشن نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے اپنے ساتھ ہی اندر لے آیا۔

سامنے ہی ایک تخت تھا۔ اس پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی ان ہی میں سے تھا۔ ہم جب فریپ پہنچے تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ یا ہو چکی تھی۔ اس کے جسم پر ایک زانہ لپاس تھا۔

ایک گھجڑا اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ دوسرا اسی صحن میں ایک طرف کھڑا تھا۔ روشن چاکر اس بوڑھے سے لپٹ گیا۔ ”پھولی میں آگئی۔“ اس نے کہا۔

”اری، آج کیسے آگئی، آج تو تیرا دن نہیں ہے۔“
”محبت کا کوئی دن نہیں ہوتا پھولی! آج تمہاری یاد آئی تو میں چلی آئی اور ہاں پھولی یہ میرے دوست ہیں اشعر۔“

”جم جم جیتے رہیں۔“ اس نے دعادی۔
”پھولی باہر کی دنیا میں، میں نے صرف ان ہی کو اپنا دوست بنایا ہے۔“ روشن نے کہا۔

”مولا جوڑی کو سلامت رکھے۔“ اس نے پھر دعا دی۔

”مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں ان ہی جیسے بہت سے آگئے۔“

نیا ماحول، نئی طرح کے لوگ۔ روشن سب سے مکمل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ سب اس سے مذاق کر رہے تھے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا طرح دار نوجوان اور پڑھا لکھا۔ ایک بڑی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز بھی ہو سکتا ہے۔ وہ جب باتیں کر رہا تھا تو اس کا وہی انداز تھا جو ان لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ چپک چپ کرتا لیاں بجا کر۔ وہی زانہ پن۔ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی کوئی اور شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔

باقاعدہ تربیت لے رکھی ہے۔ اس کی تصدیق اس بوڑھے نے کر دی۔

”میرے بچے نے چار سال گانا سیکھا ہے۔ استاد کو میں ہی لانی تھی۔“

روشن نے کچھ دیر گانا سنایا۔ اس کے بعد اس نے بوڑھے سے کہا۔ ”اچھا پھولی اب اجازت دو۔“

”ارے ہاں، میں تہیں ایک بات بتانی تو بھول ہی گئی۔“ اس نے کہا۔ ”تیرا باپ آیا تھا۔“

”کون باپ؟“

”اری وہی، جس کے یہاں تو نے جنم لیا تھا جو تیرا اصل باپ ہے۔“

”نہیں پھولی، میرا اب کسی سے رشتہ نہیں رہا۔ میرا سارا رشتہ صرف تم سے ہے۔ تم ہی میرے باپ ہو۔ سب کچھ تم ہی ہو۔“

”پھر مگر بیٹا! ایک بار اس سے جا کر مل تو لے۔ تیرے دونوں بھائی تو نا کارہ نکلے ہیں۔ باپ کی پروا نہیں کرتے۔“

”تو مجھے بھی کوئی پروا نہیں ہے۔“ روشن نے کہا۔ ”نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔“

”پھولی! اس باپ نے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔ میں پیدا ہوئی تو تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں اس کی سگی اولاد ہوں۔ اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں اور تمہارے دل میں میرے لیے ہمدردی نہیں ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا۔ میں بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تا۔ خود سوچو۔ اگر میں ایسی پیدا ہوئی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کیا کیا تھا؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ مرد ہونا کیا ہوتا ہے اور عورت کس کو کہتے ہیں۔ مجھ سے پہلے دونوں بھائیوں کو تو ماں اور باپ نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا لیکن مجھے اس طرح الگ کر دیا جیسے گھر میں سانپ پیدا ہو گیا ہو۔“

”میرے بیٹے! اس دنیا کی یہی ریت ہے۔ اس میں تیرے باپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”رہنے دو پھولی، اگر مجھے تم نہیں ملتیں تو میرا کیا حال ہوتا۔ تم نے مجھے اسکول بھجوا یا۔ اسکول والوں سے میرے داخلے کے لیے لڑائی کی۔ پھر مجھے کالج بھیجا۔ اس ماحول میں رکھنے کے باوجود تم نے مجھے اس ماحول سے بچائے رکھا۔ میرا اتنا خیال کیا کہ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں اپنے باپ کے گھر نہیں رہی۔ تم نے مجھے اتنی اعلیٰ تعلیم دلوا دی اور مجھے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا حوصلہ دیا۔ کون

کچھ دیر میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں آگئیں۔ جب ان سے فارغ ہوئے تو روشن نے اشارہ کیا کہ میں جس کام کے لیے آیا ہوں، وہ کروں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنا موڈ بنا کر بولنا شروع کر دیا۔ ”دیکھیں، میں آپ کے پاس ایک خاص کام سے آیا ہوں۔“

”ہاں بیٹا کہو۔“ اس بوڑھے کے لہجے میں بہت شائستگی تھی۔

”یہ روشن آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کو آپ کی ضرورت ہے۔ اس کا فلیٹ بہت بڑا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ جا کر رہیں۔“

”بیٹا! یہ تو پاگل ہے۔ خود سوچو۔ اس نے بہت مشکلوں اور بڑی قربانیوں کے بعد تمہاری دنیا میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ میں چلی گئی تو ساری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔“

اس موقع پر روشن ہنسنے لگا۔ ”بھڑ میں جائے ایسی عزت۔ پھولی مجھے تو آپ کی ضرورت ہے۔ کسی کی پروا نہیں مجھے۔“

”نہیں میری جان نہیں۔ مولا سائیں نے تم پر کرم کیا ہے۔ اس کرم کو سنجال کر رکھو۔ کوئی ایسی بات نہ کرو۔ جس سے تمہاری بنی بنا کی عزت پر حرف آجائے۔ میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں۔ ایک بات اور..... تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جیتے جی ان لوگوں کو چھوڑ سکتا ہوں، نہیں بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ میری زندگی ہیں۔ میں اگر چھوڑ گئی تو سب کی سب بے آسرا ہو جائیں گی۔ بلبلاتی پھریں گی۔ میں ان کو کیسے چھوڑ دوں۔ پورے پچاس سال ہو گئے ہیں مجھے۔ ان کی پچاس سال کی محبت ایک دو دن کے لیے چھوڑ دینا میرے بس میں نہیں ہے بیٹا..... میں ایک دو دن اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں اب بہت بیمار رہنے لگی ہوں۔ نہ جانے کب مولا سائیں کا بلاوا آجائے۔ بیٹا! میرا جنازہ یہی لوگ اٹھائیں تو اچھا ہوگا۔“

روشن رونے لگا تھا۔ بوڑھے نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ دونوں دیر تک روتے رہے تھے۔ پھر جب چپ ہوئے تو ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا دل بھلانے کو ایک تجھو ایک ڈھولک اٹھایا تھا۔

دوسرا ایک ہارمونیم لے آیا۔ وہ واقعی فنکار لوگ تھے۔ کمال کی ڈھولک بج رہی تھی اور کمال کا ہارمونیم تھا۔ پھر سب کی فرمائش پر خود روشن نے گانا شروع کر دیا۔ اس کے اس روپ نے بھی میرے حیران کر دیا تھا۔ اس نے بے پناہ خوب صورت گلا پایا تھا۔ لگتا تھا اس نے

ایسا کرتا ہے۔ میرے ہر شوق کو پورا کیا۔ میں نے گانا سیکھنا چاہا تم نے استاد کا بندوبست کر دیا۔ میں نے تصویریں بنانی چاہیں تو تم مجھے رنگ لاتے رہے۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے تم نے مجھے آرٹس کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ پورا خرچ برداشت کیا۔ کون کرتا ایسا؟ کیا وہ باپ جس نے مجھے اس وقت تمہاری جھولی میں ڈالا تھا جب میں صرف ایک سال کی تھی۔“

میں گم سا ہو کر یہ سب سن رہا تھا۔ روشن کی ساری کہانی سامنے آگئی تھی۔ میں اس بوڑھے کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا جس نے ایسی قربانی دی تھی۔ وہ معمولی سا انسان اچانک بہت بڑا ہو گیا تھا۔

”اشعر.....“ روشن نے میری طرف دیکھا۔ ”اب تو تم نے میرے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔“

”ہاں، سب معلوم ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔
”خود سوچو، کیا میں ایسے باپ کی طرف جاسکتی ہوں؟“

”ایک بات بتاؤ، تمہارے باپ کو کیسے معلوم کہ تم یہاں ہو اور ایسے ماحول میں پرورش پا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی ان ہی کی مہربانی ہے۔“ روشن نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے بیٹا! کیا کرتا میں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں روشن کو اپنے ساتھ لے تو آیا تھا لیکن میرا دل نہیں مانا۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے ماں اور باپ کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ اسی لیے کبھی کبھی ان کو دکھانے کے لیے روشن کو ان کے پاس لے جاتا تھا۔ اس طرح ان کو میرا ٹھکانا معلوم ہو گیا تھا۔“

”پھولی ذرا یہ بھی تو بتا دو کہ جب تم لے جاتے تھے تو ان کا کیارویہ ہوتا تھا؟“ روشن نے کہا۔

”ہاں بیٹا! ان کو بہت برا لگتا تھا۔ وہ کہتے کہ اس کو ہمارے یہاں نہ لایا کرو۔ ہماری عزت خراب ہوتی ہے۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اس کے دو بیٹے عمل مرد ہیں، وہ ان کا خیال رکھیں گے۔ ایسی ادھوری اولاد انہیں نہیں چاہیے پھر میں نے بھی ان کے پاس لے جانا چھوڑ دیا۔“

”واہ پھولی۔ اب تم ہی ان کے پاس جانے کو کہہ رہے ہو؟“

”ارے بیٹا! وہ تو اس کی حالت دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔“
”آئندہ ایسا مت کہنا ورنہ میں یہاں بھی آنا چھوڑ

دوں گی۔“

”اچھا بابا، اب نہیں کہوں گی۔“ بوڑھے نے کہا۔
ہم اس مکان سے باہر آ گئے۔ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے روشن نے مجھ سے کہا۔ ”اشعر! اب تم کو معلوم ہو گیا نا کہ میں کون ہوں اور میرا ایک گراؤ نہ کیا ہے؟“

”ہاں معلوم ہو گیا۔“ میں نے کہا۔
”اور اب مجھے کوئی نصیحت مت کرنا۔“
”نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ تم جو بہتر سمجھتے ہو، وہ کر رہے ہو۔“

ہم گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ اس نے مجھے میرے محلے میں ڈراپ کر دیا تھا۔

اس رات میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا زندگی تھی اس کی۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس کو نہ جانے ایسا کیوں بنایا گیا تھا۔ خدا کی مصلحتیں وہی سمجھ سکتا ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک وفادار انسان ہے۔ ورنہ کیا ضرورت تھی کہ وہ دوڑا دوڑا اس بوڑھے کے پاس جاتا۔ اس نے معاشرے میں جو پوزیشن حاصل کر لی تھی، وہ اس کے لیے بہت تھی۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ اچھے اچھے مردوں سے زیادہ کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔

پھر کئی دنوں تک اس کے پاس جانا نہیں ہوا۔
ایک دن اس کا فون آگیا..... ”اشعر شام کو میرے پاس آ جانا۔ تم سے ایک ضروری کام ہے۔ آسکتے ہونا؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں نہیں تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔“ میں نے کہا۔
”خوش رہو میری جان۔ اسی بات پر تو میں مرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

دوسری شام جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ عورتوں والے لباس میں تھا۔ ”جانتے ہو، میں یہ کیوں پہنتی ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ تم ہی بتاؤ۔“
”اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے فطرت ہی ایسی دی گئی ہے۔ ہم میں زنانہ پن زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ دن بھر دفتر میں اپنے دل پر جبر کیے بیٹھی رہتی ہوں۔ اسی لیے تمہارے سامنے اس طبع میں آ جاتی ہوں۔ کیونکہ تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور تم سے کوئی تنجک محسوس نہیں ہوتی۔“

”مہربانی ہے تمہاری۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ اگر تم

لڑکی ہوتے تو میں تم سے شادی کر لیتا۔ کیونکہ اس روپ میں تم بلا کے خوب صورت لگتے ہو۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر ذرا سی دیر کے لیے اداسی کے رنگ پھیل گئے تھے۔

آخر وہ بھی ایک انسان بنی تو تھا۔ اس کے بھی جذبات ہوں گے۔ اس کی اپنی سوچ ہوگی۔ اس نے بھی زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے ہوں گے۔ اور اب معاشرے کا ایک ایسا فرد تھا کہ جس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی تعلیم نے اس کو باوقار کر دیا تھا۔ ورنہ شاید اس کے ساتھ اور بھی زیادہ برا سلوک ہوتا کیونکہ وہ بہت خوب صورت بھی تھا۔

”اشعرا! اس نے میری طرف دیکھا۔“ جانتے ہو، میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے؟“

”تمہیں تم بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے ساتھ چلنا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کہاں چلنا ہے؟“

”اپنے باپ کے محلے میں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ مت سمجھ لیتا کہ میں موم ہو کر جا رہا ہوں یا میرے دل میں ان کی محبت جاگ اٹھی ہے، نہیں۔ میں ان کو صرف یہ احساس دلانے جا رہا ہوں کہ کھونا سکھ بھی کبھی اصلی سکے سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔“

”ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں ہے جس طرح تم قیمتی ہو گئے ہو۔“

”اچھا اچھا، بس اب چلو۔“

ہم ایک پرانے محلے میں پہنچ گئے۔ اس محلے کا سب سے بڑا مکان اس کے باپ ہی کا تھا۔ ”اشعرا! یہی وہ مکان ہے جس کے در و دیوار میری پیدائش کے بعد لرز کر رہ گئے تھے۔ اس مکان میں رہنے والوں کی عزتیں خاک میں مل گئی تھیں جس کے کمینوں کی طرف برادری اور خاندان والوں کی نظر یہ لگا ہیں اٹھنے لگی تھیں۔“ وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔

لوگ اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے اس کو کون پہچانتا ہوگا۔ لوگ اس کی نئی گاڑی اور اس کی شخصیت سے بھی مرعوب معلوم ہوتے تھے۔ اس نے گاڑی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔

”تمہیں اپنا مکان یاد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں پھوپھی کے ساتھ ایک دو بار آچکا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب وہ گھر سے باہر ہوتا اور مردانہ روپ میں ہوتا تو اس وقت وہ مذکر کا صیغہ استعمال

کرتا تھا۔ جیسے میں جا رہا ہوں، وغیرہ۔ اور اپنے گھر میں میرے سامنے مونث کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ نہ جانے اس بے چارے نے اس کے لیے کتنی پریکٹس کی ہوگی۔ ہم اس مکان کے دروازے پر آگئے جو اس کے باپ کا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

ایک پڑوسی برابر سے گزرنے لگا تو اس نے روک کر پوچھا۔ ”جناب! اس گھر میں فرقان صاحب رہتے ہیں نا؟“ ”رہتے تھے۔“ پڑوسی نے بتایا۔ ”پچھلے پختے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے۔ بے چارے خیرانی اسپتال میں رکڑتے ہوئے مر گئے لیکن ان کی اولادوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ باپ کی خیریت ہی معلوم کر لیں۔ قیامت کی نشانی ہے۔ ویسے آپ لوگ کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ رشتے میں میرے ماموں لگتے تھے۔“ روشن نے کہا۔ ”کتنی اولادیں تھیں ان کی؟“

”تین بیٹے تھے بھائی۔ لیکن ایک ایک سال بعد ہی انتقال کر گیا تھا۔“

”اوہ۔“ روشن نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے روشن کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ اس کے باپ نے جیتے جی اس کو مردہ قرار دے دیا تھا۔

”چلو اشعرا۔“ روشن نے مجھ سے کہا۔

اور ہم واپس آگئے۔

کچھ دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ ”اشعرا! مجھے تمہیں دو نیوز دیں ہیں۔“

”ہاں بتاؤ۔“

”پہلی نیوز تو یہ ہے کہ پھوپھی کا انتقال ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ ”اور دوسری خبر یہ ہے کہ میں اب تم سے شاید کبھی نہ مل سکوں۔ ہاں اگر تمہارا دل چاہے تو مجھے فون کر کے اسی بستی میں آ جانا جہاں پھوپھی رہتی تھی۔ میں پھوپھی کی گدی سنبالنے جا رہی ہوں، خدا حافظ۔“ فون بند ہو گیا۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں رو رہا تھا۔ اب اس واقعے کو دس برس ہو گئے ہیں۔ میں اس بستی کی طرف نہیں گیا۔ اس کو کسی اور روپ میں دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

☆☆☆



حماقت

مدیر محترم
سلام شوق

میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اپنی ایک بڑی حماقت کو قارئین کے سامنے لے آؤں تاکہ وہ لڑکیاں جو بڑے بڑے خواب دیکھتی ہیں مجھ جیسی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ گو کہ اس کہانی کا انجام پڑھ کر آپ بھی کہیں گے کہ میں احمق ترین لڑکی ہوں لیکن ایسا نہیں ہے، اسی کا جواب میری داستان ہے۔

سائبرہ
(فیصل آباد)

میں ایک خوب صورت لڑکی ہوں۔
خود اپنے لیے یہ کہتا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے لیکن
آئینہ اس کی گواہی دیتا تھا کہ تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہاری
ادائیں دل کش ہیں اور تمہارے انداز جان لیوا ہیں۔

وہ کم بخت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔
میں بہت جل بھن کر اپنی کہانی سنارہی ہوں۔ یہ کہانی
میری حماقت کی ہے۔ میری ذلت کی ہے اور میری بربادی کی
ہے۔

کالج میں یہ حال تھا کہ لڑکیاں میرے ارد گرد رہا کرتیں بلکہ یہاں تک ہوتا کہ میری وجہ سے لڑکیوں میں آپس میں جھگڑے ہو جاتے تھے۔

ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ میں اس کی دوست بن جاؤں۔ اس کے قریب رہوں۔ کسی اور کو اپنے پاس نہ آنے دوں۔ اس لیے ان میں ایک طرح کی رقابت ہو جاتی۔ اور مجھے یہ سب دیکھ دیکھ کر مزہ آیا کرتا۔ اپنے آپ پر ناز ہونے لگتا۔ لڑکیاں ہی نہیں بلکہ بچہ زبھی میری شخصیت اور میرے حسن سے متاثر تھیں۔ ان کی بھی یہی خواہش ہوتی کہ وہ میری نفرت بن جاتیں۔

اور سب سے بڑھ کر عادل، ایک سر پرانہ جوان جو اس کالج میں تھا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ عادل خود بھی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس پر فدا ہو سکتی تھیں۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو میرے بلائے پر میرے پاس اسپتال آئی تھی۔ وہ میرے ہی محلے کی ایک لڑکی تھی۔ رضوانہ اس نے لکھنے پڑھنے کا شوق اپنا رکھا تھا۔ کہانیاں لکھا کرتی اس کی کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں۔

میرے پاس اس کا فون نمبر تو نہیں تھا لیکن اس کے ابو کا تھا۔ اس کے ابو میرے ابو کے دوست ہوا کرتے تھے۔ میں نے فون پر انہیں بتایا کہ میں فلاں اسپتال میں ہوں۔ چلیز آپ رضوانہ کو میرے پاس بھیج دیں۔ مجھے اس سے کام ہے۔ رضوانہ اس دن میرے پاس آ گئی۔ وہ میرا حال دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ”ارے کیا ہوا باجی آپ کو آپ تو بالکل ہی ڈھلک گئی ہیں۔“

”رضوانہ میں بہت بیمار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”امید نہیں ہے کہ میں زندہ رہ سکوں۔“

”ارے نہیں باجی۔ ایسا نہیں کہتے۔ خدا آپ کو زندگی دے۔“

”رضوانہ میں نے جنہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم میری کہانی لکھو۔“ میں نے کہا۔ ”اور اسے شائع بھی کروا دیتا۔“

”ہاں وہ تو ہو جائے گی۔ لیکن آپ صحت یاب تو ہو جائیں۔“

”نہیں رضوانہ اتنا وقت نہیں ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلیز کم کم ڈائری اور قلم لیتی آنا۔ میں بولتی جاؤں گی تم لکھتی جانا۔“

”باجی میرے پاس ایک پروفیشنل ٹیپ ریکارڈر ہے

چھوٹا سا، وہ لیتی آؤں گی۔ آپ بولتی رہے گا وہ ریکارڈر ہوتا رہے گا۔ پھر میں اس کو طینان سے لکھ لوں گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کل ضرور آ جانا۔“

اس دوران وہ کمرے میں داخل ہو گیا اور میری اور رضوانہ کی گفتگو ادھوری رہ گئی۔ وہ کم بخت رضوانہ کو بھی گہری نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے رضوانہ کو اشارہ کیا تو وہ کمرے سے چلی گئی۔

رضوانہ دوسری شام کو وعدے کے مطابق آ گئی تھی۔

اس وقت وہ کمرے میں ہی موجود تھا۔ رضوانہ نے اس کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر ہم سے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا۔

رضوانہ نے اپنے بیک سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر بستر پر رکھ دیا۔ وہ ایک طاقت ور قسم کا ٹیپ ریکارڈر تھا اور اتنا چھوٹا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنی کہانی پھر سے شروع کی۔

میں کل عادل تک پہنچ چکی تھی کہ وہ میرے کالج میں میرے ساتھ ہوا کرتا تھا اور وہ خود بھی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس پر فدا ہوا کرتیں۔

اتنی دیر میں وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا۔ ”سارہ! مجھے اس وقت کسی مینٹگ میں جانا ہے۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ جنہیں کوئی براہم تو نہیں ہوگی؟“

”نہیں کوئی براہم نہیں ہوگی۔ آپ جائیں۔“

وہ چلا گیا اب ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ میں اتنی دیر میں اپنی کہانی مکمل کر سکتی تھی۔

”ہاں باجی آپ عادل کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں۔“ رضوانہ نے پوچھا۔

”میں یہ بتا رہی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک خوب صورت اور طرح دار نو جوان تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے پاس صرف خواب تھے۔ آنے والے اچھے دنوں کے خواب۔ اس کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور رضوانہ تمہارا حلق تو خود میرے محلے سے ہے۔ تم کو تو میرے گھر کے حالات معلوم ہیں ناں۔“

”ہاں باجی جانتی ہوں میں۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”آپ لوگوں نے بہت پریشانی کی زندگی گزاری ہے۔“

”بہت زیادہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”رضوان تم ان پریشانیوں کا اعزاء بھی نہیں کر سکتیں۔ کبھی کبھی تو ہمارے یہاں کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تم سے کچھ چمپاؤں گی نہیں کیونکہ تم میری کہانی لکھ رہی ہو۔“

”جی ہاں آپ بے جھجک ہو کر بولتی جائیں۔“

”تو جس عادل کے ساتھ ہمیں پراہلم تھی، وہ غریب تھا اور میں ایک غربت سے نکل کر دوسری غربت میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں یہ بیچ بتا دوں کہ میں شروع سے اسی حراج کی گئی تھی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ میرے پاس ڈھیروں پیسے ہوں، بینک بینکس ہو، اپنی گاڑی ہو، اپنا مکان ہو، یہ کیا بات ہوئی کہ ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترستے رہو اور اس طرح سکتے ہوئے مر جاؤ۔“

عادل کہا کرتا تھا۔ ”سارہ دیکھ لینا ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر لوں گا۔“

”چلو مان لیا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”اس کے بعد مجھے اچھی سی نوکری مل جائے گی۔“ اس

نے کہا۔ ”اور ہمارے حالات بدل جائیں گے۔“

”میرے بھولے بادشاہ، حالات بدلیں گے نہیں بلکہ گزراے لائق ہو جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسے ہمارے حالات آج کل بھی گزراے لائق ہی ہیں لیکن یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔“

”تو پھر تم کیا چاہتی ہو۔“

”ڈھیروں دولت، ایک شاندار زندگی، تم کو اگر اچھی چاہ بھی ملی تو کیا ہوگا، کیا سیلری ہوگی، زیادہ سے زیادہ بچیں تیں ہزار اور اتنے میں شاندار زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی۔“

”تو پھر کیا ارادے ہیں تمہارے۔“

”پلاننگ تو تمہیں کرنی ہے۔ کوئی ایسا کام کہ میرے خواب پورے ہو جائیں۔ میں سسکتی ہوئی اور محتاج زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔“

”چلو باا تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔“

”لیکن وہ کچھ نہیں کر پایا۔ جب کہ میرے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہمیں لاکھ بھی کم تھے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو ہاں۔“ رضوان حیران رہ گئی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میرے خواب ایسے ہی تھے۔ میرے گھر والے بھی میری اس بات سے بہت پریشان رہا کرتے۔ خدا جانے اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ یہ اٹنی سیدھی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس کو اعزاء ہی نہیں ہے کہ جس کے

پاس قناعت کی دولت ہو اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔“

میری اماں کہا کرتیں۔

”نہیں اماں مجھے ایسی قناعت والی زندگی نہیں چاہیے۔“

میں نے تمہارا حال دیکھا ہے۔ بلکہ دیکھ رہی ہوں۔ چھوٹی

چھوٹی باتوں کے لیے ترستی رہتی ہوں۔ کیا ہے تمہارے پاس۔

ڈھنگ کے جوڑے تک تو نہیں ہیں۔“

اماں ایسے موقعوں پر کچھ بولنا چاہتیں لیکن خاموش

رہتیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سچ

ہے۔ ہماری زندگی کچھ ایسی ہی ہے۔

اس دوران عادل کو ایک جاب مل گئی۔

لیکن کیا تھا صرف پندرہ ہزار روپے۔ اس دن وہ بہت

خوش تھا۔ اس نے فون کر کے مجھے ایک آتش کریم پارلر پر بلا لیا

تھا۔

”سارہ! مبارک ہو تمہیں کہ مجھے ایک اچھی جاب مل

گئی ہے اور اس میں آگے جا کر ترقی کے بہت چانسز ہیں۔“

”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ

تمہارے لیے مبارک ہو۔ میرے لیے نہیں۔“

”وہ کیوں!“

”ذرا ایسی سیلری تو دیکھو پندرہ ہزار۔ کیا بنتا ہے اس میں

اگر ترقی بھی ہوئی تو کیا ہوگی۔ ایک سال بعد پانچ ہزار بڑھ

جائیں گے۔ پھر ایک اور سال کے بعد پانچ ہزار اور بڑھ

جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دس بارہ سال کے بعد تمہاری سیلری

پچاس ساٹھ تک پہنچ جائے لیکن اس سے بھی کیا ہوتا ہے اور

دوسری بات یہ کہ دس بارہ سال گزر چکے ہوں گے۔ میری

خواہشیں دم توڑ چکی ہوں گی۔“

”سارہ تم شاید پاگل ہو چکی ہو۔“ عادل ہنسا کر بولا۔

”پاگل نہیں ہوں عادل۔ امکانات کو سامنے رکھ کر

بات کر رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

عادل ناراض ہو کر چلا گیا تھا لیکن مجھے اس کے جانے

کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں

اسے کبھی نہیں جانے دیتی لیکن اس وقت تو بیسوں کے حصول کا

بھوت مجھ پر سوار تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے

ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ جب کسی منزل کی دھن سوار ہوتی ہے تو

وہ منزل قریب آ ہی جاتی ہے۔ میری منزل بھی اچانک میرے

سامنے آ گئی۔

کالج میں میری ایک دوست ہوا کرتی تھی۔ مہوش

اختر۔ اختر اس کے باپ کا نام تھا۔ وہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کی کئی ٹیکنریاں تھیں۔ مہوش کالج میں پرنسز کی طرح رہا کرتی۔ پھر ہوا کہ مہوش کی شادی ہو گئی۔

اس کا شو ہر کینیڈا میں کاروبار کرتا تھا۔ وہ بھی میسے والا آدمی تھا۔ اس دن اندازہ ہوا کہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں میسے کو پیسا ہی کھینچتا ہے۔

مہوش نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا۔ شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں شاندار شادی تھی۔ احساس ہو رہا تھا کہ دولت کی کیا طاقت ہوتی ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار مہوش کے باپ اختر کو دیکھا تھا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ بلکہ بہت بوڑھا۔ اس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ سخت بیمار بھی ہے۔ شوگر، کولیسٹرول، ایک بار پانی پاس بھی ہو چکا ہے۔ اس نے اس لیے مہوش کی شادی میں جلدی کی تھی کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔

مہوش نے جب اپنے باپ سے میرا تعارف کروایا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئی ہیں۔ اس کا اس انداز سے دیکھنا مجھے بڑا ہی کھٹکا تھا۔

اس شادی میں میری اور مہوش کی ایک مشترکہ دوست بھی تھی۔ انجیم، وہ ایک بولڈ قسم کی لڑکی تھی۔ جو محسوس کرتی وہ بول دیا کرتی۔ جتنی اس میں منافقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

کھانے کے دوران وہ مجھے اپنے ساتھ ایک طرف لے آئی۔ ”سائز اس بڈھے سے بچ کر رہنا ایک نمبر کا ٹھہرکی ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ وہ تمہیں کس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے کھا جائے گا۔“

”ہاں پارایہ تو میں نے بھی محسوس کر لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی گئی داستانیں مشہور ہیں۔“ مہوش کی امی کی موت کے بعد اس نے کئی کل کھلائے ہیں لیکن چونکہ بہت دولت مند ہے، اس لیے منہ بند کر دیا کرتا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔“

شادی کے بعد انجیم اپنے پروگرام کے مطابق باہر چلی گئی۔ میں شاید اس کے باپ کو بھول ہی چکی تھی کہ ایک دن اچانک میرے موبائل پر کسی کا فون آ گیا۔

یہ ایک نیا نمبر تھا۔ اس لیے میں نے ریسو نہیں کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اسی نمبر سے پھر کال آ گئی۔ اس بار میں نے فون سن لیا تھا۔

دوسری طرف جو آواز تھی اس کو میں فوری طور پر پہچان نہیں سکی تھی۔

”تم سائزہ بول رہی ہو ناں؟“ اس نے کہا۔

”جی ہاں میں سائزہ بول رہی ہوں اور آپ؟“

”میں اختر ہوں۔ تمہاری دوست مہوش کا فادر۔“ اس نے کہا۔

”میں نے تمہارا موبائل نمبر مہوش سے لیا تھا۔“

”جی انکل فرمائیں۔“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ”کیا تم میرے پاس آ سکتی ہو۔ مہوش نے تمہارے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔“

”اوہ۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے انکل میں آ جاؤں گی۔“

”تم ایسا کرنا اگر میرے گھر آنے میں کچھ الجھن ہو تو میرے دفتر آ جانا۔ میں ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔“

اس نے مجھے ایڈریس سمجھا دیا۔ دوسرے دن میں اس کے دفتر پہنچی۔ کیا شاندار دفتر تھا اور کیا شاندار بلڈنگ تھی۔ یہ پوری بلڈنگ اس کی تھی۔

اس نے بڑی کرم جوشی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا میں نے کل تم سے غلط بیانی کی تھی۔“

”میں نہیں سمجھی کسی غلط بیانی۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مہوش نے تمہارے لیے کچھ نہیں بھیجا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”البتہ اس نے فون پر مجھے ہدایت کی ہے کہ میں تمہیں مارکیٹ سے کچھ دلا دوں۔“

”کیا؟“ مجھے یہ سن کر کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ”آپ کیوں دلائیں گے؟“

”اس کی شادی کی خوشی میں۔“ اس نے کہا۔ ”پلیز میری بات مان لو ورنہ وہ میری جان کھا جائے گی کہ میں نے اس کی دوست کا خیال نہیں رکھا۔“

اس نے کچھ اس انداز میں بات کی کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑ گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مارکیٹ لے آیا اور تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اس نے کتنے کی شاٹنگ کرائی ہوگی۔

”چار پانچ ہزار کی تو ہوگی۔“ رضوانہ نے کہا۔

”نہیں، پورے پچاس ہزار کی۔“ میں نے کہا۔

”پچاس ہزار؟“ رضوانہ یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں پورے پچاس ہزار اور یہ میری زندگی کی پہلی بڑی شاٹنگ تھی۔ کیسے کیسے برانڈز کے سوٹ دلوائے تھے اور



جنگلاتی جھلسلاتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا مہینہ نمبر

پاکینہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے خوب صورت سلسلے وار ناول..... نئی اقساط لیے

سیما رضا ردا نے اپنے ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں دکھائے کرداروں کے نئے رنگ

سحرش فاطمہ کے سحر انگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول..... میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

عالیہ حرا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول..... اشک جگنو اور ستارے

نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور حج کی باسعادت مناسبت سے اظہر شجاعت کا پرچم مضمون

وہ آنے بزم میں.....

ہماری سینئر رائٹر صبیحہ شاہ

کی صباحت بھری آمد

شائستہ زریں کا سنہرا روپ ہمارے لیے ایک جامع سروے

اس کے علاوہ

دہن نمبر کے لیے شوخ و شگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد، امّ ثمامہ، ضادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار و دیگر ہنرمند نگہاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ، ساتھ دلچسپ اور پُر تحقیق کارنرز، سحر انگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابل عمل نسخے اور بہت بہت پُر لطف احوال..... صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر

”ہاں یہ بات تو ہے۔ میں سسکتی ہوئی زندگی نہیں گزار سکتی۔“

”بہر حال قصہ مختصر یہ کہ میں نے اپنے گھر والوں کو یہ بتا دیا کہ میں مہوش کے باپ سے شادی کر رہی ہوں۔ بہر حال تم خود کچھ سمجھ سکتے ہو کہ گھر والوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔“

”ظاہر ہے ایک ہنگامہ مچ گیا ہوگا۔“

”ہاں لیکن جب میں نے زمانے کی تخیل ان کے سامنے رکھیں، انہیں بتایا کہ ہم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی خوشی حاصل نہیں کی لیکن اب آخر کی دولت سب کے لیے خوشیاں لے کر آئی کی۔“

”میں نے اپنے گھر والوں کو یہ نہیں بتایا کہ آخر بس دو تین برسوں کا مہمان ہے۔ ورنہ وہ اصول پرست لوگ میری راہ میں رکاوٹ بن جاتے۔“

”قصہ مختصر یہ کہ آخر سے میری شادی ہو گئی اور اب اس شادی کو نو سال ہو چکے ہیں۔“

”نوسال!“ رضوانہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں نو سال!“ میں نے بڑی جتنی سے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ شادی کے بعد وہ صحت مند ہوتا چلا گیا۔ ابھی تم نے جس آدمی کو اس کمرے میں دیکھا ہے یہ وہی ہے میرا شوہر آخر۔ ایک بوڑھا انسان۔ جو مجھ سے شادی کے بعد خود جوان اور صحت مند ہوتا چلا گیا۔ جب کہ میں بیمار ہو کر بستر پر آ گئی ہوں۔ میرے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں۔ میں خود تھوڑے دنوں کی مہمان ہوں اور اس کا یہ حال ہے کہ اس کے نزدیک اب کوئی بیماری نہیں ہے۔ اس کی شوگر بھی کنٹرول میں ہے اور بلڈ پریشر بھی اور میں بیمار ہو کر رہ گئی ہوں۔“

سترہ برس کی دلہن سے پایا ہے کیا فیض
عمر رواں کو کیسی پذیرائی مل گئی
سوچا تھا کہ چل دیں گے وہ دو چار سال بعد
لیکن بڑے میاں کو تو انائی مل گئی

میرا حسن مرچھا چکا ہے۔ میری صحت جواب دے گئی اور میں نے زندگی سے ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے تو شاید موت آئے یا نہ آئے لیکن میں ضرور مرنے والی ہوں۔

میں نے اپنی کہانی اس لیے لکھوائی ہے کہ دوسری لڑکیاں دولت کی لالچ میں آکر اس قسم کا جوانہ کھیلیں۔ کیونکہ اس میں اگر ہار ہو گئی تو پھر ساری زندگی کی ہار ہے۔

میچنگ شوز، جیولری اور نہ جانے کیا کیا۔“

میں نے گھر والوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ ساری شاپنگ مہوش کے باپ نے کرائی ہے۔ بلکہ میں بھی کتنی رہی کہ مہوش نے میرے لیے باہر سے بھجوائی ہے۔

بہر حال آخر صاحب کی مہربانیاں جاری رہیں۔ اب مجھے پیسوں کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

ایک دن انجم کا فون آ گیا۔ وہ انجم جو میری اور مہوش کی مشترکہ دوست تھی۔ اس نے کسی جگہ ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ”باجی اسی نو جوان کا کیا ہوا جس کا نام آپ نے عادل بتایا تھا۔“ رضوانہ نے پوچھا۔

”وہ بے چارہ مجھ سے پانچ سو کر میری زندگی سے نکل گیا۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال میں دوسرے دن جب انجم سے ملی تو اس نے ایک عجیب بات بتائی۔“ اس نے کہا۔ ”سائرہ وہ بڑے میاں تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”کون بڑے میاں۔“ میں۔۔ اس کی بات نہیں سمجھتی تھی۔

”ارے وہی مہوش کے ابا۔“ اس نے بتایا۔ ”انہوں نے میرے ذریعے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔“

”کیا اس بڑے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دامخ تو خراب ہو گیا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ تمہاری زندگی کا گولڈن چانس ہے۔ تم تو میری عادت جانتی ہو میں کئی لپٹی رکھنے کی عادی نہیں ہوں اگر وہ بڑے میاں مجھے آفر دیتے تو میں فوراً قبول کر لیتی۔“

”اور زندگی بھر روتی رہتی۔“

”ارے نہیں بے وقوف، زندگی بھر نہیں صرف تین چار سال۔“ انجم نے کہا۔ ”تم کو نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیسے کیسے لڑائی ہیں۔ ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتے۔“

”اور اس کے بعد مجھے یہ وہ ہو جانا ہے۔“

”ہاں لیکن ایک کرڈ پتی یہ وہ۔“ انجم نے کہا۔ ”جانتی ہو کرڈ پتی یہ وہ کی ڈیمانڈ کنواری لڑکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ کنفرم ہے کہ وہ تین چار سال کا مہمان ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہ کنفرم ہے۔“ انجم نے بتایا۔ ”ڈاکٹر زکی رپورٹ یہی بتا رہی ہے اور ویسے بھی تمہارے لیے اہم تو یہی ہے دولت اور صرف دولت۔“



تریاق

محترم مدیر

سلام تہنیت

کبھی کبھی انسان کودل سے نہیں دماغ سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ غزالہ میرے دل کی ملکہ تھی مگر تب جب اس کی زندگی میرے لیے تھی مگر اب جب وہ کسی اور کی امانت بن گئی تو میرے لیے وہ اور بھی معتبر بن گئی۔ جب اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اس پر تشدد کرتا ہے اور وہ اس سے نجات کے لیے خودکشی کرنے والی ہے۔ اسے زہر کی ضرورت ہے۔ تب میں نے اسے زہر کی شیشی دیتے ہوئے کہا، یہ زہر تمہارے شوہر کے لیے ہے، پھر جو کچھ ہوا وہ اپنے اندر سبق لیے ہوئے ہے۔ ہر قاری میرے اقدام کو سراہے گا۔

وسیم

(مظفر آباد)

”تمہاری دعاں رائیگاں جا رہی ہیں وسیم۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے تو میری خوشیوں کی دعاں مانگی تھیں لیکن خوشیاں میرے نصیب میں نہیں ہیں۔ ایک ایک ہلایا ہے جیسے کانٹوں پر چل رہی ہوں۔“

وہ میرے پاس آکر رونے لگی۔ میں اس کے آنسو دیکھ کر اپ اٹھا۔ ایک تو وہ اتنے دنوں کے بعد آئی تھی اوپر سے اس کے آنسو۔ یہ سب مجھ سے برداشت کہاں ہو سکتے تھے۔ ”غزالہ، کیا ہوا ہے، سہمی۔“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

میں اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ایسی ہی خوب صورت تھی جیسے شادی سے پہلے ہوا کرتی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر دکھوں کے سائے بھی گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

میں اور غزالہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ پتا نہیں آج کے دور میں اس لفظ کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔ لیکن ہم واقعی ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے تھے کہ کالج کے لڑکوں نے ہمیں رومیو جولیٹ قرار دے دیا تھا بلکہ کئی جگہ دیواروں پر بھی لکھ دیا تھا۔ ”وسیم اینڈ غزالہ رومیو اینڈ جولیٹ۔“

ہم دونوں اس قسم کے نوشتہ دیوار پڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑتے یا نظراندا زکر کے آگے بڑھ جاتے۔

اجھا لگتا تھا یہ سب۔ محبت نے ہمیں اپنے بحر میں گرفتار کر رکھا تھا۔ جس دن وہ کالج نہیں آتی تو میں بے قرار رہتا اور جس دن میں نہیں آتا وہ جہنم رہتی۔

ہم اکثر باہر بھی ملا کرتے۔ مہینے میں کم از کم دو بار، ہم سلورمون میں جا کر کچھ ضرور کرتے تھے۔ پھر آئندہ آنے والے خوب صورت دنوں کی پلاننگ کی جاتی۔

غزالہ کو گھر کی سجاوٹ کا بہت شوق تھا۔ اس کے ذہن میں نئے نئے آئیڈیاز آتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کے درمیان پردوں کے رنگوں پر بحث بھی ہو جاتی تھی۔ غزالہ کو کوئنگ کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ وہ کہا کرتی۔ ”وسیم صاحب! یہ بات ابھی سے جان لیں کہ میں کھانا بالکل نہیں بناؤں گی۔“

”کیا مجھے بھوکا مار دو گی؟“

”نہیں، ہم کوئی کک رکھ لیں گے اور اگر ڈھنگ کا کک نہ ملا تو باہر سے منگوایا کریں گے۔“

”یاریہ تو زیادتی ہوگی۔ اچھا یہ بتاؤ چائے وغیرہ تو بنا دیا کرو گی نا؟“

”ہاں اتنا تو کر ہی لوں گی۔ اس کے علاوہ ہاف فرائی אליٹ وغیرہ بھی بنا دیا کروں گی۔“

”چلو اتنا ہی کافی ہوگا باقی میں خود سنہیال لوں گا۔“

تو ہم دونوں کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ہم ایک ہونے جا رہے ہیں۔ اس کے گھر والوں نے بھی مجھے پسند کر لیا تھا۔

میرے سامنے اگرچہ کوئی شاندار مستقبل تو نہیں تھا

لیکن اس بات کا یقین ضرور تھا کہ غزالہ اور میں دونوں ایک خوب صورت اور پرسکون زندگی کا آغاز ضرور کریں گے۔

غزالہ کا تعلق خوش حال گھرانے سے تھا۔ دو بھائی تھے۔ دونوں کا اپنا بڑا بھائی تھا۔ والد کسی زمانے میں سرکاری آفیسر رہ چکے تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو کر سکون والی پنشن یافتہ زندگی گزار رہے تھے۔

جب کہ میرے ساتھ صورت حال بالکل الگ تھی۔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔ والد صاحب نہیں تھے۔ والدہ اور دو بہنیں تھیں۔ جو اب پڑھ رہی تھیں۔ گھر کے اخراجات اس طرح پورے ہوتے کہ میں کالج کے بعد ایک جگہ ملازمت کرتا تھا لیکن امید ہی تھی کہ ایم بی اے کے بعد حالات بدل جائیں گے۔

ایک بار غزالہ نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ”وسیم میرے لیے حالات کچھ دوسرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ بالکل بگڑ جائیں۔ تم میرے گھر والوں سے مل سکتی کی بات کرلو۔“

”کیا مطلب؟“ میں پریشان ہو گیا تھا۔

”بابا کے ایک دوست کا بیٹا جرنی سے آیا ہے۔ اس کے حالات بہت اچھے ہیں اور یہاں کاروبار سیٹ کرنے کے بعد اور بھی بہتر ہو جائیں گے۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے والدین تو مجھے پسندیدگی کا عندیہ دے چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اب تک یہ بات صرف اشاروں تک ہے نا۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم جا کر کنفیرم کروالو۔“

غزالہ کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے غزالہ کی امی سے خود ہی اس موضوع پر بات کر لی تھی۔ انہوں نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا تھا۔ ”بیٹا! میں تم کو بہت پسند کرتی ہوں۔ تم ہر لحاظ سے بہت اچھے ہو لیکن ابھی ہم نے غزالہ کے لیے کچھ سوچا نہیں ہے۔“

غزالہ کا خدشہ بچ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مختصر یہ کہ غزالہ میری نہیں ہو سکی اور اس کی شادی اس شخص سے ہو گئی۔

اس کا نام سلطان تھا۔ اس کے گھر میں اس کی ماں بھی رہتی تھی، دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ والد جرنی میں تھے۔

سلطان نے یہاں آ کر اپنا کاروبار سیٹ کر لیا تھا۔ ایک بہت بڑا سپر اسٹور بنایا تھا جس کا نام اس نے غزالہ پر

”لیکن کیوں! وہ تو اچھا خاصا پڑھا لکھا انسان

ہے۔“

”پڑھا لکھا تو ہو سکتا ہے لیکن وہ انسان نہیں ہے۔“

غزالہ نے کہا۔ ”خدا کی پناہ اس کی زبان۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ذہریلے سانپ کی طرح پھنکار رہا ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر تشدد کرنے لگتا ہے۔“

”کیا!“ مجھے یہ سن کر شاک سا لگا تھا۔ ”وہ تم پر تشدد

بھی کرتا ہے؟“

”نہی بار۔“ اس نے اپنی آستینیں اٹھا دیں۔ اس

کے بازوؤں پر ٹیل پڑے ہوئے تھے۔ ”میرے پورے

بدن کا یہی حال ہے۔“

وہ پھر رونے لگی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی

زندگی تھی کہ غزالہ جیسی بے فکری، خوش باش، ذہین اور خوب

صورت لڑکی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

”خدا کے لیے وسیم کچھ کرو۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔“

اس نے کہا۔ ”کسی طرح میری جان بچا لو۔ میں بہت پریشان

اور مجبور ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”پریشان نہ ہو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا ہوں۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ ورنہ میں کوئی انتہائی

قدم اٹھا لوں گی۔“

”خدا کے لیے غزالہ کوئی حماقت مت کریں۔“

”بے فکر ہو۔ میں اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں

گی۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اسی کو جان سے مار دوں گی

جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا ہے۔ خون کر دوں گی اس کا،

گھر میں ریوا اور رکھا ہوا ہے، گولیاں بھی ہیں۔ بس تھوڑی سی

ہمت ہی کرنی ہو گی نا۔ کہانی ختم ہو جائے گی میری بھی اور

اس کی بھی۔“

”میں غزالہ یہ سب مت کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ

ٹھیک ہے کہ تمہارا شوہر تمہارے لیے بے رحم ثابت ہو رہا ہے

لیکن اب تمہاری قسمت اس سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اب

اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرو اور اگر بہت

حالات خراب ہو گئے ہیں تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ، طلع لے لو

اس سے۔“

”میں یہ ہمسکی دے کر دیکھ چکی ہوں۔ وہ ایک جنونی

انسان ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اگر طلع وغیرہ کی بات

کی تو وہ میری جان لے لے گا۔ وہ طلاق بھی نہیں دے گا

مجھے۔ اپنے ساتھ اٹکا کر رکھے گا تا کہ مجھ پر نار چرکنا

استور رکھا تھا۔

اس استور کا افتتاح بھی بہت زور و شور سے ہوا تھا۔

غزالہ نے مجھے بھی مدعو کیا تھا لیکن میں کیسے جاسکتا تھا۔ میں

بس اس کے خوش رہنے کی دعا کر سکتا تھا۔

میں نے ایک دو بار غزالہ اور سلطان کو ایک ساتھ

مختلف مقامات پر دیکھا۔ دونوں بہت خوش دکھائی دے

رہے تھے۔ میں سوائے دعا دینے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد غزالہ کا فون آیا۔ اس کا فون سن

کر میں سرشار ہو گیا تھا۔ ”ارے کیسی ہوتی؟“

”وسیم شکر ہے کہ تمہارا موبائل نمبر وہی پرانا والا ہے۔

تم نے بدلا نہیں۔“

”میں اسے بدل ہی نہیں سکتا تھا۔“

”وہ کیوں؟“

”صرف اس لیے کہ کبھی تو تمہارا فون آئے گا۔“ میں

نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ آج آ گیا۔“

”وسیم میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز میں

پریشانی شامل تھی۔

”ضرور ملو لیکن یہ بتاؤ ویسے تو سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں خیریت ہی سمجھو۔ تم سے مل کر بتاؤں گی۔“

”تو پھر آ جاؤ۔“

وہ ایک کھنکھنے کے بعد میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ

روئے جا رہی تھی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا

تھا۔

”خدا کے لیے غزالہ اتنا مت ر دو۔“ میں نے کہا۔

”میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔“

”تم نے ہمیشہ میری خوشیوں کی خواہش کی ہے نا

وسیم۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔

”ظاہر ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا

ہوگی۔“

”تو اتنا جان لو کہ میں ہرگز خوش نہیں ہوں۔“ اس

نے کہا۔

”وہ تو تمہارے آنسوؤں نے بتا دیا ہے کہ تم خوش

نہیں ہو لیکن ہوا کیا ہے؟“

”میرا شوہر۔“ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

”اس نے میری زندگی خراب کر دی ہے ایسے ایسے دکھ دے

رہا ہے وسیم کہ تم کو یقین نہیں آ سکتا۔ زندگی میرے لیے

عذاب بن کر رہ گئی ہے۔“

رہے۔ خدا جانے کس جرم کی سزا دے رہا ہے۔“
”دیکھو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا راستہ نکالو گے؟“ وہ بھڑک کر بولی۔ ”اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں اسے کوئی مار کر یہ کہانی ہی ختم کر دوں۔“

”یہ تمہاری حماقت ہوگی غزالہ۔ فرض کرو تم نے اگر اسے مار بھی دیا تو کیا خود بچ جاؤ گی! انہیں تم قانون کی گرفت میں آ جاؤ گی۔ پورے ملک میں اس کا چرچا ہو گا۔ تمہارا خاندان بدنام ہو کر رہ جائے گا۔“

”تو پھر کیا کروں میں، بتاؤ کیا کروں؟“
”سوچنے دو مجھے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔“

”راستہ۔“ وہ غچی سے ہنس پڑی۔ ”راستہ بس وہی ہے جو میں کہہ چکی ہوں۔ ویسے تم کہتے ہو تو کچھ دن انتظار کر کے دیکھ لیتی ہوں اگر وہ پھر بھی نہیں بدلا تو پھر تم یہ خبر سن لیتا۔“

وہ سوالات کھڑا کر کے چلی گئی۔
میں اس کا دکھ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کو اپنے شوہر کا قتل کرتا ہوا دیکھوں یا سُنوں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہوتی۔ دوسری طرف میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا گھر برباد ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری نہیں ہو سکتی تھی لیکن اب وہ ایک شادی شدہ زندگی گزار رہی تھی۔ بہت سے لوگ اس سے وابستہ تھے۔ میرے لیے تو یہی بہت تھا کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ لیکن کیسے؟

میں کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو گولی مار دے۔ اس میں خود اس کا نقصان تھا۔ گرفتاری، عدالت، مقدمہ، ہزار بجلیں، کیسے کیسے شرمناک مرحلے۔

دو چار دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ تقریباً برباد ہو چکا تھا۔ وہ اب انتہائی قدم اٹھانے کے لیے غچی بیٹھی تھی۔

”میں غزالہ ایسا مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ ایسا کرو تم میرے پاس آ جاؤ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے لیے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔“

”کوئی راستہ نہیں ہے وسم بلکہ قدرت نے میرے لیے کچھ آسانی پیدا کر دی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسی آسانی۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”یہ میں تمہارے پاس آ کر بتاؤں گی۔“

وہ جب آئی تو پریشانیاں اور گہری ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ آتے ہی پھٹ پڑی۔ ”بس اب بہت ہو گیا۔ جو کچھ ہے ناقابل برداشت ہے۔ اس حالت میں بھی اس کو چین نہیں ہے۔“
”کیسی حالت!“

”اوہ! میں نے شاید تم کو بتایا نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پچھلے ہفتے اس کا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔ ٹانگ میں فریجر ہے۔ چل پھر نہیں سکتا۔ لیکن زبان تو چل رہی ہے نا، اس کی زبان باتوں کے تیر تو مسلسل چل رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اب کچھ دنوں سے مجھ پر جسمانی تشدد کرنے کے قابل نہیں رہا ہے لیکن اس کی زبان تو کون روک سکتا ہے۔ وہ جو گالیاں دیتا ہے تو میرے روٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“
”کیا تم اس کی دیکھ بھال کرتی ہو؟“

”دیکھ بھال!“ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میری کوئی اتا نہیں ہے۔ کیا میں اتنی گئی گزری ہوں کہ وہ مجھے جوتے مارتا رہے اور میں اس کی خوشامد میں لگی رہوں۔“
”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”تم بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔“ اس نے پوچھا۔
”میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں اب مصالحت وغیرہ نہیں کرنا چاہتی۔ موت اس کی موت یا پھر میری موت۔“

”غزالہ اب ذرا دھیان سے سنو۔“ میں نے کہا۔
”اگر تم نے موت ہی جیسا کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ تم پر بھی کوئی آج نہ آئے اور اس کا بھی کام ہو جائے۔“

”وہ کیسے!“
”سلو پوائزن۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے۔“
”سلو پوائزن!“

”ہاں، دیکھو اس میں ہو گا یہ کہ وہ آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتا جائے گا اور اس کی موت جب ہو گی تو میڈیکل رپورٹ بھی یہی بتائے گی کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری والی بات ہو گی۔ تم پر بھی کوئی الزام نہیں آئے گا اور اس کی کہانی بھی ختم ہو جائے گی۔“
”لیکن یہ ہو گا کیسے؟“

”بہت آسانی سے۔“ میں نے بتایا۔ ”میرا ایک گہرا دوست دواؤں کی فیکٹری میں ہے۔ وہ دنیا بھر کے زہروں

برا تھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ مجھے ایسی کوئی چیز دے دے گا لیکن.....!“

”لیکن کیا!“ غزالہ یہ سب سن کر رُجڑ جوش ہو گئی تھی۔
”تم نے تو مجھے نئی امید دلادی ہے۔ بتاؤ کیا کرنا ہوگا۔“

”بہت راز داری سے کام لینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔
”کیونکہ خدا نہ کرے اگر یہ راز کھل گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی جیل چلا جاؤں گا۔ بلکہ اس کیس کو ایک اور رنگ دے دیا جائے گا۔“

”وہ کیا۔“

”اس قسم کی خبریں روزانہ آتی رہتی ہیں کہ قلاں عورت نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کا خون کر دیا۔ خود سوچو پھر ہم کہاں کھڑے ہوں گے، کہیں بھی نہیں۔“

”وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کرنا کیا ہوگا؟“

”بہت خاموشی اور راز داری سے کام لینا ہوگا۔“

”یہ تو ہو جائے گا لیکن کب؟“

”میں کل ہی اس کے پاس جا کر اس سے بات کر کے کچھ لے آتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اب اطمینان رکھو۔ یہ کچھ دنوں کی سختیاں ہیں جو تمہیں برداشت کرنی ہیں۔ اس کے بعد تمہارا راستہ صاف ہو جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

دو چار دنوں کے بعد جب وہ میرے پاس آئی تو زہر کی شیشی تیار تھی۔ ”دیکھو غزالہ میں اب بھی جھجک رہا ہوں کہ کہیں تم سے کوئی بے پروائی نہ ہو جائے۔ پھر ہم سب پھنس جائیں گے۔ ہمارے پکڑ میں میرا وہ بے چارہ دوست بھی پھنس جائے گا جس نے یہ پوا تڑن دیا ہے۔“

”اوہو، تم میری بے پروائی کی تو بات ہی مت کرو۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم مشن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اگر میں اس میں ناکام ہو گئی تو پھر میری زندگی میں کچھ نہیں رہے گا۔ صرف یہی ہوگا کہ میں خودکشی کر لوں۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ کس طرح استعمال کرانا ہوگا۔“

”روزانہ دودھ میں ڈال کر۔ صرف چار قطرے رات کو سوتے وقت۔“

”ہاں۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”میرے لیے یہ بہت آسان ہوگا کیونکہ اس کو سوتے وقت دودھ پینے کی عادت بھی ہے۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ اس کی تمام تر باتوں کے باوجود تمہیں اس کے ساتھ بہت نرم رویہ رکھنا ہوگا۔ اگر تم

جاریہ سلسلہ بن قدامہ

صحابیؓ، ابوالیوب کثیت اور الحرق لقب تھا۔ ان کا سلسلہ بن زہیر، بن الحصین بن رزاح بن ربیعہ۔

حضرت علیؓ کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور یہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے لشکر بصرے میں داخل ہوئے تو

جاریہ بن ان دنوں یہیں موجود تھے۔ جنگ جمل میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں

بصرے کے قبائل سعد اور رباب کی سرداری انہی کو سونپی گئی تھی۔ انہوں نے اس معرکہ میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ واقعہ حکیم کے بعد بھی حضرت علیؓ کے

وفادار رہے اور خوارج کے ساتھ لڑائیوں میں حضرت علیؓ کے مددگار رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے

جس لشکر کو خوارج سے جنگ کے لیے بصرہ بھیجا تھا۔

جاریہؓ اس لشکر کے سردار تھے۔ پھر جب حضرت امیر معاویہؓ نے مصر فتح کر لیا تو بصرے کی اس صورت

حال کے پیش نظر کہ وہاں حضرت علیؓ کے حمایتی قلیل تعداد میں تھے حضرت جاریہؓ نے اس شہر کو اپنے

تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ حضرت معاویہؓ نے عبداللہ ابن عامر الحضری کو اپنا سفیر بنا کر بصرے بھیجا

تا کہ بنو نجیم کی تالیف قلب کرے چنانچہ اسے ایک حد تک ان کی حمایت حاصل بھی ہو گئی۔ تو زیاد بن ابیہ

نے جو بصرے کا نائب عامل تھا۔ حضرت علیؓ کو لکھا کہ جاریہؓ بن قدامہ کو بصرے بھیجیں کیونکہ ان کی

اپنے قبیلے میں بہت زیادہ عزت ہے۔ جاریہؓ جب یحییٰ بن زکریاؓ کا ایک دست لے کر بصرے پہنچے۔ بنی نجیم کی

تالیف قلب کر کے انہیں اپنے ساتھ ملایا اور پھر ابن الحضری کے لشکر پر حملہ کیا۔ اور بصرے میں حضرت علیؓ کی حکومت قائم ہو گئی۔ جاریہؓ نے حضرت علیؓ کے عہد

حکومت میں آخری لڑائی بصرہ بن اوطا کے خلاف 40 ہھ میں لڑی تھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت حسنؓ کے لیے مدینہ منورہ میں لوگوں سے

بیعت لی۔ انہوں نے بصرے میں وفات پائی۔

مرسلہ: محمد علیؓ شاہد، یعنی پوائے اسی

جائے۔

اب وہ میری دسترس سے کتنی دور ہو گئی تھی۔ کسی اور کی ہو گئی۔ لیکن میرے دل کے کتنے قریب تھی۔ اس کے آنسو آج بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ محبت صرف کسی کے حصول کا نام نہیں ہے بلکہ ایک احساس کا نام ہے۔ احساس زندہ رہتا ہے تو محبت زندہ رہتی ہے۔

خیر تو میں آج بھی اس کے لیے اتنا ہی بے قرار تھا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس روٹی ہوئی آئی اور میں نے اس کی خوشیوں کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری پلاننگ کامیاب رہی تو اس کو پھر سے سکون مل جائے گا۔

میں نے اسے فون کرنے سے منع کر دیا تھا اور نہ ہی خود میں اسے فون کر سکتا تھا۔ صرف یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے مشورے کے مطابق کسی دن کال آفس سے فون کر لے۔

اور ایک دن کال آفس سے اس کا فون آ ہی گیا۔ وہ مجھے صورت حال بتا رہی تھی۔ ”میں بڑی ہوشیاری سے تمہاری پلاننگ پر عمل کر رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”روزانہ رات کے دودھ میں چار قطرے ملا دیتی ہوں اس کو احساس بھی نہیں ہوتا۔“

”مگنڈ! اور یہ بتاؤ کہ تم خود اپنا رویہ کیسا رکھتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا بتاؤں، بس دل پر جبر کر کے اس کے ساتھ نرم ہو گئی ہوں۔ وہ بکواس کرتا رہتا ہے لیکن میں دھیان ہی نہیں دیتی۔“

”شباباش! میں یہی چاہتا ہوں کہ اس کو کوئی شک نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

”کوشش تو میری بھی یہی ہے لیکن کبھی کبھی اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر دل چاہتا ہے کہ اس کا منہ نوج لوں یا پھر اپنی پلاننگ پر عمل کر جاؤں۔“

”نہیں..... نہیں ایسا کبھی مت کرنا۔ جہاں دس بارہ دن گزار لیے ہیں وہاں کچھ دن اور سہی۔“ میں نے کہا۔ ”صبر کرتی رہو اور اپنا کام کرتی رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اوکے۔ میں تمہیں پھر کچھ دنوں کے بعد فون کروں گی۔“

کچھ دنوں کے بعد اس کا پھر فون آ گیا۔ یہ فون بھی

نے اس کی باتوں کا جواب سختی سے دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ کھٹک جائے اور تمہارے دیئے ہوئے دودھ کا گلاس نہ پیے۔ اس لیے اس کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ بہت ہوشیاری سے کام لینا ہے۔“

”ہاں اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں۔“

”اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ یہ پولیس والے بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ اس لیے اس دوران نہ تم مجھ سے ملو گی اور نہ ہی موبائل پر رابطہ کرو گی۔ موبائل نمبر سے ہی بندہ ٹریس ہو جاتا ہے۔“

”بہت مشکل امتحان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اپنے دل پر جبر کر کے اس سے نرمی کا سلوک کرنا پڑے گا۔“

”ہاں صرف دو مہینے۔“ میں نے کہا۔ ”دو مہینوں میں تو یہ آہستہ آہستہ کام کرتا ہوا دل کی شریانوں تک پہنچ جائے گا۔ اس کے لیے ایک دن اچانک اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہو گا اور دوسری بات یہ ہے کہ بہت ہی سختی کے ساتھ اس کے دودھ لپی لینے کے بعد گلاس کو خوب اچھی طرح دھو کر رکھنا ہو گا اور کام ہو جانے کے بعد گلاس اور شیشی دونوں کو ضائع کر دینا ہو گا۔“

”میں اس سے چھکارے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”بس تو یہ شیشی لے جاؤ اور خدا کے لیے اپنی اور میری عزت بچا لیتا۔ انتہائی ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔“

”ایک بات بتاؤ اگر کبھی تمہیں حالات بتانے کی ضرورت ہو تو کیسے رابطہ کروں گی۔“

”کسی بھی حال میں اپنے موبائل کے ذریعے نہیں۔ بلکہ کسی کال آفس جا کر مجھے فون کر سکتی ہو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”تو اب میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر سختی سے عمل کرنا۔ ورنہ مصیبت ہو جائے گی۔“

غزالہ چلی گئی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ وقت کیسا ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کو حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کو پانے کے مرحلے میں آ گئے تھے۔ زندگی ہم پر مہربان تھی۔ محبت کا حصول صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا کہ اچانک سب کچھ بدل گیا۔ جیسے اسکرین پر منظر بدل

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدي بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلجیہری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

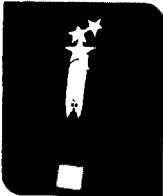
کے لیے روپیہ پاکستان کے مستقل پروفیکلر

اجمل زیدی

ملتان
ایبٹ آباد
ہولڈر



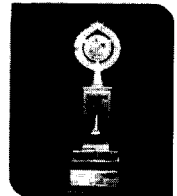
ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9-اپریل 30 تا مئی
9-اگست 30 تا ستمبر
9-دسمبر 30 تا جنوری
ملتان 62، سرحد 20، بکھر 81-G
سرحد کی ایک ایک سو سو روپے
فون: 2255880 - 2854595 (051)
سرحد: 0300-8566188
لہور: 2281636



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر
آفس: نمبر 18
نیروز میڈیوٹرک چرک چرک
نور مل کمپلیکس (آرٹیکل) لاہور
سرحد: 0300-8566188
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

پیشانی سینٹر
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر
فی بی روڈ نزد بھٹری چک چٹا درہ
فون: 2218215-9 (0521)
سرحد: 0300-8566188

ملتان

کراچی

پیشانی سینٹر
آفس: 708، 77، ٹیکسٹائل مارکیٹ
زمری بلاک 1، ف.ف.ک کراچی
فون: 021-7012068-9
سرحد: 0300-8566188
12 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

لوہیہ سینٹر
آفس: 708، 77، ٹیکسٹائل مارکیٹ
زمری بلاک 1، ف.ف.ک کراچی
فون: 021-7012068-9
سرحد: 0300-8566188
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-دسمبر تا 27 دسمبر

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

اس نے کال آفس سے کیا تھا۔ ”وسیم! اب تک سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ کسی کو شبہ نہیں ہو سکا ہے۔“
”اور تمہارا رویہ۔“ میں نے پوچھا۔

”تم میرے رویے کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں مزے کی بات بتاتی ہوں۔ خود اس کا رویہ بدلنے لگا ہے۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں بہت کم بلکہ ختم ہو گئی ہیں۔ اب وہ ویسا ہی ہوتا جا رہا ہے جیسا شادی سے پہلے ہوا کرتا تھا اور ہاں اب وہ تھوڑا تھوڑا اپنے بھی لگا ہے۔“

”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔
”کیا خاک اچھی بات ہے۔ اگر وہ مکمل ٹھیک ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”تم بس اپنا کام کرتی رہو اور اپنا وہی نرم رویہ رکھنا۔ اگر اس الٹیج پر وہ اکھڑ گیا تو پھر کیس کو سنہالنا مشکل ہو جائے گا۔“
”یہ تو ہے۔ یہی سوچ کر میں اپنا کام کیے جا رہی ہوں۔“

پھر بہت دنوں تک اس کا فون نہیں آیا اور ایک دن آیا تو وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ وہ میرے پاس آنا چاہ رہی تھی۔

”میں غزالہ میرے پاس مت آؤ، ہمیں ہر حال میں احتیاط کرنا ہے۔“

”وسیم! یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ ورنہ بہت گزبڑ ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔

”او کے اگر ایسی بات ہے تو آ جاؤ۔“

وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن بہت گھرائی ہوئی اور پریشان تھی۔

”کیا ہوا غزالہ خیریت تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
”خدا کے لیے وسیم کچھ کرو۔“ اس نے کہا۔ ”اپنے اس دوست کے پاس جاؤ جس نے تم کو یہ ہر دیا تھا۔“

”کیا اور چاہیے۔“

”نہیں، اس کا اپنی ڈونڈ چاہیے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”کوئی تو ایسی دوا ہوگی جو اس کے اثرات کو ختم کر دے۔ کوئی نہ کوئی دوا ضرور ہوگی۔ پلیز مجھ پر یہ احسان کر جاؤ۔“

”غزالہ تم مجھے اور کتنے امتحانوں میں ڈالو گی۔“ میں نے کہا۔

”پلیز وسیم بس یہ احسان کر دو۔ اس کے بعد میں

تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔“

”لیکن ہوا کیا۔ تم نے اپنا ذہن کیوں بدل دیا۔“
”اس لیے کہ میں..... میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ میرا شوہر ہے۔ میری خوشیاں اس سے وابستہ ہیں، تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس دوران ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب آچکے ہیں۔ وہ اب میرا رازداری بات پر خیال رکھتا ہے۔ میری ہر بات مانتا ہے۔ میری اداسی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ پلیز وسیم کسی طرح اس زہر کا توڑ لے آؤ۔ کسی طرح بھی۔ ورنہ میں خود مر جاؤں گی۔“

”غزالہ تم کس زہر کس بات کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں نے تو تمہیں کوئی زہر نہیں دیا۔“
”تو پھر وہ کیا تھا۔“
”ملٹی وٹامن سیرپ۔ تاکہ اس کی صحت تیزی سے بحال ہو جائے۔“

”کیا! تو پھر وہ مشورے وہ احتیاط۔“
”وہ صرف اس لیے تھا کہ تم اس کو کجبات کا ذریعہ سمجھو اور اس کو روزانہ وہ سیرپ دیتی رہو۔“

”وسیم تم نے ایسا کیوں کیا؟“
”بے خوف میں تمہاری خوشیاں لوٹانا چاہتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والے اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے میں مشورہ دیتا رہا کہ تم اس کا خیال رکھو۔ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن تمہاری طرف لوٹ آئے گا اور دیکھو وہی ہوا۔ فرض کرو اگر وہ واقعی زہر ہوتا اور میں اس کا اپنی ڈونڈ نہیں لاسکتا تو پھر کیا ہوتا؟ تم تو اپنے شوہر سے محروم ہو جاتیں نا؟“

”وسیم۔“ غزالہ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ وہ پھر رو رہی تھی لیکن اس بار اس کے آنسو دکھوں کے نہیں تھے بلکہ خوشی کے تھے۔ محبت کے تھے میری احسان مندی کے تھے۔

اس نے کھڑے ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور میری ہتھیلیوں پر بوسے دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

بیسویں گزر گئے ہیں۔ اب اس کے دو بچے ہیں۔ وہ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میری ہتھیلی کی پشت پر اس کے بوسے کی حرارت آج بھی اس کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

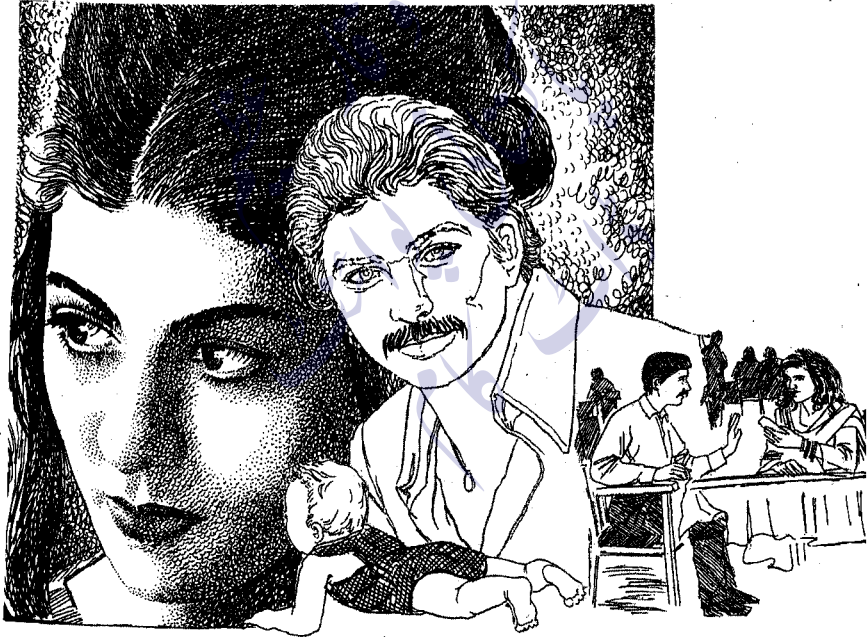


شیر کی خالہ

محترم معراج رسول
السلام علیکم

اپنی خودنوشت بھیج رہی ہوں گو کہ میری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جس پر میں کہوں کہ میری زندگی بہت اعلیٰ گزری ہے یا غم و الم سے بھرپور گزری ہے۔ بس ایک سیدھی سادی زندگی گزاری ہے لیکن ایک ایسا واقعہ ہے جس نے میری زندگی میں انقلاب برپا کیا ہے۔ اسی واقعے کو کہانی کی شکل میں لکھ دیا ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

فرح
(کراچی)



میں نے اس ادھیڑ عمر بد صورت سے شخص کی طرف
”قبلہ۔“ میں نے اسے تیز اور تلخ لہجے میں مخاطب
کیا۔ ”اگر آپ مجھے گھورنے سے فارغ ہو چکے ہوں تو کچھ
کام کی بات کریں۔“

میں نے اس ادھیڑ عمر بد صورت سے شخص کی طرف
اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اب سے دو
چار سال پہلے کی بات ہوتی تو میں کھبرا جاتی۔ مجھے پسینے

وہ سٹ چٹا گیا تھا۔ ”نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”تم کیسی بات کر رہی ہو۔ میں تو یوں ہی۔“
 ”خیر چھوڑیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”آپ یہ بتائیں مجھے جاب دے رہے ہیں یا نہیں، اگر میں
 یہاں کام کرنے لگی تو آئندہ بھی آپ کو گھورنے کے مواقع
 ملتے رہیں گے۔ جی بھر کر گھورتے رہے گا۔“
 ”لا حول ولا۔“ تم کیسی لڑکی ہو۔ یہ سب کیا کہہ رہی
 ہو۔“

”میں صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ مجھے جاب ملے گی یا
 نہیں۔“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں، میں تم جیسی کسی لڑکی کو اپنے دفتر میں نہیں رکھ
 سکتا۔ تم تو سب کے اخلاق خراب کر دو گی۔“
 ”اوہ اوہ آپ تو شاید سب کے اخلاق ستوارنے کی
 ڈیوٹی پر ہیں۔“ میں نے سامنے سے اپنی فائل اٹھالی۔ ”اور
 ہاں ایک بات اور بتا دوں کسی خوب صورت لڑکی کو اس طرح
 دیکھنے سے پہلے ایک بار آئینے میں خود کو بھی دیکھ لیا کریں۔“
 وہ تملکار کر رہ گیا ہوگا۔ میں نے اپنی فائل اٹھائی اور
 اس کے کمرے سے باہر آگئی۔ اس طرح کے واقعات تو
 میرے ساتھ ہوا ہی کرتے تھے۔ اب یہ کوئی نئی بات نہیں
 رہی تھی۔

یہ صرف دو سال پہلے کی بات ہے۔
 ابا کی موت ہوئی تو میں اس بے رحم دنیا میں کسی
 خوفزدہ ہرنی کی طرح تھی۔ سبھی سبھی، خود اپنے سائے سے
 ڈرنے والی لڑکی۔

ابا نے مرنے سے پہلے اتنا احسان ضرور کر دیا تھا کہ
 کسی طرح تین کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ اس
 کے علاوہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر میں ماں تھیں اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک
 بھائی۔ یہی ہمارے گھر کے اٹائے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا
 میرے پاس۔ میں بی اے سال دوم کی طالبہ تھی۔ کمپیوٹر
 جانتی تھی۔ میرے بھائی بہن بھی زیر تعلیم تھے۔ ابا کی پیشین
 آنی قلیل تھی کہ گیس اور بجلی کے بل میں ہی نکل جاتی۔ اس
 کے بعد پھر وہی شب و روز کی آفتیں۔

ابا کی زندگی میں بھی زندگی کوئی اتنی آسان نہیں تھی
 لیکن وہ شفیق انسان ہماری طرف آنے والی ہر پریشانی کے
 آگے ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ انہوں نے گرم و سرد کا
 احساس بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ دنیا اس وقت بہت مہربان

اور نرم دل دکھائی دیا کرتی۔

لیکن ان کی موت کے بعد ایسا ہوا جیسے ہمیں بند
 کمرے سے نکال کر میدان میں لاکھڑا کر دیا گیا ہو اور اس
 وقت احساس ہوا کہ دنیا تو اس کے بالکل برعکس ہے جیسا ہم
 نے سمجھا تھا۔

یہ تو بہت بے رحم، خود غرض اور مکار معاشرہ ہے۔
 چاروں طرف درندے گھومتے پھرتے ہیں۔ دھیوں کا
 راج ہے۔

جینا مردوں کے لیے اگر دشوار ہے تو عورت یا لڑکی
 کے لیے دشوار ترین ہے۔

میرے خدایا یہاں جیننا کتنا دشوار ہے۔ کتنے نوکیلے اور
 تیز پنچے ہیں لوگوں کے۔ جو ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کر براہ
 کر دیتے ہیں۔

میرے ابا اور امی دونوں بہت خوش شکل تھے۔ وہی
 خوبی ہم سبھوں میں آئی تھی۔ خاص طور پر میں، جو بھی مجھے
 دیکھتا اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔

اسی لیے مجھے ڈر لگتا تھا۔ ٹی وی کی خبریں دیکھ دیکھ کر
 خوف محسوس ہوا کرتا۔ میرا آنا جانا بھی کہیں نہیں تھا۔ بس گھر
 سے چادر لپیٹے ہوئے نکلی اور کالج پہنچ گئی وہاں سے سیدھے
 گھر۔ یا کبھی بھی ابا امی کے ساتھ ہم سب سیر کے لیے چلے
 گئے۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس لیے جب گھر سے باہر نکلتی تو سبھی سبھی سی، گھبرائی
 گھبرائی سی۔ ہر ایک سے خوف محسوس ہوتا۔ یہاں تک ہوتا
 کہ اگر محلے کا کوئی لڑکا مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ بھی لیتا تو
 گھر آ کر رونے لگتی تھی۔

آپ خود اندازہ لگالیں کہ جب ایسی کسی لڑکی کے سر
 سے اچانک باپ کا سایہ ہٹ جائے تو پھر اس کا کیا حال ہوا
 ہوگا۔

مجھے اپنے آپ کو مضبوط کرنا تھا لیکن کس طرح، میری تو
 پرورش ہی کسی اور انداز سے ہوئی تھی۔ محلے میں دو چار
 لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو جاب کیا کرتیں۔ میں ان کی خود
 اعتمادی کو دیکھ کر حیران ہو جایا کرتی۔ وہ لڑکیاں کسی اور دنیا
 کی باسی معلوم ہوتیں۔

وہ ان کا سویرے سویرے اپنے اپنے گھر سے نکلنا،
 خوب صورت ڈریسنگ، میک اپ، قیمتی پرس لٹکائے
 ہوئے، کمپنی کی گاڑیاں ان کو لینے کے لیے آئی ہوتی ہوتیں۔
 وہ ان میں بیٹھ کر آرام سے روانہ ہو جاتیں۔

اور میں یہ سوچ کر رہ جاتی کہ آخر میں ان جیسی کیوں نہیں ہوں۔ اپنی کمزور کیوں ہوں۔

پھر جب ابا کی موت ہوئی تو مجھے گھر سے لگتا ہوا۔ زندگی کی گاڑی کو کھینچنے اور مسائل کے انبار کو کم کرنے کے لیے گھر سے جانا پڑا۔ اس کا مشورہ بھی مجھے کی ایک لڑکی زریہ نے دیا تھا جو کئی کئی میں کام کرتی تھی۔ زریہ میری دل جوئی کے لیے میرے پاس آیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”فرح! یہ بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔“

”گھر کے حالات ابا کے بعد خراب ہوتے جا رہے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”اس لیے جاب کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں، لیکن.....!“

”لیکن کیا؟“

”ڈر لگتا ہے مجھے۔“ میں نے کہا۔ ”باہر کی دنیا سے ڈر کی کیا بات ہے۔ فیس تو کرنا ہے نا اور جب مسائل کا سامنا ہی کرنا ہے تو کیوں نہ بہادری سے کروں۔“

جب تک دوا اپنی بزدلی کو در نہ یہ دنیا بھاڑ کھائے گی۔ ”تو پھر تم ہی مشورہ دو میں کیا کروں۔“

”جاب کی کوشش کرو۔“ اس نے کہا۔ ”کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی اگر کبھی تو میں اپنی کمپنی میں بات کر کے دیکھوں۔“

میں نے اس سے ہاں کر دی۔ ایک ہفتے کے اندر ہی اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی کمپنی والوں نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔

اس موقع پر بھی اس نے مجھے سمجھایا۔ ”دیکھو بے دھڑک ہو کر جانا۔ بہادری اور خود اعتمادی کے ساتھ سامنا کرنا۔ ایسا ظاہر مت کرنا کہ تم بہت زیادہ ضرورت مند ہو۔ اپنے انداز اور رویے سے بے پردائی ظاہر کرتی رہنا۔ یوں سمجھ لو جیسے تمہیں اس کمپنی میں جاب کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بلکہ کمپنی کو تمہاری ضرورت ہے۔ ورنہ یہ کہنے قسم کے لوگ مجبور لڑکیوں کو بلیک میل کرنے لگتے ہیں۔“

زریہ نے امی سے بھی بات کر لی۔ امی نے گویا سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جاب کی اجازت دے دی تھی۔ انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں انٹرویو کے لیے زریہ کے ساتھ ہی گئی تھی۔

حالانکہ وہ میرے ساتھ تھی اس کے باوجود میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ٹھنڈے پینے آرہے تھے۔

”بے وقوف سنبالو اپنے آپ کو۔“ زریہ نے کہا۔ ”کوئی یہاں شیر نہیں بیٹھا ہے۔“ لیکن میرے لیے وہ کم بخت منیجر تو شیر ہی ثابت ہو رہا تھا۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر وہ دنگ سا رہ گیا۔

میں یہ بتا چکی ہوں کہ میں کتنی خوب صورت تھی۔ اس کے بعد اس کو میری گھبراہٹ اور مصدمیت بہت پسند آئی تھی۔

زریہ تو اس سے میرا تعارف کروا کے کمرے سے باہر چلی گئی تھی جب کہ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔

”فرح! تمہارے لیے اس کمپنی کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سمجھو کہ تمہاری جاب ہو گئی۔“

”سر! آپ نے میرا انٹرویو تو لیا ہی نہیں ہے۔“ میں نے ہنسنے لگا۔

”ارے چھوڑو انٹرویو کو۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”تمہارا آنا ہی انٹرویو ہے۔ تم کو میں اپنی سیکرٹری اپائنٹ کر رہا ہوں۔“

”لیکن مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے سر۔“

”تجربہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے تم ذہنی طور پر تیار تو ہو جاؤ۔ تمہاری سیکرٹری بہت ہنسنے مسم کروادوں گا۔“

”آپ کی مہربانی ہوگی سر۔“

”چلو ٹھیک ہے کل سے تم اپنی ڈیوٹی سنبالو۔“ اس نے کہا۔

میں اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔ زریہ نے باہر ہی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آ گئی۔ ”ہاں بتاؤ کیا ہوا۔“ اس نے بے تاب سے پوچھا۔

میں نے اپنی اور منیجر کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

”اوہ۔“ اس نے اپنے ہونٹ سیٹھڑے۔ ”تو اس کم بخت نے تم پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔“

”کیا مطلب۔“

”یار میں یہ سمجھتی تھی کہ باس کی سمجیہ کے بعد اس کو عقل آگئی ہوگی۔“ زریہ نے بتایا۔ ”وہ پہلے بھی ایسی حرکتیں کر چکا ہے۔“

”اس کے باوجود تم نے مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔“

”یار سوری میں یہ بھی تھی کہ شاید وہ مدھر گیا ہو گا۔“

”کئی جگہ انٹرویو کے لیے بھی جا چکی ہوں۔ لیکن.....!!“
 ”لیکن کیا۔“ اس نے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ شاید میں
 تمہارے کسی کام آسکوں۔ بلکہ ایسا کرو۔ میرا گھر وہ سانسے
 ہے اگر تم شام کو وقت نکال کر آسکتی ہو تو آ جاؤ۔ میرے گھر
 میں میرے باپ ماں کے علاوہ صرف ہم دو نہیں ہیں۔“

”ہاں معلوم ہے مجھے۔“
 ”واہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”اس قسم کے محلے کا یہی فائدہ
 ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ
 معلوم ہو جاتا ہے، ضرور آتا۔“

”ہاں میں آؤں گی۔“ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔
 دو چار دنوں کے بعد میں اس سے پھر ملی۔ یہ ملاقات
 محلے ہی میں ہوئی تھی۔ وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی۔
 سلیقے کا گھر تھا۔ گھروالے بھی خوش اخلاق تھے۔ اس نے
 مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر بٹھایا تھا۔ پھر میرے لیے
 جوس کا گلاس لے آئی تھی۔

”ہاں اب بتاؤ تم میرے پاس آئی کیوں نہیں۔“ اس
 نے پوچھا۔
 ”شاید سچ تو یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے
 کہا۔
 ”ڈر ایکسا ڈر۔“

”مردوں سے۔“ میں نے بتایا۔ ”گھورتی ہوئی
 نگاہوں سے۔ ان کے تیز جملوں سے ان کی نیت سے اس
 لیے اپنے سانسے سے بھی ڈرتی رہتی ہوں۔“
 ”بے وقوف ہو تم۔“ اس نے کہا۔ ”اس طرح تو تم
 کہیں کی نہیں رہو گی۔ پر اب ہم یہ ہے کہ عورت نے اپنے آپ
 کو کمزور اور مظلوم سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اگر اس دھوکے
 سے باہر نکل آئے تو پھر کسی مرد کی کیا خیال کہ وہ اس کو بری
 نگاہوں سے دیکھ سکے۔ دو منٹ میں آنکھیں نکال کر رکھ سکتی
 ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہمت سے اور بلند حوصلے سے
 کام لو۔“ شاید نے کہا۔ ”ٹھوکر دین میں رکھو سب کو۔ لوگ
 کیا کہیں گے۔ اس جملے نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔
 یہ مت کرو، لوگ کیا کہیں گے۔ وہاں مت جاؤ لوگ کیا کہیں
 گے۔ لعنت ہو پرواہ مت کرو کسی کی۔ پھر سب کچھ خود یہ خود
 ٹھیک ہو جائے گا۔ لڑنے کا حوصلہ پیدا کر لو۔ میں تمہیں
 سکھاؤں گی۔ گر بتاؤں گی۔ اتنا بولنا بنا دوں گی کہ تم بلا

بہر حال میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی اور جگہ تمہاری جاب
 جائے۔“

میں دل برداشتہ سی ہو کر گھر واپس آ گئی۔ ای نے
 میرے اترے ہوئے چہرے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں
 ناکام ہو کر واپس آئی ہوں۔

اس کے بعد اور بھی کئی جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہوا
 لیکن ہر جگہ ای قسم کی صورت حال ہوتی رہی۔ نگاہیں نيزوں
 کی طرح جسم کے پار ہوتی رہیں اور ہوس زدہ باتیں خون
 کے آنسو رانی رہیں۔

میرا وہی حال تھا وہی سہمی سہمی لڑکی۔ خود اپنے
 سانسے سے بھی خوف کھاتی ہوئی۔ شاید اس لیے میری جاب
 نہیں ہوتی ہے کہ ہوس زدہ لوگوں کو تو ایسی بے باک لڑکیاں
 چاہئیں جو ان کے کام آسکیں۔ یہاں تجاب میں لپٹی ہوئی
 لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔
 محلے میں ایک نیا خاندان کرائے دار کے طور پر آیا
 تھا۔

ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ شایدہ اور راشدہ۔ شایدہ شاید
 کسی دفتر میں کام کرتی تھی جب کہ راشدہ کالج جایا کرتی۔
 شایدہ کچھ بے باک قسم کی لڑکی تھی۔ اس کی ڈریننگ
 بھی بہت ماڈرن اور نوکری اور گفتگو بھی بے دھرم ہو کر کر لیا
 کرتی تھی۔

اس کے ماں باپ سیدھے سادے لوگ تھے۔ باپ
 ریٹائر ہو چکا تھا۔ ماں گھر سنبھالا کرتی۔ عام سا گھر تھا۔ جیسا
 ہمارے یہاں ہوا کرتا ہے۔

ایک بار شایدہ مجھے رستے میں مل گئی۔ اس کا گھر
 میرے گھر سے پانچ گھر آگے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا
 دی۔ بہت ہی دوستانہ مسکراہٹ تھی اس کی۔

اس نے کہا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”فرح۔“ میں نے بتایا۔ ”اور تم؟“

”میں شایدہ ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے محلے
 میں نئی نئی آئی ہوں لیکن یہاں سب اترے ہوئے بے زار
 سے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تم فریش فریش سی لگی
 ہو۔ اسی لیے تم سے پہلو ہائے کر لی۔“

اس کی باتیں دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اندازہ ہو گیا کہ
 وہ ایک کھلے دل کی فرینک سی لڑکی ہے۔ ”کیا مشغلہ ہے
 تمہارا؟“ اس نے پوچھا۔

”مشغلہ ہی تو تلاش کر رہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

جھک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکو۔“
اس کی باتوں نے مجھ میں واقعی حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔

میری خود اعتمادی پروان چڑھنے لگی تھی۔ میں اس کے پاس
آئی جاتی رہی۔ اس نے مجھے بہت سے طریقے بتائے۔ بلکہ
یہاں تک ہوا کہ وہ مجھے ایک کرائے سینٹر میں لے گئی۔
جہاں سے اس نے خود کرائے سیکھے تھے۔ (اس کا یہ ہنر مجھے
بعد میں پتا چلا تھا)۔

کرائے کی تربیت نے مجھے کیا سے کیا بنادیا۔
میں وہ لڑکی جو اپنے سائے سے بھی خوفزدہ رہا کرتی
تھی۔ اب عزم و ہمت کی مثال بن گئی تھی۔ ایک بار شاہدہ
کے کہنے پر میں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ دولفر قسم کے نوجوان تھے۔ جو اس وقت ہمارے
پچھے پڑ گئے تھے۔ جب ہم ایک شاپنگ سینٹر سے پیدل ہی
گھر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ یعنی میں اور شاہدہ۔

شام کا وقت تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی ہمیں
احساس ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ کم بخت طرح
طرح کی آوازیں کستے ہوئے ہمارے پیچھے چلے آ رہے
تھے۔

”شاہدہ!“ میں نے شاہدہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہم
سامنے والے راستے سے واپس جائیں گے۔“

”وہ کیوں؟“
”اس طرف لوگ ہوتے ہیں۔ دکانیں بھی ہیں۔ یہ
لوفر ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

”نہیں، ہم تو پچھلے گیٹ سے نکلیں گے۔“ شاہدہ نے
کہا۔

”اس طرف تو بڑا سناٹا ہوتا ہے۔“
”اس لیے تو ادھر سے جائیں گے۔ تاکہ ان دونوں
لوفرز کے ساتھ تسلی سے نمٹا جائے۔“ شاہدہ نے کہا۔ ”اور
ان کی ٹھکانا کی تم کروگی۔“

”میں.....!“
”ہاں تم، تم نے ٹریننگ لی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ آج تمہارا
ٹرائل ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ
ہوں اگر کوئی گڑبڑ ہونے لگی تو میں تمہاری مدد کے لیے
آ جاؤں گی۔“ شاہدہ سے مجھے حوصلہ مل چکا تھا۔ یعنی وہ مشکل
گھڑی میں میرے ساتھ ہوتی۔

ہم پچھلے گیٹ سے باہر آ گئے۔ یہ ایک ویران سارا راستہ
تھا۔ رونقیں سامنے والے گیٹ کی طرف تھیں۔ وہ کمرشل

ہم اپنا نام مسرگزشت

قارئین متوجہ ہوں

برچیا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز
سپینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C نیو ایڈیشنش ڈیفنس بلاک تھری بی بی روڈ، لاہور
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

اسپینڈ تیز کر رہی ہوں۔ تم جان بوجھ کر آہستہ آہستہ چلنا۔“
اس وقت پھر میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ شاید نے
حوصلہ دیا۔ ”بے وقوف لڑکی اسی طرح گھبراتی رہی تو یہ
بد معاش تمہارے اعصاب پر حاوی ہو جائیں گے۔ دو چار
گہری گہری سانس لو اور بھڑ جاؤ ان سے۔ میں آگے
چلی۔“

شاید نے اپنے قدم تیز کر لیے اور میری رفتار سست
ہو گئی۔ اس وقت وہ دونوں لو فر میرے پاس پہنچ گئے۔
”کیا بات ہے جان من تمہاری سیکلی نے تمہیں
ہمارے لیے چھوڑ دیا ہے۔“
”اسی لیے وہ آگے نکل گئی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔
”اچھا ہی ہوا ویسے بھی ہم تو تمہارے چاہنے والے ہیں۔“
اور اس وقت وہ سارے سبق یاد آگئے جو میں نے
ٹریننگ کے دوران سیکھے تھے۔ اس کے علاوہ برسوں کا دبا ہوا
غصہ اور طوفان بھی سامنے آ گیا تھا۔
میں نے ذرا سی دیر میں ان دونوں کو دھنک کر رکھ
دیا۔ ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ ان کی ساری مردانگی ہوا ہو
گئی۔

میں نے انہیں شو کروں پر رکھ لیا تھا۔
ان کی چیخ و پکار سن کر کچھ لوگ بھی آگئے تھے۔ اس
دوران زری نے بھی میرے پاس آگئی تھی۔ اس نے لوگوں کو
صورت حال سے آگاہ کر دیا۔
”واہ بہت اچھے اور ماروم بختوں کو۔“
”میرا خیال ہے اتنی سزا کافی ہے۔“ میں نے کہا۔
”آئیہ سے یہ ہر لڑکی کو اپنی ماں بہن سمجھیں گے۔“

وہ دن میری زندگی کا بڑیکہ قہر تھا۔ مجھے جیسی لڑکی ایسا
کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ذرا سی دیر
میں برسوں کا جما ہوا خوف موم کی صورت پھل گیا تھا۔ اس
کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری خود اعتمادی
بڑھتی چلی گئی۔ اب سارے مرد مجھے کھلوئے محسوس ہونے
لگے۔ برسوں کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔

اور یہ سب کچھ زری نے کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ اس
لڑکی نے مجھے بہادری کے ساتھ جینے کا ہنر سکھایا تھا۔
میں نے اپنی کہانی کے آغاز میں جو واقعہ بیان کیا
ہے۔ وہ اس وقت میرے کام آیا تھا جب میں اچھی طرح
خود اعتماد ہو چکی تھی۔ اب مرد میرے لیے خوف کا باعث نہیں
بلکہ میں ان کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک

اچھے سے دفتر میں ایک اچھی سی جاب بھی مل گئی۔
اس دفتر کے سب لوگ واقعی مہذب تھے۔ نام نہاد
مہذب نہیں بلکہ پھر ڈ لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے
والے۔

اور اس دفتر میں مجھ پر زندگی کے سب سے خوب
صورت تجربے کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ یہ دروازہ تھا
بخت کا۔

ذیشان اس دفتر میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ کہنی کی
طرف سے اسے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ ایک مہذب
نوجوان تھا اور اس سے مل کر اور اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا
کہ وہ آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔

ہم دونوں کے درمیان دوستی اسی طرح ہوئی جس
طرح ایک ہی دفتر میں ایک ساتھ کام کرنے والوں کے
درمیان ہوا کرتی ہے۔

ایک دوسرے سے رکی باتیں۔ پھر ایک دوسرے کی
خیریت معلوم کرنا۔ پسندنا پسند کی معلومات حاصل کرنا۔ پھر
آگے جا کر ختے ختے تحائف وغیرہ۔

میں اور ذیشان بہت تیزی سے ایک دوسرے کے
قریب ہوتے چلے گئے۔ اس کے گھر کے حالات بھی میرے
گھر کے حالات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہی زندگی کی
بھاگ دوڑ وہی خواہوں کا تسلسل۔ سب کچھ ایک ہی جیسا
تھا۔ اس لیے ہم میں بہت بے تکلفی ہی ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہی
ہم دونوں کے ساتھ ہوا۔ پورے دفتر کو ہماری اسیت کا پتا
چل گیا تھا۔

دفتر کی لڑکیاں اور لڑکے ہمیں چھیڑا کرتے اور
سارک بادویوں کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ گویا بہت ہی
خوشگوار صورت حال تھی۔

ہم دونوں کے گھر والوں کی طرف سے بھی کوئی
اندیشہ نہیں تھا۔ یعنی ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم
بہت آسانی سے ایک دوسرے کے ہو سکتے تھے۔

میں نے ذیشان کے بارے میں زری نے کبھی سب کچھ
بتا دیا تھا۔ وہ بھی خوش ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس
نے یہ نصیحت بھی کی تھی کہ مکمل طور پر کسی مرد کے سامنے
سرینڈر مت کرنا۔ اس کو پرکھنا، کیونکہ تم مردوں کے رویے
دیکھ چکی ہو۔

”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ

کراٹھایا ہے۔ میں ڈیشان کو کئی بار پرکھ چکی ہوں۔ وہ اعتماد کے میزان پر پورا اترتا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”سنو تم ایسا کرو۔ میں تمہیں ڈیشان سے ملوا دیتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں کیا کروں گی مل کر۔“

”تم اس کو اپنے پوائنٹ آف ویو سے جانچ لو گی اور تمہیں یہ اطمینان بھی ہو جائے گا کہ تمہاری دوست نے کوئی گھائے کا سودا نہیں کیا ہے۔“

ڈیشان بھی ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے ایک شام ڈیشان کو شاہدہ سے ملوا ہی دیا اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

شروع شروع میں تو اس کا احساس نہیں ہو سکا تھا لیکن جب میں نے ڈیشان کے رویے کو بدلتے ہوئے دیکھا تو کھٹک گئی۔

پہلے ہر دوسرے تیسرے دن وہ میرے ساتھ ہی دفتر سے نکلا کرتا۔ اپنی گاڑی پر مجھے ڈراپ کر دیتا، ہم راستے میں کسی ریستوران میں بیٹھ جایا کرتے۔ ہنستے رہتے، ایک دوسرے کو مزے مزے کی باتیں سنایا کرتے۔

اب وہ کام کا بہانہ کر کے دفتر میں ہی بیٹھا رہتا اور مجھ سے معذرت کر لیتا۔ مجبوراً مجھے اکیلے آنا پڑتا۔ میں نے اس کے رویے کو اس وقت تک خاص اہمیت نہیں دی۔ جب تک میں نے اسے شاہدہ کے ساتھ نہیں دیکھ لیا۔

میں نے اتفاقاً ان دونوں کو ایک شاپنگ مال سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ مجھ پر تو جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔

یہ کیا تماشا تھا۔ یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ کیا رہا تھا دونوں کے درمیان۔

میرے خدا میں نے تو ان دونوں کی ملاقات کروا کے اپنے پیروں پر کھڑی ماری تھی۔ مجھے ان دونوں ہی سے ایسی امید نہیں تھی۔

کیا ہوا تھا ڈیشان کو اور کیا ہوا تھا زینہ کو۔ وہ میری خوشیوں کی قاتل کیوں بنتی جا رہی تھی۔ وہ تو اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ڈیشان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

ایک دن دفتر میں ڈیشان کے کمرے میں جا کر میں پھٹ پڑی۔ ”ڈیشان صاحب مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ

آج کل آپ کا رویہ اجنبی جیسا ہو گیا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیا اندازہ ہوا ہے۔“

”شاہدہ نے تم کو ٹریپ کر لیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اپنی آنکھوں سے تم دونوں کو دیکھ چکی ہوں۔“

وہ خاموش رہ کر میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

”بتاؤ کیوں کہا ہے ایسا۔“ میں نے پوچھا۔ ”میری محبت میں کیا کی رہ گئی تھی؟“

”میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“

وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم خود اپنی دوست سے جا کر پوچھ لو وہ تمہیں بتا دے گی۔“

میں دفتر سے سیدھی شاہدہ کے پاس چلی گئی تھی۔

”اوہو! آؤ بہت دنوں کے بعد آئی ہو۔“

”شاہدہ تم ایک باکمال لڑکی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے کیا دوستی نبھائی ہے میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح ڈیشان کو مجھ سے چھین کر لے جاؤ گی۔“

”دیکھو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”یہ مت کہو ایسا ہی ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈیشان نے خود اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکی اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا کی گئی تھی مجھ میں۔“

”اب اگر بات کھل ہی گئی ہے تو میں یہ بتا دوں کہ تم میں کیا کی گئی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”تم میں اس ہنر کی کمی ہے مرد جس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تم گرم جوش نہیں ہو۔ تم میں خوب صورتی کے باوجود پھیکا پن ہے اس لیے مرد ابتدا میں تو تمہاری خوب صورتی سے متاثر ہو جائیں گے لیکن پھر وہ تم سے پورے ہوئے لگیں گے۔ جس طرح ڈیشان ہوا ہے۔“

”شاہدہ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے جہاں مجھے بہت کچھ سکھایا ہے وہاں یہ سب کیوں نہیں سکھایا۔“

”فرخ اب جاؤ کسی اور کو تلاش کرو۔ ڈیشان اب تمہاری طرف واپس نہیں آئے گا۔ ہم بہت جاگمگنی کر رہے ہیں۔“

میں بہت دلی شکستہ سی شاہدہ کے گھر سے باہر آ گئی۔

اس نے ایک ہنر اپنے پاس رکھا تھا۔ جس طرح لمبی نے شیر کو سب کچھ سکھادیا یا سوائے ایک ہنر کے۔



زہر کا پیالہ

مدیر محترم

سلام تہنیت

ایک سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں گو کہ اسے میں نے سچ بیانی کے انداز میں نہیں لکھا ہے، بالکل فلمی انداز میں واقعات لکھے ہیں لیکن قارئین کو یہ انداز بھی پسند آئے گا۔

تفسیر عباس بابر
(چیچہ وطنی، ساہیوال)

تھے۔ ملک نور کے سامنے چھوٹی سی میز پر ایک پیالہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں سرخ الاثر زہر تھا، اور وہ مارنے والے کو اپنے ہاتھوں سے پینا تھا۔ یہی اس ہستی کی رسم تھی۔ ملک نور گاؤں کا کرتا دھرتا تھا، اس کا فیصلہ گویا عدالت کا آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہوئے دونوں حریف ایک لمحے کے لیے رکے اور موڑھے پر پڑے ہوئے زہر کے پیالے کو دیکھنے لگے۔ دونوں پس و پیش اور تذبذب سے دوچار تھے۔ ”مقابلہ شروع کیا جائے“ ایک بھاری آواز گونجی۔ ”مقابلہ کا وقت چندہ منٹ ہے۔ ہارنے والے کو فوراً سے پہلے زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔“

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شہزاد اور شہباز آسنے سامنے کھڑے تھے۔

”کہا تھا ناں! تم ہی دستبردار ہو جاتے۔“ شہباز نے سرگوشی کی۔

”دستبردار ہوتا تو بھی مرجاتا“ شہزاد نے مقابلے سے پہلے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور جب مرنا ہی ہے تو پھر پشیمانی کیسی؟ سقراط نے بھی زہر کا پیالہ پینا تھا۔“

موسم سرما کے ابتدائی ایام تھے، تاہم دن کے اوقات میں قدرے گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ شہزاد اور شہباز کی پیشانیوں پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اغلب امکان یہی ہے کہ یہ موت کا پینا تھا، یا ہار کر گوہر مقصود کو کھودینے کا، لیکن یہ طے ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی موت سے خوف زدہ نہیں تھا۔ دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ

دونوں حریف مقابلے کے لیے تیار تھے۔ یہ کوئی عام نہیں، موت کا مقابلہ تھا۔ جو ہارتا اس کی موت یقینی تھی۔ یہی پہچانیت کے بڑوں نے صدیوں سے اس علاقے میں چل رہی رسم کے مطابق طے کیا تھا۔ دونوں حریف کڑیل جوان تھے۔ ایک کا نام شہباز تھا، اور دوسرا شہزاد۔ دونوں کے سچ کوئی سیاسی یا مذہبی خاصیت نہیں تھی۔ بس رقابت تھی۔

گاؤں سے کچھ فاصلے پر ملک نور کے کھیتوں میں میدان سجایا گیا تھا۔ لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ کچھ تجسس تھے، کچھ انصرہ، سچ تو یہ ہے کہ تماشا شائق بہت کم تھے کیونکہ اس اکھاڑے میں ایک کی موت یقینی تھی۔ شہزاد یا شہباز میں سے ایک کو مرنا تھا، زندہ رہنے والے کو گوہر مقصود ملنا تھا۔ جوں جوں مقابلے کا وقت قریب آ رہا تھا، دلوں کی دھڑکنیں تیز اور بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ سب کے چہرے ملول و انصرہ تھے۔ دونوں حریف گاؤں بھر میں مقبول تھے۔ ان کی ذات اور کردار سے کسی کو تکلیف یا شکایت نہیں تھی۔ بالآخر خونی مقابلے کا وقت آن پہنچا۔ ملک نور اپنے حواریوں کے ساتھ موڑھے پر برابر جمان تھا۔ وہ حقے کی نئے دانتوں تلے دبائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ میدان کے چاروں اطراف گول دائرے کی صورت میں رسا باندھ دیا گیا تھا۔ بچے بوڑھے جوان اور متعدد بوڑھی عورتیں، دائرے کی شکل میں مقابلے کے منتظر تھے۔ دونوں نے حریف مد مقابل ہونے تو دلوں کی دھڑکنیں بھرپور احتجاج کرنے لگیں۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو قتل رہے

”ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بہت دور۔“ وہ رونے لگی۔ ”بس مجھے میرا بیٹا دے دو۔“

شہزاد کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے استہزائیہ نظروں سے شہباز کی طرف دیکھا، اور بولا۔ ”اپنی بوڑھی ماں کا خیال، کرو یار، دستبردار ہو جاؤ۔“

”نہیں شہزاد، اب تو عزت اور مردانگی کا مسئلہ بن گیا ہے۔ میں اس میدان میں مروتو سکتا ہوں، چھوڑ نہیں سکتا۔“

”نہیں بی بی، تو چنچائیت کے فیصلے میں دخل مت دے۔“ ملک نور بولا۔ ”ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ مقابلہ ملتوی ہوا ہو۔“

صفری کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بن بائی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی، لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ چند بزرگ افراد نے آگے بڑھ کر اسے میدان سے باہر نکال دیا۔ وہ چپٹی چٹائی بیہوش ہو چکی تھی۔

☆.....☆

ملک کو آزاد ہونے 18 سال ہو چکے تھے، کہ جنگ کا غلغلہ اٹھا۔ دونوں ممالک کی فوجیں کمر کئے لگیں۔ ہتھیار تیار

ڈالے تو ان کے توانا باز دوس کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ دونوں صحت مند اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ شہباز والی بال کھینٹا تھا، اور شہزاد کبڈی کا اجمرتا ہوا کھلاڑی، لیکن اس مقابلے میں لڑائی کی شرائط لاگو نہیں تھیں۔ بس کسی بھی طرح حریف کو زہر کے پیالے تک پہنچانا تھا۔ اور دونوں مروتو ڈکوش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ دونوں باقاعدہ متحرک ہوتے۔ اچانک ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ دونوں نے ٹھٹک کر مجمع کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیر عمر خاتون، بیشکل رسا مچھلا گئی ہوئی، ملک نور کی جانب بھاگتے ہوئے بڑھنے لگی۔ چند گھنٹوں بعد وہ اس کے رو برو کھڑی تھی۔

”ہمیں کچھ نہیں چاہیے ملک نور، وہ انتہائی انداز میں بولی۔ ”میرے بیٹے شہباز کو میرے ساتھ جانے دیں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“

”میدان چھوڑنے سے مر جانا بہتر ہے اماں۔“ دور سے شہباز بولا۔ ”تو بچ میں مت آ۔“

”یہی مقابلے کا اصول ہے صفری بہن۔“ ملک نور زری سے بولا۔ ”ورنہ یہ پتلاش اور خاصیت زندگی بھر ہوتی رہے گی۔“



”ہاں ہاں میری فصلیں تو ہمیں ہری بھری نظر آ رہی ہیں۔“ رشید نے درمختی سے کہا۔ ”تم جتنے موٹے ہو، تمہاری عقل بھی اتنی ہی موٹی ہے، اس لیے عقل کے اندھے بھی ہو۔“ عبدالغنی نے کسی کے دستے پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے جمایا، اور غرا کر بولا۔ ”دیکھو رشید، بدزبانی اور گالی گلوچ سے مجھے بڑی چڑ ہے، منہ سنبھال اور یہاں سے چلتا پھرتا نظر آ، ورنہ.....“

”ورنہ..... ورنہ کیا؟“ رشید دہاڑا۔ ”کیا کرے گا تو، دھمکی دیتا ہے؟ مجھے کسی مارے گا؟“

”ہاں، میں مار بھی دوں گا۔“ وہ بھی دہاڑ کر بولا۔

”چل اپنی ماں کا دودھ پیابے تو مارا۔“ رشید کو بھی طیش آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے عبدالغنی کی ”کسی“ اس کے سر میں اتر گئی۔ چہرہ لہو میں تر ہوا، تو منتظر وندلانے لگے۔ وہ نیم جاں ہو کر پگھڑی پر گر گیا۔ اس کا لہو بہتے ہوئے پانی میں شامل ہو کر فصلوں کو سیراب کرنے لگا۔ ضرب کاری بھی، کسی کی تیز دھار نے دماغ تک رسائی حاصل کی اور اسے ترہنے کا موقع تک نہیں ملا۔ عبدالغنی نے کسی پھیگی اور کما کی فصلوں میں غائب ہو گیا۔ بالآخر یہ فیصلہ بھی پچائیت تک پہنچا۔ عبدالغنی پکڑا گیا اور اس نے اقرار جرم بھی کر لیا۔ اس سے پہلے کہ فیصلہ سنایا جاتا، رشید کی جواں سال خوبرو بیٹی رملانے عین فیصلے کے وقت تیز دھار کھلاڑی عبدالغنی کے سر میں اتار دی۔ پچائیت کے بڑے اور گاؤں کے دنگر لوگ اکشت بدعیاں تھے کہ ایک نازک اندام لڑکی نے بھری پچائیت میں قتل کر دیا۔

”اب اس کا کیا ہوگا ملک نور؟“ پچائیت کا بزرگ ملک اللہ یار شکر لہجے میں بولا۔

”کیا تو اس نے غلط ہی ہے ملک جی، پردہ اس کا باپ تھا۔ اس کا باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اسلام میں بھی ضرب کا بدلہ ضرب اور قتل کا بدلہ قتل ہے۔“ ملک نور نے دلیل دے کر گویا اپنا فیصلہ سنایا۔

ملک نور کھینچی انداز میں سر ہلاتا ہوا اٹھا تو لوگ منتشر ہونے لگے۔

”اب یہ کہاں جائے گی ملک صاحب۔“ ایک اور بزرگ نے غصے اور خوف کی شدت سے نیم بیہوش رملہ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ اب میری پاس میری بیٹی بن کر رہے گی۔“ یہ فیصلہ بھی اہل تھا۔ وقت گزرا تو رملہ بھی سنبھل

ہونے لگے۔ جو جوانوں کو جنگلی تربیت اور داؤ پیچ سکھائے جانے لگے۔ یہ دونوں بھی جنگی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ شہزاد اور شہباز، دونوں بہت اچھے دوست اور بھائیوں کی طرح تھے۔ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے، ایک ہی محلہ حتی کہ دونوں کے گھروں کی دیوار بھی مشترک تھی۔ بس گھروں کے درجہ جدا تھے، لیکن یہ بڑی بات نہیں تھی۔ ایک دو بچے کے گھروں میں بلا جھجک آنا جانا تھا۔ شہباز کے ابا تقسیم کے وقت بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے جبکہ شہزاد کے ابا کچھ سال پہلے طبی موت مرے تھے۔ دونوں ملک پور گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ دونوں دراز قامت سرخ و سپید اور خوروتھے، ہم عمر بھی تھے اور قابل تعریف کردار کے حامل بھی۔ ملک پور ساہیوال کا ایک پسماندہ ترین گاؤں تھا۔ ان دنوں ساہیوال کو ٹنکری کہا جاتا تھا۔ بڑے بچے کے کھنڈرات کے قریب سے ایک جہتی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی، ملک پور کی طرف جاتی تھی۔ بمشکل تانگا دستیاب ہوتا تو قسمت، ورنہ عمومی طور پر لوگ پیدل سفر کرنے کے عادی تھے۔ ملک پور میں قانون کی بالادستی کا تصور بھی محال تھا۔ اگر کبھی کوئی نا خوشگوار واقعہ پیش آ جاتا تو فیصلہ پچائیت کے بڑے بزرگ کرتے اور وہ فیصلہ حتیٰ اور اٹل ہوتا۔ گاؤں کے بڑوں میں سب سے معتبر اور معزز نام ملک نور کا تھا۔ شکل و صورت اور قد و قامت سے ہی وہ ایک انتہائی اثر انگیز اور سخت شخصیت کا حامل نظر آتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، اور بڑی بڑی آنکھیں اسے ممتاز کرتی تھیں۔ تاحہ نگاہ اسی کی زمین تھی۔ اس کے اہل و عیال میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں، جو کہ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ ان کی بیگم کو ایک سال پہلے ہارٹ ایک ہوا، اور وہ رانی ملک عدم ہو گئیں۔ یہ ایک بہتی ہوئی دوپہر کا واقعہ ہے، جب فصلوں کو پانی دینے کی باری پر عبدالغنی اور خورشید خان میں جھگڑا ہو گیا۔ یہ دونوں ملک پور کے رہائشی اور جموٹے زمیندار تھے۔ عبدالغنی نے عین اس وقت پانی کا ناکہ اپنے کھیتوں کی طرف کھول دیا، جب رشید خان نے اپنی فصلوں کو پانی دینا تھا۔ اسی لمحے رشید خان وہاں پہنچ گیا، اس کے تیرا اچھے نہیں تھے۔

”عبدالغنی کوئی شرم حیا بھی ہوتی ہے۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”نہیں پتا بھی ہے آج میری باری ہے۔“

”باری ہے تو کون سی قیامت آگئی ہے۔“ عبدالغنی بھی ہتھے سے اکڑ گیا۔ ”دیکھو تو میری فصلیں سوکھ رہی ہیں۔“

جل تریگ بجانے لگتیں۔ وہ چوڑیوں کی ایک دکان برآئی اور رنگ برنگی چوڑیوں کو دکھتے ہوئے بولی۔ ”ثریا! تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟“

”جو تمہیں پسند ہو وہی لے لو۔“ ثریا بھی چوڑیوں پر نظر جماتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی۔

”مجھے تو یہ پسند ہیں۔“ اس نے سیاہ رنگ کی چوڑیوں پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنے اور ثریا کے لیے مختلف رنگ کی چوڑیاں خریدیں اور جھولے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی لمحے جھولے کے قریب اسے خود اور جواں سال شہباز دکھائی دیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ اس طرف مرد حضرات کا داخلہ قطعی ممنوع تھا۔ مٹھا شہباز کی سرسری نظر اس پر پڑی۔ چند لمحوں کے لیے وہ مبہوت سا ہوا۔ پھر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دونائی بندوق کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے میلے کے جھوم میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ وہ اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس مزاج کی حامل ہی نہیں تھی۔ اسے تو حیرت نے ادھر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ شہباز نے سفید رنگ کے پاجامے کے ساتھ طیلے رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں موچی کے ہاتھ کا بنا ہوا پیش قیمت سنہری کھس، ٹھنکریالے لمبے اور سیاہ بال، چھوٹی سی داڑھی اور لمبوں پر دلی سی مسکراہٹ۔ بلاشبہ وہ ایک اثر انگیز سراپا کا لک تھا لیکن یہ بھی کم نہ تھی۔ اپنے حسن بیکراں کی مملکت کی ملکہ عالیہ ہے، اس نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تھا، یہ بات رملاکو بھی کھٹکی تھی لیکن اس نے زیادہ سوچنا ضروری نہیں سمجھا۔

”ہونہ۔۔۔۔۔۔ یہ ڈھنگرا یہاں کیا کر رہا ہے؟“ وہ بڑبڑائی تو ثریا کا قبچہہ بلند ہوا۔ وہ اسے مصنوعی حنفی سے گھورتے ہوئے بولی۔

”یہ تمہارے دانت کیوں نکل رہے ہیں؟“
”وہ ڈھنگرا۔۔۔۔۔۔“ وہ بات مکمل نہ کر پائی اور پھر ہنسنے لگی۔
”تو اور کیا؟ ڈھنگرا ہی تو ہے، ملک بابا سے پوچھوں گی یہ ادھر کیا کر رہا تھا۔“

ثریا انجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”گر وہ اس طرف آیا ہے تو ملک صاحب کے علم میں ضرور ہوگا کیونکہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے انہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔“
”کیوں ایسا کیا ہے؟“ وہ منتظر ہوئی۔
”شاید تمہیں معلوم نہیں ملک نور کی پڑوسی گاؤں کے ملک خدا بخش سے پرانی دشمنی چلی آرہی ہے۔“ وہ دونوں

گئی۔ اس کے شب وروز ملک نور کی حویلی میں گزرنے لگے۔ عبدالغنی کی بیوی اور بیٹی بھی اس فیصلے پر خاموش تھیں، کیونکہ یہاں یہی ہوتا تھا۔ لوگ ناخواندہ مگر انصاف کے قائل تھے۔ رملاکو بھی کبھار گھر سے باہر نکل جاتی تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے آگے بھر کے دیکھتا ایک تو عبدالغنی کا لٹل اور اوپر سے ملک نور کی سرپرستی، وہ سب کے لیے قابل احترام تھی۔ اس کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ جو اسے دیکھتا اسے پلک جھپکنے کا خیال کم ہی آتا تھا، لیکن گاؤں کے نوجوان اس سے خائف تھے، اور اس سے زیادہ خوف انہیں ملک نور کا تھا۔

”ملک بابا!“ میں بھی میلے میں جاؤں گی۔“ اس نے اتنے پیار اور مصوویت سے کہا کہ ملک نور بیساختہ مسکرا دیا اور بولا۔ ”دبی رانی، تمہیں روکا کس نے ہے۔ تم بلا جھجک جاسکتی ہو۔ ویسے بھی کس مائی کے لال میں اتنی برأت ہے کہ میرے شیر پتر کو آگے اٹھا کر دیکھے۔“ اس نے اپنا مضبوط ہاتھ رملاکے سر پر رکھا تو اسے باپ کی شفقت یاد آنے لگی۔ اس سے پہلے کہ اس کے تیر گم آٹسو پکلوں کی سرحد عبور کرے وہ بولا۔ ”پر پتر اپنے ساتھ ثریا کو لے جانا۔“

”جی بابا۔“ اس نے ضبط کے بند کو بائیں ہاتھ، اور ملک پور کے قدیمی میلے میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

☆.....☆

وہ میلے میں کیا آئی اس نے تو میلہ ہی لوٹ لیا۔ ہر نظر اس پر نچھاور تھی، ہر ایک تہہ دل سے اس پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ سیاہ رنگ لباس میں اس کی سرخ و سفید رنگت جیسے بادلوں کی اوٹ سے چاند جھلک رہا ہو۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی تو میلے کا رنگ دوبالا ہو جاتا۔ ثریا اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکی ہوئی تھی کہ مبادا اسے کوئی اٹھا کر بھاگ نہ جائے۔ ثریا بھی جواں سال اور خوش شکل تھی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی میلے میں گھوم پھر رہی تھیں۔ زرق برق لباسات میں آس پاس کے گاؤں سے آئی ہوئی لڑکیاں ادھیڑ عمر عورتیں اور بچہ بچی میلے میں شریک تھے۔ یہ بازار صرف خواتین اور بچوں کے لیے مختص تھا۔ اس طرف مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ قطار در قطار جی ہوئی دکانیں جلیبیوں کے تھال، پکڑوں سموسوں کی اشتہا انگیز خوشبو اور بچوں کے کھیلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بازار کے اختتام پر جھولے نصب تھے جنہیں ایک ادھیڑ عمر بدوق صورت آدمی ہاتھ سے چلا رہا تھا۔ ادھر جھولے کی رفتار ذرا سی تیز ہوئی ادھر جھولا جھولتی لڑکیوں کی سریلی جینیں کانوں میں

ہاتھیں کرتی ہوئی مست سرکار کے دربار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مست سرکار یہاں مدتوں پہلے آکر آباد ہوئے اور یہیں ان کی موت ہوئی تھی۔ ملک پور کا میلہ انہی سے منسوب تھا۔ دربار کا عقیقی حصہ قبرستان کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں دربار کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ رملہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ اس نے دربار کے مرکزی دروازے کے باہر ایک اور سرخوہو جوان کو دیکھا۔ وہ چاقو جو بند کھڑا تھا اور اس کی تقابلی نگاہیں چاروں اطراف کے جائزے میں مصروف عمل تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نظر رملہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی ذمہ داری میں مگن ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر رملہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے متعدد اسلحہ بردار نظر آئے، اسے شریا کی بات پر یقین ہونے لگا۔ جو دشمنی چل رہی ہے اسی خطرے کے پیش نظر یہ انتظام ہے۔ دشمنی کی وجہ کیا ہے یہ اسے پتا نہ تھا اسی لیے وہ جس لمحے میں بولی۔

”ملک بابا اور ملک خدا بخش کی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟“
 شریا بولی۔ ”یہ بڑی لمبی بات ہے۔ یہ دونوں پیچیرے بھائی بھی ہیں اور ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی۔“ وہ دربار کی کوتاہ قامت دیوار سے لگ کر باتیں کر رہی تھیں۔ لمحائی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ”ابا کہتا ہے کہ ملک نور کو ملک خدا بخش کے گاؤں مہراب پور میں غضب کا عشق ہوا تھا لیکن وہ لڑکی خدا بخش کی منگیت تھی۔ کہتے ہیں عشق اور محبت کبھی نہیں چھوٹے۔ جب یہ عشق کی کہانی زبان زد عام ہوئی تو ملک خدا بخش نے اپنی منگیت کو اٹھوایا اور اسے خوب مارا۔“
 ”ہائے اللہ، ایسا تھوڑی ناں ہوتا ہے؟“ رملہ نے تھیر آئیر لہجے میں آنکھیں پھیلائیں۔

”ایسا ہی ہوا تھا۔“ وہ بولی۔ ”برادری کے بڑوں نے اس ہاجرہ نامی لڑکی کو ملک خدا بخش سے بازیاب کروایا اور جب اس سے اس کی مرضی پوچھی گئی تو اس نے ملک خدا بخش سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“
 ”پھر؟“

”پھر وہی ہوا جو یہاں کا رواج ہے۔ ملک خدا بخش تو مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ ہتچائیت نے فیصلہ کیا کہ دونوں آپس میں مقابلہ کر لیں، جو جیتے گا ہاجرہ اس کی ہو جائے گی اور جو ہار جائے گا اسے ہمرے میدان میں زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔“

”ہائے اللہ، زہر کا پیالہ؟ پھر مقابلہ ہوا؟“

”نہیں، جسمانی لحاظ سے ملک خدا بخش، ملک نور کی نسبت کمزور تھا۔ لہذا وہ موت کے مقابلے کی بجائے ہاجرہ سے دستبردار ہو گیا۔ تب سے اب تک دشمنی چلی آ رہی ہے۔“
 ”اور ہاجرہ بی بی کا کیا ہوا؟“ رملہ کی دلچسپی فزوں تر تھی۔

”لے دس، جنہیں یہ بھی نہیں پتا، وڈی ملکانی ہاجرہ بی بی ہی تو تھیں، پچھلے سال ہارٹ ایک نے ان کی جان لے لی۔“
 ”اچھا، مجھے معلوم نہیں تھا، کیونکہ انہیں سب وڈی ملکانی کے نام سے ہی جانتے تھے۔“

مذکورہ کہانی کی تفصیلات میں ان دونوں کو وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ سادوں بھادوں کے جس زندہ ایام تھے۔ جسم پسینے میں شرابور ہونے تو انہیں گرمی کی شدت کا احساس ہوا۔ دونوں نے مست سرکار کے دربار پر حاضری دی، اور اپنی اپنی مٹیں مائیں۔ وہ دربار کے در سے باہر نکلیں تو وہی دو آنکھیں ایک لمحے کے لیے رملہ کے دلکش چہرے پر مرکوز ہوئیں۔ اس کی نسوانی حس نے اسے خبردار کیا کہ دو آنکھوں کی گراہٹ اس کے وجود کا طواف کر رہی ہیں۔

”اب یہ کون ہے۔“ اس نے شریا سے استفسار کیا۔
 وہ ہلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”یہ بھی ڈشکر ہے۔“ اور پھر دونوں کی چوڑیوں کی کھٹک اور سریلے ہتھکڑیوں کا جلت رنگ بچ اٹھا۔

”اس کا نام شہزاد ہے۔ اپنے ہی گاؤں میں رہتا ہے۔“
 شریا بتانے لگی۔ ”شہزاد اور شہزاد اپنے ملک صاحب کے بہت چہیتے ہیں۔ دونوں انتہائی نڈر اور بہادر ہیں۔ سنا ہے حکومت نے انہیں جنگی خدمات کے لیے تربیت دی ہے، لیکن فی الحال جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے، اس لیے اب ملک صاحب کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔“

”چل، ہمیں کیا لیتا ایسی باتوں سے؟ میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔“ رملہ نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ مرکزی دروازے کے سامنے برآمدہ کے درخت کے نیچے کھڑے شہزاد اور شہزاد باتیں کر رہے تھے۔ معاشرہ شہزاد کی ستائشی نظر نے رملہ کی دید کی سعی کی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ تھی۔

”ہونہہ ڈشکر۔“ وہ ناک کو سٹو کر بولی اور شریا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسم نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ چلپلائی دھوپ کو سیاہ بادلوں کی دیر تہہ نے پسا کر دیا۔ اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، اور پھر ان تیز تند

ہواؤں نے شدت اختیار کر لی۔ گھنے سیاہ بادل آسمان کے کشادہ سینے پر پھیلنے لگے، یہ تیز دھند ہواؤں کی کارستانی تھی۔
 ”ہائے اللہ، کیا یہ ہوگا۔“ رملانے ثریا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، لیکن افراتفری میں ان دونوں کے ہاتھوں کا بندھن ٹوٹ گیا۔ گردوغبار نے مناظر کو دھندلا دیا اور ثریا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ عین اسی وقت اس نے ثریا کی چیخ سنی۔ گردوغبار اور تیز دھند ہواؤں نے میلے لوہے کی طرح شروع کر دیا۔ اب جس کا جدر منہ اٹھا وہ اندھا دھند ہی طرف بھاگتا چلا گیا۔ بچوں لڑکیوں اور عورتوں کی چیخ و پکار، مردوں کی تنہائی آوازیں۔

عجیب ماحول بنا گئے۔ ہوانے طوفانی انداز اختیار کر لیا۔ دھندلی آنکھوں سے اس نے ایک منظر دیکھا۔ دو نیم شیم آدی ثریا کو پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ وہ بلا ارادہ اس کی طرف بھاگی۔ ہوا کے تیز پھیرے نے اسے اٹھا کر کئی فٹ چھپے چھپک دیا۔ اس کی آنکھیں مٹی اور پانی سے بھر گئیں۔ ثریا کی پٹیلیں معدوم ہونے لگیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بلیوں کے ایک قتل میں گری ہے۔ اسے اپنے جسم پر پیٹنے کی چھچھاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ برق رفتاری سے نیچے کودی اور کسی سمت کا تعین کیے بغیر سر پٹ بھاگنے لگی۔ کوئی سست تھی بھی نہیں، ہواؤں کی عبادت عروج پر تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی کئی لوگوں سے ٹکرائی۔ اس کے سر کا دوپٹا ہواؤں کی گستاخی نے چھین لیا تھا۔ بے سمت بھاگتی ہوئی اچانک وہ کسی کہنی چیز سے ٹکرائی۔ اس کی چیخ ہواؤں کے شور میں تحلیل ہو گئی۔ اسے اپنی پیشانی پر شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ زخم خاصا گہرا تھا اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہوا کے پھیرے نے دوبارہ اسے اس کہنی چیز کی طرف پھینکا۔ اس بار اس نے ہمت جمع کی اور اس کہنی چیز کو تھام لیا۔ یہ بچوں کا جھولا تھا، جس پر کچھ دیر پہلے لڑکیاں جھولے لیتی ہوئی خوشی سے چیخ رہی تھیں۔ جیٹیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن انداز بدل گیا تھا۔ اب ہواؤں کی سنناہٹ میں خوفزدہ چیخوں کا شور تھا۔ اس نے جھولے کو کس کر پکڑ لیا۔ ہوا کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جتنی بھی بہادر اور نڈر طرح مگر تھی تو ایک نازک اندام لڑکی، عالم خوف میں اس کے ہاتھ سے جھولا چھوٹ گیا۔ وہ غیر متوازن ہو کر لڑکھرائی اس سے پہلے کہ وہ بچہ گرتی دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

☆.....☆

وہ دونوں سر جھکائے ملک خدا بخش کے سامنے کھڑے

ملہ نام مسرگروشت

تھے۔ وہ رعونت زدہ انداز میں سر کندوں کے مونڈھے سے ٹپک لگے بیٹھا انہیں تہہ بار نظر دے رہا تھا۔ اس کے دیگر حواریوں کی نگاہیں بھی اُن دونوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔

شہر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ملک خدا بخش کا ڈیرہ تھا۔ جہاں ہر برائی پختی تھی۔ ہر ظلم پروان چڑھتا تھا۔ دن کے پچھلے پہر طوفانی بارش کے بعد کاجس جان لیوا تھا۔ ایک ماریل سا لمبا ترنگا آدی اس کے دائیں جانب کھڑا ایک بڑا سادتی پنکھا مسلسل ہلاتا رہا تھا۔ پنکھا بھور کے چوں سے تیار کر کے اس کے اوپر نیلے رنگ کا کپڑا چڑھا دیا گیا تھا۔ غصے کے ساتھ اس کی سرخ جھار تو اتر کے ساتھ متحرک تھی۔ پنکھا بردار ذرا سست پڑتا تو ملک کی سرخ غصیلی آنکھیں ناگواری سے اس کی طرف اٹھ جاتیں اور اسی لمحے پنکھا بردار کے ہاتھوں میں تیزی آجاتی۔ قطار در قطار مونڈے بان کی چار پائیوں پر بیٹھے ہونے اس کے کاندے شکلوں سے ہی چھپے ہوئے بد معاش لگ رہے تھے۔ ٹاہلی کے گھنے درخت کے نیچے گویا عدالت لگی ہوئی تھی۔ چند فلائنگ کے فاصلے پر پنڈہ اور چوڑی اینٹوں سے تیار شدہ چار کرے تھے۔ ڈیرے کا مرکزی گیٹ بند کر کے زنجیر چڑھا دی گئی تھی۔ توت کے درخت کے نیچے دو بل ٹیرتیر کتوں کی خوفناک آنکھیں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”دل تو کرتا ہے تمہیں ان کتوں کے آگے ڈال دوں“ ملک خدا بخش اپنی ٹوک دار مونچھ کو مروڑتے ہوئے غرایا۔ ”بالکل ٹکے ہو، کسی کام کے نہیں ہوتے دونوں۔“
 ”وہ جی.....“ شرفو نے کہا تھا کہ یہی رملانی بی ہے۔“
 شرفو کے ساتھ کھڑا ہوا رمضان منٹایا۔ ”اور ملک جی اوپر سے طوفان نے تو اندھا کر کے رکھ دیا تھا۔“

شرفو ہمت کر کے بولا۔ ”ملک جی اگر طوفان نہ آتا تو ہم تو دونوں کو ہی اٹھانے والے تھے۔“

”یکو اس بندہ کر، طوفان تو اب آئے گا جب تیرے پو ملک نور کو شک پڑے گا کہ یہ سب ہمارا کیا دھرا ہے۔“ وہ دہاڑ کر بولا۔ ”اٹھانے رمل کو گھسے تھے اور نہ آئے اس کی نوکرائی کو۔“

”ملک جی غلطی ہو گئی،“ رمضان آہستگی سے بولا۔
 ”غلطی نہیں، بیوقوفی کہو، اب وہ چوکنے ہو جائیں گے اور ہمیں موقع نہیں ملے گا۔“

”ملک جی ایک موقع اور دے دیں“ شرفو بولا۔ ”بس

کچھ ہی دنوں میں رملہ آپ کے قدموں میں ہوگی۔“

وہ غرا کر اٹھا اور ایک نائے دار چھڑ شرفو کے گال پر رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کتنی بار کہا ہے اسے رملہ بی کہا کر خنزیر کی اولاد اور اب دفع ہو جاؤ، غائب کر اس معصیت کو جسے اٹھایا ہے۔ بڑا آیا موقع مانگنے والا، تمہیں اندازہ نہیں وہ ملک نور کے چیلے کیا نام ہے ان کا؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”جی شہباز اور شہزاد“ چار پائی پر بیٹھا ہوا شوکا بولا۔

”ہاں وہ شہباز اور شہزاد،“ نوٹے کر دیں گے تمہارے، اب دفع ہو جا اور اسے غائب کرو۔“ وہ تملاتا ہوا دوبارہ موندھے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ ان کا رخ سامنے والے کمرے کی طرف تھا۔ جس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ رضو نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور شرفو کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں کھاد کی یوریاں اور زرعی پیرے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک جھٹکا سی چار پائی پر بیٹھے میں شرابور یا اوندھے منہ پڑی تھی۔ دھینگا مشتق میں جگہ جگہ سے اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں نے کلائیوں کو رنگین کر دیا تھا۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں گرا رہی تھی۔

”اب کیا کرنا ہے اس کا؟“ شرفو نے پوچھا۔

”کرنا کیا ہے؟ مار کر دریا میں پھینک آئیں گے رات کو۔“ رضو نے سفاک لہجے میں کہا۔

اسی لمبے کٹڑی کا دروازہ چڑھایا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ ان کے سامنے شوکا کھڑا حریصانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”ملک کہیں چلا گیا ہے۔ تم بھی جاؤ آرام کرو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اور ہاں رضو اس کے ہاتھ کھول دے۔“ اس نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کرنا کیا چاہتے ہو تم؟“ رضو اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بے غیرتی نہ کرنا پہلے ہی معاملہ بہت خراب ہو گیا ہے۔“

”زیادہ ٹرٹن نہ کر، تیری بے لگتی ہے؟ اور ویسے بھی مدعا تو غائب کرنا ہی ہے۔ اگر مدعے کے ساتھ کچھ ہو بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا۔“ وہ بولا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آنے لگی۔ ”کیا خیال ہے شرفو؟“ اس نے آنکھ دہائی تو شرفو کے اندر بھی ایلٹس نے انگڑائی لی۔

”بات تو ٹھیک ہے بار۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ کر ثریا کے ہاتھ کھول دیے۔ ثریا ایک بھر پور اور جوان عورت تھی۔ پینتیس کی عمر میں تھی تو جوان دکھائی دیتی تھی۔ یہ ملک نور کے شفیق رویے اور اس کے گھر کی بہترین غذا کا کمال تھا۔ کچھ عرصہ قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ کئی سال تک اس کی گودہری نہ ہوئی تو اس کی ساس نے اپنے بیٹے کو درغلا کر اس کی شادی کہیں اور کر دی، مجبوراً ثریا نے طلاق لے لی اور اپنے باپ کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کا باپ خادم علی ملک نور کا مٹھی تھا۔ وڈی ملکائی کے کہنے پر اسے ملک کی حوٹلی میں چھوڑ دیا گیا۔ ملک نور نے ہمیشہ اسے بیٹی کی نظر سے دیکھا اور جب رملہ حوٹلی میں آئی تو وہ دونوں کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔ اگرچہ وہ گھر کے کام کاج کرتی تھی لیکن رویہ روایتی مالکوں جیسا نہیں تھا۔

”میں تمہیں ایسا ہر گز نہیں کرنے دوں گا۔“ رضو فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”تنگ نہ کر بار۔“ شوکا استہزائیہ انداز میں بولا اور ایک قدم آگے بڑھ کر رضو کو گھورنے لگا۔ معاس کے چہرے پر سفاکی در آئی۔ دوسرے لمبے ایک تیز دھار خنجر رضو کے سینے میں اتر گیا۔ خنجر عین دل کے مقام پر لگا تھا۔ اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا اور سانسٹ ہو گیا۔ مٹی زمین پر اس کا خون پھیل رہا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ شرفو کھیرا ہٹ زدہ انداز میں بولا۔

”کچھ نہیں، یہ کئی دنوں سے میری نظر میں تھا۔ ملک سے کہنا اسے اس لڑکی نے مارا ہے۔ بدنیت ہو رہا تھا۔ چل اسے اٹھا دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اچانک ثریا پھدکارتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور غرا کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم لوگ کون ہو اور یہ حرکت تمہیں بہت جہنگلی پڑے گی۔“

اس کے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے تھے۔ وہ بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ شوکے کو گھور رہی تھی۔

وہ پھنکار کر بولا۔ ”تم یہ تو جانتی ہو کہ ہم کون ہیں پر یہ نہیں جانتی کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ وہ مکروہ قہقہہ لگا کر اس پر چھپٹا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ اچانک پوری قوت کے ساتھ ثریا کے ہاتھ میں دبا ہوا سریا اس کے سر کے وسط میں لگا۔ سریا اسے یورپوں کے پاس بڑا ہوا ملتا تھا جسے اس نے پھرتی سے اٹھایا تھا۔ وہ ڈکرا کر فیچے کر اور لوٹ پوٹ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
اسٹریٹ انڈیا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ماک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے اپنے خیالوں کے تحت یہ بھیج سکتے ہیں

بیرون ملک سے قارئین صرف وائٹرن یونین یا مٹی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری پیک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شہ عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر III بکینیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

ہونے لگا۔ وہ دہاڑتی ہوئی شرف کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے
کہ وہ اس تک پہنچی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور دروازہ کھول کر
سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کے لیے یہی بہترین موقع تھا۔ اس
نے دروازہ عبور کیا۔ ڈیرے میں سوائے کتوں کے کوئی ذی
نفس نہیں تھا۔ شرف کتوں کی طرف بھاگا اور وہ مرکزی گیٹ کی
طرف دوڑنے لگی۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے زنجیر میں
ہاتھ ڈالا اسی لمحے شرف نے کتوں کو آزاد کر دیا۔ کتے غراتے
ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران ثریا دروازہ
کھول چکی تھی۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکلی اور اس نے
گیٹ بند کر دیا۔ پھرے ہوئے کتے آزاد تھے اور ان کے
سامنے شرف تھا۔ کتوں کے لیے وہ اجنبی تھا۔ چند ساعتوں میں
کتوں نے اسے جبر بھاڑ کے رکھ دیا۔ اس کی دگرش چھین
حوالی میں گونج رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد چھین معدوم
ہو گئیں۔ کتے مسلسل غرارے تھے۔ ثریا جیتی چلائی ایک ایک
پکڑی پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

☆.....☆

دھیرے دھیرے رملہ بیہوش ہو رہی تھی۔ شاید یہ پیشانی
میں لگنے والی گہری چوٹ کا نتیجہ تھا۔ خون کا اخراج قدرے کم تو
ہوا تاہم رکنا نہیں۔ شہباز نے اس کی پیشانی پر کس کر پڑا باندھ
دیا تھا۔ جو بھی موسم کے تبد بدلے وہ رملہ کے پیچھے بھاگ پڑا
تھا، لیکن موسم کی بگنی نے پھر بھی کافی دیر کر دی۔ وہ آہنی
جھولے سے ٹکرا کر گرتی تو زیادہ نقصان کا احتمال تھا۔ شہباز
نے بروقت اسے تھام لیا اور وہ اس کی پانہوں کے مضبوط حصار
میں بے سدھ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ تھا کہ وہ کسی
بہرہ اور خیر خواہ کے ہاتھوں میں ہے۔ تاہم اسے یہ قطعی معلوم
نہیں ہو سکا کہ وہ اسی کی پانہوں میں ہے جسے وہ کچھ دیر پہلے
ڈشکرا کہہ کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ تیز و تند ہواؤں کی
جاریت بدستور جاری تھی۔ متزادیہ کہ طوفانی بارش بھی شروع
ہو گئی۔ وہ دونوں بری طرح بھیگ رہے تھے۔ وہ کسی سمت
کا تعین نہیں کر پایا، بس جدھر کونہ آیا، جہاں سے راستہ ملا وہ
رملہ کو امانت سمجھ کر اٹھائے ہوئے چلا چلا گیا۔ جھیکے بدن کا
نسوانی لمس کسی زاہد خشک کو بھی متاثر کر سکتا ہے لیکن اس نے کسی
مثنیٰ سوچ کو ذہن میں نہیں آنے دیا۔ وہ ملک نو رکھی امانت تھی
جس کے تحفظ کی ذمہ داری کئی ماہ پہلے اسے اور شہزاد کو سونپ
دی گئی تھی۔

وہ چلتی حسین تھی اتنی ہی مغرور اور خست بدل چکی تھی۔
”لیکن ہے تو ایک عورت ہی ناں“ اس نے

سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی یہی صورت حال تھی۔ کچھ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، اسی طرح ہندوؤں میں سے کچھ پاکستان میں رہ گئے۔ برگد کے گھنے درخت کی وجہ سے یہاں بارش قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ اب تو پھری ہوئی ہواؤں کو بھی قرار آ رہا تھا۔ بلونت رانھور نے رملہ کی پیشانی سے ہٹی اتار کر اس کے ذمہ کو دیکھا اور بولا۔ ”ختم گہرا نہیں ہے، شاید کوئی نوک دار چیز لگی ہے؟ اس لیے خون کا اخراج زیادہ ہوا ہے۔ تم اس کی ہتھیلیاں رگڑو، جسم میں گرما ہٹ ہوئی تو خون متحرک ہو جائے گا۔ فی الوقت یہی علاج ممکن ہے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی دوا موجود نہیں اور ویسے بھی زیادہ فکر والی کوئی بات نہیں۔“ بلونت نے نرم لہجے میں کہا اور وہ اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔

”یہ دانا آباد گاؤں ہے، بلونت بولا۔ تمہیں شاید راستہ نہیں ملا اور نہ ملک پور یہاں کی نسبت نزدیک ہے۔“
 ”ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔“ وہ رملہ کی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بولا۔

”بھگوان کی کرپا ہوگی۔ جیسے ہی موسم ٹھیک ہوتا ہے تم میرے تاقے میں اپنے گاؤں چلے جانا بیابان بھلی چلی ہے۔“
 اس نے رملہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بارش رک چکی تھی اور ہوائیں بھی ستا رہی تھیں۔
 اچانک وہ چیخ مار کر اٹھی اور بری طرح روتے ہوئے بولی۔ ”وہ شریا کو لے گئے۔“

”کون لے گئے اسے؟“ شہباز نے فکر انگیز لہجے میں پوچھا۔
 ”مجھے نہیں پتا وہ کون لوگ تھے۔“ وہ رندگی ہوئی آواز میں جو کچھ دیکھا تھا بتانے لگی۔ شہباز کے دلی میں دوسووں نے سراپا اٹھا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ کس کا کام ہے۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”تم بے فکر ہو جاؤ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ لیکن وہ بے فکر نہیں ہوئی۔ اسے شریا کی فکر کھائے جا رہی تھی اور پھر وہ چکیاں باغہ کر رونے لگی۔

☆.....☆

رملہ کا حصول شہزادی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ وہ ماں باپ کی اگلی اولاد تھا۔ ماں باپ بھی نہ رہے تو اکیلا ہی اُن کی جائیداد کا وارث بن گیا۔ مالی لحاظ سے آسودگی کے باوجود وہ ایک ہاتھ بندہ اور سلکھا ہوا نوجوان تھا۔ اس نے اور شہباز نے ایک ساتھ ہی پرانری تک پڑھا اور ہمیشہ ایک ساتھ ہی رہے۔ جب ملک نور نے انہیں اپنے ساتھ باعزت طور پر رہنے کی پیشکش کی تو وہ دونوں متح نہ کر پائے کیونکہ ایک شفیق و

سوچا۔ ”اس کے سینے میں بھی گوشت کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ بھی سننے دیکھتی ہوگی۔ عین ممکن ہے کسی کو پسند بھی کرتی ہو۔“ دفعتاً اسے کچھ دیر پہلے شہزادے ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔

”یار شہباز! سچ تو یہ ہے اس کے لیے جان بھی دی جا سکتی ہے۔“ اس کے لہجے میں جہاں بھر کی محبت درآئی۔
 ”ایسی بات مت کرو۔“ شہباز تنبیہی لہجے میں بولا۔ ”اب وہ ملک نور کی غیرت ہے۔“

”میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اور مجھے پتا ہے تم بھی اسے پسند کرتے ہو۔“ اس نے ذومعنی لہجے میں کہا۔
 ”پسند کا تو پتا نہیں البتہ میں اس کی فکر ضرور کرتا ہوں۔“
 یہ گفتگو طوفان سے چند لمبے پہلے ہوئی تھی اور اب وہی سوال سیزتان کر اس کے سامنے کھڑا اس سے سوال کر رہا تھا۔

”کیا واقعی میں تم اسے چاہتے ہو؟“ اس نے غیر ارادی طور پر خود سے لپٹی ہوئی رملہ کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید پیشانی پر اس کے نیلے کرتے کی پٹی خوب چب رہی تھی۔ تیز و تند ہواؤں میں لہراتے ہوئے رملہ کی بال جیسے کوئی ناگن عین کے آگے تاج رہی ہو۔ بے ساختہ اس کا دل خیانت کرنے کو چاہا۔ غیر ارادی طور پر اس نے مدہوش بدن کو بانہوں میں بچھ لیا۔ ایک راحت افزا احساس اس کی رگ دپے میں سراپت کر گیا۔ نہ جانے وہ کتنے دیر اسے اٹھاے چلا رہا۔ اب اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا تھا۔ یہ مسلسل بارش اور تیز ہوا کا شاخسانہ تھا۔ دفعتاً اس کی نظر اسے سامنے برگد کے ایک وسیع و عریض درخت پر پڑی۔ یہ بہت گہنا اور بلند والا درخت تھا۔ چند گھنٹوں بعد وہ درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی درخت کے تنے سے ٹپک لگائے سڑکر بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھا اور اپنے جسم پر لپٹی ہوئی بوسیدہ سی چادر اتار کر زمین پر بچھاتے ہوئے بولا۔ ”اوہ..... تم دونوں بری طرح بھگ گئے ہو اسے یہاں چادر پر لٹا دو۔“ اُس نے یہی کیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

رملہ ذرا سی کسمپاسی اور کراہنے لگی۔ ”یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ کون ہے یہ اور تم؟“

ادھیڑ عمر آدمی نے سوالیہ انداز میں استفسار کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شہباز نے اسے مختصر آسب کچھ بتا دیا۔ وہ تپکنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا یہ ملک نور کی بیٹی ہے، طوفان کچھ کم ہو جائے تو کچھ کرتے ہیں، پریشان مت ہو۔ میں دید ہوں، میرا نام بلونت رانھور ہے۔“
 شہباز کو حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ہندو مسلم سالہا سال

خلیق بزرگ اور گاؤں کے بڑے ہونے کی حیثیت سے وہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور یہاں تو سوال رملا کی حفاظت کا تھا۔ دونوں کرب بار سائی کے کرب میں مبتلا تھے اور پھر قدرت کی جانب سے انہیں رملا کے قرب کا موقع مل گیا۔ اس قرب کی تشناہ کو مٹی پہلو کار فرمائیں تھا۔ بس وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی نظروں کے حصار میں محصور رہے۔ البتہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ملک نور کو ایسا کیا خدشہ لاحق ہے یا پھر رملا سے اس کی کیا جذباتی وابستگی ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے ان دونوں کے علاوہ بھی کئی آدمی رکھ رہا ہے۔

”ملک چاچا عبدالغنی کا تو آگے پیچھے کوئی ہے نہیں تو پھر رملا کو کس سے خطرہ ہے جو اس کے لیے اپنے آپ اتنے حفاظتی اقدامات کر رہے ہیں۔“ ایک دن غیر متوقع طور پر شہزاد نے سوال کیا تھا تو ملک نور کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

”یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اور خطرناک راز ہے پھر“ وہ جیسے لہجے میں بولا۔ ”جس دن یہ راز آشکار ہوا سمجھو اس دن تمہارا چاچا زندگی کی بازی ہار جائے گا“ لمحائی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”بس پھر اگر میری زندگی چاہتے ہو تو آئندہ یہ سوال مجھ سے دوبارہ مت پوچھنا۔ اس راز اور رملا کی حفاظت کے بدلے میں تم مجھ سے جو کچھ بھی مانگو وہ میں تمہیں دے دوں گا۔“

”چاچا ہو سکتا ہے میں آپ سے رملا ہی مانگ لوں۔“ اس نے دل میں کہا، لیکن یہ الفاظ ادا نہیں کر پایا۔ پھر وہ سائے کی طرح رملا کے آس پاس رہنے لگے، لیکن وہ ان معاملات سے قطعی بے خبر تھی، اور آج رملا کے اچانک غیاب نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ طوفان میں رملا کی حادثاتی طور پر گمشدگی کا قصور وار وہ خود کو ہی سمجھ رہا تھا۔ بس چند لمحوں کے لیے اس کی نظر تجر حیات سے ہٹی تھی اور اس نے شاید اسے کھو دیا تھا۔ اب وہ دیوانہ وار اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ منہ زور ہواؤں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رملا کے غیاب میں ملک خدا بخش کی مکروہ سازش بھی کار فرما ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ گھوڑی برسوار قریہ قریہ گھوم رہا تھا۔ جب سورج نے رخصتی کے لیے رنجب سفر باندھا وہ مہراب پور کے قریبی باغ سے گزر رہا تھا۔ امون کا یہ وسیع و عریض باغ ملک خدا بخش کے اثاثوں میں شامل تھا۔ وہ باغ کے قریب سے گزرتی ہوئی چکی سڑک سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، جب اچانک ایک کرب انگیز کڑا اس کی سماعت میں اتری۔ وہ ٹھٹک گیا۔ دس بارہ فرلانگ کے فاصلے پر اسے

ملک خدا بخش کا ڈیرہ نظر آیا۔ فطرتاً وہ ایک نڈر اور بہادر آدمی تھا۔ اس نے وہی کرب انگیز کڑا دوبارہ سنی، کوئی انتہائی تکلف کے عالم تھا۔ اس نے بے خوف و خطر گھوڑی کا رخ باغ کی جانب کر دیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، کربانے کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آم کے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ ایک شخص اوندھے منہ پڑا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس نے برق رفتاری سے زمین چھوڑی اور چھلانگ مار کر زمین پر اترا۔ لبو میں لت پت شخص نے بدقت تمام سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف و بے یقینی سے پھیلے گئیں۔ وہ ملک خدا بخش کا خاص کارندہ شوکا تھا۔ ”گلتا ہے آج کسی سوا سیر سے گھرا مجھے ہو شو کے۔“ وہ اس کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔ شو کے نے کچھ کہا چاہا لیکن لفظ اس کی دسترس میں نہیں تھے۔ شریانے اس کے سر کے وسط میں پوری قوت سے سریا مارا تھا۔ اس کا سر درمیان سے پھٹ کر بری طرح مجروح ہوا تھا۔ گاڑا خون اس کے چہرے گردن اور ہاتھوں کو رنگین کر گیا۔

”بول سکتے ہو تو بتاؤ، یہ کس ظلم کا بدلہ ہے۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں استفسار کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شوکا آخری دموں پر ہے۔ اس نے شو کے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض ماند پڑ رہی تھی۔

”شش شہزادے“ وہ بمشکل بولا۔ ”م مجھے..... مجھے بچا لو یا ر تمہیں اللہ کا واسطہ۔“

”تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے، اور نہ ہی میرے پاس۔“ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے مجھے سچ بتا دو، اور اگر یاد ہے تو کلمہ بھی پڑھ لو۔“

اس کی آنکھوں کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ زندگی تمام ہوتی، وہ زندگی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سی..... میرے سر میں شریانے سریا مارا ہے۔“ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک رہی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے سب کچھ من و عن بتا دیا۔ وہ کئی لمحوں تک بے یقینی کے بحر میں غوطہ زن رہا۔ اس نے جو کچھ سنا، اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شو کے کی آخری پچھلی نے اسے تیزی سے تحریک کر دیا۔ وہ گھوڑی پر سوار ہوا اور چکی سڑک پر اسے سر پٹ دوڑانے لگا۔ وہ شو کے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے اپنے اعمال کی سزا مل چکی تھی۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا خمیازہ بھی یہیں بھگت جاتا ہے۔ یہ قدرت کا کائل قانون ہے۔ باغ کی اختتامی حدود میں سرکنڈوں، سرو کے پودوں اور خود ر ہجاریوں کی

بہتات تھی۔ بلا کی جس نے اسے پسینے میں شرابور کر دیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی گھوڑی کو ترم آئینہ نگاہوں سے دیکھا۔ سستانے کا وقت نہیں تھا۔ گھوڑی سر پٹ بھاگ رہی تھی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے چاروں اطراف دیکھنے لگا۔ نعا اسے خود رو جھاڑیوں کی آڑ میں ایک سرخ گھڑی نظر آئی۔ اسے یاد آگیا کہ شریا نے میلے میں گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس گھڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن وہ اپنی قدرتوں سے ہر جگہ نظر آجاتا ہے۔ شو کے نے اسے جو کچھ بتایا وہ ناقابل یقین تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کمرے سے باہر نکلا۔ خونخوار کتوں نے شرف کو ہی نہیں ملک خدا بخش کو بھی چر بھاڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں محو استراحت تھا، جب اسے شرف کی چیخیں اور کتوں کی خراہیں سنائی دیں۔ اس نے ذہنی پچھلا تے ہوئے خادم علی کو رکنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکلا۔ یہی وہ وقت تھا جب کتے شرف کی ضیافت سے فارغ ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ملک خدا بخش سٹھلا اسی کے پالتو کتے اس پر ٹوٹ پڑے۔ خادم علی دروازہ بند کر کے کڑی سے قدرت کے قہر کو دیکھتا رہا۔ شہزاد کو یہ باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ اس نے سرخ گھڑی سے کترہ کی آواز سنی تو خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ چھلانگ مار کر نیچے اترا۔ سرخ گھڑی کی صورت میں شریا زمین پر پڑی تھی۔ اس نے بغور اسے دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ خدا کی قدرت نے اسے شکر کا موقع فراہم کیا۔ اس نے اسے اٹھایا اور گھوڑی پر بٹھا کر ملک پور کی طرف اسے سر پٹ دوڑانے لگا۔ ملک خدا بخش مکافات عمل کا شکار ہوا تھا۔ یہی ہوتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ وہ ڈیرے پر پہنچا، تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ شہباز اور بلونت راغور ملک نور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے رملہ کی بازیابی کی خبر بھی مل گئی۔ شریا کو علاج کے لیے بلونت کے حوالے کر دیا گیا۔ ملک نور لشکر آئینہ نگاہوں سے شہباز اور شہزاد کو دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

”آج وقت آگیا ہے کہ تم دونوں کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز اور تاریک پہلو سے آگاہ کر دوں۔“ ملک نور نے بے دلی سے حقے کی نے ہونٹوں میں دبائی اور انہیں مجروح نظروں سے دیکھنے لگا۔ شہباز اور شہزاد اس کے سامنے چار پائی پر براجمان تھے۔ یہ اس کا خاص کمرہ تھا۔ آج کے جدید دور میں اسے ڈرائنگ روم کہا جانے لگا ہے۔ انگریز ہمارا

ملک تو چھوڑ گئے لیکن ان کا آدھا کلچر یہیں رہ گیا۔ امت مسلمہ نے اس کی تقلید یوں کی کہ انگریزوں کو بھی مات دے دی۔ خیر یہ بات تو برسٹیل تذکرہ ہوئی۔ کمرے میں رنگین چار پائیاں نہایت قریب سے رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے اوپر سیاہ اور سفید رنگ کے ٹھیس بچے ہوئے تھے۔ آئے سامنے رکھی ہوئی چار پائیوں میں ایک پر ملک نور بیٹھے سے ٹیک لگائے سوختہ ماضی کی راگھ کرید رہا تھا۔ اس کے سامنے والی چار پائی پر وہ دونوں پلک بچکے بغیر اسے دیکھے جا رہے تھے۔ چائے کی خالی پیالیاں چار پائی کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر پڑی تھیں۔ انہوں نے ابھی ابھی ناشتا کیا تھا۔ شریا نے رو بہ صحت ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا، البتہ رملہ کو شدید بخار ہو گیا تھا۔ وید بلونت راغور دلجمعی سے اس کا علاج کر کے لوٹ گیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو شہزاد نے آہستگی سے کہا۔

”چا چا جی، ہم نے کب اصرار کیا کہ آپ اپنے ماضی سے ہمیں آگاہ کریں اگر آپ نہیں بتا رہے تو رہنے دیں۔“ ”نہیں پتر۔“ وہ سوچتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بوجھ میرے دل پر مدتوں سے ہے۔ پہلے زخم تھا اب ناسور بن گیا ہے۔ نہ بتایا تو بھی مر جاؤں گا اور دیے بھی تمہارے لیے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے۔“ وہ دونوں ابھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ”جی چا چا جی بتائیں، ہم آپ کے راز کے امین ثابت ہوں گے۔“ شہباز نے کہا تو ملک نور نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

”ملک خدا بخش شروع سے ہی مجھ سے عناد رکھتا تھا، لیکن مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ آخر اس کی بنیادی وجہ کیا تھی۔“ لہجائی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”البتہ ایک یہ وجہ ضرور تھی کہ میری مردانہ وجاہت اس کے لیے سوبان روح تھی، کیونکہ وہ واجبی سی شکل و صورت رکھتا تھا۔ جب ہمارے بیگم نے اسے ٹھکرایا تو اس کے جسد کی آگ ناپہنم کی طرح اسے جلانے لگی۔ اس نے انتہائی گھٹیا چال چلی اور ہمارے بیگم کو اٹھوایا۔“

انتا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اک اذیت نیکراں کا پتا دے رہے تھے۔ شہباز نے سلور کے گلاس میں پانی ڈالا، اور اس کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے دو گھونٹ پیے اور گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”گاڈز کے بڑوں نے ہمارے کو بازیاب تو کر لیا، لیکن وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ لٹوا چکی تھی۔ اگر میں بھی شادی

سے انکار کر دیتا تو یقیناً وہ خودکشی کر لیتی۔“ وہ دونوں دروازے حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا اور انتہائی اذیت ناک راز تھا جو اس کے سینے میں مدتوں سے مضمر تھا۔ وہ بولا۔ ”میں نے پچائیت کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم تو کر دیا تھا لیکن میں کئی دنوں تک ہاجرہ کو وہ عزت اور مقام نہ دے سکا جو کہ ایک شرفی اور باحیاء بیوی چاہتی ہے۔ ایک مہینے تک میں نے اسے اتھ تک نہیں لگایا۔ اس دوران اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ وید موہن سنگھ نے اسے بچا تو لیا، لیکن ایک زہریلا راز میری سماعتوں میں اغلیل دیا۔

”مبارک ہو ملک صاحب آپ باپ بننے والے ہیں۔ اس نے گویا مجھے خوشخبری دی تھی۔ میں نے ایک زناٹے اور صاحبزادے کے گال پر رسید کیا اور ہاجرہ کو وہیں چھوڑ کر اس کے دو اخانے سے واپس آ گیا۔ وہ انتہائی تجربہ کار حلیم تھا۔ اس کڑے وقت میں رشید خان نے میرا بہت ساتھ دیا۔“ وہ دونوں چونک کر ملک نور کو دیکھنے لگے۔

”ہاں میں اسی رشید کی بات کر رہا ہوں جسے عبدالغنی نے قتل کر دیا تھا۔“ اس نے ان کی سوالیہ نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے وضاحت کی۔ پھر بولا۔ ”میں نے رات کے اندر میرے میں ہاجرہ بیگم، رشید اور اس کی بیوی کو لاکھ پور (موجودہ فیصل آباد) بھیج دیا۔ وہاں رشید کی بہن رہتی تھی۔ باقی آٹھ مہینے میں نے لوگوں اور رشتہ داروں کو کس طرح مطمئن کیا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ سچ سچ میں، میں بھی وہاں جا کر رہا تھا۔“ اور پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ در آیا۔ وہ خاموشی کی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، اور وہ دونوں پتھر کے بت بنے اس کے سامنے بیٹھے رہے۔

”چاچا جی، وہ بچہ کہاں گیا؟“ شہزاد مستنصر ہوا۔ ”بچہ نہیں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔ ”آٹھ ماہ بعد لاکھ پور میں ہاجرہ نے ایک بچی کو جنم دیا اور اسے میں نے فوراً رشید اور اس کی بیوی کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں نے اس بچی کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔“

”وہ بچی کون سی؟“ شہباز کے لہجے میں تجسس تھا۔ اسی لمحے ملک نور کے کمرے کا دروازہ کھلا، اور اندر داخل ہوئی ہوئی رملہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ بچی میں تھی۔“

وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملک نور جھجکاٹے چار پائی پر بدستور بیٹھا رہا۔ ”مجھے میری ماں نے پہلے بتا دیا تھا ملک بابا کہ میں ملک خدا بخش کی

ناجا نر اولاد ہوں۔“

وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ لفظ سنگ اور زبانیں خنجر تھیں۔ وہ زارو قطار روتے ہوئے بولی۔ ”معاشرے میں میرا کیا مقام ہوگا۔ یہ مجھے اندازہ ہے۔ میں کسی کی بیوی بن سکتی ہوں نہ کسی کی بیٹی بن پائی۔“ ”میں نے تمہیں بیٹی سے بڑھ کر محبت دی ہے پتر۔“ ملک نور تڑپ کر بولا۔

”اور میں تمہیں ایک معزز اور باحیاء بیوی جیسا مقام دوں گا اگر تم مجھ سے شادی کر لو۔“ شہزاد نے کہا اور اس کی طرف پر امید نظروں سے دیکھنے لگا۔

”نہیں، تمہاری شادی صرف اور صرف مجھ سے ہوگی۔“ شہباز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس کا فیصلہ تم دونوں نہیں، ملک بابا کریں گے۔“ رملہ آہستگی سے بولی۔

”نہیں پتر، اس کا فیصلہ زہر کا پیالہ کرے گا۔ جو جیتے گا میں تمہیں اس کی دہن بنا دوں گا۔“

وہ تینوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وقت جیسے سقم گیا تھا۔ دنوں کی دھڑکنیں ملک نور کے کمرے میں دھمال ڈال رہی تھیں۔

”ہمیں منظور ہے۔“ وہ دونوں بیک آواز بولے تو وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ملک نور نے ٹپکے سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کیونکہ اسی میں رملہ کی بھلائی تھی۔ دونوں اس کی چاہت میں مبتلا تھے جسے وہ مل جاتی تو وہ شکر گزار ہوتا لیکن جسے نہ ملتی وہ اپنے دل میں کڑھتا رہتا اور حسد کی آگ اس کی زبان کھول دیتی انہیں خاموش کرانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے راز سے بے وجہ پردہ اٹھایا تھا، اب اس غلطی کو سدھارنا بھی اسی کو تھا۔ اسی لیے اس نے مقابلے کا کہا تھا۔ تین دن بعد موت کا مقابلہ تھا۔

☆.....☆

ہر مختصر و متجسس اور افسردہ آنکھ ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ رسم یہاں مدتوں سے چلی آ رہی تھی۔ جب ملک نور نے دیگر بزرگوں سے مشاورت کی تو انہوں بھی اس کے فیصلے کی تائید کی۔ رملہ اس دن سے خاموش تھی، جیسے کو ما میں چلی گئی ہو۔

”ملک صاحب، آپ شہباز یا شہزاد سے جو کہتے، وہ قطعی انکار نہ کرتے، اس موت کے مقابلے کی کیا ضرورت تھی؟“ شہزاد نے ڈرتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

پراس کی ہلکی سی چیخ بلند ہو کر معدوم ہو گئی اور پھر کہنی کی ضربوں کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ اس کی پسلیوں میں شدید درد ہونے لگا۔ اتنا کہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ جسم پسینے میں شرابور ہونے تو چکتا ہٹ پیدا ہونے لگی۔ پسینے کی نمی اور تازہ مٹی سے ہاتھ پھسل رہے تھے۔ شہزاد نے ہمت جمع کی اور زور دار کھوسنا شہباز کے جڑے پر جڑ دیا۔ یہ کھوسنا کام کر گیا۔ اس کے منہ سے خون نکلا اور شہباز کے چہرے پر بد وضع سے نقش و نگار بنا گیا۔ وہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور پشت کے بل پیچھے کرتے کرتے کھڑا ہو گیا۔ اب وہ دونوں پھر آٹنے سانسے تھے۔ اسی لمحے اچانک مجمع متحرک ہوا اور آوازوں کا شور اٹھنے لگا۔ انہوں نے مجمعے کی طرف دیکھا۔ لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی رملار سا پھلانگ کر میدان میں کود پڑی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ان دونوں پر مرکوز تھیں۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں جذبات کی لرزش اور آنسوؤں کی نمی تھی۔

”تم میں سے جو مقابلے سے دستبردار ہو جائے گا میں اسے اپنا جیون ساتھی تسلیم کر لوں گی۔ ابھی اسی وقت اسی جگہ۔“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے گھورنے لگے۔ مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ملک نور نے ایک جھٹکے سے مونٹھا چھوڑا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا بزرگ ملک اللہ یار غصیلے لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا مذاق ہے لڑکی اب تمہاری کوئی بہن، بات اور پیشکش ناقابل قبول ہوگی۔ جو دستبردار ہوگا وہ مرے گا، سبکی ریت ہے، برواج ہے، اصول ہے۔“

ملک نور دوبارہ مونٹھے پر ڈھسے سا گیا۔ رملار ملک اللہ یار کو گھورتی ہوئی زہر کے پیالے کی طرف بڑھی اور پھر جو کچھ ہوا کسی کے سامان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ انتہائی پمچرتی سے اس نے زہر سے بھرا ہوا پیالہ اٹھایا اور چند ہی لمحوں میں غماغت پی گئی۔

”میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری وجہ سے مرے، کیا اس کے بعد میں جین سے جی پاتی؟“ اس نے کہا اور دھڑام سے نیچے آگری۔ سربلج الاثر زہر نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ پہلے رنگ ہلدی کی طرح ہوا اور پھر نیلا پڑنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے خون بھی نکلنے لگا۔ شہباز شہزاد اور دوسرے لوگ انگشت بندھاں تھے۔ ملک نور نے اٹھنا چاہا لیکن مونٹھے سے اٹھ نہیں پایا۔ جب ملک اللہ یار نے اسے کاندھے سے پکڑ کر ہلایا تو اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ ادھر رملانے جان کی بازی ہاری ادھر ملک نور نے دامی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

وہ بولا۔ ”یہی تو میری مجبوری تھی شہزاد۔“
شہباز گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ شہباز کی ماں کا واپس بھی بے سود ٹھہرا۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی مقابلے سے دستبردار ہو جاتا تو لوگ تا عمر نکلے کرتے۔

بہر حال اعلان اور وقت کے عین مطابق مقابلہ شروع ہو گیا۔ شہباز اور شہزاد آٹنے سانسے تھے۔ دونوں نے جنگی ترتیب لے رکھی تھی اور لڑائی کے داؤ پیچ بھی جانتے تھے۔ لوگوں کا جم بغیر تھا۔ ملک نور اپنے مونٹھے پر براجمان کسی غیر مرئی نلتے کو گھور رہا تھا، گویا اسے مقابلے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تو دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

”مجھے معاف کرنا میرے دوست۔“ شہباز تاسف سے بولا۔ ”اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“
”کوئی بات نہیں شہباز، محبت قربانیاں مانگتی ہے اور مجھے کوئی افسوس نہیں۔“

”مجھے بھی۔“ وہ آہستگی سے بولا اور اپنی دائیں ٹانگ کی زوردار ٹھوکراں کی پینڈی پر ماری۔ یہ غیر متوقع وار تھا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا۔ شہزاد نے مضبوط بازو کی گرفت میں اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا لیکن گرفت بجائے ڈھیلی ہونے کے مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

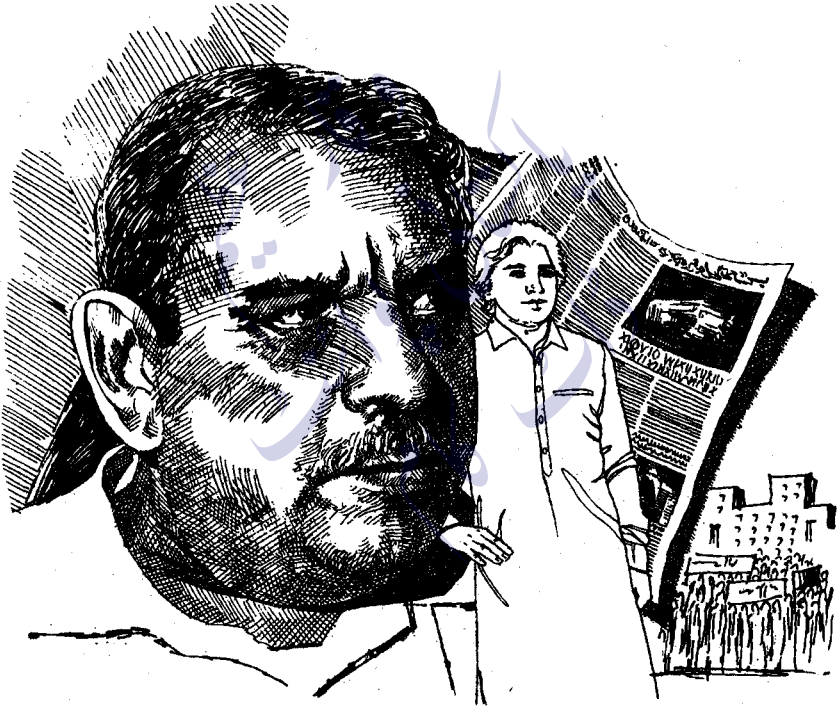
”مجھے کی آنکھیں گویا پھٹ رہی ہیں۔ کسی کی سانس تک کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ملک نور نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی حقے کی نیندوں تلے دبا لی۔ یہ اضطرابی کیفیت کا اظہار تھا۔ اس نے ان دونوں کو بیٹوں کی طرح رکھا تھا۔ آج ایک بیٹا، دوسرے کے ہاتھوں مرنے جا رہا تھا۔ کیا عجیب کشش تھی۔ اک روح فرساہیں و پیش در پیش تھا۔ بارہا اس کے دل نے چاہا کہ مقابلہ روک دیا جائے لیکن اسے ڈر تھا کہ اگر ایسا ہوا تو باقی تمام عمر یہ غماغت، اور مخالفت چلتی رہے گی۔“

”جیسے کہ میری اور ملک خدا بخش کی مخالفت تھی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”مقابلہ تو ملتوی ہو سکتا ہے ملک نور لیکن رملار کا کیا کر دے؟“ اس کے ضمیر نے صمدادی تو بیہ ساختہ اس کی نگاہیں سربلج الاثر زہر کے پیالے پر جم گئیں۔ اسی لمحے شہباز کا داؤ کام کر گیا۔ اس نے پوری قوت سے دہنی کہنی شہزاد کی پسلیوں میں ماری۔ وہ ”ادب“ کی آواز کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دوسرے ہی لمحے کہنی کی دوسری ضرب اس کی پسلیوں میں عین اسی جگہ پر پڑی جہاں پہلی ضرب پڑی تھی۔ غیر ارادی طور

محترم مدیر
سلام تہنیت

میں سیاست سے نفرت کرتا ہوں، کیوں؟ یہ اسی کیوں کا جواب ہے میری سچ بیانی۔ آپ کو اس میں وہ ساری باتیں مل جائیں گی جس کی وجہ سے میں سیاسی خبریں تک نہیں پڑھتا۔ گو کہ اس علاقے کو چھوڑے کئی سال ہو گئے ہیں لیکن وہاں کی باتیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں اسی لیے میں یہ سچ بیانی لکھ رہا ہوں۔
عبداللہ
(مظفر گڑھ)



ہمارے قصبے کا نام بکسر تھا۔ بکسر کیوں تھا۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔ اچھا خاصا چھوٹا سا شہر تھا۔ دو کالج تھے ایک لڑکیوں کے لیے، دوسرا لڑکوں کے لیے۔ ایک درجن کے قریب اسکول تھے۔ کئی بازار تھے۔

اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا ہمارا۔ کم از کم چار پانچ لاکھ کی آبادی تھی۔ اگر اس پاس کے علاقوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ آبادی سات آٹھ لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔

میں اپنے علاقے کا تفصیلی تعارف اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ کو یہ بتا سکوں کہ وہاں اچھی خاصی مصروف زندگی تھی۔ ایسی مصروف زندگی کے باوجود ایک بات بہت اہم تھی کہ قصبے میں کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو پورے قصبے کو خبر ہو جاتی تھی۔

کس کے یہاں موت ہو گئی۔ کس کے یہاں پیدائش ہوئی یا کس کے یہاں اس قسم کا کوئی واقعہ ہو گیا۔ سب کو پتا چل جاتا تھا۔ یعنی کوئی خبر وہاں پہنچی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے جب میں نے کسی شیخ کے بارے میں سنا کہ انہوں نے کہیں باہر سے آکر اس قصبے میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے تو بہت حیرت ہوئی۔

میرے ایک دوست واسع نے ان کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ ”ارے بھائی کیا شخصیت ہے ان کی۔ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہیں۔ نور بنی نور ہے ان کے چہرے پر۔“

”واسع! سوچ تو یہ ہے کہ میں اب ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس قسم کے درجنوں باباؤں کو دیکھ چکا ہوں۔ ایک سے ایک فراڈ۔“

”لیکن یہ بے خود صاحب کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔“ واسع نے بتایا۔

”بے خود سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا ان کا نام ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ان کا تخلص ہے۔“ واسع نے بتایا۔

”فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ نعتیں لکھتے ہیں۔“

”پھر تو کوئی اونچی چیز ہیں۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”یاد رکھ ایک بار ان کے پاس چلے جاؤ۔ یوں ہی چلے جاؤ۔ اپنے لیے دعا کرانے۔ پھر دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ تمہارے سارے شک ختم ہو جائیں گے۔“

”ضرور جاؤں گا۔ دیکھو تو سہی تمہارے یہ بے خود صاحب کتنے پانی میں ہیں۔“

میں نے واسع سے کہا تھا کہ میں اس قسم کے درجنوں باباؤں کو دیکھ چکا ہوں تو یہ کوئی غلط نہیں تھا۔ ہمارے قصبے سے ایک اخبار بھی نکلا کرتا تھا ”زندگی“۔ میں ہی اس اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس کے لیے رپورٹنگ بھی کیا کرتا۔ اس سلسلے میں، میں اب تک بہت سے تفکری اور جعلی عاملوں اور باباؤں سے نمٹ چکا تھا۔ میرا طریقہ واردات یہ ہوتا کہ میں خود ضرورت مند بن کر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ پھر ان کی

مکاریاں اور پیٹریے جب سمجھ آ جاتے تو اپنے اخبار کے ذریعے ان کا کچا پھنسا کھول دیتا۔ اس طرح نہ جانے کتنے عامل اور کتنے بابا مجھے برا بھلا کہتے ہوئے میرے قصبے سے یوریا سٹر پلیٹ کر جا چکے تھے۔

اب یہ بے خود صاحب آگئے تھے۔ میرا اگلا شکار۔ بے خود نے عام آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک عام سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ دو کمروں کے اس مکان کا احاطہ اچھا خاصا بڑا تھا۔

ایک کمرے میں بے خود کی رہائش تھی۔ جب کہ دوسرا کمرہ آنے جانے والوں کے لیے تھا۔ مجھے اس دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ جس آدمی نے مجھے اس کمرے میں بٹھایا تھا وہ ایک معقول صورت مہذب انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ بے خود صاحب بس دس منٹ میں آجائیں گے۔

مجھے اس کمرے میں بیٹھ کر حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ کتابوں کے فیلفٹ بنے تھے اور ان میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور کتابیں بھی کیسی شہوید گنڈوں کی نہیں بلکہ احادیث کی، فلسفہ کی، نفسیات کی، مقدمہ مابین خلدون بھی تھا۔

اگر یہ کتابیں بے خود کے مطالعے میں رہتی تھیں پھر تو وہ واقعی ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ میں نے اب تک جتنے باباؤں کو دیکھا تھا ان میں سے کسی کو کتابوں کا شوق نہیں تھا بلکہ ان کے کمروں میں الٹی سیدی چیزیں بھری رہتی تھیں۔ کھوپڑی، ہڈیاں، سانپ کی کنگلی اور نہ جانے کیا کیا لیکن اس بابا کے پاس تو کتابیں تھیں۔ یہ بھینا! بسکھوں سے مختلف تھا۔

اور جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر سامنے آیا تو وہ واقعی ایک مختلف انسان تھا۔ اس نے جب وہ نہیں پہن رکھا تھا، چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ عینک لگی ہوئی، بہت ہی مہذب سالباں، دیکھنے میں وہ کوئی اسکالر معلوم ہوتا تھا۔

اس نے بہت ہی مہذب انداز میں میرے پاس آکر معذرت کی۔ ”معاف کیجئے گا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔“

”نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“

وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ”فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میں اپنی ایک پراہلم لے کر آپ کے پاس آیا

ہوں۔“ میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔

”جی ضرور، فرمائیں کیا مسئلہ ہے؟“

”میرے ایک عزیز ہیں، وہ بے گناہ ایک مقدمے میں پھنس گئے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی جان چھوٹ جائے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہیں؟“ بے خود نے پوچھا۔

”جی ہاں جناب، ورنہ میں ان کے لیے کبھی نہیں آتا۔“

”ہوں۔“ اس نے ایک ہنکاری لی۔ ”نام کیا ہے ان کا؟“

نام تو میں پہلے ہی سوچ کر گیا تھا۔ ”شعیب عزیز۔ عزیزان کے والد کا نام ہے۔“

اس نے ایک کاغذ پر کچھ حساب کتاب کرنا شروع کر دیا۔ میں اس قسم کی کارروائیاں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یعنی وہ آہستہ آہستہ اپنے خول سے باہر آ رہا تھا۔

اس نے حساب کتاب کرنے کے بعد ایک دوسرے کاغذ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لیں اس سے کہیں کہ اس کا دور کرتے رہیں۔“

اس کاغذ پر یا قومی لکھا ہوا تھا۔ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام۔ میں نے وہ کاغذ اپنے پاس رکھ لیا۔

”جناب! اس کا نذرانہ؟“ میں نے پوچھا۔

”نذرانہ! کس بات کا نذرانہ۔“

”یہی جو آپ نے لکھ کر دیا ہے۔“

”ارے نہیں بھائی۔ میں اللہ کے ناموں کا سودا نہیں کرتا اور میں نے کام ہی کیا ہے۔ بس علم جعفر کے لحاظ سے اس کے نام سے ایک نام مطابقت کرتا ہوا نکال دیا ہے۔“

اس شخص کے اثرات مجھ پر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”کیوں آپ حیران ہو رہے ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جی ہاں میں واقعی حیران ہو رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ دوسرے تو اس بات کے بدلے کچھ نہ کچھ ضرور لیتے۔“

”بھائی میں کوئی حیر فقیر یا عامل وغیرہ نہیں ہوں کہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے حاصل کروں۔ بس جو کچھ میں جانتا ہوں اس کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا

رہتا ہوں۔ خدا کرے کہ میری ذات سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ میں نے اب تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔“

”عید نام ہے میرا۔“ میں نے بتایا۔

اس دوران وہ شخص اندر آیا جس نے مجھے اس کمرے میں لا کر بٹھایا تھا۔ ”جناب! دو خواتین ملنا چاہ رہی ہیں۔“

اس نے بتایا۔

”وہ کیوں؟“

”کوئی مسئلہ ہے ان کا۔“

”ان سے کہو کہ کسی کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور تم کو تو یہ معلوم ہے کہ میں عورتوں سے نہیں ملتا۔“

”جی جناب! جانتا ہوں میں لیکن وہ بعد تھیں۔“

”ان سے معذرت کر لو۔ بس ان کا مسئلہ لکھ لو۔ خدا بہتر کرے گا۔“

اس آدمی کے جانے کے بعد بے خود نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ پریشانیاں کسی وبا کی طرح جا رہی ہیں۔“

”سائل تو پہلے بھی ہوتے تھے لیکن ان کی نوعیت بہت سادہ ہوتی تھی۔ کیونکہ زندگی بہت سادہ تھی۔ زندگی میں پیچیدگیاں مشینوں نے پیدا کی ہیں۔“

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی پڑھی لکھی بات کر رہا تھا۔

”میں مسائل کو نفسیاتی اور سماجی تناظر میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”میں نے کبھی کسی کو یہ نہیں کہا ہوگا کہ تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ یا کوئی جن

آگیا ہے۔ کیونکہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ خدانے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ اپنے اپنے دائرے میں کام کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مخلوق دوسری مخلوق پر غالب آجائے جیسے چاند اور سورج اپنے اپنے دائروں میں ہیں۔ نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ دن پر غالب آجائے اور نہ ہی دن کو اجازت ہے کہ وہ رات کو اپنے آپ میں سمو لے۔“

میں مجھم اٹھا۔ اس شخص نے قرآن کی ایک آیت کا مفہوم بتا دیا تھا۔ وہ یقیناً ایک مختلف انسان تھا۔ اس کے بارے میں جو بتایا گیا تھا کہ وہ کوئی بابا یا عامل وغیرہ ہے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا مہذب انسان تھا۔

میں اس سے اجازت لے کر اور اس سے متاثر ہو کر واپس آ گیا۔

میں اس پر بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک زبردست اسٹوری کی ضرورت تھی اور

یہاں کوئی اسٹوری ہی نہیں تھی بلکہ ایک سیدھا سادا معاملہ تھا۔ لیکن یہ خبر بھی کم نہیں تھی کہ ہمارے علاقے میں ایک بہت پڑھے لکھے اور مہذب شخص نے قیام کر لیا تھا۔ میں نے اپنے اخبار میں یہ خبر شائع کر دی۔

اس کے لیے میں بے خود سے ملنے چلا گیا۔ مجھے وہ پہچان گیا تھا۔ اس بار وہ اس کمرے میں تھا جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کیا کرتا۔

”تشریف لائیں جناب۔“ اس نے مہذب انداز میں کہا۔ ”فرمائیں کیا ہوا اس شخص کا جس کا مقدمہ چل رہا تھا۔“

”بے خود صاحب! سچ یہ ہے کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”کیا مطلب؟“ وہ چونک گیا۔

”میں آپ کو پرکھنے کے لیے آیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”میں اس علاقے سے سفت روزہ احتساب نکالتا ہوں۔“

”اوپر تو آپ ہی نے اپنے بہت روزہ میں میری اتنی تعریفیں لکھی ہیں۔“

”جی ہاں کیونکہ میں آپ سے بہت متاثر ہو کر گیا تھا۔“

”ارے صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں بس چند کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اس کے علاوہ تو مجھ میں اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ مجھے آسمان سے اترا ہوا سمجھنے لگے ہیں۔ یہ سب سن کر مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس اب یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔ اپنا کام ہمیں اور جا کر کر لوں گا۔“

”بے خود صاحب! پہلے تو یہ فرمائیں کہ آپ کا اشارہ کس کام کی طرف ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں طریقت اور شریعت کو جدید پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس موضوع پر کتاب لکھ رہا ہوں۔“

”سبحان اللہ۔“ میں پھڑک اٹھا۔ ”کیا اچھا موضوع ہے۔“

”عبید صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں کے لیے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اس لیے آپ کے علاقے کا انتخاب کیا تھا لیکن ہوا یہ کہ یہاں کے کچھ لوگوں کو میرے بارے میں پتا چل گیا۔ انہوں نے میری پہچانی کر دی اور اب رہی کئی کسر آپ نے پوری کر دی ہے۔“

”بے خود صاحب! میری تو درخواست ہو گی کہ آپ یہاں سے نہ جائیں۔ بتا دیں لوگوں کو بلکہ اپنے وقت Manage کریں۔ کہہ دیں کہ آپ فلاں وقت سے فلاں وقت تول سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو زحمت نہ دی جائے۔ تو پھر دونوں کام ہو جائیں گے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”یہی کرنا ہوگا۔ ورنہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا گا۔“

اس دن میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی شاعری بھی سنائی۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ نہ جانے ایسا آدمی اب تک اتنا چھپا ہوا کیوں تھا۔

ہمارے قصبے میں اس کی شہرت اور نیک نامی پھیلی جا رہی تھی۔ البتہ کچھ مولوی قسم کے لوگ اس کے خلاف تھے۔

ایک بار میرے اخبار کے دفتر میں ایک اسی قسم کے صاحب آئے۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ”عبید صاحب! یہ کیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ کون ہے یہ آدمی؟“

”کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”وہی بے خود کی۔ آپ کا اخبار جس کی تعریف میں بھرا ہوتا ہے۔“

”کرامت صاحب! وہ آدمی اسی قابل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہت پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہے۔“

”لیکن آپ اس کا حلیہ تو دیکھیں۔ وہ تو پینٹ قیص میں بھی نظر آتا ہے، شرعی حلیہ بھی نہیں ہے۔“

”یہی تو بہت سے لوگوں کی غلط فہمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شرعی لباس کیا ہوتا ہے کرامت صاحب! لباس کا تعلق علاقے کی شناخت سے ہوتا ہے۔ جیسے یہاں دھوٹی باندھی جاتی ہے سرحد وغیرہ کی طرف شلوار نہیں پہنتے ہیں۔ اب بتائیں کیا دھوٹی غیر شرعی ہے یا شلوار قیص شرعی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ وہ آدمی ایک فتنہ ہے۔“

”وہ اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے نام نہاد اور جھوٹے عالموں کی ہوا اکھڑ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ان کے دھندے بند ہو گئے ہیں۔ اس لیے سبھوں نے بے خود صاحب کے خلاف محاذ بنالیا ہے۔“

لیکن کرامت صاحب کی سمجھ میں یہ سب باتیں کہاں سے آتیں۔ وہ اسی طرح بک بک کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ ہو گیا تھا کہ میں ہر دوسری یا تیسری شام کو اس کے پاس چلا جاتا۔ علاقے کے اور بھی پڑھے لکھے اور با ذوق لوگ آنے لگے تھے۔

اجہی خاصی محفل جم جاتی تھی۔ اس میں ہر قسم کے موضوع پر بات ہوا کرتی اور قائل ہونا پڑتا کہ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص ہے۔

ایک بار کرامت صاحب نے راز دارانہ انداز میں میرے دفتر آکر کہا۔ ”عبید صاحب آپ مائیں یا نہ مائیں وہ شخص اس قصبے پر کوئی آفت لے آئے گا۔“
”وہ کسے؟“

”خود دیکھ لیں۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی سے ایک پسا نہیں لیتا۔ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔ اس کی بھتیجی باڑی بھی نہیں ہے۔ پھر اس کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟“

کرامت نے یہ ایک بہترین سوال اٹھایا تھا۔ واقعی بے خود کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے اس کے اخراجات میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہر وقت چائے کی دیگ چڑھی رہتی۔ کئی طرح کے کھانے بننے۔ شام کے وقت جو محفل جیتی تو اس میں رات ہو جاتی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ سب کو کھانا کھلا کر بھیجتا تھا اور کھانے بھی کئی طرح کے ہوا کرتے۔

کہاں سے ہوتے تھے یہ سب؟ اب یہ معلوم کرنا میرا جیسے فرض بن گیا تھا۔ میں یک طرفہ اس کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ اس کی زندگی کے اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک شام جب اس کے کمرے میں میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو میں نے یہ سوال کر دیا۔ ”بے خود صاحب! پوچھتا تو نہیں چاہیے تھا لیکن آپ کی طرف سے ایک بات گلگتی رہتی ہے۔“

”چلیں بھائی وہ بھی بتا دیں۔“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”آپ کے اخراجات کہاں سے چلتے ہیں۔ ماشاء اللہ چائے اور کھانوں کے لنگر چلتے ہی رہتے ہیں۔“

”بس اتنی سی بات۔“ وہ دوزور سے ہنسنے لگا۔ ”ایک منٹ میں ابھی آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جس میں وہ سویا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک قائل تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عبید صاحب! میں ایک کھانا پیتا خوش حال قسم کا انسان ہوں۔ میرے والد کی پلاسٹک کے سامان بنانے کی فیکٹری تھی جو اب میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں میرا پورا ایک

شاہنگ پلازہ ہے۔ جس کی دکانیں میں نے کرائے پر دے رکھی ہیں اور آپ کی دعا سے دو سے تین لاکھ صرف کرائے میں آجاتے ہیں۔ لہذا مجھے کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے پاس خدا کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔“

میں یہ سوال پوچھ کر شرمندہ ہو گیا تھا۔
”میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ بے گنی بات پوچھ لی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بلکہ بہت اچھا کیا کہ آپ نے پوچھ لیا۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سوں کے ذہنوں میں میرے اخراجات کھلک رہے ہوں۔ بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ اپنے اخبار میں بھی اس بات کی وضاحت کر دیں۔“

”اب تو میں ضرور کر دوں گا۔“ میں بھی پرجوش ہو گیا تھا۔ ”لیکن بھائی ایک بات تو بتائیں۔ اتنی آرام و آسائش کو چھوڑ کر یہاں آکر اس طرح رہنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہاں یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور ہر سوچنے والے کو یہ سوال ضرور کرنا چاہیے۔ آخر کیوں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے لوگ ابنا ریل بھی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مال و دولت زندگی گزارنے کا شخص ایک اوزار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ نے مہاتما بدھ کے بارے میں تو پڑھا ہی ہوگا۔ وہ ایک ریاست کے شہزادے تھے لیکن جب گیان کی تلاش میں نکلے تو انہوں نے اپنا راج پاٹ سب کچھ چھوڑ دیا۔ میں ان جیسا بڑا آدمی تو نہیں ہوں لیکن میں بھی گیان کی تلاش میں ہوں۔ دعا کریں مل جائے۔“

اب میرے دل میں اس کے لیے انیت کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے اخبار میں اس پر پورا ایک مضمون لکھ دیا تھا۔ جس پر وہ زیادہ خوش نہیں ہوا تھا۔ ”عبید صاحب لگتا ہے کہ آپ یہاں نہیں رہنے دیں گے۔“

”اس کے برعکس میں تو یہی چاہوں گا کہ آپ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ بھی کبھی قصبے کے بازار کی طرف بھی نکل جاتا تھا۔ اس وقت تک پورا قصبہ اس کا احترام کرنے لگا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر ادب سے رک جاتے۔ اس وقت اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے اسے یہ سب پسند نہ ہو۔ بے نیازی کی یہ کیفیت بھی میں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔“

قصبے میں ایک واقعہ ہوا۔

سیلاب تو ہر سال آیا کرتا تھا لیکن اس بار کا سیلاب کچھ زیادہ شدید تھا۔ ہمارے قصبے کے ساتھ جو نہر بہتی تھی وہ پانی سے پوری طرح بھر کر ابل آئی تھی اور اس کے کنارے بنے ہوئے بہت سے کچے مکانات سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ ہر وقت بارش ہی ہوتی رہتی تھی۔

اسی دوران ایک دن بے خود کا خاص آدمی رشید میرے دفتر آگیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو بے خود کے معاملات کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

”عبید صاحب! صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ دونوں سے پیار ہیں کہہ رہے تھے انہیں سکتے اس لیے آپ آجائیں۔“

یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔

”میں نے اپنی چھتری اٹھائی اور رشید کے ساتھ چل پڑا۔ بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ ان علاقوں میں بارش یا تو بہت کم ہوتی ہے یا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس سال زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ حال ہو رہا تھا۔

بے خود کے پاس پہنچا تو وہ واقعی پیار تھا۔ بخار سے اس کا چہرہ چم رہا تھا۔ رشید فوراً میرے لیے چائے بنانے چلا گیا تھا۔

بے خود نے کہا۔ ”عبید صاحب اس وقت آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ سے زیادہ ذمے دار شخص مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ یا میں کسی سے واقف نہیں ہوں۔“

”فرمائیں بے خود صاحب میرے لیے کیا حکم ہے۔“ میں جو کچھ کہوں گا اس کے لیے وضع داری کی شرط ہے۔ ورنہ میں شرمندہ ہوتا رہوں گا۔“

”آپ فرمائیں تو سہی۔“

”میں آپ کو پچیس لاکھ روپے دے رہا ہوں۔ یہ میں نے اپنے اکاؤنٹ سے منکوائے ہیں۔“

”پچیس لاکھ روپے؟“ میں حیران رہ گیا تھا۔ ”وہ کیوں؟“

”میں کل خود دیکھ کر آیا ہوں نہر کے کنارے غریبوں کے کچے کچے گھر تباہ ہو گئے ہیں۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اپنی نگرانی میں ان گھروں کی مرمت کروادیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کہیں میرا نام نہ آئے کسی کو نہ معلوم ہو کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔“

”بے خود صاحب آپ کیا ہیں آخر؟“ میں نے

حقیقت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”انتا بڑا کام اور وہ بھی یوں ہی۔ بغیر کسی لالچ کے۔“

”ایک لالچ تو ہے نا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اور وہ ہے اپنے خدا سے اس کا اجر پانے کا۔“

”بے شک..... بے شک.....“ میں اس شخص کے سامنے کچھ بول تو نہیں پارہا تھا۔

رشید اس دوران چائے بنا کر لے آیا، بے خود اپنے دوسرے کمرے سے ایک بڑا سا لفافہ لے آیا تھا جس میں پچیس لاکھ روپے تھے۔ ”یہ لیں عبید صاحب! پورے پچیس لاکھ ہیں جائیں اور اللہ کا نام لے کر ان غریبوں کے ٹوٹے ٹھکر بنوادیں۔“

بارش کا زور ختم ہو گیا۔ سیلاب بھی اتر گیا تھا۔ اس وقت سے میری ذمے داری شروع ہو گئی۔

میں نے اپنی نگرانی میں گھروں کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔

بے خود ہو جانے والے لوگ جموں یاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دے رہے تھے لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اپنے ہفت روزہ میں ساری کہانی شائع کر دی۔ اس کے بعد کیا تھا۔

بے خود پورے علاقے کے لیے ایک دیوتا بن کر رہ گیا۔ ہر شخص کی زبان پر بے خود تھا جب کہ خود اس کا یہ حال تھا کہ مجھ سے سخت ناراض ہو گیا تھا۔

”عبید صاحب یہ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے تو آپ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے وعدہ خلافی کر دی۔“

”وعدہ خلافی تو ہے لیکن یہ ضروری بھی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ وہ دور ہے جب نیکی کے کام کے لیے ترغیب کی ضرورت ہونے لگی ہے۔ خود سوچیں جب کوئی جرم ہوتا ہے یا کوئی بڑا جرم پکڑا جاتا ہے تو دنیا بھر کے ٹی وی چینل اس کا ڈھنڈوا پیٹ پیٹ کر اسے ہیرو بنا دیتے ہیں اور جو کوئی بے چارہ نیکی کرے اس کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگوں میں نیکی کی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔“

بے خود منہ ہی منہ میں کچھ بول کر رہ گئے۔ اس سے اس شخص کے ظرف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پچیس لاکھ کی رقم معمولی نہیں ہوتی لیکن اس نے سوچے بغیر غریبوں کو دے دیئے تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ بے خود کے یہاں میرا آنا جانا

رہتا تھا۔ میں جب بھی جاتا لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازے پر ہوتی۔ وہ سب ایک نجات دہندہ جان کر اس کے پاس آیا کرتے۔ وہ کسی کو کوئی وظیفہ بتا دیتا۔ کسی کی پیسوں سے مدد کر دیتا۔

سیلاب والے واقعے کے بعد اس نے قصبے میں صفائی کی مہم کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ اس مہم میں بھی لوگ اس کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے۔

اس ایک شخص کی وجہ سے پورا علاقہ بدل کر رہ گیا تھا۔ پھر اسی دوران ایکشن کے دن آگئے۔

ہمارے حلقے سے ایک ایم این اے اور چار ایم پی اے ہو کر تھے۔

حسب دستور پھر وہی بلند و بانگ دعوے۔ وعدے تقدیر بدل کر رکھ دیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔

آزمائے ہوئے سہرے پھر بے وقوف بنانے آگئے تھے۔ یہ سب مشہور سیاسی پارٹیوں کے پلیٹ فارم سے ایکشن لڑ رہے تھے۔

ایسے میں میرے ذہن میں نہ جانے کیوں ایک خیال آ گیا۔

کیوں نہ بے خود صاحب کو ایم این اے کے لیے کھڑا کر دیا جائے۔ ان تمام بد معاش امیدواروں کی بھیڑ میں وہ تنہا اچھے بندہ تھے۔

میں نے بے خود صاحب سے ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھے۔ ”کیا ہو گیا ہے عبید صاحب، مجھے کس کچھڑ میں دھکیل رہے ہو۔“

”دیکھیں بے خود صاحب سیاست ان لوگوں کے لیے کچھڑ ہے جو اس کچھڑ کا حصہ بن جانا چاہتے ہیں اور یہ لوگ خدمت کے لیے نہیں آتے ہیں ان کے لیے سیاست کا رو بار کی طرح ہے۔“

”یہاں ایک سے ایک لوگ ایکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیا ہوں۔“

”آپ ان کے سامنے بہت کچھ ہیں، بلکہ آپ ہی ہیں۔ اس علاقے میں اور کوئی نہیں ہے۔“

”دیکھو بھائی میرا تعلق کسی پارٹی واریٹی سے نہیں ہے۔“

”کوئی بھی پارٹی آپ کے لیے بہت چھوٹی چیز ہے۔ بے خود صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے ایکشن لڑنا ہے۔“

انہوں نے خوف کو بھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک نہ سنی پھر جب یہ خبر باہر نکل تو پورے قصبے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ہم لوگوں نے اپنے طور پر ان کے کاغذات جمع کر دیئے تھے۔

ایکشن ابھی دور تھا بے خود صاحب کے دروازے پر جشن کا سماں رہتا تھا۔ لوگ مٹھائیاں اور تھلے لے لے کر آ رہے تھے۔

ہر ایک کو یقین تھا کہ سوائے بے خود صاحب کے اور کوئی جیت ہی نہیں سکتا اور ہوا بھی یہی۔ بڑے بڑے ناموں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

ہر ایک نے ان پر کھل کر بھروسہ کیا تھا۔

ان کی جیت کے بعد پورے قصبے میں جشن کا سماں تھا۔ یہ بات بھی بتا دوں کہ اس جشن کے لیے بے خود صاحب نے انہیں جیب سے پیسے دیئے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ ”میں عبید صاحب بے چارے غریب لوگ میری محبت میں سرشار تو ہو رہے ہیں لیکن میں ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ ان کو خوش ہونے دو۔“

”بے خود صاحب نے منتخب ہونے کے بعد انٹرویو بھی بہت زبردست دیا تھا۔ وہی ان کی کھری اور دھمکیاں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ جس نے مختلف محفلوں پر ان کے انٹرویوز دیکھے ہوں گے۔ وہ ان سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔“

دو مہینے کے بعد قومی اسمبلی کا ایکشن ہوا۔ حلف برداری کی تقریب ہوئی اور بے خود صاحب اسلام آباد چلے گئے۔

اس کے بعد بے خود صاحب کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے جتنے والی سیاسی جماعت نے انہیں اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی بلکہ ایک اہم عہدہ یعنی وزیر اطلاعات کا شعبہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ یہ خبر بھی قصبے والوں کے لیے جشن کا سبب بن گئی۔

ہمارے قصبے کا ہر دل عزیز انسان پورے ملک کا وزیر اطلاعات بن گیا تھا۔

لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ بے خود صاحب دوبارہ ہمارے قصبے کی طرف نہیں آئے۔ ان کی کتابیں اور دیگر سامان بھی چلا گیا تھا۔

قصبے والے ان کی طرف سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔

”عبید صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم نے سمجھا تھا

کہ بے خود صاحب وزیر بن گئے ہیں ہمارے قصبے کی قسمت بدل جائے گی لیکن وہ تو اسلام آباد جا کر ہمیں بھول ہی گئے۔ ”دیکھو بھائی۔“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ تم نہیں جانتے کہ جو عہدہ ان کو یاد کیا گیا ہے۔ کتنا اہم ہے۔ ان کو تو ایک لمحہ کی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔“

”پھر بھی ایسا بھی کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ اسلام آباد جا کر ان کو یاد دلانیں۔“

”ہاں عبید صاحب! آپ اسلام آباد چلے جائیں۔ آپ کے توان سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں بلکہ یہاں تک پہنچانے میں آپ ہی کا ہاتھ ہے۔“

”تو پھر چلے جائیں بھائی۔ قصبے کی حالت کچھ تو بدلے۔“

میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ خدا کی پناہ یہاں کے کسی وزیر سے ملنا کتنا بڑا خواب ہے میرا خیال ہے کہ یورپ کے کسی سربراہ سے بھی آپ یوں ہی ملاقات کر سکتے ہیں لیکن کسی پاکستانی وزیر تک آپ کے لیے رسائی ناممکن ہے۔

خدا بھلا کرے میرے پریس کے کارڈ کا اس کی وجہ سے آسانی ہوگی اور میں بے خود تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کی سواری دیکھی۔

واہ کیا پروڈکٹ تھا، پولیس کی دو موٹر بائزر پھر بے خود کی شاندار گاڑی جس پر پاکستان کا قومی پرچم لگا ہوا تھا۔

گاڑی سے اتر کو وہ اندر جانے ہی والا تھا کہ میں نے آواز دی۔ ”بے خود صاحب۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھ چلنے والے ایک شخص سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے آئے۔

اس کا کمر الگ سے بنا ہوا تھا۔ کیا شاندار کمر تھا۔ اس نے اپنے بیک میز سے کہا کہ وہ باہر جائے۔ پھر

میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جی عبید صاحب فرمائیں کیسے زحمت کی۔“

میں اس کے سر و لہجہ کو سن کر اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

”بے خود صاحب آپ تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔“ میں نے کہا۔

”عبید صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے ایک لمحے کی

فرصت نہیں ملتی۔“

”لیکن بے خود صاحب جس حلقے کے لوگوں نے آپ کو اس مقام تک پہنچایا ہے ان کا تو آپ پر حق بننا ہے ناں؟“

”حق!“ بے خود ہنس پڑا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بس یوں ہی اس عہدے تک پہنچا ہوں۔ جی نہیں پوری پلاننگ میری ذہانت مجھے یہاں تک لے کر آئی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”ارے بھائی حاتم طائی والا زمانہ گزر گیا۔ اب اگر ایک روپیہ خرچ کیا جاتا ہے تو یہ اُمید ہوتی ہے کہ اس کے بدلے ستر ملیں گے۔ آپ نے خود میری ذہانت دکھ لی۔ میں نے پہلے اپنی ساکھ بنائی۔ آپ کے علاقے والوں کو اپنے حق میں کیا۔ ایک خاص پلاننگ کے تحت پچیس لاکھ خرچ کر دیئے۔ اس کے بعد الیکشن میں کھڑا ہوا۔“

”اور ہم سب بے خوف بن کر آپ کا ساتھ دیتے رہے۔“ میرا لہجہ بھونک رہا تھا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یار، اس ملک کا عام آدمی اسی طرح بے خوف بن رہا ہے۔ اب ہمیں دیکھیں کہ میں نے اس وقت سارے دانے کھول دیئے ہیں لیکن کیا ہوگا کچھ بھی نہیں۔ آپ کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت ہی نہیں ہو گا۔ آپ جاہل لاکھ میرے خلاف اپنے اخبار میں لکھتے رہیں میرا کچھ نہیں بڑھے گا۔“

”سچ کہا تھا اس نے واقعی ہم یہاں کسی کرپٹ شخص کا کچھ نہیں لگاڑ پاتے۔ کیونکہ ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔“

”ویسے عبید صاحب اگر آپ جاہل تو میں آپ کو انفرادی طور پر فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔“

”وہ کس طرح؟“

”میں آپ کے اخبار کے لیے کاغذ کا کوڑے دے سکتا ہوں۔ آپ اسے بیچ کر لاگوں کھا سکتے ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ بے خود صاحب۔“ میں نے کہا۔

”میں ایک عام سا انسان ہوں اور مجھے دیہاتی رہنے دیں۔“

میں اس وزیر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

اور اب مجھے کسی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ چاہے وہ کتنا ہی پارسیانہ کر سامنے آجائے۔ آپ سے بس یہی کہنا ہے کہ آپ بھی کسی پر بھروسہ نہ کریں۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔



تیزاب

محترم و مکرم
السلام علیکم

یہ میں جو کچھ بھیج رہی ہوں یہ میرا اظہارِ یہ ہے۔ اعتراف ہے میں نے
جو گناہ کیا یا جس کی سزا عدالت نے سنائی ہے کیا واقعی یہ میرا
جرم ہے؟ آپ بھی پڑھیں۔

رافعہ
(ملتان)

اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔
کیونکہ ایک تو میں سر سے پاؤں تک برقع میں تھی۔ اس
کے علاوہ میں نے اپنا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ صرف میری
آنکھیں ہی دکھائی دیا کرتیں۔
گزشتہ دو برسوں سے میں اسی طرح باپڑ نکلتی، اسی لیے
وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا اور میں چاہتی بھی نہیں تھی کہ کوئی مجھے
پہچانے۔
بڑے فائدے بھی مل رہے تھے۔ پردہ عورتوں کے
لے کہنا ضروری ہے اس کا احساس اب ہو رہا تھا۔ عورت اپنے
آپ کو ایک مضبوط حصار میں محسوس کرتی ہے۔
میں بھی دو برسوں سے مضبوط حصار میں تھی۔ ایک بار تو
ایسا ہوا کہ میں ایک سپر اسٹور میں اس کے بالکل برابر جا کر
کھڑی ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ مجھے پہچان نہیں سکا۔
اس نے بس ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی پھر کسی اور
طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو مارک بادی کی اس
کی نگاہوں سے خود کو چھپانے میں کامیاب رہی تھی۔

لیکن دو برس پہلے ایسا نہیں تھا۔

اس وقت نہ تو میں برقع پہنتی اور نہ ہی حجاب میں رہتی تھی۔ اس لیے دنیا بھر کی ہوس زدہ نگاہیں میرے ارد گرد طواف کیا کرتیں۔

پتا نہیں کیا عاشق ہوا کرتا ہے اپنے آپ کو کبھی نہیں دیکھتے۔ یہ میرا مشاہدہ تھا کہ جتنا بد صورت مرد ہو گا وہ اتنی ہی خوب صورت عورتوں کے چکر میں ہو گا۔ شاید یہ اس کی کسی قسم کی احساس کمتری ہوتی ہے۔

تو اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اپنی دوست کے ساتھ ایک مارکیٹ میں تھی۔ گرمیوں کے نئے پرنس آئے ہوئے تھے۔ میں وہی لینے گئی تھی۔ میری دوست نے اچانک مجھے متوجہ کیا۔ ”رافدہ ایک بندہ تجھے بری طرح گھور رہا ہے۔“ ”ارے جانے دے، اس قسم کے بندے ہر مارکیٹ میں ملتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ کچھ خاص معلوم ہوتا ہے۔“ میری دوست نے کہا۔ ”ایک نمبر کا غنڈہ اور لوفر۔“ ”کہاں ہے؟“

”آہستہ سے اپنی گردن گھما کر دیکھ لے۔“ دوست نے کہا۔ ”لال قمیص پہن رہی ہے۔ توبہ۔“

میں نے اپنی دوست کے کہنے پر آہستہ سے گردن گھمائی اور وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ سرخ قمیص اور جینز میں اس نے اپنے گلے میں سونے کی زنجیر ڈال رکھی تھی۔ اتنے فاصلے کے باوجود اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی ہوس صاف محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی اور دکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب کسی قسم کی خریداری میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

ہم نے جلدی جلدی دکاندار کو پیسے دیے اور مارکیٹ سے باہر آ گئے۔

وہ کم بخت اب ہمارا تعاقب کرنے لگا تھا۔

”یار! یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔“ میری دوست نے کہا۔

”یہ سب تیرا تصور ہے۔“

”کیوں میرا کیا تصور ہوا؟“

”اتنی پیاری صورت کیوں پائی ہے جو دیکھتا ہے لٹو ہو جاتا ہے۔ اس بے چارے کا بھی کوئی خاص تصور نہیں ہے۔“

”اچھا اچھا رکشا پکڑ لے اور یہاں سے نکلنے کی سوچ۔“ میں نے کہا۔

”ہم دونوں نے رکشا کر لیا۔ اتفاق سے ہم دونوں کا ایک

ہی محلہ تھا اور ہم برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہم نے بچپن اسی محلے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہنسنے کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔

ناظمہ ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ جس طرح کی قبول صورت لڑکیاں ہوا کرتی ہیں لیکن میری بات کچھ اور تھی۔ خدا نے مجھے حسن کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔

گورارنگ، دل کش قامت، نازک چہرہ یا جسم اور اس پر میری آنکھیں۔ سب یہی کہا کرتے کہ یہ آنکھیں جادو جگانی ہیں۔

ان سب کے باوجود میں کبھی ادھر ادھر نہیں بٹکتی۔ مجھے ہمیشہ اپنے غریب والدین کا خیال رہا۔ ابوائیک بڑے سپر اسٹور میں کیشیئر تھے۔ ماں گھریلو عورت تھیں۔ ایک بڑا بھائی تھا جو کسی کمپنی میں کام کیا کرتا تھا۔ میں بھی اور میرے بعد دو اور بہنیں جو ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔

میں کالج میں تھی لیکن بہنیں اسکول میں تھیں، گھر کا گزارا کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔ میرے لیے رشتے بھی آیا کرتے لیکن ابھی میرا ارادہ شادی کا نہیں تھا۔

میں یہ جانتی تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایسے حالات پیدا کر دوں کہ گھر میں ٹھوڑی سی خوش حالی آجائے۔ اس کے بعد شادی دیکھی جائے گی۔

رشتے آیا کرتے تھے لیکن میں سلیقے سے ٹال دیا کرتی۔

اس معاملے میں گھروالوں نے مجھے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

ناظمہ بھی میرے ہی محلے میں رہا کرتی تھی۔ ہر شام یا تو

میں اس کے گھر چلی جاتی یا وہ میرے پاس آ جایا کرتی۔ ہم

دونوں کا ایک ہی شوق تھا۔ کہانیاں پڑھنے کا۔ ناظمہ اور میں

اکثر خواتین کے ڈائجسٹ لے آیا کرتیں اور ہم کہانیاں پڑھ

پڑھ کر ان پر تبصرے کرتے رہتے۔

ہمیں کہانیوں کا ماحول بہت اچھا لگتا تھا، چمکتی دیکتی

ہیر وئن دل کو بھاتی تو تھی لیکن ہم اپنی حد میں رہنا جانتے تھے۔

ہم دونوں کو اپنے اپنے گھر اور خاندان کی عزت کا خیال رہا کرتا تھا۔

ایک شام جب ناظمہ میرے پاس آئی تو وہ کچھ

پریشان سی تھی۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”کیا بات ہے ناظمہ، خیر تو ہے۔“

”یاروہ لوفر تیرا پتا کر کے یہاں تک آ چکا ہے۔“ ناظمہ

نے یہ خبر سنائی۔

”کیا! میں بھی حیران رہ گئی تھی۔“ کیا کہہ رہی

”ہے۔“
 ”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اس
 لوفر کو تیرے گھر کے سامنے دیکھا ہے۔“
 ”میرے خدا۔“ میں بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ”لیکن
 اسے میرے گھر کا پتا کیسے چلا؟“

”لگتا ہے کہینے نے مارکیٹ ہی سے ہمارا پیچھا کیا ہو
 گا۔“ ناظمہ نے کہا۔ ”ہم رکشے پر تھے۔ اسی لیے ہمیں پتا نہیں
 چلا۔ ایسے لوگ قبر سے بھی بندے کو تلاش کر کے لے آتے
 ہیں۔“

”یار یہ تو بڑی گریز ہو گئی۔“ میں واقعی پریشان ہو گئی
 تھی۔ ”اب بتاؤ کیا ہو گا۔“

”ایسے لوگوں کو اگر چھیڑا جائے یا پلٹ کر جواب دیا
 جائے تو بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔“ ناظمہ نے کہا۔
 ”جنونی قسم کے ہوتے ہیں ناں، اس کے لیے سب سے بہتر
 یہی ہے کہ نظر انداز کر دیا جائے۔ بالکل ان کی طرف توجہ نہ دی
 جائے۔ پھر یہ خود ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں، کم از کم ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں۔“
 ہم پھر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ہم
 دونوں نے ایک ہفتے قبل ایک کہانی پڑھی تھی۔ اب ہم اس پر
 گفتگو کرنے لگے تھے۔

دو دن بعد ایک شام وہ لوفر مجھے بھی دکھائی دیا۔ میں کچھ
 فاصلے پر ایک گھر میں ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی۔ ہاں میں
 نے یہ بتایا تھا کہ میں ٹیوشن بھی پڑھایا کرتی تھی۔ اس طرح
 میں کسی حد تک خود اپنا خرچ نکال لیتی تھی، تو جب میں ٹیوشن
 سے واپس آ رہی تھی تو میں نے اس لوفر کو اپنے گھر کے سامنے
 دیکھ لیا۔

میں نے اس کی نگاہ سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی
 لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہنس
 زدہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔
 اس نے ایک لوفرا نہ انداز سے مجھے سلام کیا لیکن میں
 برا سا منہ بنا کر اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔ وہ بھینا
 تملکا کر رہ گیا ہو گا۔

لیکن کیا یہ کافی تھا؟ کیا وہ میرا پیچھا چھوڑ دینے والا تھا۔
 وہ ان میں سے نہیں معلوم ہوتا تھا جن کو کوئی لڑکی اگر ایک بار
 شٹ نہ دے تو دوبارہ اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں
 ہیں۔ بہر حال اب مجھے بہت احتیاط کرنی تھی۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے بارے میں اپنے ابا اور

سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔
 پتا نہیں یہ کیسا دستور ہے۔
 قانون اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کسی کی زندگی
 تباہ ہو چکی ہو۔ کوئی تکلیف واردات ہو چکی ہو۔ ہمارے یہاں
 ہمیشہ یہی رواج رہا ہے۔

ایک دن اس نے راستے میں مجھے روک لیا۔ کیسی
 جرات تھی اس کی۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ جس ہنگامہ کھڑا
 کروں لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
 اس نے میرا راستہ روک کر کہا تھا۔ ”آخر تم مجھ سے اتنا
 کسرتا ہی کیوں ہو۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔ ”کون ہو
 تم۔“
 ”بندے کو سکندر خان کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا نام
 بتایا۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“
 ”مجھ سے دوستی کرلو۔ بہت فائدے میں رہو گی۔“
 ”شٹ اپ بدترین انسان۔“
 ”یاد رکھو سکندر خان کو شٹ اپ کہنے والے کی خیر نہیں
 ہوتی۔“

”تم جاتے ہو یا میں لوگوں کو بلاؤں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ اب تو جا رہا ہوں لیکن اب اس طرح
 آؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گی۔“

وہ ایک طرف چلا گیا۔ میں کچھ دیر سکتے کے عالم میں
 کھڑی رہ گئی۔ میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے اتنی
 بدتمیزی سے بات کی تھی، جب کہ مجھ سے فری اور پیار سے
 بات کرنے والے بہت تھے۔

میں شام کے وقت ناظمہ کے پاس چلی گئی۔ میں نے
 اسے سب کچھ بتا دیا۔ ناظمہ بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی۔
 ”کیسا بے شرم انسان ہے۔ ایسے لوگوں سے تو اللہ ہی
 سمجھے۔“

”ناظمہ مجھے تو اب اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ میں نے
 کہا۔ ”وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔“

”اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ تم اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں بتا دو۔“

”یار میرے گھر والے پریشان ہو کر رہ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ وہ غریب لوگ ہیں اور غربت سب سے بڑا جرم، سب سے بڑی کمزوری ہوا کرتی ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”کچھ نہیں، میں کچھ دنوں کے لیے کالج نہیں جاؤں گی۔“ میں نے بتایا۔ ”اس کے بعد دیکھا جائے گا کیا ہوتا ہے۔“

میری ہوا اور میں نے کالج فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں کچھ بیمار ہو گئی ہوں اور ایک ہفتے تک کالج نہیں آسکوں گی۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایک ہفتہ اتنے دنوں پر محیط ہو جائے گا۔

ایک ہفتے تک وہ گلی میں دکھائی نہیں دیا۔ یہ رپورٹ ناظمہ سے ملتی رہی تھی۔ وہ گھرانی کرتی رہی تھی اور جب وہ ایک ہفتے تک دکھائی نہیں دیا تو اس نے کہا۔ ”رافعہ ایسا لگتا ہے کہ اس نے مایوس ہو کر تمہارا چھچھا چھوڑ دیا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو۔“

میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئی تھی کہ وہ اب میری طرف نہیں آئے گا لیکن اس اذیت ناک دن جب میں کالج سے واپس آ رہی تھی اس نے راستے میں مجھے گھیر لیا۔ وہ اپنی بائیک پر تھا اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی۔ اس نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے میرے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔

میرے خدا! کیا میں اس اذیت کو بیان کر سکتی ہوں۔ شاید کبھی نہیں۔ ایک طرف کا چہرہ اور گردن جھلس گئی۔ میں ہانگوں کی طرح پیچ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لوہر کو یہ عمل کرتے ہوئے محلے کے کچھ لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے فون کر کے ایبویٹنس منگوائی تھی۔

اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا جو ایسے مرحلوں میں ہوا کرتا ہے۔

مجھے ایک سرکاری اسپتال میں تین مہینوں تک رہنا پڑا تھا۔ وہ لوہر گرفتار ہو گیا تھا۔ محلے والے اسے پہچانتے تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی تھی۔

لیکن اس سے کیا ہوا صرف تین سال کی سزا۔ کسی خوب صورت چہرے کو بد صورت کرنے اور اس کی زندگی برباد کرنے کی سزا صرف تین سال۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خود اس کے چہرے پر بھی تیزاب ڈال دیا جاتا تاکہ وہ اس اذیت کو خود بھی برداشت کرنا رہے۔

خدا کی پناہ میں آئینے میں اپنا بد صورت اور چھلکا ہوا چہرہ دیکھ کر کتنا روٹی تھی۔ میرے ساتھ پوا گھر دور ہا تھا کیونکہ اب میں کہیں کی نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ جو پہلے مجھے دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے اب اس طرح پیچھے ہٹ جاتے جیسے میں کوئی بد روح ہوں اور وہ میرے سائے سے بھی بچنا چاہتے ہوں۔

محلے کے بچوں نے میرا نام ہی چڑیل رکھ دیا تھا۔ جب میں ان کے سامنے آتی تو وہ جھج کر بھاگ جاتے، دور جا کر چڑیل چڑیل کہتے۔ اس وقت میرا کرب سوا ہوا جاتا۔

دل خون کے آنسو روتا رہتا۔ صرف ناظمہ تھی جو اب تک میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں نے تو کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا اگر کہیں جاتی بھی تو تھاب میں اور وہ بھی اس طرح کہ صرف میری آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ چہرہ تو اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی دیکھ سکتا۔

کچھ مہینے گزرے تھے کہ ناظمہ نے ایک خبر سنائی۔ ”رافعہ وہ لوفر جیل سے باہر آ گیا ہے۔“

”باہر آ گیا ہے۔ وہ کیسے؟ اس کو تو تین سال کی سزا ہوئی تھی۔ ابھی تو صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔“

”اب کیا بتایا جائے۔ سفارش اور رشوت دو ایسی چیزیں ہیں جن سے پورا قانون بدل جاتا ہے۔“

”لیکن یہ تو بہت بڑی نا انصافی ہے ناظمہ۔“

”میری جان نا انصافی تو اسی وقت ہو گئی تھی جب اتنے بڑے جرم کی سزا تین سال ہوئی تھی۔ اس کے مددگاروں نے پہلے پولیس ریکارڈ میں تبدیلی کرائی اور ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ عدالت ثبوت پر فیصلہ کرتی ہے۔ تمام ثبوت مٹا دیے گئے تھے اس لیے فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔“

وہ رات میں نے روتے اور بکھتے ہوئے گزاری تھی۔ اس خبر نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ کیسا دستور تھا۔ کسی کی زندگی برباد کرنے والے کو صرف چند مہینوں کے بعد باعزت بری کر دیا جائے۔

صبح ہوتے ہوتے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

میں نے ناظمہ کو بتایا۔ ”ناظمہ قانون نے تو اسے کوئی سزا نہیں دی لیکن میں اس سے اپنی زندگی کا بدلہ ضرور لوں گی کیونکہ اس نے میرا رڈ کر لیا ہے، خون کیا ہے میرا اور میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

”لیکن تم کبھی کیا سکتی ہو۔“

”یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا ہے لیکن اتنا ضرور سوچ لیا ہے کہ بدلہ ضرور لیتا ہے۔“
”رافہ تم ایک کمزوری لڑکی ہو۔“

”یہ خیال ذہن سے جھٹک دو تو ہمت خود بخود آ جاتی ہے۔ میں خدا کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق برابری کا انصاف چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا ضرور میری مدد کرے گا۔“

ناظمہ نے بھی زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میرے جذبات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں کس کرب میں ہوں اور میرے وجود میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔

میں نے اس لوفر کا ایڈریس معلوم کر لیا۔ وہ ہمارے محلے سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔

ایک بار میں نے اسے ایک اسٹور میں دیکھ لیا۔ جس کا ذکر میں اپنی کہانی کی ابتدا میں کر چکی ہوں۔ وہ میرے پاس ہی کھڑا تھا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکا کیونکہ میرا چہرہ پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ صرف میری آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ اسٹور سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر باہر نکل ہی رہا تھا کہ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”ایک منٹ ذرا بات سنیں۔“

”جی۔“ وہ حیران ہو کر رک گیا۔ ”کیا مجھ سے کچھ کہا؟“

”کیا آپ میرا ساتھ دے سکتے ہیں؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے میں کسی سے خوفزدہ ہوں۔ ”پلیز! ایک لڑکی کا تو کھرے ٹکنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
”آخربات کیا ہے؟“

”میں کچھ خریدنے کے لیے آئی تھی کہ دو غنڈے میرے پیچھے بڑ گئے۔“ میں نے بتایا۔ ”بڑی مشکلوں سے ان سے بچ کر اس طرف آئی ہوں۔“

مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ آواز سے بھی میری شناخت نہیں کر پارہا تھا۔ ویسے بھی اس حادثے کے بعد چہرے کے ساتھ ساتھ میری آواز بھی بدل گئی تھی۔ صرف آنکھیں زندہ اور جادو بھری تھیں اور شاید ان ہی آنکھوں کے سحر نے اسے گرفتار بھی کر لیا ہو۔

”بناؤ کہاں ہیں وہ غنڈے۔“ اس نے پوچھا۔
”میں نہیں پلیز میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتی۔ بس اپنے

ساتھ مجھے لے جا کر اسٹاپ تک پہنچا دیں تاکہ وہ فٹلے آکر دیکھیں تو انہیں پتا چلے کہ میرے ساتھ کوئی ہے۔“

”تم روتی کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”حبیب کالونی۔“ میں نے مختلف ڈائریکشن کا پتا دیا۔ جہاں میری ایک خالہ رہتی تھیں۔

”لیکن تم نے مجھ پر کیوں بھروسہ کر لیا۔ میں بھی تو ویسا ہی ہو سکتا ہوں۔“

”پتا نہیں کیوں، آپ پر بھروسہ کرنے کو دل چاہا اسی لیے میں آپ کے پاس آ گئی ورنہ یہاں اور بہت سے لوگ گھوم رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پلیز جلدی مجھے یہاں سے نکال لے پلیز۔“

”اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں بائیک پر تمہارے گھر تک پہنچا دوں؟“ اس نے کہا۔

”ارے نہیں آپ کو زحمت ہوگی۔ میں بس سے چلی جاؤں گی۔“

”کوئی زحمت نہیں۔ تمہارے کام آکر مجھے خوشی ہوگی آؤ میرے ساتھ۔“

میں اس کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھ کر حبیب کالونی تک آ گئی۔ اترتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔“ اس نے اپنی فطرت کے مطابق پھر پوچھا۔

”آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے میں آپ سے ضرور ملوں گی۔“ میں نے کہا۔

”تم مناسب سمجھو تو میرا موبائل نمبر نوٹ کر لو۔“
”مجھے موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔
”تو پھر کیسے ملوگی؟“

”میں ہفتے میں ایک دن اس اسٹور پر آیا کرتی ہوں۔ یعنی آج کے دن۔ آپ کو ملنا ہو تو وہیں آ جایا کریں۔“

”کس وقت؟“
”بہی کوئی چار پانچ کے درمیان۔ ٹھنڈے ٹائم۔“ میں نے کہا۔ ”خدا حافظ۔“

میں تیزی سے اس گلی میں داخل ہو گئی جس میں خالہ کا گھر تھا۔ میں نے پہلا قدم اٹھا لیا تھا۔ اب اس کو بہت ہوشیاری کے ساتھ انجام تک پہنچانا تھا۔

میں بہت دیر تک خالہ کے گھر بیٹھی رہی۔ وہ بھی یہ دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں کہ میں ان کے گھر آئی ہوں۔ کچھ دیر وہاں

”اس کے بعد وہی ہوگا جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم گھبرا رہی ہو تو پھر رہنے دو۔ میں کسی اور جگہ کا بندوبست کر لیتی ہوں۔“

”ارے نہیں، تو کیسی بات کر رہی ہے۔“ مدیحہ بولی۔

”میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔ میں تو خود ایسے کینوں کی تلاش میں رہتی ہوں بس اس کو گھیر کر لے آؤ۔ لیکن کیسے لائے گی؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔ ”وہ میرے محر سے بچ کر جا نہیں سکتا۔“

پروگرام کے مطابق میں نے اس لوہرے ملاقات کی۔ سکندر پوری تیار کی کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے شاید اسی ملاقات کے لیے نیا سوٹ بنوایا ہوگا۔ خوب پر فوم میں بسا ہوا ان سب کے باوجود اس کے اندر کی خباثت اس کے چہرے سے برس کر اسے اور بھی بد نما کر رہی تھی۔

”واہ! تم تو وقت کی بہت پابند نکلیں۔“ اس نے مجھ سے ملنے کے بعد کہا۔

”ظاہر ہے تم کو وقت جو دیا تھا۔“

”اس دن میں تمہارا نام نہیں پوچھ سکا تھا۔ یا تم نے نہیں بتایا تھا۔“

”یا سیمین نام ہے میرا۔“

”یا سیمین بہت خوب صورت نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم یا سیمین کے پھول کی طرح خوب صورت ہوگی۔“

”پتا نہیں۔ گھر والے تو یہی کہتے ہیں۔“

”میں بھی اگر تمہارا چہرہ دیکھ لوں تو شاید یہی کہنے لگوں۔“

میں ہنس پڑی۔ ”مردوں کے ساتھ یہی پرابلم ہوتی ہے کہ وہ ہر کام میں جلدی چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جلد بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ پلیز اس بات پر مجبور نہ کریں۔“

”اچھا اچھا ناراض نہ ہو۔ یہ بتاؤ وہ غنڈے پھر تو نہیں ملے۔“

”نہیں اس دن کے بعد سے نظر نہیں آئے۔“

”چلو چل کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ویسے جی بھر کر باتیں کریں گے۔“

میں اتنی جلدی اس کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ وغیرہ جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خوش اسلوبی سے اسے ٹال دیا۔

رہ کر میں اپنے گھر واپس آگئی۔

میں نے ناظرہ کو بھی صورت حال بتا دی تھی۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ”تو نے تو کمال کر دیا۔ کیا تجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ وہ تجھے پہچان لے گا۔“

”میرا پورا چہرہ نقاب میں تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”صرف میری آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں اور تو یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ میری آواز تک بدل گئی ہے۔“

”یہ بات تو ہے۔ اب کیا ارادے ہیں۔“

”میں نے اس پر ڈر تو ڈال دی ہے اب اس کو کچھی طرح اپنے جال میں پھنسا کر وہاں لے جانا ہے جہاں میں اس سے اپنا حساب لے سکوں۔“

”کہاں لے جائے گی۔“

”یہ ابھی نہیں سوچا ہے لیکن مدیحہ کا نام ذہن میں آ رہا ہے۔“

”اور یہ مدیحہ کون ہے؟“

”میرے کالج کی دوست۔ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے گھر والے لاہور میں ہیں۔ ایڈیٹر پنڈت قسم کی لڑکی ہے۔ دو دفعہ اس حادثے کے بعد مجھ سے ملنے آ چکی ہے۔ وہ خود بھی یہی کہتی رہی ہے کہ اس کینے سے بدلہ ضرور لیتا ہے۔“

میں دوسری شام مدیحہ کے فلیٹ پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہلکے سے لگا لیا تھا۔ ”یار! میں تو یہ بھی سمجھی تھی کہ تو نے بن باس لے لیا ہے۔“

”تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اب جو بھی ہے اس کا سامنا تو کرنا چاہیے نا۔“

”اس لیے تو تیرے پاس آئی ہوں کہ مجھے سامنا کرنا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ بتاؤ کیا میرا ساتھ دوگی۔ گھبراؤ گی تو نہیں؟“

”تو بتا تو سہی۔ تیرے لیے جو ہو سکتا ہے وہ کرنے کو تیار ہوں۔“

”میں اس کینے کو گھیر کر تیرے فلیٹ میں لانا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن وہ تیرے ساتھ کیوں آنے لگا۔“

”میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس پر اپنا حال ڈال چکی ہوں اور اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں ہے کیونکہ میں مکمل نقاب میں تھی۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا۔“

کینے کو لانے کی کوشش کروں گی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کے ہوشیار ہو جانے سے پہلے پہلے بہت کچھ کر لیتا تھا۔

وہ مجھے اپنی بائیک پر مدیحہ کے اپارٹمنٹ تک لے آیا۔ ایک بات اور کہ مدیحہ اس اپارٹمنٹ میں صرف دس روپے رہنے والی تھی۔ اس نے اپنا زیادہ تر سامان دوسرے اپارٹمنٹ میں شفٹ کر دیا تھا۔

اس کام کے انجام پاتے ہی وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر وہاں سے روانہ ہو جاتی۔ ہم نے یہ احتیاطی تدابیر پہلے سے اختیار کر رکھی تھیں۔

”واہ۔“ سکندر نے ستائشی نگاہوں سے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری دوست تو بہت شاندار بلڈنگ میں رہتی ہے۔“

”ہاں اس کی پوسٹ بھی تو اچھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی کمپنی میں مینیجر کا عہدہ ہے اس کا۔ ڈیڑھ لاکھ روپے سگری ہے اس کی۔“

”کیا اس وقت وہ نہیں ہوگی۔“

”نہیں، وہ اپنی ڈیوٹی پر مگنی ہوگی۔“

میں اسے لفٹ کے ذریعے مدیحہ کے اپارٹمنٹ تک لے آئی۔ جو چھٹی منزل پر تھا۔

ڈرائنگ روم میں صوفے اور کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ اس لیے اسے کوئی شک نہیں ہوا کہ یہ فلیٹ خالی ہونے والا ہے۔ مدیحہ میری ہدایت کے مطابق دوسرے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

”اب تو یہ نقاب اتار دو۔“

”اوہو آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”میں چائے نہیں پیتا۔“

”کیا میرے ہاتھ کی بھی نہیں پیو گے۔“ میں نے

ایک لگاؤ سے پوچھا۔

”اچھا یار۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”تم بھی کیا یاد کرو گی۔ جاؤ

لے آؤ۔“

”سب کچھ پہلے سے تیار تھا۔ صرف چائے بنانی تھی

اور اس میں خواب آور صوف ڈال دیتا تھا۔ جب میں اس کے

لیے چائے لے کر آئی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ نقاب ہٹا دو گی۔“

”ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم چائے پیو۔ میں اپنا

اگلی ملاقات اگلے ہفتے طے پائی تھی۔ وہ اپنی بائیک پر مجھے صیب کالونی تک لایا تھا لیکن اس دفعہ میں خالہ کے گھر نہیں گئی بلکہ بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اپنے گھر واپس آ گئی۔

ایک اور ملاقات ہوئی۔

اس بار ہم ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

اصل فنکاری مجھے وہاں دکھائی تھی۔ میری فرمائش پر اس نے کولڈ ڈرنک منگوایا لیکن مجھے کولڈ ڈرنک اس طرح پینی گئی کہ میرا چہرہ اس کے سامنے نہ آئے۔

اس نے دائیں بائیں سے جھانکنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ کھسا کر بولنے لگا۔ ”یار اب ایسا بھی کیا۔ جب ہمارے درمیان دوستی ہو چکی ہے تو پھر اتنا پردہ کیوں۔“

”نہیں سکندر، پلیز اس کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی خاندانی اصول کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے وقت آنے دو میں خود ہی اپنا نقاب ہٹا دوں گی۔“

”اچھا بابا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا۔“

تیسری یا چوتھی ملاقات میں اس نے کہا۔ ”یار یاسمین

اس طرح کی ملاقاتوں میں مزہ نہیں آ رہا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“ میں نے پوچھا۔

”چلو میرے ساتھ میں تمہیں اپنا گھر دکھا دیتا ہوں۔“

اس نے کہا۔

”نہیں تمہارے گھر نہیں اگر اطمینان سے بیٹھنا ہے تو

میرے ساتھ چلو۔“

”اوہو! تمہارے پاس بھی کوئی ایسی جگہ ہے۔“

”تم مجھے غلط مت سمجھو۔“ میں نے کہا۔ ”وہ میری

دوست کا گھر ہے۔ وہ کسی فیکٹری میں اچھے عہدے پر کام کرتی

ہے اس کے فلیٹ کی ایک چابی میرے پاس بھی رہتی ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”اسٹڈی کے لیے۔“ میرے پاس جواب تیار تھا۔

”جب گھر پر پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تو میں اس کے فلیٹ میں

جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔“

”واہ یہ تو بہت زبردست بات ہوئی۔“ وہ اندر سے

نہال ہوا جا رہا تھا۔

میں نے مدیحہ سے کہہ رکھا تھا کہ کسی طرح آج میں اس

ڈریس پہنچ کر کے آتی ہوں۔ آج پہلی بار تمہارے سامنے آ رہی ہوں تو اپنے آپ کو ذرا ٹھیک تو کر لوں۔“
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”محبوب کے سامنے محبوبہ کو بالکل فٹ فٹ رہنا چاہیے۔“
 میں اس کمرے میں آئی جس میں مدیحہ بیٹھی ہوئی تھی۔
 ”اب تک سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔
 ”تم پریشان مت ہونا۔“
 پانچ منٹ کے بعد جب میں اس کمرے میں پہنچی تو وہ کمینہ مد ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے عام طور پر یہی سنا ہے کہ جو اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت پوز بھی کرتے ہیں وہ عام طور پر عورت کے چکر میں آ کر بے وقوف بن جاتے ہیں۔

ان کی ساری طر م خانی دھری رہ جاتی ہے۔ جس طرح اس کے ساتھ ہوا تھا۔ میری دوستی کے شوق میں وہ خود اس جال میں آ کر پھنس چکا تھا۔

میں نے مدیحہ کو دوسرے کمرے سے بلوایا۔ میں نے ابھی تک اپنا برقع اور نقاب نہیں اتارا تھا۔ مدیحہ ڈوریاں لے آئی تھی۔ ہم دونوں نے اسے کس کرکری سے باندھ دیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دئے کچھ دیر بعد وہ کسمسا کر ہوش میں آ گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔

مدیحہ نے میرے کہنے پر اپنے چہرے پر اس طرح نقاب ڈال رکھی تھی کہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دے۔ سکندر نے کرکری سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھے ہوئے کی وجہ سے پھنس کر رہ گیا۔

”کیا ہے۔“ وہ حلق بھاڑ کر چلا یا۔ ”کون ہو تم دونوں کیوں باندھ رکھا ہے دھوکے باز عورت۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تو نے مجھے کیا پلا دیا تھا۔ کون ہو تم۔“

”میں وہی ہوں جس کا چہرہ دیکھنے کے لیے تو مرا جا رہا ہے۔“ میں نے اپنا نقاب اتار دیا۔

مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا تھا۔ ”کک..... کون ہو تم؟“

”میں وہی ہوں جس کے خوب صورت چہرے کو تو نے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یاد ہے کہ بھول گیا۔“

”معاف کر دو مجھے۔“ وہ گڑ گڑانے لگا۔ ”مجھے اس کی سزا تو ہو گئی۔“

”سزا کسی کی زندگی برباد کرنے کی سزا صرف تین مہینے۔ نہیں تیری سزا بھی وہی ہوتی چاہے جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے۔“

میرے اشارے پر مدیحہ تیزاب کی بوتل اور ماسکنگ ٹیپ لے آئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے۔“ اس نے بوتل کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”تیزاب۔“ میں بے رحم ہو کر بولی۔ ”ویسا ہی تیزاب جیسا تو نے میرے چہرے پر ڈالا تھا۔ اب ذرا تو بھی اس کی اذیت برداشت کر۔“

”نہیں تو میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ چلانے لگا۔

میں نے اور مدیحہ نے اس کے منہ پر ماسکنگ ٹیپ لگا دی تھی۔ جس میں اس کی چیخیں گھٹنے لگی تھیں پھر ہم نے وہی کیا جو سوچ رکھا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔ اس کا تڑپنا خون خوں کرنا یہ سب اچھی طرح یاد ہے مجھے۔

انتہائی کرب میں اس نے اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔ وہ یا تو مر چکا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر ہم اس فلیٹ سے نکل آئے۔ میں ایسی کوئی چیز چھوڑ کر نہیں آئی تھی جو مدیحہ پر روشنی ڈال سکتی۔ یا وہ کسی طرح پھنس جاتی۔

اور جہاں تک میرا سوال تھا تو میں تو اس کے سامنے تھی۔

وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔ اس کی اطلاع دونوں بعد اس وقت ہوئی جب اس فلیٹ کو کھولا گیا۔ مدیحہ ٹریس کر لی گئی۔ لیکن میں نے صاف بتا دیا کہ اس جرم میں مدیحہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس فلیٹ کی چابی میرے پاس رہتی تھی اور میں ہی سکندر کو گھیر کر وہاں تک لے گئی تھی۔ مدیحہ بے چاری کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ اس کے فلیٹ میں کیا ہو رہا ہے۔

میرے بیان نے مدیحہ کو صاف بچا لیا تھا۔

لیکن مجھ سزا ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔

اب میرا پورے معاشرے سے ایک ہی سوال ہے کہ کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے، کیا کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے والے کو ایسی ہی سزا نہیں ملنی چاہیے؟

دل مشکل

محترم مدیر

سلام مسنون

ایک ایسی سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں جو کئی معنوں میں بالکل الگ انداز کی ہے۔ پوری دنیا کے لیے پیغام ہے۔ ماں بچوں کو کتنا چاہتی ہے اس کا بیان ہے۔ امید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

حسیب اشرف

(سیالکوٹ)



”ای جان میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں آپ صبح سویرے اُٹتی ہیں نماز پڑھتی ہیں اور پھر ہمارے لیے کھانا بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں اس کے بعد ہم سب تو نکل جاتے ہیں لیکن آپ پھر سے گھر کے کاموں میں مصروف ہو

”السلام علیکم ای جان۔“ وہ کھانے کی میز پر آیا تو ای میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔
”علیکم السلام کیسا ہے میرا بچہ۔“ ای نے پیار سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

طرف دیکھا۔

”علیہ سے بتا رہی تھی کہ آج شام اماور بابا مہوش بھائی کے گھر جانے والے ہیں شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے۔“

”یہ علیہ سے بھی نا، مجھے بہن کم اور ننوز کا شر زیادہ لگتی ہے۔“

”امی کیا واقعی آپ شادی کی بات کرنے والی ہیں؟“ محبت نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹا، عون بھائی چاہتے ہیں کہ وہ اب بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور ویسے بھی اب ایک سال ہو گیا ہے تم دونوں کی منگنی کو اس لیے مزید دیر کرنا مناسب نہیں۔“

”ارے امی جان ابھی تو ایک مہینہ ہوا ہے بھائی کو بابا کا بزنس جوائن کیے ہوئے۔ ابھی انہیں سیٹ ہو لینے دیں شادی ایک دو سال بعد ہو جائے گی۔“ عمار نے محبت کو چڑانے کی کوشش کی۔

”بیٹا کہہ دو تم ٹھیک رہے ہو لیکن وہ کیا ہے کہ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنے تمام فرائض کسی اور کے حوالے کر دینے چاہیے۔“ امی نے بھی اسی انداز میں کہا تو اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور آفس کے لیے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

”ہاں تم صرف پانچ منٹ انتظار کرو میں بس پہنچ رہا ہوں۔“ وہ کان پر موبائل لگائے اپنے کیمین سے نکل کر مرکزی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”محبت بیٹا کہاں جا رہے ہو، ہماری اتنی اہم میٹنگ ہونے والی ہے۔“ بابا نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔

”جی بابا مجھے عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے، آپ پلیز میٹنگ اکیلے ہی دیکھ لیں۔“ اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

”وہ اب بچہ تو نہیں ہے اپنا کام خود بھی کر سکتا ہے۔“ ”اصل میں بابا مجھے اس کے پرنٹل سے بھی ملنا ہے تاکہ پتا چل سکے کہ وہ کالج میں پڑھائی بھی کرتا ہے یا بس کھیل کود میں ہی مصروف رہتا ہے۔“ اس نے پھر سے بہانہ بنایا۔

”تو پرنٹل سے ملنے کی کیا ضرورت ہے تم مہوش سے پتا کر لو وہ بھی تو اسی کالج میں پڑھتی ہے۔“

”جی بابا مہوش سے بھی پتا کر لوں گا لیکن فی الحال پرنٹل صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں اس لیے مجھے اجازت

جاتی ہیں۔ سارا دن کام کرنے کے بعد بھی نہ کبھی چہرے پر مسکندہ نظر آتی ہے اور نہ ہی زبان پر کوئی شکوہ جبکہ ہم تو صرف آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں پھر بھی تھک جاتے ہیں۔“

”بیٹا تم لوگ کام کرتے ہو اور میں اپنا فرض نبھاتی ہوں، انسان کام کرتے ہوئے تھک سکتا ہے لیکن فرض بھی اسے تھکا تا نہیں بلکہ اسے اور ہمت دیتا ہے تاکہ وہ مزید اچھے طریقے سے اسے نبھاسکے۔“ انہوں نے جگ سے جوں گھاس میں اثرایا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ اب آپ کی عمر ہو چکی ہے گویا وقت آ گیا ہے کہ آپ کھانا پکانے کی ذمہ داری کسی اور کے حوالے کر دیں۔“

”ہاں، تمہارے بابا نے کتنی بار کہا ہے کہ کنگ ہائیر کر لیتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ تم لوگوں کے لیے کوئی اور کھانا بنائے۔“

”میری پیاری امی جان میں کنگ کے بارے میں بات نہیں کر رہا بلکہ میں تو.....“

سیڑھیوں سے آتے ہوئے عمار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”واٹس اپ برو..... مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی کہ آپ دونوں اتنی جلدی کیسے اٹھ جاتے ہیں۔“

”لو آگیا انگریز کہیں کا.....“ امی کو اس کی انگلی سے چڑھتی۔

”سو مسٹر عمار آپ نے آج پھر نماز نہیں پڑھی۔“ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”یار بھائی کیا کروں لاکھ کوشش کے باوجود فجر کے وقت آنکھ نہیں کھلتی۔“ عمار نے کندھے اچکا کر کہا۔

”آکھ کب کھلے گی تا جب رات کو ٹائم پرسوگے ساری ساری رات تو تم موبائل پر لگے رہے ہو۔“ امی کو اس کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی۔

”ماما موبائل پر نہیں لگا رہتا بلکہ پڑھائی میں مصروف رہتا ہوں! آپ تو جانتی ہیں کہ اگلے مہینے میرے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور رہی بات کل رات کی وہ تو میں مہوش بھابی سے بات کر رہا تھا۔“

”بیٹا اتنی بات تو تمہارا بھائی بھی اپنی مگھیر سے نہیں کرتا جتنی تم اس سے کرتے ہو۔“

”ارے ماما میں نے تو ایک اڑتی اڑتی خبر سنی تھی بس کفر م کرنے کے لیے بھابی کو بھول گیا تھا۔“

”کون سی خبر۔“ محبت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی

دیں۔“ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

”ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلدی واپس آنا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ انہوں نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”جی بابا.....“ وہ جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

☆.....☆.....☆

اس نے رینٹورنٹ میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کوئی کی میز پر بیٹھی تھی۔ اس نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سوری سوری دیر سے آنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

”اگر اتنے ہی مصروف تھے تو پہلے ہی بتا دیتے میں تھوڑی لیٹ آ جاتی۔“

”میں تو بک کا آفس سے نکلنے کا سوچ رہا تھا لیکن کام کی وجہ سے وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور اب جب وقت ملا تو بابا نے روک لیا بڑی مشکل سے بہانہ بنایا کہ عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے۔“

”تو اب آپ کو میری وجہ سے بابا کے سامنے جھوٹ بھی بولنا پڑ رہا ہے۔“ اسے اس کا یوں جھوٹ بولنا مگوار گزرا تھا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ایک انتہائی ضروری میٹنگ چھوڑ کر مہوش سے ملنے جا رہا ہوں تو کیا وہ مجھے آنے دیتے۔“

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی جھوٹ بولنا بھی تو اچھی بات نہیں۔“ وہ جھوٹ کی وجہ سے افسردہ تھی۔

”تم فکر نہ کرو اب مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ آج شام کو امی اور بابا تمہارے گھر جا رہے ہیں شادی کی تاریخ لینے کے لیے۔“ اس نے موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خبر پہلے ہی مجھے تک پہنچ چکی ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم نے تو میرے گھر میں تین تین جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو تمہیں پل پل کی خبر دیتے ہیں۔“ اس نے طنز پر انداز میں کہا۔

”جاسوس نہیں بہن بھائی ہیں میرے۔“

”آرڈر کر لیا ہے، مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ بھیرا۔

”ہاں کرو یا ہے آتا ہی ہوگا۔“

”Your order sir۔“ ویٹر نے کھانا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جزاک اللہ۔“ اس نے شکر یہ ادا کیا۔

”بابا سوچ رہے ہیں کہ الف ایس سی کے بعد عمار اور علیہ کے کو میڈیکل میں داخلہ دلوا دیں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”اچھا ہے علیہ تو پڑھائی میں کافی انٹر سٹڈ ہے لیکن عمار کا کچھ پتا نہیں، میں نے کئی بار پوچھا اس سے لیکن وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا ہے کہ جو بھی کرنا ہے الف ایس سی کے بعد ہی سوچوں گا۔“ اس نے کھانا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ وہ چاہتا کیا ہے اپنے مستقبل کی تو اسے کوئی فکر ہی.....“ بات کرتے کرتے اچانک وہ کراہ اٹھا تھا۔

”کیا وہ اعبت تم ٹھیک تو ہو۔“

”ہاں ٹھیک ہوں پتا نہیں ایک عجیب سا وردہ اٹھا تھا۔ ریزہ کی ہڈی کے نیچے تھوڑا دائیں طرف۔“ اس نے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”چلو اٹھو..... ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں اب..... تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔“

”کیا واقعی تم ٹھیک ہو۔“ اس نے تسلی کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں یا ٹھیک ہوں تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔“ اس نے درد کے مقام سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور کھانا کھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”تو آپ ہی بتائیے عمن بھائی آپ کے خیال میں شادی کی کیا تاریخ رکھنی چاہیے۔“ مسز راحت نے پوچھا۔

”ارے بھابی میں نے کیا کہنا ہے، مہوش آپ ہی کی تو بیٹی ہے، آپ جب چاہیں اسے اپنے گھر لے جائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ انہوں نے سامنے پڑی ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھایا۔

”تو پھر ٹھیک ہے میرے خیال سے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو نکاح کی تقریب رکھ لیتے ہیں اور اس جمعہ چھوٹی سی تقریب کر لیتے ہیں۔“ راحت صاحب نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ عمن صاحب نے بھی ان کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

”عمن، مہوش کی شادی کے بعد تم بالکل اکیلے ہو جاؤ

گئے اس لیے میری بات تو تم بھی ہمارے ساتھ اسی گھر میں شفت ہو جاؤ۔“
 ”نہیں بھائی میں بھلا اپنی بیٹی کے گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔“ انہیں دنیوالوں کی بھی فکری۔
 ”تمہارے بھائی کا گھر ہے۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے بھائی لیکن میں یہیں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی اس گھر میں مہوش کی ماں کی بہت ساری یادیں ہیں اور میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔“ انھوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور سامنے والی دیوار پر لگی تصویر کے پاس آگئے۔

”پندرہ سال گزر چکے ہیں لیکن مریم کے لیے تمہاری یہ چاہت اور تڑپ ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔“ راحت صاحب بھی اٹھ کر ان کے پاس آگئے۔

”آپ نہیں جانتے بھائی کیسے گزارے ہیں میں نے یہ پندرہ سال، مریم کی موت کے بعد تو ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بھائی نے مہوش کو سنبھال لیا اور نہ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالوں یا مہوش کو..... آپ لوگوں نے مشکل وقت میں نہ صرف اسے سنبھالا بلکہ آج اسے اپنے گھر کی بیوی بنا رہے ہیں اس لیے میں ہمیشہ آپ لوگوں کا احسان مند رہوں گا۔“ انہوں نے مشکور نگاہوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

”کیسی غیبروں والی باتیں کر رہے ہو، مہوش تمہاری ہی نہیں بلکہ ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ تو ہمارا فرض تھا۔“ راحت صاحب نے کہا۔

”عون بھائی آپ ان سب باتوں کو چھوڑیں اور اب مہوش کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں ایک مہینہ کیسے گزر جائے گا پتا بھی نہیں چلے گا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی میں کل سے ہی تیاریاں شروع کر دیتا ہوں۔“ انہوں نے واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں میری بات کو مذاق میں مت اڑا دینا۔ تم ہمارے ساتھ شفت ہو جاؤ۔“ راحت صاحب نے ایک بار پھر سے انہیں منانے کی کوشش کی۔

”جی بھائی آپ فکر نہ کریں میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔“ عون صاحب نے سرسری سے انداز میں کہا اور پھر سے کپ اٹھا کر چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

ای بغیر دروازے پر دستک دیئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ پیٹھ کے نیچے دہائی طرف ہاتھ رکھے درد سے ہانپ رہا تھا۔

”محبت بیٹا کیا ہوا تم اس طرح ہانپ کیوں رہے ہو۔“ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔

”پتا نہیں اسی عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے، درد کی ایک لہری اٹھ رہی ہے۔“

”تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... کب سے درد ہو رہا ہے۔“

”کبھی کبھی، ہلکا سا درد تو کافی پہلے سے ہوتا تھا لیکن کچھ دیر بعد اپنے آپ ہی ٹھیک ہو جاتا تھا اس لیے کبھی میں نے زیادہ فینش نہیں لی لیکن آج تو ایسا لگ رہا ہے جیسے درد کا مقام پہنچنے والا ہے۔“ درد کی شدت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”اللہ نہ کرے بیٹا..... تم فکر مت کرو ہم ابھی اسپتال چلتے ہیں۔“ انہوں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”عمار..... عمار۔“ انہوں نے بلند آواز میں پکارا پھر دروازے کی طرف..... چہرہ موز کر لیں۔ ”مجھے تو تمہارے بابا کہہ گئے تھے کہ رات کو دیر تک آفس میں کام کرتا ہا ہے اس لیے آج اسے ڈسٹرب نہ کرنا جب اٹھے گا تو آفس آ جائے گا اسی لیے میں تمہارے کمرے میں نہیں آئی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری اتنی طبیعت خراب ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ نکلیں۔

”کیا ہوا ماما.....“ اریشہ بھاگی ہوئی آئی۔

”اریشہ، عمار سے کہو گاڑی نکالے محبت کی طبیعت خراب ہے، اسے اسپتال لے کر جانا ہے اور علیے تم اپنے بابا کو فون کر دو کہ وہ بھی جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں۔“

”کیا ہوا بھائی آپ ٹھیک تو ہیں۔“ عمار بھاگتا ہوا آیا۔

”فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو جلدی سے اسپتال چلو۔“

”ٹھیک ہے امی چلیں۔“ عمار نے اسے سہارا دیا اور باہر لا کر گاڑی میں بٹھایا پھر وہ اسپتال کی طرف چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

”بھابی کیا ہوا محبت کو..... کیسی طبیعت ہے محبت کی۔“ مہوش اور اس کے بابا بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

”پتا نہیں بھائی کیا ہوا، میں جب کمرے میں گئی تو وہ

کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا اسے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ ”وہ نم آنکھوں سے اس کا حال بتا رہی تھیں۔

”فکر نہ کرو کچھ الٹا سیدھا کھالیا ہو گا۔“ بابا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اللہ کرے میرا بچہ جلدی سے صحت یاب ہو جائے۔“
”آپ فکر نہ کریں بھائی..... انشاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ عون صاحب نے ان کی ہمت بندھائی۔
ڈاکٹر امیر جنسی سے باہر آئے تو سب ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

”اس وقت وہ ٹھیک ہیں ابھی ہم انہیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں پھر آپ لوگ ان سے مل سکتے ہیں۔“
”اللہ کالا کھلاکھلا شکر ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔“ راحت اور عون صاحب ڈاکٹر کے پاس آ گئے۔

”دیکھیں ہم نے تمام ضروری ٹیسٹ کر لیے ہیں انشاء اللہ جلد رپورٹ مل جائے گی جب تک رپورٹ نہیں آ جاتی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن میرے خیال سے محبت صاحب کو کڈنی کا ہی مسئلہ ہے۔“ انہوں نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگایا۔
”لیکن ڈاکٹر ابھی تک نکل تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر

اچانک ایک رات میں ہی کڈنی کا مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ راحت صاحب کو ڈاکٹر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
”اللہ کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہوئی الحال باقی رپورٹس آنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کیا مسئلہ ہے۔“

”جی ٹھیک ہے ہم رپورٹس کا انتظار کر لیتے ہیں۔“ عون صاحب نے ڈاکٹر سے کہا۔

☆.....☆.....☆

”جی ڈاکٹر صاحب آپ نے بلایا۔“ انہوں نے دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب کی۔

”آئیے راحت صاحب میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ محبت کی رپورٹس آ گئی ہیں۔“

”جی ڈاکٹر صاحب سب خیریت تو ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں۔“

”راحت صاحب مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن کیا کریں حقائق بتانا ہمارا فرض ہے۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر کی باتیں ان کو پریشان کر رہی تھیں۔

”رپورٹس سے پتا چلا ہے کہ محبت کو کڈنی کا ہی مسئلہ

ہے۔“

”کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر.....“ انہیں اپنی ساحت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”معاف کیجیے گا لیکن میں وہی کہہ رہا ہوں جو ان رپورٹس میں ہے۔“ ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر آج اچانک کڈنی کی بیماری.....“

”میں نے آپ کو بتانے سے پہلے کئی بار رپورٹس کو چیک کیا ہے بلکہ دوسرے ڈاکٹر ز سے بھی تصدیق کروائی ہے اور ان کا بھی یہی کہنا ہے۔“

”تو اب کیا حل ہے اس بیماری کا۔“ بالآخر انہوں نے محبت کی بیماری کو قبول کر لیا۔

”راحت صاحب..... اس بیماری کا ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے اور ہمیں جتنی جلدی ہو سکے محبت کا ٹرانسپلانٹ کرنا ہوگا ورنہ..... اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔“

”کڈنی ٹرانسپلانٹ..... لیکن کیسے۔“

”ہمیں کسی ایسے ڈونر کو ڈھونڈنا ہوگا جو کڈنی دینے کو تیار ہو پھر اس کے گھر والوں سے اجازت لے کر ہم اس کا کردہ محبت کو لگا سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے سارا طریقہ کار سمجھایا۔

”کیا آپ کی نظر میں ایسا کوئی شخص ہے؟“

”اس وقت تو نہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں آپ بھی کوشش کریں باقی جو اللہ کو منظور۔“ ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر..... کیا میں..... محبت کو گھر لے جا سکتا ہوں۔“ ان کی آواز رندہ چکی تھی۔

”جی الحال آپ اسے لے جا سکتے ہیں میں نے کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں آپ وہ ٹائم پر دیتے رہیں اور اسے ریکورل چیک اپ کے لیے بھی آنا ہوگا۔“

”جی..... ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے لڑکھڑا گئے۔

”راحت صاحب حوصلہ کیجئے آپ کمزور ہو گئے تو محبت کو کون سنبھالے گا۔“ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

”شکریہ..... میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ڈمگاتے قدموں سے کیمین سے باہر نکل آئے۔

☆.....☆.....☆

”گڈ مارننگ..... تو جناب ابھی تک سو رہے ہیں۔“ وہ کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔

”گڈ مارننگ..... اچھا ہوا مہوش تم آگئیں، میں تو بور ہو گیا ہوں آرام کر کر کے۔“
 ”طبیعت کیسی ہے۔“ اس نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔
 ”ٹھیک ہوں چلو نا کہیں باہر چلتے ہیں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ناشتا کر لیا۔“
 ”باہر ہی کر لیں گے۔“ اس نے بستر سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔
 ”ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے کہ باہر کی کوئی چیز نہیں کھانی اس لیے ناشتا کر لو پھر کچھ دیر کے لیے باہر چلتے ہیں۔“
 ”یار نہ تم لوگ مجھے باہر جانے دیتے ہو نہ کوئی چیز کھانے دیتے ہو جیسے کوئی بہت بڑی بیماری ہوگئی ہو۔ معمولی سادروی تو ہے۔“

”جانتی ہوں معمولی سادروی ہے لیکن ابھی ٹھیک تو نہیں ہوا نا جب ٹھیک ہو جائے گا پھر جودل کرے وہی کرنا لیکن تب تک ہماری مان لو۔“
 ”مہوش تم لوگ مجھے ایسے کیوں ٹریٹ کر رہے ہو، کہیں کوئی سیریس بات تو نہیں ہے۔“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں..... کوئی سیریس بات نہیں ہے۔“
 ”تم سچ کہہ رہی ہو۔“ اس کی نگاہوں میں بدستور حیرت تھی۔

”پہلے کبھی تم سے مہوش بولا ہے..... تم فریش ہو جاؤ میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔“ اس نے کہا۔
 ☆.....☆.....☆

راحت صاحب آفس سے آتے ہی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے محبت کی۔“
 ”بظاہر تو ٹھیک ہے لیکن ہر وقت بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے اس لیے میں اسے کہیں باہر بھی نہیں جانے دیتی..... پتا نہیں ہمارا یہ ڈر کب ختم ہوگا۔“ فاطمہ بیگم بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”جب تک اس کا ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا۔“
 ”تو کب ہوگا یہ ٹرانسپلانٹ؟“
 ”جب تک کسی ڈور کا انتظام نہیں ہو جاتا۔“ راحت صاحب نے سر آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے کہیں پتا بھی کیا ہے یا صرف ڈاکٹروں کے بھروسے ہی بیٹھے ہیں۔“
 ”کیسی باتیں کر رہی ہو فاطمہ، کیا مجھے اپنے بیٹے کی زندگی پیاری نہیں ہے۔“ وہ اس بات سے زچ ہو گئے تھے۔
 ”تو پھر ابھی تک آپ نے کچھ کیا کیوں نہیں۔“
 ”کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہر جگہ سے پتا کر لیا ہے لیکن اس وقت کوئی بھی ڈور موجود نہیں ہے۔“
 ”تو..... اس کا مطلب..... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے غم آنکھوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

”اللہ تعالیٰ سے دعا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اگلے مہینے..... اس کی شادی.....“
 ”میں عمن سے بات کروں گا ابھی کچھ وقت کے لیے شادی والے معاملے کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔“ راحت صاحب نے ان کی بات کاٹ کر اپنا فیصلہ سنایا۔

☆.....☆.....☆
 ”علیغے..... کیا ہوا تم آج اسکول نہیں گئیں۔“ عمار اپنے کمرے سے باہر آیا تو وہ ہال میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”نہیں گھر میں جو حالات ہیں ان کی وجہ سے پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔“ علیغے نے ریوٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا۔

”اچھے برے حالات تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم لوگ اپنے روزمرہ کے کام چھوڑ دیں۔“ عمار نے اس کے ہاتھ سے ریوٹ چھین کر دو بارہ ٹی وی آن کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمار لیکن ہمارے دماغ میں ہر وقت محبت بھائی کا خیال رہتا ہے، کتنے خوش تھے ہم لوگ ان کی شادی کی خبر سن کر مگر آج تک میری مرض لاحق ہو گیا ہے۔“

”علیغے..... تمہیں تو یہ سمجھ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے اپنے پیارے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور اگر وہ ایک مصیبت میں ڈالتا ہے تو اس سے نکلنے کے لیے ہزار راستے بھی کھول دیتا ہے اس لیے اب یوں اداس بیٹھنے کی بجائے پڑھائی پر توجہ دو۔“ عمار نے اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر کہا۔

”عمار بھائی ٹھیک تو ہو جائیں گے؟“

”انشاء اللہ بہت جلد لیکن جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک ہمیں ان کا بہت خیال رکھنا ہے اس لیے تم جاؤ اور محبت بھائی کے پاس بیٹھو تب تک میں مہوش بھائی کو ان کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔“

”بھائی خوش قسمت ہیں جو انہیں مہوش جیسی بیوی مل رہی ہے، لکنا خیال رکھتی ہے وہ بھائی کا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے وہ واقعی بھائی کا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔“ عمار نے اثبات میں سر ہلایا۔

”انشاء اللہ ان کی یہ محبت ہمیشہ سلامت رکھے۔“ علیزے نے ان دونوں کو دعا دیتے ہوئے کہا۔

”آمین۔“

☆.....☆.....☆

”مہوش پہلے تو جب ہم اس پارک میں آتے تھے تمہیں بہت اچھا لگتا تھا پھر آج کیا ہو ام اتنی پریشان کیوں ہو.....؟“

اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی دیکھ کر اس سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

”کل بڑے پاپا کا فون آیا تھا بابا کو کہ وہ ہماری شادی کو پوچھنے کر رہے ہیں۔“

”ہاں یہ تو بہت ہی اچھا ہے..... اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔“ محبت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مہوش تم اچھی طرح جانتی ہو یا کہ اس وقت مجھے کڈنی کا مسئلہ ہے ہاتھیں میں ٹھیک ہو بھی سکتا ہوں یا.....“

مہوش نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”اللہ سے اچھی امید رکھو معمولی سا درد ہے اور تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔“

”اب تم لوگوں کو مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اپنی رپورٹس اپنے دوست جو کہ ایک اسپیشلسٹ ہے اس کو دکھائی ہے اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔“ محبت کے منہ سے یہ سب سن کر اس نے اپنا سر شرم سے جھکا دیا۔

”تمہیں تو جھوٹ سے سخت نفرت تھی پھر بھی پچھلے کتنے دنوں سے تم اتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھیں کیوں.....؟“

”سوری لیکن میں تو یہ سب تمہارے لیے کر رہی تھی۔“

”ایک بیمار شخص سے بھی جھوٹ بولنا اتنی ہی غلط بات ہے جتنی ایک تندرست انسان سے۔“

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اس لیے مہوش نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”اگر تم جھوٹ بولنے کی بجائے مجھے یہ کہہ دیتیں کہ میں مرنے والا.....“ اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا مہوش نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو..... انشاء اللہ بہت جلد ڈونر اربچ ہو جائے گا۔“

”سچ بتاؤ مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ اس نے معنی خیز نظروں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

”کیونکہ میں یہ جانتی تھی کہ اگر تمہیں یہ سب بتا چل گیا تو پھر تم بھی شادی کی تاریخ کو آگے بڑھانے کا کہو گے۔“

”فرض کر دو کہ شادی ہو جاتی ہے پھر اگر کڈنی کا اربچ نہیں ہوا تو.....“

”تم ہمیشہ مشتاقی کیوں سوچتے ہو۔“ اس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے محبت کی طرف دیکھا۔

”میں صرف وہی سوچ رہا ہوں جو نظر آرہا ہے۔“

”تم کیا سوچتے ہو مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا

میں نے تو بابا سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ شادی مقررہ تاریخ پر ہی ہوگی اور وہ آج شام کو تمہارے گھر آ رہے ہیں

بڑی امی اور بڑے پاپا سے اسی سلسلے میں بات کرنے۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے پھر گھر چلے ہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ محبت بھی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

”راحت صاحب محبت کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ اس وقت ڈاکٹر

راحت صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے وہ راحت صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے اس لیے وہ ہر روز آ کر محبت کو چیک کر لیتے تھے۔

”کیا یہ کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں راحت صاحب اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلد سے جلد محبت کا ٹرانسپلانٹ ہو جانا

چاہیے ورنہ ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”میں کیا کروں ڈاکٹر میں ہر جگہ پتا کر چکا ہوں لیکن کوئی اربچ نہیں ہو رہا۔“ راحت صاحب کے لہجے سے ان کی بے بسی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

”میں نے بھی کافی جگہ رابطہ کیا ہے اور میرے ایک دوست کے اسپتال میں ایک ایسا مریض ہے لیکن اس کے گھر والے نہیں مان رہے۔“

”تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے ڈاکٹر کس طریقے سے ہم اس کے گھر والوں کو مانا سکتے ہیں۔“

”وہ لوگ کافی غریب ہیں تو اگر ہم اس کے گھر والوں کو دو تین لاکھ روپے دے دیں تو امید ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”دو تین لاکھ تو کیا میں دس لاکھ دینے کے لیے بھی تیار ہوں آپ انہیں ہر حال میں راضی کریں ڈاکٹر۔“ راحت صاحب نے کہا۔

”میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا راحت صاحب آپ بے فکر رہیے۔“

”السلام علیکم۔“ عون صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”علیکم السلام۔“ ڈاکٹر اور راحت صاحب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

”آؤ عون سب خیریت تو ہے۔“ راحت صاحب نے اس وقت آنے کی وجہ دریافت کی۔

”جی بھائی سب خیریت ہے مجھے آپ سے اور بھائی سے ایک ضروری بات کرنی ہے اسی سلسلے میں آیا ہوں۔“

”ہاں ٹھیک ہے میں ڈاکٹر صاحب کو دروازے تک چھوڑ کر آتا ہوں جب تک تم بیٹھو۔“

”نہیں شکریہ راحت صاحب آپ اپنے مہمانوں کو ایڈیڈ کریں میں چلتا ہوں۔“

”شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ راحت صاحب نے ڈاکٹر کو رخصت کرتے ہوئے کہا پھر مڑ کر بولے۔

”خیریت تو ہے۔“

”جی بھائی سب خیریت ہے آپ یہ بتائیے کڈنی کا کوئی انتظام ہوا؟“ انہوں نے راحت صاحب کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی تک تو کچھ نہیں لیکن ڈاکٹر نے ایک جگہ بات کی ہوئی ہے امید ہے کہ انشاء اللہ ضرور وہاں سے ڈوز بزل جائے گا۔“

”چلیں اللہ کرے کہ سب کچھ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔“

”السلام علیکم..... عون بھائی۔“ مسز راحت نے

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

”علیکم السلام بھائی اچھا ہوا آپ بھی آگئیں اصل میں مجھے آپ دونوں سے محبت اور مہوش کی شادی کے بارے میں بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اپنے آنے کی اصل وجہ بیان کی۔

”یاریں میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا شادی نہیں ہوگی۔“

”بھائی سب چاہتے ہیں کہ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ہو۔“

”عون تم جانتے ہو کہ اس وقت گھر میں جو ماحول ہے اس میں کوئی بھی اس شادی کو انجوائے نہیں کر پائے گا اس لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے اور فرض کرو کہ اللہ نہ کرے اگر کڈنی کا ارنج نہ ہوا اور ہم محبت کو نہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔

”اللہ نہ کرے..... یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔“ اس طرح کی بات سن کر مسز راحت کا دل دہل گیا تھا۔

”بھائی مہوش کا کہنا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہے۔“

”اللہ نہ کرے..... یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔“ اس طرح کی بات سن کر مسز راحت کا دل دہل گیا تھا۔

”بھائی مہوش کا کہنا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہے۔“

”حد ہوتی ہے پاگل پن کی اور مجھے تو اس سے زیادہ تم پر غصہ آ رہا ہے تم اسے سمجھانے کی بجائے یہاں آگئے ہو مجھے اس کا فیصلہ سنانے۔“ راحت صاحب غصے سے بولے۔

”جب میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ شادی ٹرانسپلانٹ کے بعد ہی ہوگی تو بس بعد میں ہی ہوگی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور جا کر بتا دینا مہوش کو کہ اس گھر میں پہلے ہی فیصلے میں ہی کرنا تھا اور آگے بھی میں ہی کروں گا۔“ راحت صاحب نے سخت لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ضروری میٹنگ میں موجود تھے لیکن موبائل اسکرین پر چمکتا ہوا نمبر دیکھ کر انہوں نے میٹنگ روک دی اور فون کو اپنے کان سے لگا لیا۔

”جی ڈاکٹر صاحب میں آپ کے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”جی مجھے بہت افسوس ہے راحت صاحب..... لیکن اس ڈور کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”تو کیا آپ نے اس کا.....“ انہوں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں راحت صاحب اس کے گھر والے ڈونٹ کرنے کے لیے تیاری نہیں ہوئے۔“

”جی نہیں راحت صاحب اس کے گھر والے ڈونٹ کرنے کے لیے تیاری نہیں ہوئے۔“

”تو کیا آپ نے انہیں پیسوں کی آفر نہیں کی تھی.....؟“

”جی میرے دوست نے پیسوں کی بات کی تھی لیکن ان لوگوں نے ڈونٹ کی اجازت نہیں دی اور میت کو دفن کر دیا۔“ ڈاکٹر نے تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اب ہم کیا کریں گے ڈاکٹر صاحب.....“

”میں معذرت خواہ ہوں راحت صاحب لیکن اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دعا کریں کہ جلد سے جلد کڈنی کا انتظام ہو جائے۔“

”کیا ہوا بھائی آپ کس سے بات کر رہے تھے اور اتنے پریشان کیوں ہیں.....؟“ فنجبر صاحب نے ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار کو دیکھ کر پوچھا۔

”ڈاکٹر کا فون تھا۔“ انہوں نے رندمی ہوئی آواز میں کہا۔

”اچھا تو پھر..... کیا کہا ڈاکٹر نے؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ جس شخص کی کڈنی ہم محبت کو لگانے والے تھے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔“ انہوں نے کرسی پر جھکے ہوئے شخص کی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا..... تو اب..... ہم کیا کریں گے؟“

”دعا کے علاوہ اور کبھی کیا سکتے ہیں۔“ انہوں نے چہرہ چھت کی طرف کر لیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم۔“ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسز راحت الماری سے کپڑے نکال رہی تھیں۔

”وعلیکم السلام..... آؤ مہوش خمریت تو ہے تم اتنی صبح صبح۔“

”جی بڑی امی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہاں تو کہو تمہیں بات کرنے کے لیے کب سے اجازت لینے کی ضرورت پڑ گئی۔“ انہوں نے الماری بند کر دی اور تریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”بڑی امی آپ بلینز بڑے پاپا کو ہماری شادی کے لیے راضی کریں۔“ اس نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور منت سماجت کرنے لگی۔

”مہوش، عون بھائی امی ان سے اس بارے میں بات کر چکے ہیں لیکن انہوں نے صاف صاف منع کر دیا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ چمڑاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ بڑے پاپا نے بابا کی بات نہیں مانی پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ آپ انہیں راضی کریں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”مہوش بیٹا تم تو اپنے بڑے پاپا کو جانتی ہو کہ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر وہ کسی کی نہیں سننے اور ویسے بھی اب کیا بات کرنی ہے مقررہ وقت میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔“

”بڑی امی ایک ہفتے میں سارا انتظام ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔“

”مہوش بیٹا صبر نہ کرو تمہیں اس وقت سمجھ نہیں آرہی لیکن اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

”لیکن جو میں کہہ رہی ہوں اسی میں میری خوشی ہے اور کیا آپ میری خوشی کے لیے میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔“ بالآخر اس نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری خوشی کے لیے تمہاری زندگی برباد نہیں کر سکتی شاید تمہیں بتائیں ہے کہ جس ڈونر کا کردہ ہم محبت کو لگانے والے تھے اس کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ اب تو ڈاکٹر نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس مینے میں محبت کا آپریشن نہ ہوا تو ہم.....“ وہ ہنسی بکٹی رک گئی تھیں۔

”میں جانتی ہوں اور میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی کہ میں نے محبت کے لیے ڈونر کا انتظام کر لیا ہے۔“

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو کون ہے وہ ڈونر.....؟“ یہ سن کر اداس چہرے پر عجیب سی خوشی چھا گئی تھی۔

”یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی اگر آپ چاہتی ہیں کہ محبت کو ڈونر ملے تو آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔“

”مہوش..... تم..... تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ انہوں نے اس کی خاموشی سے اندازہ لگایا تھا۔

”پاگل نہیں ہوں بڑی امی..... دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”مہوش تمہیں ہوش بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”بڑی امی میں پورے ہوش میں ہوں، محبت کے آپریشن میں ایک مہینہ ہے اور میں اس ایک مہینے میں اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اس کے بعد مجھے موت کا بھی کوئی غم نہیں۔“ اس نے دیوانگی کی حد کر دی تھی۔

”اگر تم اپنی کڈنی دے کر اسے بچا بھی لو تو بھی وہ تمہاری قربانی کا سن کر مر جائے گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ آپ اسے سنبھال لیں گی۔“ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
”مہوش تم بہت کیوں ہار رہی ہو انشاء اللہ جلد ہی کچھ ہو جائے گا۔“ مسز راحت دو دیوانگی کی یہ باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

”بڑی ای کب تک آپ جھوٹی آس لگا کر بیٹھی رہیں گی ہرگز رتا ہوا لمحہ محبت کو موت کے قریب لے جا رہا ہے اور میں اسے یوں اپنی نظروں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

”کچھ نہیں ہوگا محبت کو اور نہ ہی تمہیں کچھ ہوگا اگر اللہ نے چاہا تو میرے سب بچے ایک ساتھ خوشحال زندگی گزاریں گے۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

☆.....☆.....☆

”آپ سوئے نہیں ابھی تک۔“
”کب سے کوشش کر رہا ہوں لیکن نیند ہی نہیں آتی۔“ انہوں نے سردا ہجرتے ہوئے کہا۔
”محبت کی وجہ سے۔“ انہوں نے پریشانی کی وجہ سے اندازہ لگا لیا تھا۔

”بیٹم تم جانتی ہو کہ ایک ماں کی محبت اور ایک باپ کی محبت میں کیا فرق ہوتا ہے؟“
”ماں باپ اپنی اولاد سے ایک جیسا ہی پیار کرتے ہیں بھلا فرق کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ہوتا ہے بیٹم فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنی محبت کا اظہار کر لیتی ہے لیکن باپ اپنی محبت کو اپنے غصے میں چھپائے رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا یہ غصہ ہے جو اس کی اولاد کو غلط راہ پر چلنے سے بچائے گا۔“ انہوں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ واقعی جب کوئی بچہ غلطی کرتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ آئیے دو تھمارے پاپا کو پھر دیکھنا وہ کیسے تمہاری خبر لیتے ہیں۔“ انہوں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

”باپ کا یہی ڈر ہوتا ہے جو بچے کے دماغ میں رہتا ہے اور پھر جب بھی وہ کوئی غلط کام کرنے لگتا تو یہی ڈر اسے روکتا ہے لیکن افسوس کہ اپنا ڈر قائم رکھتے رکھتے اسے بھی اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور اس کے سارے جذبات اس کے دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔“

”آپ نے اظہار نہ بھی کیا ہو لیکن آپ کے بچے پھر بھی جانتے ہیں کہ آپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“ انہوں نے راحت صاحب کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

”بیٹم میں نے بھی یہ سوچا تھا کہ جو مدت میں محبت کے ساتھ نہیں گزار سکا انشاء اللہ وہ اس کے بچوں کے ساتھ گزاروں گا لیکن افسوس.....“ راحت صاحب کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو..... جتنا میں آپ کو جانتی ہوں چاہے جیسے بھی حالات آئے ہوں آپ تو ہمیشہ باہمت رہے ہیں پھر آج یوں بچوں کی طرح کیوں رو رہے ہیں۔“ یہ حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا اٹھی تھیں۔

”بیٹم میں نے ساری زندگی بہت سے مشکل حالات دیکھے ہیں اور بہت ہی ہمت سے ان کا سامنا بھی کیا ہے لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس عمر میں اپنے جوان بیٹے کی موت دیکھوں۔“

”انشاء اللہ آپ یہ غم نہیں دیکھیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے وہ اگر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو سو اور دروازے کھول بھی دیتا ہے۔“
”راحت اب یوں رونا بند کیجیے محبت کے لیے کڈنی کا اربغ ہو گیا ہے۔“

”کیا، یہ تم سچ کہہ رہی ہو؟“ راحت صاحب کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

”جی میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے محبت کے لیے اپنی ایک فریڈ سے بات کی تھی اس کے بھائی ایک بڑے اسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور وہاں ایک مریض ہے جس کی کڈنی محبت کے کام آ سکتی ہے۔“ مسز راحت نے تمام تفصیل بتا دی تھی جسے سن کر راحت صاحب کو بھی حوصلہ ملا تھا۔

”بقول ڈاکٹر ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا وقت ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں آپ کو ایک مہینے سے پہلے پہلے گردہ مل جائے گا جس ڈاکٹر سے کہہ دیں کہ وہ اپنی تیار پوری رکھے کسی بھی وقت آپریشن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ راحت صاحب نے چھت کی طرف نگاہیں کر کے دعا مانگنے کے سے انداز میں کہا۔

”کیا آپ میری ایک بات مانتے ہیں گے۔“
”بیٹم تم نے جو خبر سنا کی ہے اس کے بدلے چاہے جان مانگ لو۔“ راحت صاحب نے کہا۔

ابن حسن جارچوی

ممتاز عالم دین۔ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے اور بی اے کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1930ء میں سکھر میں جو شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں انہوں نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کی صدارت شمس العلماء مرزا علی بیگ نے کی تھی۔ علامہ جارچوی 1931ء سے 1938ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں استاد رہے۔ 1938ء میں انہیں راجا محمود آباد دہلی تعلیم دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ بعد ازاں وہ شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مکمل ایک مہینہ شمولیت اختیار کی۔ 1945ء میں انہیں مشن کے سامنے پیش ہوئے تاکہ برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے نظریے کی وضاحت کر سکیں۔ 1951ء میں بھارت سے پاکستان چلے آئے۔ ان کی کوششوں سے کراچی میں انٹی ٹیوٹ آف کالج ایڈز رنرچ بھی قائم ہوا۔ ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

نامہر حسین زیدی، کراچی

اسے اتنی بڑی خبر کا پتا ہی نہیں چلا۔

”کون سی خبر.....“ اس نے آنکھیں ملے ہوئے پوچھا۔

”مگر میں محبت بھائی کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔“

”کیا.....“ یہ سن کر اس کی آنکھیں فٹ سے کھل گئی تھیں۔ ”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا نے تو منع کر دیا تھا کہ جب تک بھائی کا آپریشن نہیں ہو جاتا شادی بھی نہیں ہوگی اور ابھی تو کوئی ڈور بھی نہیں ملا۔“ اسے عمار کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ڈور مل گیا ہے اسی لیے تو بابا نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔“

”کیا تم بچ کھڑے ہو کہاں سے ملا ڈور۔“ یہ سن کر وہ بھی خوش ہو گئی۔

”اسی کی کوئی فریڈ ہے ان کے بھائی کے اسپتال میں کوئی مریض ہے جس کی کڈنی بھائی کو لگے گی۔“ اس نے تمام تر تفصیل بتا دی تھی۔

”لیکن بھائی وہ مریض اپنی کڈنی بھائی کو کیوں دے گا۔“ اریشہ نے بھی مصوویت بھرے اعماز میں سوال کیا۔

”اریشہ میری پیاری سی ڈول.....“ اس نے بہن کو اٹھا

”اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ محبت اور مہوش کی شادی کی جو تاریخ ہم نے رکھی تھی اسی تاریخ پر ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔“ مسز راحت نے بھی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بات منوانی چاہی۔

”یہ بات تو ہم پہلے بھی کر چکے ہیں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی۔“ راحت صاحب اپنی سند پر قائم تھیں۔

”پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تو ڈور بھی مل گیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد محبت کا ٹرانسپلانٹ بھی ہو جائے گا اور آپریشن کے بعد اسے کافی ٹائم لگ جائے گا دوبارہ سے صحت مند ہونے میں اور ایسی صورت میں اس کی بیوی اس کا بہتر خیال رکھ سکتی ہے۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آج تین تاریخ ہے اور دس تاریخ کو شادی اتنی ساری تیاریاں اسے کم دنوں میں کم یہ سب کیسے کروگی؟“ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے مسز راحت کی طرف دیکھا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں آپ اور عون بھائی مہمانوں اور کارڈ وغیرہ کا انتظام کر لیں باقی شاپنگ اور گھر کی تیاریاں میں اور میرے بچے مل کر کر لیں گے اور ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ سب بہت پریشان ہیں اسی بہانے بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ بالآخر انہوں نے اجازت دے دی۔

”شکریہ۔“ مسز راحت نے تشکر بھری نگاہوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

”شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے آج تمہاری وجہ سے میں کتنے دنوں بعد چین کی نیند سو سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے آپ سو جائیں، رات کافی ہو گئی ہے صبح جلدی اٹھنا ہے۔“ انہوں نے لائٹ بند کر دی اور سونے کے لیے تیار ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

”ارے تم دونوں ابھی تک سو رہی ہو گھر میں اتنے سارے کام ہیں کرنے والے۔“

”کیا ہے عمار اتنی صبح کیوں تنگ کر رہے ہو جاؤ یہاں سے سونے دو میں۔“

”کیا بات ہے یہ تو کمال ہو گیا ہمارے گھر کی نیند کا ستر جس کو پورے گھر کی خبر سب سے پہلے ہوتی تھی آج

راہی ہاںہوں میں بھر لیا۔ ”ہم سب کو کس نے پیدا کیا ہے۔“
”اللہ تعالیٰ نے۔“

”زندگی اور موت کس کے ہاتھ میں ہے۔“
”اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں۔“ وہ بھی تیز تیز جواب دے رہی تھی۔

”تو بس یوں سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے محبت بھائی کی زندگی کا فیصلہ کیا ہے۔ ابھی تم دونوں فریض ہو کر نیچے آ جاؤ اسی ناشتے کے لیے تم دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔“
☆.....☆.....☆

”السلام علیکم امی جان.....“ اس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔

”وعلیکم السلام..... آج کتنے دنوں بعد تم سب سے پہلے ناشتے کے لیے آئے ہو۔“

”یہ میں کیا سن رہا ہوں بابا نے شادی کے لیے اجازت دے دی۔“ محبت نے ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

”ہاں..... سن تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن لگتا ہے کہ تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی۔“ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے محبت کی طرف دیکھا۔

”ایسی بات نہیں ہے لیکن مجھے بس تجس ہو رہا تھا کہ راتوں رات ایسا کیا ہو گیا کہ بابا نے اپنا فیصلہ ہی تبدیل کر دیا۔“ محبت نے کرسی پیچھے کی طرف پٹخی اور اس پر براجمان ہو گیا۔

”بس سمجھ لو کہ میں نے ان سے درخواست کی اور وہ مان گئے۔“ انہوں نے جوس گلاس میں ڈال کر اسے پیش کیا۔

”اور یقیناً یہ درخواست آپ نے مہوش کے کہنے پر ہی کی ہوگی۔“ اب کی بار سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے کی اس کی باری تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا اصل میں پچھلے کچھ دنوں سے گھر کا ماحول کچھ ڈسٹرب تھا اور میرے خیال سے یہ موقع ہے دوبارہ سے خوشیاں بکھیرنے کا۔“

”ٹھیک ہے امی جان اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو یہی سمجھ لیں۔“ اس نے جوس کلاسپ بھرتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو بھائی جان۔“ عمار نے پیچھے سے آ کر اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔

”کیا بات ہے آج تو عمار صاحب بھی اتنی صبح صبح اٹھ گئے ہیں۔“

”میں ہی کیا آج تو سب جلدی اٹھ گئے ہیں۔“
”اچھا..... کیوں؟“

”کیونکہ آپ کی شادی کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں۔“ کمرے میں داخل ہوتی علیزے نے کہا۔

”لیکن اس سے پہلے آج پارٹی ہوگی۔“ اریشہ نے محبت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کوئی پارٹی نہیں ہوگی..... یہ پارٹی شادی بھائی کے آپریشن کے بعد ہوگی ابھی چپ چاپ ناشتا کرو اور اسکول جاؤ اور علیزے تم مہوش کو فون کر دو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی

بہت ساری شاپنگ کرنی ہے اور عمار تم بھی ساتھ چلے جانا۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں سب کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

”بھائی مجھے اسکول نہیں جانا بلکہ آپ کے ساتھ جانا ہے۔“ اریشہ نے عمار کے کان میں سرگوشی کی۔

”امی جان اریشہ کو بھی جانے دیں ہمارے ساتھ وہ بھی کچھ شاپنگ کر لے گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن زیادہ تنگ نہیں کرنا بھائی کو.....“ انہوں نے اریشہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں کروں گی.....“ اس نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہا۔

”چلو باتیں بعد میں کر لیتا ناشتا شروع کرو۔“
☆.....☆.....☆

آج کے دن سب لوگ پریشانیاں بھول کر شادی کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شادی کے لیے خوب تیاریاں کی گئی تھیں پورے شہر کے نامور لوگ شادی میں شرکت کے لیے موجود تھے۔

”کتنے خوش لگ رہے ہیں دونوں ایک ساتھ۔“ امی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو خوش لگ ہی رہے ہیں لیکن ان سے زیادہ تو تم خوش لگ رہی ہو۔“ راحت صاحب نے شوخی بھری نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”خوش کیوں نہیں ہوں گی میرے بیٹے کی شادی ہے۔“ انہوں نے بھی کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تو کچھ خوشی دوسرے بچوں کے لیے بھی بچا کر رکھو کل کوان کی بھی شادی کرنی ہے۔“

”آپ جانتے ہیں میں نے اس شادی کے لیے اتنی ساری تیاریاں کیوں کی ہیں وہ اس لیے کہ میں اپنے سارے

زندگی عطا کرے تاکہ تم اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار سکو۔“ انہوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھ کے پیلے میں بھر لیا۔

”میں صرف دس دن محبت کے ساتھ خوشی خوشی گزارنا چاہتی ہوں اس کے بعد آپ جب چاہیں آپریشن کے لیے ڈاکٹر سے بات کر سکتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں کی نمی اس کے رخسار پر آگئی تھی۔

”مہوش ایک بات تو بتاؤ؟“

”جی پوچھیے بڑی امی۔“ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یاد ہے تم کتنے سال کی تھیں جب مریم کی موت ہوئی تھی؟“ انہوں نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

”مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے لیکن بابا بتاتے ہیں کہ میں پانچ سال کی تھی جب ماما کی وفات ہوئی تھی۔“

”تمہاری ماما کی وفات کے بعد تمہاری پرورش کس نے کی تھی؟“

”آپ نے بڑی امی اور کس نے..... لیکن یہ سب آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“ اس سوال پر وہ چونک گئی تھی۔

”کیا تمہیں بھی ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نے تم میں اور علیزے میں کوئی فرق کیا ہو۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں بڑی امی بلکہ میں تو دس سال کی عمر تک آپ کو ہی اپنی امی سمجھتی رہی تھی۔ وہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ آپ میری امی نہیں بلکہ بڑی امی ہیں۔“

”پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے اپنی بیٹی کی جان قربان کر دوں گی۔“ اسے ساری بات کی سمجھا گئی تھی اور اس نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کرنا چاہتیں..... لیکن اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔“

”ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ جب اپنے کسی بندے کو ایک مشکل میں ڈالتا ہے تو اس مشکل کے حل کے سبب اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ ہماری نظر کی کمزوری ہوتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔“

”مجھے آپ کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے جیسے محبت کے لیے کدنی مل گئی ہے میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ نے میری

بچوں کی شادیوں کے ارمان آج ہی پورا کرنا چاہتی تھی کیا پتہ چل ہوتا ہو۔“ انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے محبت اور مہوش کی طرف دیکھا۔

”بیکار یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، اگر اللہ نے چاہا تو ہم دونوں ساتھ مل کر اپنے بچوں کی ہی کیا بلکہ ان کے بچوں کی بھی خوشیاں دیکھیں گے۔“ راحت صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اببی جان بابا جان چلیں اسٹیج پر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں فلی فوٹو کے لیے۔“ عقب سے علیزے نے آواز دی۔

”ہاں بھی چلو.....“ بابا سے اجازت ملنے کی دیر تھی علیزے نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑے اور اسٹیج کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

”صبح اتنا تیار ہونے کی کیا ضرورت تھی میں تو پہلے ہی مریض ہوں اگر مجھے ہارٹ ایک ہو جاتا تو.....“ وہ ششے کے سامنے تیار ہو رہی تھی کہ محبت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس سے زیادہ تیار تو میں شادی والے دن ہوئی تھی اس دن ایک نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا۔“ مہوش نے کہا۔

”اچھا تو اس کا مطلب ہے مجھے ایک ہونے سے تمہیں خوشی ہوگی۔“

”یہ صبح کس بات پہ بحث چل رہی ہے۔“ امی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

”کچھ نہیں امی ہم نیچے ہی آرہے تھے۔“

”اچھا ٹھیک ہے آ جاؤ ہم سب تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ مڑ کر جانے لگیں تو مہوش نے روک لیا۔

”محبت تم چلو مجھے بڑی امی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

”شکر یہ بڑی امی..... آپ نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔“ اس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔

”اس میں شکر یہ والی کون سی بات ہے یہ تو ہم سب ہی چاہتے تھے کہ تم ہمارے گھر کی بہو بنو۔“

”محبت سے شادی میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا اب چاہے موت بھی آجائے کوئی غم نہیں۔“

”موت آئے تمہارے دشمنوں کو..... اللہ تمہیں لمبی

طبیعت خراب ہونا شروع ہو جائے گی اور ویسے میں نے بھی جہاں قتادل کٹنی کے لیے بات کی وہاں سے کسی وقت بھی فون آسکتا ہے اس لیے لیکل ہی تم اور مہوش اسلام آباد والے گھر جا رہے ہو۔“ انہوں نے ساری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی؟“
 ”نہیں بیٹا تم تو جانتے ہو مجھے اسپتال سے ویسے ہی گھبراہٹ ہوئی ہے اس لیے میں تو نہیں آسکوں گی لیکن دویا تین دن بعد تمہارے بابا وہاں آجائیں گے۔“
 ”ای میری زندگی کا اتنا بڑا آپریشن ہونے جا رہا ہے مجھے وہاں آپ کی ضرورت پڑے گی۔“ اس نے بچوں کی طرح خند کرتے ہوئے کہا۔

”تم پریشان نہ ہو میری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔“ انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ چوم کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔
 ”لیکن پھر بھی اگر آپ وہاں ہوں گی تو مجھے بھی ہمت ملے گی۔“

”محبت تم تو جانتے ہو کہ عمار کے امتحان ہونے والے ہیں اور علیزے اور ادریش بھی کافی دنوں سے اسکول نہیں جا رہی ہیں اس لیے میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے اب ضد نہ کرو اور جاؤ جا کر تیار کی کرو۔“

”ٹھیک ہے ای جیسا آپ کا حکم۔“ اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرماں بردار بیٹے کی طرح حکم مان لیا۔
 ☆.....☆.....☆

”محبت اور مہوش تو اسلام آباد پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کب جا رہے ہیں؟“ انہوں نے چائے کا کپ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا کیا مطلب ہے کیا تم نہیں جا رہی میرے ساتھ۔“ راحت صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”راحت صاحب صرف محبت ہی نہیں بلکہ یہ تینوں بھی میرے ہی بچے ہیں اور ان کو بھی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔“
 ”ہاں تو ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔“ راحت صاحب نے ایک آسان سا حل پیش کیا۔

”نہیں پہلے ہی ان کی پڑھائی کا بہت نقصان ہو گیا ہے اب مزید چھٹیاں مناسب نہیں اس لیے آپ چلے جائیں۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے..... بیگم ویسے ابھی تک کسی کا فون

خند کی وجہ سے یہ بات کہی ہے۔“
 ”بچے خند کرتے ہی ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، تم نے چاہے مجھے اپنی ماں سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی مانا ہے اور میں کوئی بھی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جس سے تمہیں کوئی تکلیف ہو۔“ آج پہلی بار وہ اس لہجے میں مہوش سے بات کر رہی تھیں۔

”ایسی بات نہیں ہے میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی ای ہی سمجھا ہے۔ وہ تو میں بس محبت کی وجہ سے اس دن چاہیں کیا کہہ گئی۔ آپ پلینز مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے فوراً اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔

”جو ہو تا تھا سو ہو گیا ابھی ان سب باتوں کے بارے میں مت سوچو اور اپنی زندگی کو اچھے بنائیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بڑی ای آنے والے لک لک کر شکر میں اپنا آج ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

”اچھا اب باتیں بہت ہو گئی ہیں جلدی سے نیچے چلو سب لوگ کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”جی چلیے.....“ اس نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔

☆.....☆.....☆

”ای جان آپ نے بلایا تھا۔“ محبت ای کے کمرے میں آیا تو وہ صوفے پر بیٹھ کر پرانی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔

”آؤ محبت بیٹا میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ انہوں نے اہم بند کر کے سائیز ٹیبل پر رکھ دیا۔

”ای خیر ہے تو ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟“ وہ ان کے سامنے دوڑا توں ہو گیا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا بس سر میں تھوڑا سا درد ہے۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ای آپ کی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ رو رہی تھیں سب ٹھیک تو ہے۔“ اس نے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے وہ بس کل تم لوگ یہاں سے جا رہے ہو نا ہی سوچ کر آنکھ پھراؤ۔“

”ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

”محبت تم تو جانتے ہو کہ ڈاکٹر کے بقول تمہارا آپریشن اسی مہینے میں ہونا ضروری ہے ورنہ اگلے مہینے سے تمہاری

نہیں آیا۔“ راحت صاحب نے چائے کاسپ بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں راحت صاحب آپ بے فکر ہو کر چائیے انشاء اللہ ایک دو دن تک کڈنی آپ کے پاس اسلام آباد پہنچ جائے گی۔“ انہوں نے بھی چائے کاسپ بھرا۔

”یہ کون سی سیمپلی ہے جس کی بات پر تمہیں اتنا پکا یقین ہے۔“

”میری بچپن کی دوست ہے خود بھی ڈاکٹر ہے اور وہ اسپتال اسی کے بھائی کا ہے جہاں محبت کا آپریشن ہوگا۔“

”کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا۔“ راحت صاحب نے ایک اور سپ بھرا۔

”میری سیمپلی کا نام تو فریہ ہے لیکن میرے خیال سے جو ڈاکٹر محبت کا آپریشن کرے گا اس کا نام ڈاکٹر جہانگیر ہے۔“

انہوں نے تمام تر تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کل جاتے ہی اس سے مل لوں گا۔“

انہوں نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں کہ اچانک فون کی گھنٹی کی آواز سے گھبرا کر اٹھ گئی۔

”ہیلو.....“ انہوں نے فون اپنے کان سے لگایا۔

”بڑی امی میں مہوش.... دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہاں مہوش یوں تم اتنی گھبراہٹی ہوئی کیوں ہو؟“

”بڑی امی اچانک درد شروع ہو گیا ہے ہم اسے اسپتال لے کر آئے ہیں ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اب مزید دیر کیے بغیر محبت کا آپریشن کرنا ہوگا ورنہ اس کی جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔“ اس نے روتے ہوئے تمام تفصیل بتائی۔

”تم پریشان مت ہو انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا میرے بیٹے کو۔“

”بڑی امی آپ اپنی دوست سے پتا کریں کہ ڈونر کی کیا صورت حال ہے اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔“ انہوں نے کال بند کی اور موبائل سے نمبر ملا کر کان پر لگایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆.....☆.....☆

”مہوش کیا تمہاری فاطمہ سے بات ہوئی ہے میں کب سے کال کر رہا ہوں لیکن وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی۔“ اسپتال

ماہنامہ مسرگڑشت

اگر ہوائی جہازوں کے ڈیزائن کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ 1950 اور 1954 تک ہوائی جہازوں کی کھڑکیاں گول نہیں بلکہ چوکور ہوتی تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر انہیں تبدیل کر کے گول کیوں کیا گیا؟ فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹریشن (ایف اے اے) اور جہاز بنانے والے انجینئرز اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ چوکور کھڑکیوں کی وجہ سے جہاں جہاز کی لمبائی میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں ان کھڑکیوں سے جہاز میں ہوا کا دباؤ برقرار رکھنا مشکل بن جاتا ہے۔ ایف اے اے کی تحقیق کے مطابق 1953 اور 1954 میں برطانیہ سمیت دیگر ممالک کے طیاروں کے تباہ ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کی کھڑکیاں چوکور تھیں، جس وجہ سے طیاروں میں ہوا کے دباؤ کا توازن برقرار نہیں رہ سکا اور وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔ جہاز بنانے والے انجینئرز نے 1954 کے آخر تک طیاروں کے ڈیزائن تبدیل کر کے ان میں گول کھڑکیاں لگانا شروع کر دیں، جن کے استعمال سے جہاں جہاز کی طوالت کم ہوئی، وہیں یہ کھڑکیاں ہوا کا دباؤ برقرار رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوئیں۔ ایف اے اے کے مطابق چوکور کے مقابلے میں گول کھڑکیاں ہوائی جہاز کے لیے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، ان کے گول ہونے کی وجہ سے یہ کمزور نہیں ہوتیں، اور جہاز کے اندر ہوا کا توازن برقرار رہتا ہے جہاز کی گول کھڑکیوں میں ایک گول سیاہ لکیر ہوتی ہے، جو جہاز کے اندر ہوا کے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

مدرسہ: شمیمہ خانم۔ ملتان

کے کوریڈور میں کھڑے راحت صاحب نے موبائل پر کہا۔

”جی بڑے پاپامیری رات کو بات ہوئی تھی بڑی امی سے وہ اپنی فریڈ کے اسپتال جانے والی تھیں۔“

”نہیں کب آپریشن ہوگا۔“

”راحت صاحب مبارک ہو اگر وہ دل گیا ہے ابھی آپ اس صبح پر اپنے دستخط کر دیں تاکہ ہم جلد سے جلد آپریشن شروع کر سکیں۔“ ڈاکٹر جہانگیر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”کیا..... آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ ان

کے بلند آواز میں کہا۔

”اچھا بڑی امی کہاں ہیں میں کب سے ان کا نمبر ملا رہی ہوں۔“ مہوش نے دیر کیے بغیر سوال کیا۔

”امی تو کل رات ہی اسلام آباد کے لیے نکل گئی تھیں میں نے ساتھ چلنے کو کہا تو کہنے لگیں کہ تم یہیں علیزے اور اریشہ کے پاس رکو۔“

”کیا..... کل رات سے۔“ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

”کیوں کیا ہوا..... کیا ابھی تک امی آپ سے نہیں ملیں۔“

”نہیں میں تو کل سے اسپتال میں ہی ہوں، اچھا میں سمجھ گئی بڑی امی کو اسپتال سے ڈر لگتا ہے نا اس لیے وہ گھر چلی گئی ہوں گی تم پریشان مت ہو میں گھر جا کر ان سے مل جیتی ہوں۔“ اس نے بات ختم کر دی۔

”ٹھیک ہے جب ان سے ملیں تو مجھے کال کر لینا اریشہ بار بار امی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ اس نے موبائل بند کر کے بڑے پاپا کی طرف دیکھا۔

”میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔“

”بڑے پاپا زک جانیں پاپا گھر پر ہی ہیں میں ان سے پوچھ لیتی ہوں۔“ جیسے وہ مڑ کر جانے لگے تو مہوش نے پیچھے سے آواز دی۔

”ہاں ٹھیک ہے پھر جلدی سے رابطہ کرو۔“

”جی.....“ اس نے پھر سے نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔

”السلام علیکم.....“

”بابا بڑی امی گھر پر ہیں کیا.....“ اس نے سلام کے جواب کا انتظار کیے بغیر سوال پوچھا۔

”نہیں بیٹا میں تو صبح سے گھر پر ہی ہوں بھابی تو یہاں نہیں آئیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کیا اگر گھر پر بھی نہیں ہیں تو پھر کہاں جا سکتی ہیں؟“ اس نے پریشانی میں سر پکڑ لیا۔

”کیا ہوا سب خیریت تو ہے۔“ اس کی بات سن کر عون صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔

”جی بابا بڑی امی کل رات گھر سے نکلے ہیں یہاں اسلام آباد آنے کے لیے لیکن ابھی تک یہاں نہیں پہنچیں۔“

”تو بھابی سے کہو کہ ڈرائیور کو کال کریں یقیناً بھابی کے بلند آواز میں کہا۔

کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا تھا۔

”جی میں سچ کہہ رہا ہوں آپ جلدی سے سائن کر دیں تاکہ ہم اپنا کام شروع کر سکیں۔“ ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

”لیجئے میں نے سائن کر دیئے ہیں۔“ انہوں نے سائن کر کے کاغذ لوٹا دیئے۔

”بہت شکریہ..... اب آپ لوگ دعا کریں انشاء اللہ اللہ نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ ڈاکٹر پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے اجازت ملے ہی وہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئے اور آپریشن شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

ہرگز رتے ہوئے لمحے کے ساتھ ان کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں پچھلے پانچ گھنٹے سے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں کھسے ہوئے تھے، انتظار کا ایک ایک لمحوں پر بھاری تھا۔

”مبارک ہو راحت صاحب اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی اور ہم محبت کے آپریشن میں کامیاب رہے۔“ ڈاکٹر جہانگیر کے چہرے سے رخ کے تاثرات واضح تھے۔

”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ انہوں نے خوشی سے ڈاکٹر کو گلے لگا لیا۔

”میں ابھی یہ خوشخبری بڑی امی کو سناتی ہوں۔“ اس نے موبائل سے نمبر ملایا اور کان کے ساتھ لگا کر انتظار کرنے لگی لیکن دوسری طرف سے نمبر بند جا رہا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“

”پتا نہیں بڑے پاپا ابھی بھی نمبر بند جا رہا ہے۔“

”گھر والے نمبر پر کال کرو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے پھر سے نمبر ملایا اور فون کان کے ساتھ لگا لیا۔

”السلام علیکم.....“ دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز سے صاف پتا چلتا تھا کہ فون عمار نے اٹھایا تھا۔

”وعلیکم السلام..... عمار میں مہوش۔“

”جی بھابی کیسی ہیں آپ اور محبت بھابی کی طبیعت کیسی ہے۔“

”تمہارے لیے اچھی خبر ہے محبت کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے اور وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں کر

ڈرائیور کو ساتھ لے کر ہی گئی ہوں گی کیونکہ بھالی کو تو گاڑی چلانا نہیں آتی۔“ عون صاحب نے اپنے خیال کے مطابق حل پیش کیا۔

”ٹھیک ہے بابا۔“

”بڑے بابا ڈرائیور کو کال کریں۔۔۔۔۔“ اس نے فون بند کیا اور بڑے بابا کو کال کرنے کا کہا۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں تم میں ابھی کال کرتا ہوں۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔ احمد کہاں ہو تم۔“ پریشانی میں سلام دعا کا ہوش بھی نہیں تھا۔

”جی سر میں تو گھر پہنچ ہی ہوں۔“

”گھر پر کیا کر رہے ہو تم تو فاطمہ کو لے کر اسلام آباد

آنے والے تھے نا۔“

”نہیں سر میں تو گھر پر ہی ہوں اور مجھے کسی نے بھی

اسلام آباد جانے کا نہیں کہا اور نیگم صاحبہ کو تو صبح سے میں نے

دیکھا ہی نہیں۔“ ڈرائیور نے ساری صورت حال سے آگاہ

کرتے ہوئے کہا۔

”گاڑی کہاں ہے؟“

”سڑ گاڑی تو یہیں گیران میں کھڑی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے بے دلی سے فون بند کیا اور

وہیں ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

”بڑے بابا کیا کہا ڈرائیور نے؟“

”وہ گاڑی لے کر نہیں گئی۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں

سے سر تھام لیا۔

”جی موبائل پر ایک انجان نمبر سے آنے والی کال کو

دیکھ کر انہوں نے موبائل کان سے لگایا۔

”کیا میں راحت صاحب سے بات کر سکتی ہوں۔“

دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی عورت کی تھی۔

”جی بول رہا ہوں۔“

”راحت صاحب میں ڈاکٹر فریدہ بات کر رہی ہوں

..... فاطمہ کی دوست۔“

”جی ڈاکٹر صاحبہ کہیے۔“ نام سنتے ہی انہوں نے پہچان

لیا تھا۔

”راحت صاحب مجھے آپ سے فاطمہ کے بارے میں

بات کرنی ہے۔“ ڈاکٹر نے بھی مزید تعارف کی بجائے مدد سے کی

بات کی۔

”کیا فاطمہ کے بارے میں لیکن اس کا تو کچھ پتا نہیں

کہاں ہے۔۔۔۔۔“

خواتین کا عالمی دن

1975ء میں سیکسکس عالمی خواتین کی

جو پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں پہلی بار دنیا

بھر کی ختج خواتین کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ ایک

جگہ پر اکٹھی ہو کر پوری دنیا میں عورتوں کے

حقوق کی بات کر سکیں، چونکہ خواتین کا ایک اجتماع

8 مارچ کو ہوا تھا اس لیے اس نسبت سے دنیا

بھر میں خواتین کا یہ عالمی دن منایا جاتا ہے۔

خواتین کانفرنس

ارکان اسمبلی کی دسمبر 2002ء کو اس

وقت کے صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے

خواتین ارکان اسمبلی کو قانون سازی اور اسمبلی

کی کارروائی میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کے

حوالے سے خواتین کانفرنس کا اسلام آباد میں

افتتاح کیا۔ اس کا اہتمام وزارت ترقی خواتین

سامی بہبود اور خصوصی تعلیم نے کیا۔ کانفرنس میں

ملک بھر کی تمام سیاسی جماعتوں کی ختج

72 ارکان قومی و صوبائی اسمبلیوں نے حصہ لیا۔

سابق صدر نے اس موقع پر کہا تھا کہ خواتین

ارکان اسمبلی عورتوں کے متعلق قانون سازی

کے وقت واج ڈاک کانکشن ادا کریں اور اس

امر کو یقینی بنائیں کہ آئندہ پاکستان میں خواتین

کے مفاد کے خلاف قانون نہیں بنے گا نیز وہ

اسمبلی کے اندر اپنی طاقت کو جمع کریں اور اپنے

حقوق کے لیے اکٹھی ہو کر لڑیں، دنیا کی

پارلیمنٹ میں خواتین ارکان کی تعداد ساڑھے

سترہ فیصد ہے لیکن پاکستان میں اوسطاً 20 فیصد

خواتین رکن ہیں۔ اسی دور میں پاکستان آر کی

تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون ڈاکٹر منیر مجر جنرل

کے عہدے پر پہنچیں۔ عدالتوں میں زیادہ سے

زیادہ خواتین ججز کو لایا گیا۔

مرسلہ: صادق بخاری، کوٹ ادو

”جی میں جانتی ہوں راحت صاحب آپ جتنی جلدی ہو سکے لاہور آجائیں مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“
”کیا فاطمہ لاہور میں ہے ہم سب تو اسے اسلام آباد میں ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”جی راحت صاحب فاطمہ یہی ہے میرے پاس لیکن جتنی جلدی ہو سکے آپ یہاں آجائیں۔“
”سب خیریت تو ہے ڈاکٹر۔“ انہیں ڈاکٹر کی باتوں سے پریشانی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”جی فی الحال میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی آپ جتنی جلدی ہو سکے لاہور آجائیں۔ میں اسپتال کا ایڈریس آپ کو بھیج کر رہی ہوں۔“ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور راحت صاحب نے موبائل جیب میں رکھا اور جلدی سے گاڑی کی طرف ہولے۔

☆.....☆.....☆

”جی سر کس سے ملنا ہے آپ کو۔“ جیسے ہی وہ اسپتال کے اندر داخل ہوئے تو ریسپشنسٹ نے ان سے سوال کیا۔
”مجھے ڈاکٹر فریڈ سے ملنا ہے۔“ بھاگتے ہوئے آنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہے تھے۔

”آپ یہاں سے سیدھے چلے جائیں آگے جا کر دائیں طرف مڑتے ہی پہلا آفس ڈاکٹر فریڈ کا ہی ہے۔“ ریسپشنسٹ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے راستہ بتایا۔

ریسپشنسٹ کے بتائے ہوئے راستے سے گزرتے ہوئے جیسے ہی دروازے پر پہنچے تو دستک دیئے بغیر ہی اندر چلے گئے۔

”ڈاکٹر، فاطمہ کیسی ہے؟“

”آئیے راحت صاحب میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔“

”فاطمہ کہاں ہے۔“ انہوں نے پھر سے اپنی بات کو دہرایا۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ ڈاکٹر انہیں اپنے ساتھ لے کر ایڈیشنل وارڈ کی جانب چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

”مہوش دو ہفتے ہو گئے ہیں میرے آپریشن کو لیکن ابھی تک اریشہ کے علاوہ گھر سے کوئی بھی مجھے ملنے نہیں آیا سب ٹھیک تو ہے۔“ اسے فکر ہونے لگی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے میری کچھ دیر پہلے ہی علیر سے بات ہوئی ہے۔“ مہوش نے اسے تسلی دینے کی کوشش

کی۔

”اچھا تو تم ہی میری بات کرو ادوا می سے میرا بہت دل چاہ رہا ہے ان سے بات کرنے کا۔“

”اُمی تو یہاں نہیں ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا مطلب یہاں نہیں ہے۔“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں ہیں بلکہ لندن گئی ہوئی ہیں خالہ کے پاس۔“

”تو کیا وہ اریشہ کو ساتھ لے کر نہیں گئیں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

”نہیں خالہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لیے بڑی اُمی اریشہ کو میرے پاس چھوڑ کر گئیں ہیں۔“

”میرے موبائل میں خالہ کا نمبر ہے تم ایسا کرو کہ میرے موبائل سے لندن فون کرو مجھے اُمی سے بات کرنی ہے۔“ وہ اپنی بات رہنمائی کرتا۔

”تمہارا موبائل تو کافی دنوں سے گمراہ ہوا ہے ابھی میں گمراہوں کی تو آتے وقت لے آؤں گی۔“

”مہوش مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ اتنے دن گزر گئے ہوں اور اُمی نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہ کی ہو۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو محبت بڑی اُمی نے تو کافی بار فون کیا ہے لیکن تم سو رہے تھے اور ڈاکٹر نے تمہیں ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا اس لیے تم سے بات نہیں ہو پائی۔“ وہ بھی اپنی بات پر ڈھٹائی سے قائم تھی۔

”اگر اب اُمی کا فون آئے تو بے شک میں سو یا بھی ہوا ہوں تو مجھے اٹھا دیتا۔“ بالآخر اس نے تھک ہار کر مان ہی لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب زیادہ باتیں نہ کرو اور آرام کرو تمہارے اسٹچر کچے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”اریشہ کہاں ہے۔“ گھر آتے ہی اس نے اریشہ کے بارے میں پوچھا۔

”کل صبح ڈرائیور آیا تھا تو میں نے اریشہ کو اس کے ساتھ لاہور بھیج دیا تھا۔“

”اس کا مطلب کہ اُمی آگئیں ہیں لندن سے اسی لیے تو

حمیدہ بیگم (اکبر کی ماں)

مؤرخین انہیں مریم مکاری کے لقب سے یاد کرتے ہیں جو اکبر کی طرف سے انہیں عطا ہوا تھا۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں اس کے بڑے بڑے القابات لکھے ہیں۔ مثلاً قدوة طاہرات، اسوۂ زاہرات۔ حمیدہ بیگم خاموش طبیعت اور گوشہ نشین تھی۔ اس نے اکبر کے عروج کی بہاریں دیکھیں اور اکبر کی وفات سے چند سال قبل فوت ہوئیں۔ حمیدہ بیگم نے شہنشاہ وقت کی ماں کی حیثیت سے کبھی امور سلطنت میں مداخلت نہ کی۔ بلکہ حتی الامکان بردباری سے فتنے کو روکا کرتی تھی۔ ماثر الامراء جلد اول میں تحریر ہے کہ ملا عبدالنبی، اکبر کے استاد تھے۔ وہ اکبر سے اپنی جوتیاں سیدی کروایا کرتے اور مسجد میں جھاڑو دلاتے، حمیدہ بیگم یہ سب دیکھتی لیکن مزاحمت نہ کرتی بلکہ ایک مرتبہ اکبر سالگرہ کی تقریب میں کپڑوں پر زعفران کا رنگ چڑک کر دربار میں گیا تو ملا عبدالنبی نے اس کو ایک مشرکانہ فعل تصور کیا اور اس قدر برہم ہوئے کہ اپنے عصا سے اس کو سرد دربار مارا۔ اکبر کو نار ہو کر کل میں جا کر ماں سے شکایت کی کہ دربار میں اس طرح ذلیل کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ خلوت میں جو چاہے کرتے۔ نیک نفس ماں نے کہا کہ بیٹا دل پر نیل مت لے یہ نجات اخروی کا سبب ہے گا۔ قیامت تک چر چار ہے گا کہ ایک مظلوم الحال ملانے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی لیکن بادشاہ نے اپنی سعادت مندی سے اس کو برداشت کیا۔ البتہ بیرم خاں کے خلاف حمیدہ بیگم نے اپنے بیٹے اکبر کی حمایت ضرور کی لیکن اس کے بعد وہ امور سلطنت سے بالکل الگ تھلگ رہی۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

”کچھ نہیں بھائی..... بس آپ کو اتنی دیر بعد دیکھا اس لیے۔“

”اتنا ہی مس کر رہی تھی تو مجھے ملنے کیوں نہیں آئی؟“

اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اس نے خود سے ہی اندازہ لگالیا۔

”مجھے گپا می نے آنے نہیں دیا ہوگا انہیں تم لوگوں کی پڑھائی کی بہت فکر ہے، اچھا باقی سب کہاں ہیں۔“

”اریشہ اسکول ہے اور عمار کا جج اور بابا اپنے کمرے

انہوں نے اریشہ کو واپس بلا لیا ہے۔“ اس نے خود سے ہی اندازہ لگالیا۔

”ہوں۔“ اس نے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔

”مہوش سامان پیک کر دو ہم بھی گھر جا رہے ہیں۔“ اس

نے اچانک سے فیصلہ کیا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو اسپتال سے آئے

ہیں۔“

”ایک مہینا ہو گیا ہے مجھے اسپتال میں پڑے ہوئے

اور تم کہہ رہی ہو کہ جلدی کیا ہے۔“ وہ زچ ہو گیا تھا۔

”وہی تو کہہ رہی ہوں کہ ایک مہینے سے آپ بستر پر

رہے ہیں اس لیے ابھی کچھ دن گھومتے پھرتے ہیں تاکہ آپ

کاموڈ بھی فریش ہو جائے گا۔“

”اس وقت میرا بالکل بھی سیرپائے کا دل نہیں چاہ رہا

میں بس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“

”لیکن محبت.....“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے

مہوش کی بات کاٹ دی تھی۔

”مہوش سمجھنے کی کوشش کرو پچھلے ایک مہینے سے میں نے

اپنی فیملی کو نہیں دیکھا میں ترس گیا ہوں ان کو دیکھنے کے لیے۔“

”اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ جان چکی تھی

کہ اب بحث بیکار ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ لوگ واپس لاہور آ رہے تھے سارے راستے وہ

دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے، مہوش کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ

محبت سے کیا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اسے بعد میں پتا

چلا تو اسے زیادہ دکھ ہوگا۔

”محبت میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ جیسے ہی

ڈرائیور نے گاڑی گھر کے سامنے روکی تو بالآخر اس نے ہمت

جتائی۔

”بعد میں ابھی میں پہلے سب سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ

جلدی سے گاڑی سے اترا اور مرکزی دروازے کی طرف ہو

لیا۔

”السلام علیکم.....“ وہ مرکزی دروازے سے اندر داخل

ہوا تو علیہ کے کواٹے سامنے دیکھ کر کہا۔

”محبت بھائی، علیہ کے کی نظر اس پر پڑی تو بھارتی

ہوئی اس سے لپٹ گئی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”کیا ہوا علیہ کے تم رو کیوں رہی ہو۔“ اس کی آنکھوں

میں آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”کیا..... لیکن کیوں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں میں ہے۔“
 سے مہوش کی طرف دیکھا۔

”کیونکہ وہ ماں تھیں بھائی.....“ علیزے نے بھی اسے دلا سدیئے کی کوشش کی۔
 ”جب کہیں سے ڈور نہ ملا تو انہوں نے نہایت خاموشی سے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت وہ خود بھی خطرے میں ہیں اس لیے تم ابھی حوصلہ رکھو۔ ان سے کچھ نہ کہتا۔ صرف اپنا چہرہ دکھا کر لوٹ آنا۔“

وہ کانپتے قدموں سے ای کے کمرے میں داخل ہوا۔ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ان کے سینے سے جا لگا۔
 ”محب میرے بچے مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے اور تمہیں دنیا جہان کی ساری خوشیاں عطا کرے۔“ انہوں نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”ای آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایسا کیوں کیا تو اس سوال کا جواب تمہیں اس وقت ملے گا جب تم خود باپ بن جاؤ گے۔ بیٹا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے اور اس نے مجھے اولاد کے ذریعے آزمایا اور مجھے اس وقت جو ٹھیک لگا میں نے وہی کیا۔ دیکھا جائے تو اس دنیا میں ماں باپ اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے کچھ لوگوں کی اولاد ہی انہیں خود سے دور کر دیتی ہے اور کچھ کو موت ان سے جدا کر دیتی ہے لیکن دیکھو میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہارے جسم کا حصہ بن کر۔“

”اور امی؟“
 ”ای بھی ہیں۔“
 ”ارے محبت..... بیٹا تم..... کبھی طبیعت ہے تمہاری؟“ عقب سے بابا نے آواز دی۔
 ”بابا میں ٹھیک ہوں بس آپ لوگوں سے ملنے کا دل کر رہا تھا اس لیے یہاں آ گیا..... ای کہاں ہیں۔“
 ”اچھا اب درود تو نہیں ہے؟“ انہوں نے اس کو سینے سے لگا کر کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بابا..... ای کہاں ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر امی کے بارے میں پوچھا۔
 ”میں جانتا ہوں تم ٹھیک ہو لیکن پھر بھی میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں وہ ٹہلی کر لے گا کہ واقعی تم ٹھیک ہو یا نہیں۔“
 ”بابا میں آپ سے کیا پوچھ رہا ہوں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ زچ ہو گیا تھا۔
 ”بیٹا..... وہ سہیل ہے ہمارے ساتھ۔“ بالآخر انہوں نے جواب دے ہی دیا تھا۔
 ”کیا مطلب سہیل ہیں..... اگر یہیں ہیں تو نظر کیوں نہیں آ رہیں۔“

”محب ابھی تم اس سے مل نہیں سکتے۔“
 ”بابا یہ آپ کیسی پھیلیوں میں بائیں کر رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ پھیلیوں سے تنگ آ گیا تھا۔
 ”علیزے تم تیار مانا کہاں ہیں..... وہ نہ ہی مجھ سے ملنے اسلام آباد آئیں گی ابھی یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی نہیں ہیں آخر تم سب کیا پوچھا رہے ہو مجھ سے۔“
 ”بھائی..... امی۔“ اس نے پہلے بابا کی طرف دیکھا اور پھر سے محبت کی طرف۔

”علیزے میں اس وقت پاگل ہو رہا ہوں مجھے سچ بتا دو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دل پھٹ جائے اور میں.....“
 ”بھائی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے اس لیے وہ کمرے کے باہر نہیں آئیں۔“ بالآخر اس نے بتا ہی دیا۔
 ”انہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ رو ہانسا ہو گیا تھا۔
 ”مجھے معاف کر دو محبت لیکن یہ بڑی امی کا حکم ہے کہ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم تمہیں کچھ نہ بتائیں۔“
 ”آخر انہیں ہوا کیا ہے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ مہوش ہی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔
 ”تمہارے اندر جو کڑنی کام کر رہی ہے وہ بڑی امی کی

شمارہ ستمبر 2017ء کی منتخب سچ بیاتیاں

ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

- ☆ اول: ٹھکرائی ہوئی لڑکی..... سیما (فیصل آباد)
- ☆ دوم: گلدہ..... وسیم بن اشرف (ملتان)
- ☆ سوم: فرشتہ انکل..... شرنیل (ملتان)

پبلک ڈورس اور دوسرے انعام کے لیے آپ جتنی منتخب کججے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے